میرے ہمنوا کو خبر کرو

فاخرہ گُل

فاخرہ گل



"واہ بھئی سلیقہ قرینہ تو اپنی ندرت پر ختم ہے ایسا کوئی کام ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا جو اس لڑکی کو نہ آتا ہوگا۔"

"بنانے والے نے بنایا بھی تو یوں فرصت سے ہے کہ ایک ایک نقش پر فدا ہونے کو دل چاہے۔ اس پر کانچ سی آنکھوں میں ڈولتی معصومیت۔۔۔ دیکھتے ہی زبان بے اختیار تعریف کرنے لگتی ہے۔"

"نا صرف یہ بلکہ پہننے اوڑھنے کا بھی خوب ہنر رکھتی ہے۔ سستے سے سستے کپڑے کو ایسا کٹ دیتی ہے کہ ڈیزائنر کا معلوم ہوتا ہے اور پھر قدبت بھی ایسا کہ لان کا کوئی پرانا جوڑا بھی نکال کر پہن لے تو بنارسی لہنگوں ساڑھیوں کو مات دے دے۔"

"ساری باتیں ایک طرف لیکن غرور نام کا نہیں ہے اُس میں۔ اور یہی خوبی اسے ہمارے خاندان کی "سنو وائٹ" بنائے ہوئے ہے۔"

یہ اور اس جیسے کئی تعریفی کلمات اور سراہتی نظریں اکثر ندرت کی بصارت و سماعت سے ٹکراتے رہتے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کی لاڈلی ندرت، جسے دیکھ کر ہمیشہ لوگ اس میں موجود کسی نہ کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے اور ہر بار ہی ناکامی ہوتی کہ شکل و صورت بھی اچھی تھی اور ذہن بھی اسکول سے لے کر اب یونیورسٹی تک ہمیشہ ٹاپ تھری پوزیشنز پر رہنے کے باوجود اس کی بھنویں کبھی اوپر نہیں چڑھی تھیں۔ سر میں کبھی غرور نہیں سمایا تھا۔ کم عمر ہونے کے باوجود اس کا ذہن، اس کے خیالات انتہائی پختہ اور میچور معلوم ہوتے۔ غرض یہ کہ اٹھارہ سال کی ہونے کے باوجود اس کا وجود تمام گھر والوں کے لیے چابی کی اُس گڑیا کی مانند تھا جسے دیکھ دیکھ کر سب جیتے تھے، خوش ہوتے تھے اور اس کی سدا خوش رہنے کی دعائیں کیا کرتے تھے۔

☆☆☆

شاعر حضرات نے بادِ نسیم کے حوالے سے جتنے اشعار لکھے ہیں اس کیفیت کا اندازہ کرنے کے لیے خود اسے محسوس کرنا ضروری ہے۔ صبح صادق کے وقت چلتی نرم اور ٹھنڈی ہوا پر جیسے ماں کی گود کا گمان ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سبک خرام ہوا کے ساتھ فضا ہمیں اپنی بانہوں میں بھرنے لگی ہو۔ ندرت کے لیے صبح کا یہ حسین وقت ہمیشہ ہی آئیڈیل ہوا کرتا تھا۔ رات کو بے شک دو ڈھائی بجے سوتی لیکن فجر کے وقت اس کی آنکھ میکانکی انداز میں کھلتی کہ لگتا اس کے دماغ میں کوئی الارم سیٹ ہے جو اس کی تھکن، نیند کی کمی، موسم کی گرمی سردی سے بے نیاز اپنے مخصوص ٹائم پر بج اٹھتا اور وہ کسی روبوٹ کی مانند اٹھ کر اس وقت کے سکون اور ہوا کی پاکیزگی کو اپنے اندر اتارا کرتی۔ فجر کی نماز کے بعد وہ گھر میں موجود چھوٹے سے لان میں ننگے پاؤں چلتے ہوئے گھاس پر پڑی شبنم کے شفاف قطروں کو پاؤں سے محسوس کرتی تو ذہن ایک دم فریش سا ہو جاتا۔

آج بھی حسب معمول وہ تھوڑی دیر گھاس پر چہل قدمی کرنے کے بعد ابا کے لگائے ہوئے پودوں کو دیکھ رہی تھی جن میں موجود ننھی منی کلیاں پھول بننے کے لیے تیار اور بے تاب تھیں۔

"ندرت بیٹا!" امی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے آواز لگائی۔

"آج تو تم نے جلدی یونیورسٹی جانا تھا؟"

"جی امی! لیکن ابھی تو بہت ٹائم ہے۔ کپڑے وغیرہ تو میں نے رات کو تیار کر لیے تھے۔" امی کی آواز پر مڑنے کے ساتھ ہی جواب دیتے ہوئے اس نے اندر کا رخ کیا۔

مکمل ناول

سورج نرم نرم اوائل کرنوں کے ساتھ دھرتی کے بسنے والوں پر اپنی آمد کا طبل بجا چکا تھا، جسے پرندوں

کی چہچہاہٹ اور پھول، پودوں نے لہلہا کر خوش آمدید کہا ہر چیز میں زندگی دوڑنے لگی تھی گھر کے اندر اور گھر کے باہر سے نفوس کی ملی جلی آوازیں زندگی کا احساس دلا رہی تھیں۔

''السلام علیکم امی، السلام علیکم ابا!''

ندرت نے کمرے میں داخل ہو کر صبح کا سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! جیتی رہو۔'' دونوں نے اسے دعا دی تو وہ امی کے پاس بیٹھ گئی۔ انہوں نے قرآن پاک بند کر کے اس پر پھونک ماری اور جزدان میں لپیٹنے لگیں۔ یہی ان کا معمول بھی تھا۔ وہ روزانہ اس وقت تک قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہتیں جب تک ندرت ان کے کمرے میں نہ آتی۔

''کیا بات ہے بیٹا! آج یونیورسٹی میں کوئی فنکشن ہے یا ویسے ہی جلدی جانا ہے؟'' ابا نے مسواک کرنے کے بعد کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں کلی کرنے کے بعد پوچھا تھا۔

''نہیں ابا! آج تو فنکشن نہیں ہے۔ ہاں تیاری آج سے شروع کر رہے ہیں دراصل ہمارے پرنسپل کا ٹرانسفر ہو گیا ہے تو ان کے اعزاز میں ایک چھوٹا سا لنچ ہماری کلاس نے دینا ہے پھر ہم سب نے سوچا کہ لنچ کے ساتھ ذرا موج مستی بھی ہو جائے تو اچھا ہے بس وہی تیاری کرنی ہے۔'' ندرت نے ہمیشہ کی طرح مکمل تفصیل سے بات کی تھی۔ امی اور ابا کے ساتھ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات شیئر کرتی تھی۔ تب سے جب سے ثروت آپا کی شادی ہوئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں باقی رہ جانے والے ناصر بھائی بڑے بھی تھے اور پھر ان کی مصروفیات بھی ایسی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں اپنی باتیں شیئر نہیں کر پاتی تھی۔ ایسے میں وہ اپنی ہر بات امی ابا سے یوں شیئر کرتی کہ لگتا ڈائری لکھی جا رہی ہو اور اس روٹین میں ناصر بھائی کی شادی کے بعد تک بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

''ہاں بھئی جہاں ہماری ندرت ہو وہاں موج مستی نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟''

ابا نے خوش دلی سے کہا تو امی بھی مسکرا دیں۔

''موج مستی کا دوسرا نام۔۔۔ ندرت خان ندرت خان۔'' قافیے کی غرض سے خان کا اضافہ کر کے ندرت نے نعرہ لگانے کے انداز میں دایاں بازو بلند کرتے ہوئے کہا تو امی اور ابا بے اختیار ہنس دیے۔

☆☆☆

چوکیدار بابا کو سلام کرنے کے بعد وہ کافی دیر سے یونیورسٹی کے لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اسٹوڈنٹس بھی آنے لگے تھے۔ لیکن اس کے گروپ کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ غصہ اور جھنجلاہٹ اب اس کے چہرے سے بھی صاف نظر آنے لگی تھی۔ اور سوئے اتفاق آج وہ اپنا موبائل بھی گھر بھول آئی تھی ورنہ اب تک ایک ایک کی اچھی طرح کلاس لے چکی ہوتی۔

''ہیلو ندرت!'' رابعہ دور سے ہی بڑے زبردار انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کی طرف آ رہی تھی۔ جواباً اس نے بھی اس سے بڑھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان یا امریکا پاکستان سے ملاتے ہیں۔ یعنی اوپری دل سے۔۔۔

''دفع ہو جاؤ یار تم سب۔۔۔ مجھے پتا ہے تم سب نے مل کر مجھے بے وقوف بنایا ہے۔'' ندرت نے رابعہ سے چند قدم پیچھے شاہ زین، زبیر اور صبا کو دیکھ کر کہا تھا۔

''ارے نہیں یار، تم پہلے ہی اتنی پرفیکٹ بنی ہوئی ہو کہ ہماری محنت کی ضرورت ہی نہیں۔'' شاہ زین نے موبائل جیب میں رکھتے ہوئے کہا تو وہ تپ گئی۔

''شاہ ہو کے بچے، تم یہ اپنی بیوی کو بھی گھر پر کیا چھوڑ آیا کرو۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے۔۔۔ ہونہہ! یہ تمہیں میسجز کرنے کے علاوہ بھی کوئی کام ہے کہ نہیں۔''

وہ پہلے ہی اسے صبح صبح موبائل پر میسج ٹائپ کرتے دیکھ کر جل گئی تھی اور پھر تیل کا کام اس کے جلنے نے کر دیا اور ویسے بھی شاہ زین کا اپنے موبائل سے برتاؤ دیکھ کر وہ اسے موبائل کے بجائے اس کی بیوی ہی کہتی تھی۔

''شکر کرو تم نے یہ بات میرے بچے سے کہی اور بچ گئیں، مجھے کہتیں تو ضرور ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔''

''بس یار تم ہنگامے کو بیٹھا ہی رہنے دو تو اچھا ہے۔ کھڑا کرنے کی زحمت نہ دو۔۔۔'' زبیر بیچ میں بول اٹھا تھا۔

''ندرت کا غصہ اپنی جگہ ٹھیک ہے وہ بے چاری صبح سے آ کر ہم سب کا انتظار کر رہی ہے۔'' زبیر نے اقوام متحدہ کا کردار ادا کیا تھا۔ سب جانتے بوجھتے ہوئے رسمی کارروائی سا۔

''یار دراصل شاہ زین کی امی کی شوگر رات میں کافی ہائی ہو گئی تھی اور صبح اس کا خیال تھا کہ آج گھر پر ہی رہے لیکن پھر ثمینہ نے کالج سے چھٹی کر لی تا کہ شاہ زین اپنی کلاس لے لے۔'' صبا نے بات شروع کی تھی۔

''ہاں اور ہم بھی صبح سے وہیں تھے، اب شاہ زین نے ان کی شوگر چیک کی تو وہ کافی بہتر تھی جبھی ہم ذرا لیٹ بھی ہو گئے اور تمہیں انتظار کرنا پڑا۔'' زبیر نے بات مکمل کی۔

''اوہ۔۔۔! آئی ایم سوری۔ لیکن مجھے بھی تو اطلاع دی جا سکتی تھی نا۔''

''تمہارا موبائل میڈم صاحبہ گھر بیٹھے ناشتے میں ہم سب کے کتنے ہی ایس ایم ایس ڈکار چکا ہے۔ جا کر اس کا پیٹ چیک کرنا اب تک تو بدہضمی بھی ہو گئی ہوگی۔'' شاہ زین نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو سب ایک بار پھر مسکرانے لگے۔

''سرکاری ٹی وی کے نیوز اینکرز کی طرح تم نے اس بے چارے کا منہ بھی بند کر رکھا ہے۔ وہ تو آنٹی نے اسے اتحادی جماعتوں کی مانند کبھی کوئی تو کبھی کوئی رنگ بدلتے دیکھا تو اٹھا لیا اور ہمیں معلوم ہوا کہ محترمہ کسی بے وفا صنم کے وعدے کی طرح بے چارے موبائل کو بھول گئی ہیں۔ بس تب سے اب تک ہم سب ایک مظلوم بہو بنے تمہاری ساس نما جھڑکیوں کے لیے خود کو تیار کر رہے تھے۔''

اب کی بار سب کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی تھی۔

ندرت جانتی تھی کہ شاہ زین کے لیے اس کی ماں اور بہن ہی کل کائنات ہیں۔ باپ کا سایہ کم عمری میں ہی سر سے اٹھ جانے کی بنا پہ ماں نے بغیر کسی دنیاوی سہارے کے ان دونوں کی پرورش کی تھی کہ ان کے تمام رشتہ دار محض موم کے پتلے ثابت ہوئے تھے جو حالات کی تپش میں ان تینوں کو اکیلا چھوڑ گئے۔ شاہ زین کم عمری کی چوکھٹ عبور کر کے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے اس قدر باشعور ہو چکا تھا کہ بہت سی باتوں کو بڑی سنجیدگی سے سمجھنے لگا۔ خود پڑھتا اور پڑھنے کے بعد دوسروں کو ٹیوشنز پڑھاتا تا کہ ماں کی مالی پریشانیوں کو کچھ کم کر سکے۔

اور پھر ایسا ہوا کہ اس کا اوڑھنا بچھونا ہی یہ ٹیوشنز بن گئیں۔ پہلی کلاس نو بجے اسٹارٹ ہوتی اور وہ صبح چھ بجے سے ٹیوشنز پڑھانے کا آغاز کر دیتا۔ گھر گھر جا کر ٹیوشنز پڑھانے کا یہ سلسلہ رات گیارہ بجے جا کر اختتام پذیر ہوتا اور وہ ثمینہ اور اماں کے مطمئن چہرے کو دیکھ کر ساری تھکان بھول تو جاتا، لیکن اس سارے چکر میں وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے مقابلے میں انتہائی سنجیدہ ہوتا چلا گیا۔ مسکراہٹ کی تتلی اس کے ہونٹوں سے ناامید ہو کر کسی اور سمت جا نکلی تھی۔ ایسے میں اسے ندرت سمیت ان سب کی دوستی ملی اور تب ہی اس نے جانا کہ حالات کا مقابلہ خوش دلی سے کیا جائے تو بوجھ، بوجھ نہیں لگتا۔ ثمینہ اور اماں نے اس کے اندر ہونے والی اس تبدیلی کو بہت سراہا تھا اور یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کے اوپر جما سالوں کا یہ زنگ ندرت کے قہقہوں کے بغیر اترنا ناممکن تھا اور دوستی کی اس شروعات کو وہ یقیناً کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

''صبا۔۔۔!'' ندرت نے پروفیسر شجاع کے لیکچر

کے دوران صبا کو کہنی ماری تھی۔

''کیا ہے؟'' صبا کی ڈری ڈری سرگوشی سن کر ندرت نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی تھی۔ کیونکہ چند دن پہلے ندرت کے بولنے کی وجہ سے غلط فہمی میں پروفیسر شجاع نے صبا کو ڈانٹ دیا تھا۔

''وہ دیکھو زبیر کی سیٹ کے ساتھ کتنا بڑا کیڑا۔۔۔ لیکن یہ آیا کب؟''

''آ۔۔۔ کیڑا۔'' صبا نے نیوز چینلز کی تقلید کرتے ہوئے خبر کی تصدیق اور تحقیق کرنا بالکل ضروری نہیں سمجھا تھا البتہ نیوز بریک کرنا تھی سو ہوگئی اور اب کلاس میں موجود لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے لڑکیوں کی اکثریت کی حالت دیکھ کر انجوائے کر رہے تھے۔ جو ''نزاکت'' میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں فرش سے پاؤں اٹھائے اوہ۔۔۔ آ۔۔۔ اور آوچ جیسی آوازوں میں ردعمل ظاہر کر رہی تھیں۔ پروفیسر شجاع نے چند سیکنڈز میں معاملہ سمجھنے کے بعد خشمگیں نظروں سے صبا کی طرف دیکھا تھا جس کا سانولا سا چہرہ شرمندگی سے جامنی ہو رہا تھا۔

''صبا۔۔۔!'' پروفیسر شجاع کی ایک ہی آواز سے کلاس میں سکوت طاری ہونے لگا تھا۔ چند لڑکیاں البتہ اب بھی پاؤں نیچے رکھنے سے کترا رہی تھیں۔

''یہ۔۔۔ یس سر!'' بمشکل کھڑی ہو کر اس نے نگاہیں زمین پہ ہی مرکوز کیے رکھی تھیں۔

''اینی پرابلم؟''

''نو سر!''

''پھر یہ روز روز کلاس کو ڈسٹرب کرنے کا مقصد؟''

''سوری سر! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''اٹس یور وارننگ صبا! اگر نیکسٹ ٹائم آپ کا مزید کچھ ڈسٹرب کرنے کا ارادہ ہو تو پلیز کلاس میں آنے کی زحمت نہ کیجیے گا انڈر اسٹینڈ؟''

''یس سر!'' مری مری آواز میں کہہ کر وہ ان کے کہنے پر بیٹھ تو گئی تھی لیکن پھولا ہوا منہ بتا رہا تھا کہ وہ ندرت سے ناراض ہے۔

☆☆☆

''روٹھی ہو تم، تم کو کیسے مناؤں صبا۔۔۔! بولو نا بولو نا۔''

ندرت کینٹین میں صبا کے سامنے بیٹھی اس کے ہونٹوں کے ''پنچ بٹن'' کھولنے کی کوشش تو ضرور کر رہی تھی لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

''یار پلیز اسٹاپ اٹ ندرت! یہ ہنسی مذاق ہر وقت اچھا نہیں لگتا ہے۔'' اس دفعہ صبا واقعی ناراض ہوگئی تھی اور اگر پوائنٹ کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید اب تک گھر بھی جا چکی ہوتی۔

''تو ٹھیک ہے تم مجھے وقت بتا دو میں اس وقت کر لوں گی ہنسی مذاق۔ لیکن پلیز یہ جو تمہارے ماتھے پر ''سلوٹوں کا جلسہ'' ہو رہا ہے انہیں تو منتشر کر و پہلے۔'' ندرت بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

اس دفعہ صبا کے چہرے پر واقعی روٹھی روٹھی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''تمہاری وجہ سے آج پھر میری کتنی انسلٹ ہوئی ہے پوری کلاس کے سامنے، تم ہوتیں تو کرتیں برداشت۔''

''ہاں یار آئی ایم رئیلی سوری، مجھے اندازہ ہے کہ ''سیاست دانوں'' کے علاوہ کوئی بندہ اتنی انسلٹ برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن کہا نا آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' ندرت نے کان پکڑے تھے۔

''ارے ارے کیا آئندہ نہیں ہوگا اور یہ تم کان کیوں پکڑ رہی ہو۔'' زبیر ابھی کینٹین میں داخل ہوا تھا اور سیدھا ان کی طرف ہی چلا آیا۔

''وہ دراصل میں نے کلاس میں صبا کو کیڑا دکھانا چاہا مگر یہ اسٹوپڈ دیکھنے سے پہلے ہی چیخ پڑی۔'' ندرت نے مزے سے فرنچ فرائز کھانے کے دوران ٹانگ ہلاتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔

''کیڑا۔۔۔؟ اور کلاس میں؟'' زبیر کو لگ رہا تھا کہ اسٹوری میں ٹوئسٹ ابھی باقی ہے اور وہی ہوا بھی۔

''ہاں بھئی تمہارے ساتھ ہی تو تھا کیڑا۔۔۔ کتابوں کا۔''

آخری الفاظ اس نے زیر لب کہے تھے لیکن ان دونوں نے سن ہی لیے۔

''یار تم سدھر جاؤ ندرت!''

''تو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ تمہارے ساتھ ہی تو بیٹھا تھا شاہ زین۔ کتابی کیڑا نہیں تو اور کیا ہے وہ؟'' ندرت نے بڑی معصومیت سے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو پھیلایا تھا۔

''ہاہاہاہا۔۔۔ صبا تم اس کیڑے سے ڈر گئی تھیں۔'' زبیر کو بے اختیار ہنسی آئی تھی جسے اس نے روکنا مناسب ہی نہیں سمجھا تھا۔

صبا نے ایک بار پھر ملامتی نظروں سے ندرت کو دیکھا لیکن پھر ہنس دی۔

''لیکن تمہیں شاہ زین کے لیے ایسا کہنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ شاید تمہیں پتا نہیں ہے۔۔۔'' زبیر نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور سنجیدہ ہو کر سر جھکایا۔ "You know he is abnormal"

''واٹ؟'' دونوں ایک ساتھ چیخی تھیں اس بار پر انہیں حیرت بھی ہوئی تھی اور دکھ بھی۔

''ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایب نارمل نہیں تو اور کیا ہے وہ، اتنے دن ہوگئے ہیں یونیورسٹی آتے ہوئے، آج تک اس نے کسی لڑکی سے تو دور لڑکوں سے کسی لڑکی کا نام نہیں پوچھا، پاس سے گزرتی کسی مدہوش کن خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے مڑ کر اس حسینہ کو دیکھا تک نہیں کہ جس کی پرفیوم چوائس اتنی زبردست ہے وہ خود کیسی ہوگی، جو لائبریری کسی لڑکی کی نہیں واقعی کتاب کی تلاش میں جاتا ہے۔ جو کوریڈورز میں موجود رنگینیوں کو پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلموں سے بھی کم نمبر دے تو بولو کیا میں اسے ایب نارمل بھی نہ کہوں۔''

''زو۔۔۔ بیر! تم سے تو واقعی زو (Zoo) کو بھی مدہو گیا بھی وہاں سے نکال کر یہاں پھینک دیا۔'' ندرت نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

''اور ویسے بھی میں جانتی ہوں تم کتنے نارمل ہو۔ ہر لڑکی کا نام پتا تو چھوڑو بہن بھائیوں کی تعداد تک معلوم ہے تمہیں، ہے نا۔'' صبا بھی آخر فارم میں آ ہی گئی۔

''تم ایک کام کرو ''نادرا'' میں بھرتی ہو جاؤ لیکن۔۔۔ زنانہ سیکشن میں۔'' ندرت نے بڑے ہمدردانہ انداز میں مشورہ دیا جس نے تینوں ہی کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

''ویسے ندرت، شاہ زین اتنا بھی ایب نارمل نہیں ہے۔ یاد ہے نا اس کا فرسٹ ڈے، جب بڑے مزے سے کہنے لگا۔ ''میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' اور پتا ہے زبیر ندرت نے کیا کہا؟ ''جی جی کیوں نہیں پوچھیے نا، ویسے باقی سب کو تو میرا نام پوچھنے کے لیے این۔ او۔ سی بنوانی پڑتی ہے لیکن خیر ہے آپ تو شاہ زینہ خیالات کے مالک لگتے ہیں اس لیے آپ کے لیے خاص رعایت۔''

''اوہ رئیلی۔۔۔! پھر؟'' زبیر حیران تھا۔ کیونکہ ندرت عام طور پر ہر کسی کے ساتھ بے تکلف ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس کی چھیڑ چھاڑ اور مذاق مستی عموماً محض چند دوستوں تک ہی محدود رہتا تھا اور خوامخواہ لفٹ لینے والے لڑکوں کو پل بھر میں جھاڑ دیتی تھی جبھی کوئی بھی اس سے بات کرنے سے پہلے کئی دفعہ الفاظ کی ترتیب کو الٹ پھیر کرتا۔

''پھر کیا۔ اس نے پہلے تو حیران ہو کر اسے اور پھر مجھے دیکھا اور پھر تھینکس کہہ کر چلا گیا۔''

''ندرت! آئی ڈونٹ بلیو اٹ۔'' زبیر اب ندرت سے تصدیق چاہ رہا تھا۔

''ہاں ہاں ایسا ہی ہوا تھا۔ دراصل میں صبح سے اسے اتنا سیریس دیکھ رہی تھی کہ مجھے الجھن ہونے لگی۔ بھئی لائف میں کوئی رولا رپا، موج مستی یا شوخی شرارت نہ ہو تو فائدہ۔ زندہ اور مرے ہوئے لوگوں میں فرق تو نظر آئے نا، اسی لیے جب جاتے جاتے اس نے میرا نام پوچھا تو مجھے موقع مل گیا۔''

"اچھا تو یہ بات ہے، بائی داوے یہ نظرِ عنایت صرف شاہ زین پر ہی کیوں؟" زبیر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"کلاس میں اور بھی کتنے لوگ ہیں جن کا مزاج سنجیدہ ہے۔"

"ہاں کئی ہوں گے لیکن اس پر عنایت صرف اس لیے کیونکہ وہ اس دن تمہارے ساتھ ساتھ تھا تو میں نے سوچا اس کے جراثیم کہیں تم پر بھی اٹیک نہ کردیں۔"

"او۔۔۔ چلو مان لیتے ہیں کیا یاد کرو گی۔"

زبیر کی بات ختم ہونے پر صبا اور زبیر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے۔ لیکن ندرت نے اس فعل کو خارجی معاملہ قرار دیتے ہوئے کوئی نوٹس نہیں لیا اور فریج فرائز ختم ہونے پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

"بھابھی کھانا تیار ہے یا کچھ ہیلپ کروادوں؟"

آج وہ یونیورسٹی سے جلدی آ گئی تھی جبھی ہاتھ منہ دھو کر اب کچن میں آ موجود ہوئی تھی۔ پانی کے شفاف قطرے ابھی تک چہرے پر موجود تھے اور یہی اس کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ سردی ہو یا گرمی منہ دھونے کے بعد اسے ٹاول یا ٹشو پیپر سے صاف نہیں کرتی تھی۔

"کھانا تو تقریباً تیار ہی سمجھو میں روٹیاں ڈال رہی ہوں تم بس سلاد اور پودینے کی چٹنی بنالو۔" بات ختم کرتے ہوئے عائشہ نے مڑ کر ندرت کو دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ صاف شفاف سرخی مائل سفید چہرے پر موجود پانی کے ننھے ننھے قطروں کو دیکھ کر بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے گلاب پر ابھی شبنم کی پھوار ہوئی ہو۔ اس پر بڑی بڑی کانچ سی آنکھوں پر موجود سیاہ پلکوں کی لمبی سی گھنی جھالر۔۔۔ وہ بات کرتے کرتے رک گئی تھی۔ اور یہ سب عائشہ کے ساتھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا اکثر وہ ندرت کو دیکھ کر کبھی مبہوت تو کبھی رشک و حسد میں مبتلا ہو جاتی تھی۔

گو کہ وہ خود بھی اچھی خاصی پرکشش تھی سانولی رنگت پر تیکھے نقوش اسے بہت سوں سے بڑھ کر فریب بناتے تھے لیکن پھر بھی وہ ندرت کو دیکھ کر رشک اور کبھی حسد کے جذبے کا شکار ہو جاتی کیونکہ تمام کزنز میں صرف ندرت ہی ایسی تھی جسے دیکھ اکثر لڑکوں کی مائیں اس کا نام پتا ضرور پوچھا کرتیں۔ آج کل ہمارے معاشرے میں ایوریج ہائٹ پانچ فٹ دو انچ تصور کی جاتی ہے وہ پانچ فٹ چھ انچ کے ساتھ سب میں منفرد لگتی۔

عائشہ کو اچھی طرح یاد تھا مہندی اور شادی کی تقاریب میں لوگ اس سے زیادہ ندرت کو دیکھ رہے تھے جو بلاشبہ ایک تراشا ہوا پیکر ہی تو تھی۔

"بھابھی! دہی تو فریج میں ہے ہی نہیں۔" پودینہ، ہری مرچ اور انار دانہ وغیرہ گرائنڈ کرنے کے بعد اب فریج میں چیزیں ادھر سے اُدھر ہٹا کر دہی ڈھونڈ رہی تھی۔

"اوہ! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا آج صبح لقمان دہی لا ہی نہیں تھا اور نہ ہی بعد میں مجھے منگوانے کا خیال آیا۔" عائشہ اس کی بات پر اپنے خیالات سے چونکی تھی۔ ایک بار پھر ندرت کو دیکھا جس کا چہرہ اب گرمی سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

"اوہ نو بھابھی! دہی کے بغیر تو مزا ہی نہیں آئے گا، چلیں خیر ہے میں ٹماٹر ڈال لیتی ہوں۔" ندرت نے منہ بسورا مگر پل بھر میں دوسرے آپشن پر کام کرنے لگی۔

☆☆☆

"شاہ زین بیٹا کیا بات ہے۔ بہت تھکے تھکے معلوم ہو رہے ہو۔"

اماں نے کھانا پلیٹوں میں نکالتے ہوئے کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"ہاں اماں دراصل ایگزیمز کا سیزن شروع ہونے والا ہے تو بس بچوں پر بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور پرسے روز ان کے پیرنٹس میں سے کوئی ایک تو ضرور تاکید کرتا ہے کہ نمبر اچھے آنے چاہئیں۔ بس ہمیشہ ہی بچوں کے ایگزیمز مجھے ان سے زیادہ پریشرائز کرتے ہیں۔"

شاہ زین نے کبھی ان سے اپنی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ کیونکہ وہ اور اماں آپس میں ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب تھے اسی لیے اماں کے پوچھنے پر آج بھی اس نے اپنی فیلنگز شیئر کی تھیں۔

"تم فکر نہ کرو بیٹا! بس اپنی طرف سے ایمانداری اور محنت سے کام کرو اور باقی سب اللہ پر چھوڑ دو۔"

"بے شک اماں یہ بات تو ٹھیک ہے۔" شاہ زین نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور کھانا کھانے لگا۔

☆☆☆

پروفیسر خورشید کا نام تمام اسٹوڈنٹس کے لیے خوف کا باعث تھا اور وہ اس لیے کہ وہ کسی کی بھی انسلٹ کرتے ہوئے اس کا سابقہ اچھا یا برا ریکارڈ بھول جایا کرتے تھے اور معافی کا لفظ ان کی ڈکشنری میں ندرت جیسے ذہین طالب علموں کے لیے بھی نہیں تھا۔ ڈانٹنے پر آتے تو اسٹوڈنٹس کے "اوصاف" ان کے منہ سے ساس کے طعنوں کی طرح برآمد ہوتے۔ بھی ندرت کا خیال تھا کہ کلاس میں موجود ہر ایک اسٹوڈنٹ کو کم از کم ایک بار پروفیسر خورشید سے ڈانٹ کھا کر اتنا تو جاننا چاہیے کہ وہ ان کی نظر میں کیا مقام رکھتا ہے لیکن یہ خواہش ایسی تھی جس کی تکمیل کے لیے کوئی بھی دانستہ عملی قدم اٹھانے پہ تیار نہ ہوتا۔ اور اسی بات سے ڈرتے ہوئے آج ندرت اور صبا نے الگ الگ راستہ چنا تھا۔ یعنی ندرت چونکہ آج کلاس ڈسکشن کی تیاری نہیں کر پائی تھی اس لیے طے یہ پایا کہ صبا پروفیسر شجاع کی کلاس اٹینڈ کرے گی اور ندرت اس کے بعد والے پیریڈ میں پروفیسر خورشید کے "دل کا حال" جاننے سے بچنے کے لیے لائبریری میں موجود کتابوں سے تھوڑی بہت تیاری کی کوشش کرے گی۔ اور اسی تیاری کے لیے اب وہ لائبریری سے ہوتی ہوئی اپنے مطلوبہ مضامین کی الماری کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ندرت بیٹا! آپ کون سی ٹیبل پر بیٹھو گی۔" جامی چاچا نے اسے کتاب نکالتے دیکھ کر پوچھا تو اسے حیرت ہوئی۔

"لیکن چاچا آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔" بات کرتے ہوئے اس نے سامنے ہی موجود کرسی کھسکائی اور کتاب ٹیبل پر رکھ دی۔

"وہ دراصل یہ میڈم انیتا نے آپ کے لیے بھجوایا ہے۔" جامی چاچا نے "Silence" کا بورڈ اس کی کتاب کے ساتھ رکھا اور مسکرا دیے۔

"ارے جامی چاچا! آپ فکر ہی نہ کریں کیونکہ آج میں اکیلی ہوں نہ تو صبا میرے ساتھ ہے اور نہ ہی وہ رنگیلا۔۔۔ میرا مطلب ہے زبیر۔" ندرت نے بھی مسکرا کر پہلے میڈم انیتا کو دیکھا جو اسے مسکراتے دیکھ کر خود بھی مسکرا رہی تھیں اور پھر جامی چاچا کو، جو ہمیشہ ان تینوں کو خاموش رہنے کا پیغام دینے آیا کرتے۔

ندرت کتابی کیڑا نہیں تھی بلکہ اس کے اندر خداداد ذہانت تھی۔ بچپن سے اب تک کسی بھی چیز میں اس نے رٹا نہیں لگایا تھا۔ بس ہمیشہ کانسیپٹ اپنے دماغ میں جامع اور واضح رکھنے کی کوشش کرتی۔ بس مسئلہ اس کا یہ تھا کہ وہ بہت زیادہ دیر خاموش یا اکیلی نہیں رہ پاتی تھی جبھی چند پوائنٹس دیکھ لینے کے بعد اب وہ بور ہو رہی تھی۔ صبا اور زبیر کلاس میں تھے سو اس نے وقت گزاری کے لیے شاعری کا سہارا لینا بہتر سمجھا۔ لیکن ایک خوش گوار حیرت کا احساس اسے تب ہوا جب اسے بک شیلف کے دوسری جانب شاہ زین کتاب کھولے کسی اخبار میں گم نظر آیا۔ ندرت نے چند لمحے اخبار کو غور سے دیکھا اور پھر اس کی محویت توڑنے کے لیے گلا صاف کرنے لگی۔ شاہ زین نے اچانک چونک کر اسے دیکھا اور پھر اخبار تہ کرنے لگا۔

"ہیلو شاہ زین۔" ندرت نے ٹائم پاس کرنے کے لیے خوش اخلاقی کا سہارا لینا ضروری سمجھا تھا۔

"ہیلو۔" شاہ زین کا رسمی اور خشک لہجہ ندرت کی توقع کے سو فیصد خلاف تھا کیونکہ اس سے پہلے ہمیشہ دوسرے لوگ اس سے بات کرنے کی خواہش کرتے آئے

جسے وہ رد کر دیا کرتی لیکن آج۔۔۔۔

"آئی تھنک میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔ اچھا خاصا آپ خوش ہو رہے تھے نا اپنی مارکیٹ ویلیو چیک کر کے۔" ندرت نے اپنا غصہ زائل کرنے کا ڈھروپرا پر چینل رستہ ڈھونڈا تھا۔

"مارکیٹ ویلیو؟" شاہ زین نے ناسمجھی کا اظہار کیا تھا۔ چہرے کے تاثرات ابھی تک روکھے ہی تھے۔ ندرت کی خوب صورتی، ذہانت کچھ بھی جیسے اسے اٹریکٹ نہیں کر رہا تھا اور شاید یہی بات ندرت کے غصے کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔

"ہاں تو اور کیا "ضرورت رشتہ" کے اشتہارات اتنے محو اور گم ہو کر پڑھنا تو بس آپ پر ختم ہے۔ اتنی دلچسپی سے تو لڑکے خواتین کے رسالے بھی نہیں پڑھتے ہوں گے۔" طنزیہ مسکراہٹ ندرت کے چہرے پر کلاسیکل رقص پیش کر رہی تھی لیکن اس کی بات شاہ زین کے چہرے پر کوئی بھی تبدیلی لانے میں ناکام رہی۔

"بس محترمہ! اپنے اپنے ذہن کی بات ہے۔ مکھی صاف ستھری چیز پر بھی گندگی سمیٹنے کی نیت سے بیٹھتی ہے جبکہ پھول گندگی میں بھی حتی الامکان جگہ کو خوشبودار کر دیتا ہے۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے یہی کافی ہے کہ اس صفحے پر ضرورت رشتہ کے علاوہ "کرائے کے لیے خالی ہے"، "ضرورت ہے"، "برائے فروخت" اور اس جیسے دوسرے ایڈز بھی موجود ہیں۔ لیکن بس بات وہی ذہن کی ہے اور قصور آپ کا بھی نہیں، دراصل آپ کا ذہن بہت چھوٹا اور سوچ اس سے بھی محدود، سو آئی نیور مائنڈ۔"

شاہ زین نے اتنے عزت دار طریقے سے ندرت کی بے عزتی کی تھی کہ وہ تپ گئی۔ کھڑی ہی ناک سرخ ہو کر احتجاج میں اٹھک بیٹھک کرنے لگی تھی تو آنکھیں فلموں کی ہیروئنوں کی تقلید میں پھیلتی چلی گئیں۔

"مسٹر سامان۔۔۔ یاداشت اور جو بھی آپ کا نام ہو مجھ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ ہی کریں تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔"

ندرت نے جان بوجھ کر اسے غلط نام سے۔۔۔ تھا کہ اس وقت اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ شاہ زین۔۔۔ ان نرم لفظوں میں کی گئی بے عزتی کا بدلہ کیسے لے۔

"پہلی بات تو یہ کہ آئی ایم شاہ زین اور پھول کو کسی بھی نام سے پکاریں وہ پھول ہی رہتا ہے۔ اگین نیور مائنڈ اور دوسری بات یہ کہ آپ کے ذہن اور سوچ کے ساتھ آپ کی یادداشت کا خانہ بھی بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور شاید آپ بھول رہی ہیں۔ میں نہیں بلکہ آپ مجھ سے بات کرنے اس ٹیبل تک آئی تھیں ورنہ میں زیادہ تو کیا آپ سے کم فری ہونے کی کوشش کرنا بھی پسند نہ کرتا۔"

ایک بار پھر شاہ زین نے اسے اس کی اوقات دلائی تھی۔ وہ خود حیران تھا کہ اسے ہو کیا رہا ہے اور کیوں ندرت سے اس انداز میں گفتگو کر رہا ہے ورنہ وہ تو ایک نہایت سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہے۔ ہنسی مذاق، فقرے بازی، شوخی، شرارت۔۔۔ یہ سب چیزیں تو اس کے لیے اجنبی تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دن بھر ہنسنے رہنے کے بعد رات کو جب اسے اپنے والد کے انتقال کی خبر ملی تب بھی وہ ثمینہ کے ساتھ بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا لیکن یہ خبر ملتے ہی اس کی ہنسی کو بریک لگا تھا۔ قہقہوں کو قفل میں بند کر کے شاید کہیں پھینک دیا گیا تھا اور تب سے اسے ہنسنے سے، اپنی مسکراہٹ سے جیسے ڈر لگنے لگا تھا اسی ڈر کے زیر اثر والد کی وفات کے بعد ایک نئے شاہ زین کے طور پر سامنے آیا تھا جس نے اپنی ذات کو ایک خول میں بند کر کے شاید خود کو ہمیشہ کے لیے محفوظ تصور کر لیا تھا۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا اور اب وہ خول شاید ٹوٹنا ہی چاہتا تھا کہ آج ندرت کے سامنے جان بوجھ کر وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جس سے وہ چڑ جائے، غصہ کرے اور جوابی بیان دے اور لاشعوری طور پر یہ سب کرتے ہوئے اسے خیال ہی نہیں رہا کہ کب وہ مسکرانے لگا تھا اور اس کی اس مسکراہٹ نے ندرت کے آگ ہی تو لگا دی تھی۔

"شاہ زین بیٹا کہیں یہ کتاب تو نہیں ڈھونڈ رہے؟" جامی چاچا نے ہاتھ میں پکڑی موٹی سی کتاب اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل! یہی کتاب تو میں ڈھونڈ رہا تھا۔" شاہ زین اسے نظر انداز کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ابھی ابھی سمیر واپس کر کے گیا ہے اپنے نام پر اشو کروا لو ورنہ پھر کوئی اور لے جائے گا۔ جامی چاچا نے بڑے خلوص سے اسے مشورہ دیا اور یہی ان کا معمول بھی تھا۔ پڑھنے والے اسٹوڈنٹس کی ان معاملات میں وہ کافی مدد کر دیا کرتے تھے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" شاہ زین جلدی سے کاؤنٹر کی طرف چل دیا اور جوابی کارروائی کا موقع ہاتھ سے نکل جانے پر ندرت تلملاتے ہوئے اس کی پشت پر نظریں جمائے حیرت سے اسے دیکھتی چلی گئی۔ اس کا حال یقیناً ایک شکست خوردہ شیرنی سا ہو رہا تھا جو ایک کمزور شخص سے ہار گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے بارے میں مزید سوچتی ٹیبل پر موجود اخبار اور کتاب کو دیکھ کر ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی۔ کتاب کے عین پیشانی پر خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا شاہ زین چوہدری کا نام اس وقت اس کے لیے مرہم ہی ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

پروفیسر خورشید نے آج "مارکیٹنگ اینڈ ہیومن بی ہیویئر" کے موضوع پر کلاس کو ڈسکشن کی تیاری کر کے آنے کا کہا تھا۔ ندرت بھی لائبریری میں موجود کتاب میں سے چند نکات سمجھ لینے اور مختلف رائٹرز کی رائے پڑھ لینے کے بعد اب مکمل طور پر تیار تھی۔ اور پورے دھیان سے پہلے پروفیسر خورشید کی تمہید سن رہی تھی۔

"مارکیٹنگ دراصل چرب زبانی کا ہی دوسرا نام ہے۔ اپنی گھٹیا ترین پراڈکٹ کو اس انداز سے پیش کرنا کہ گدھی پر بھی پری کا گمان ہو۔ دراصل مارکیٹنگ کہلاتا ہے۔

زیادہ دور کیوں جائیں۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ جس چیز کو جتنا اچھا ایڈورٹائز کر کے ٹی وی یا اخبار و جرائد کے ذریعے لوگوں تک پیش کیا جاتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ بکتی ہے۔ چاہے حساب "اونچی دکان پھیکے پکوان" والا ہو۔ لوگ وہی چیز استعمال کرنا چاہتے ہیں جو ان کا فیورٹ فلم اسٹار استعمال کرے۔ یہی ہمارا آج کل کا ہیومن بی ہیویئر ہے کہ ہم کسی بھی چیز کی ظاہری چمک دمک اور لش پش پر ہی دھیان دیتے ہیں اور بس، میری پوتی پچھلے ہفتے ایک عجیب و غریب شیمپو یہ روپے اس لیے ضائع کر آئی کہ یہی پروڈکٹ بقول ایک ٹاپ ماڈل کے وہ بھی استعمال کرتی ہے۔"

پروفیسر خورشید کا یہی اندازِ تدریس تھا بہت ہی سادے اور ہلکے پھلکے انداز میں بڑی سے بڑی گمبھیر بات بھی سمجھا دیتے لیکن یہ الگ بات تھی کہ ان کا کوئی بھی لیکچر پوتے پوتیوں کے ذکر کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا اور یہ بات اسٹاف اور اسٹوڈنٹس سمیت سبھی جانتے تھے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی اولاد سے محبت نہیں عشق کرتے تھے۔

"ایکسکیوزمی سر!" ندرت نے دایاں ہاتھ بلند کر کے بات کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور پروفیسر خورشید کے رک کر اثبات میں سر ہلانے پر وہ بولی۔

"سر میں جانتی ہوں کہ آج ڈسکشن میں ہم دراصل مارکیٹنگ کے چند بنیادی اصول اور نفسیات کے لحاظ سے انسانی بی ہیویئر کو ڈسکس کریں گے لیکن آئی ایم سوری سر۔۔۔! جو کچھ آپ نے کہا میں اس سے بالکل بھی متفق نہیں ہوں کیونکہ حقیقت آپ کی باتوں کے بالکل برعکس ہے۔" ہمیشہ کی طرح پراعتماد لہجہ اپنی بات بغیر کسی ثبوت کے درست ثابت کر رہا تھا۔

"کیا مطلب؟ کون سی بات ایسی ہے جس سے آپ اتفاق نہیں کرتیں۔"

"سر! یہ جو آپ نے ابھی کہا کہ لوگ وہی چیز استعمال کرتے ہیں جو ان کی فیورٹ سلیبریٹی کرے، یس! آئی ایگریڈ لیکن ایسا صرف ایک دفعہ ہی ہو سکتا ہے اگر آپ کی پوتی پھر اسٹار فوبیا کا شکار ہو کر وہی شیمپو

لے آئی ہے تو کیا وہ سوٹ نہ کرنے کے باوجود بھی ہمیشہ وہی شیمپو صرف اس لیے خریدے گی کیونکہ اس کی فیوریٹ اسٹار کی چوائس یہی ہے؟ نو سر! It never happend، صرف پہلی بار خریدنے کے بعد وہ ایسی غلطی ہرگز نہیں دہرائے گی کیونکہ صارف کے لیے ظاہر ہے کہ Quality Matters! اہم ہے۔"

پروفیسر خورشید نے اسے بات کرنے کا پورا موقع دیا تھا کیونکہ جانتے تھے کہ جب تک وہ اپنا دماغ کلیئر نہیں کرے گی انہیں اور کلاس کو آگے بڑھنے نہیں دے گی۔ اور ندرت کی یہی بات سوالات کرنے کی یہی عادت، پروفیسرز کے ساتھ فرینکلی ڈسکس کا یہی انداز اسے تمام اسٹوڈنٹس سے ممتاز کیے رکھتا تھا۔

"اس طرح کے پھیکے پکوان صرف ایک ہی بار بک سکتے ہیں کیونکہ انہیں چکھنے کے بعد لوگ دوبارہ خریدنا تو کیا انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ آج ہی لائبریری میں میں نے ایسی ہی چند پراڈکٹس کا گراف دیکھا تھا جنہوں نے اچھی مارکیٹنگ سے معیاری پراڈکٹس کو کچھ عرصے تک ٹف ٹائم تو دیا لیکن زیادہ عرصہ چل نہیں سکیں۔" بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ میں موجود فائل کے صفحات کو الٹتی پلٹتی جا رہی تھی۔

"دراصل میں نے جلدی میں ان پراڈکٹس کے نام، ٹائم اِن مارکیٹ، پبلک کی رائے وغیرہ کا ایک گراف بنایا بھی تھا جو میں آپ کو دکھانا چاہتی تھی لیکن۔۔۔۔ شاہ زین کہیں آپ کی کتاب میں، میں نے اپنا گراف تو نہیں رکھ دیا، کیونکہ آپ کی بک بھی اسی ٹیبل پر رکھی تھی اور میں نے کچھ پڑھی بھی تھی۔"

بات کرتے کرتے اس نے ایک دم شاہ زین کو مخاطب کیا تو وہ اس اچانک "افتاد" پر حیران رہ گیا کہ یہ بات اس کی توقع کے بالکل برعکس تھی۔

"کیا آپ کی بک مارکیٹنگ سے ہی ریلیٹڈ ہے؟" پروفیسر خورشید نے شاہ زین کے سامنے رکھی کتاب کے نام پر شیشوں کے پیچھے سے اپنی آنکھیں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا تو وہ کتاب لے کے ان کے ڈائس کے قریب ہی آ گیا اور کتاب ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

"یس سر! یہ بک دراصل فرنچ رائٹر کی ہے جسے انگلش میں ترجمہ کیا گیا ہے۔"

"واہ بھئی یہ ہوئی نا بات، اور یہی اچھے طالب علموں کی نشانی ہے کہ وہ محض ٹیچر کے لیکچر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ مزید تاج کی دھن میں لگے رہتے ہیں اور بے شک ایسے طالب علم ہی کل ہمارے وطن کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہیں۔"

اپنی تعریف پر شاہ زین نے ایک نظر مسکراتی ہوئی ندرت کو دیکھا اور اس کی سیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے "آہم" کر کے گلا صاف کرتے ہوئے یوں سینہ تان کر اپنی جگہ کی طرف آیا جیسے شمشیر زنی میں فتح حاصل کر کے آیا ہو لیکن افسوس۔۔۔۔ اس کا فخر اور خوشی اس وقت عارضی ثابت ہوئے جب پروفیسر خورشید کے چہرے کے تاثرات بدل کر طنزیہ ہونے لگے۔

"ہاں بھئی مان گئے کہ یہ کتاب مارکیٹنگ کے لیے بہترین ہے ہاں لیکن یہ یاد رہے کہ اس میں کسی چیز کی نہیں بلکہ اس کی آڑ میں شاہ زین میاں شاید اپنی مارکیٹ کر رہے ہیں۔" پروفیسر خورشید نے چند لمحے رک کر شاہ زین کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر بولے۔

"دیکھنے میں تو تم اچھے خاصے ہو عمر بھی ابھی زیادہ نہیں، آگے بڑھنے کے جراثیم بھی مجھے تم میں نظر آتے ہیں پھر دولت حاصل کرنے کے لیے شادی کا سہارا کیوں لے رہے ہو؟" ندرت کا دکھایا جانے والا گراف شاید کسی کو یاد بھی نہیں رہا تھا۔

پروفیسر خورشید کے اس غیر متوقع سوال پر شاہ زین سمیت پوری کلاس حیران تھی۔

"سر میں سمجھا نہیں۔۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو آپ نے سنا۔" پروفیسر خورشید نے کتاب میں موجود اخباروں کے تراشے نکال کر کلاس کو دکھائے۔

"ضرورتِ رشتہ کے چھ اشتہار کاٹ کر تم نے اپنی کتاب میں رکھے ہیں اور یہ جوان یہ ریڈ پین سے وری امپورٹنٹ کا سمپل بھی بنا رکھا ہے تو اس کو میں کیا سمجھوں؟" کلاس میں دبی دبی ہنسی محسوس کی جانے لگی تھی۔

"اور مزے کی بات تو یہ کہ ساری خواتین چالیس پینتالیس سے اوپر کی بیوہ یا طلاق شدہ ہیں اور ان میں سے کہیں بھی اگر شاہ زین کو اوکے کر دیا جاتا ہے تو بے چارے شاہ زین کو ناچاہتے ہوئے بھی ان کی کروڑوں کی جائیداد، لاکھوں کا کاروبار تو سنبھالنا ہی پڑے گا کہ ان سب کا آگے پیچھے کوئی والی وارث نہیں۔"

دبی دبی ہنسی اب قہقہوں میں تبدیل ہو گئی تھی ہر جملے پر کلاس نے قہقہے لگا کر مکمل داد دی تھی اور سب میں سے بلند قہقہہ یقینی طور پر ندرت کا ہی تھا۔

ندرت کی طرف سے بدلے کے طور پر اتنا کاری وار تو شاہ زین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ جبھی چند لمحوں پہلے چہرے پر موجود حیرت کے تاثرات اب شرمندگی اور خجالت میں بدلنے لگے تھے۔ اعصاب کا تمام زور جبڑوں اور بند مٹھیوں پر آزماتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر پروفیسر خورشید کے ہاتھ میں موجود تراشے دیکھے اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"سر یہ ضرور کسی کی نہایت گھٹیا شرارت ہے۔ ورنہ نہ تو میں نے یہ کٹنگز اپنی بک میں رکھی ہیں اور نہ ہی مجھے اس طرح کی فضول حرکتوں کا شوق ہے۔" بات کرنے کے دوران اس نے کھلکھلاتی ہوئی ندرت کی طرف دیکھا تھا۔

"میاں کتاب ابھی میں تمہارے ہاتھ سے لے رہا ہوں، تو یقینی میں نے یہ کٹنگز رکھی ہوں گی اس میں۔" پروفیسر خورشید نے انگلی سے چشمے کو ناک کی سرحد پر پہنچا کر اوپر سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

"سر آپ رکھتے تو پھر بھی خیر تھی لیکن یہ تو بالکل ہی گیا گزرا ہے، آج پتا چلا۔" قہقہوں کے دوران کسی نے پھلجھڑی چھوڑی تھی۔

"انٹرنیٹ کی کھاد ڈلے تو فصل تو پھر ایسی ہی اُگے گی۔"

"انٹرنیٹ نہیں انڈین فلمیں۔۔۔۔"

"نہیں نہیں کون بنے گا کروڑ پتی۔۔۔۔" آج تو کلاس میں میران کے گروپ کے ساتھ ساتھ ہر کوئی اپنی کہہ رہا تھا اور یہی پروفیسر خورشید کی کلاس کا خاصہ تھا کہ وہ خود تو طنز کے تیر برساتے ہی لیکن کلاس کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھتے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی کلاس میں تمام اسٹوڈنٹس آنکھیں، کان کھول کر اور اپنے تمام تر اعصاب کو جگا کر بڑی توجہ اور دھیان سے ان کی ہر بات سنتے اور جواب دیتے۔ لیکن شاہ زین کے لیے یہ سب انتہائی دکھ کا باعث تھا۔ ایک چھوٹی سی شرارت اس کا تمام تر امیج تباہ کر گئی تھی اور اب اس کے لیے کلاس میں ٹھہرنا بہت مشکل تھا جبھی وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر کلاس سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کنیزاں آج صبح سے ملکانی کے منہ سے نکلے الفاظ کو فضا میں بکھرنے سے پہلے عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں اب مکمل طور پر ہانپ رہی تھی لیکن جانتی تھی کہ وہ خود سے کبھی اسے بیٹھنے یا کچھ دیر ریسٹ کرنے کا نہیں کہیں گی۔ بلکہ اتنی محنت اور دل جمعی سے کیے گئے کام کو بھی نخوت سے یوں ناک اور ابرو چڑھا کر دیکھتیں کہ کام کرنے والے کی تھکن مزید بڑھ جاتی۔ یوں بھی جاگیردارنی تھیں جو چاہے اور جیسے چاہے کرتیں۔ ان کے لیے نوکروں کی کوئی کمی نہیں تھی کہ وہ اپنی جاگیر میں بسنے والے ہر شخص کو ذہنی طور پر اپنا غلام ہی تصور کرتیں اور اس بات کا احساس وہ سب کو نا صرف اپنے عمل بلکہ الفاظ سے بھی دلاتی رہتیں۔

اب بھی وہ چند لمحے فون سننے کے لیے دیوار کی طرف رخ کیے کھڑی ہوئیں تو ان کے لیے لائی گئی چائے کمرے کے عین وسط میں موجود شیشے کی ٹیبل پر

رکھنے کے بعد کنیزاں وہیں فرش پر بچھے دبیز قالین پر بیٹھی تو دل چاہا وہیں لیٹ بھی جائے۔ اس قدر نرم تو اس کا بستر بھی نہیں تھا جتنا ملکانی کی حویلی کا فرش تھا۔

اسی لمحے ملکانی فون بند کر کے پلٹیں تو کنیزاں کو یوں سکون سے بیٹھے قالین پر انگلیاں پھیرتے دیکھ کر طیش میں آگئیں۔

"نی کنیزاں۔۔۔ میکوں یہ تو بتا کہ اپنی اوقات کب سے بھولنے لگی ہے۔" آنکھیں بند کیے بیٹھی کنیزاں نے نا صرف جھٹکے سے آنکھیں کھولیں بلکہ جھٹ سے کھڑی بھی ہوگئی۔

"او ملکانی جی۔۔۔ میں تو بس۔۔۔"

"جا دفع ہو دیکھ سونی کو بھوک لگ رہی ہوگی۔"

"میں ابھی دیکھتی ہوں جی۔"

"او عقل دی انی اے (عقل کی اندھی) صرف دیکھیں نا اسے اٹھا کر میرے پاس لے آئیں۔"

"میں ابھی گئی تے ابھی آئی۔"

کنیزاں فوراً سے پیشتر اٹھ کر ملکانی کی پالتو بلی سونی کی تلاش میں نکل گئی۔ تو ملکانی نے سامنے رکھا چائے کا کپ اٹھا کر گھونٹ لیا اور تشویش سے ایک دم کھڑی ہوگئیں۔

"یہ میرو نہیں آیا اب تک؟"

خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے وہ عجلت میں کمرے سے نکلیں اور وسیع و عریض راہداریوں اور دالان عبور کرتے ہوئے میران کے کمرے تک جا پہنچیں۔ خوب صورت کڑھی ہوئی بڑی سی چادر سنبھالے وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے کمرے کے باہر کھڑی دستک دے رہی تھیں۔

"میرو۔۔۔ میرو پتر! کمرے وچ ہیں؟ (میرو بیٹا۔۔۔ کمرے میں ہو؟)"

"جی اماں سائیں۔۔۔ آپ؟" وہ حیران ہو کر دروازہ کھولے ان کے سامنے تھا۔

"بس پتر ذرا سا ویلا (وقت) آگے پیچھے ہو جائے تو فکر لگ جاتی ہے۔" اس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ملکانی نے کہا تو وہ ہنس دیا۔

"نہ پریشان ہوا کریں میرے لیے، میں ابھی ابھی یونیورسٹی سے آیا تھا اور ابھی آپ کے پاس آ[...] والا تھا۔"

"سوہنا رب میرے بچے کو خوش رکھے اور کسی چیز کی تھوڑ نہ دے (کمی نہ دے)"

ملکانی کی دعا پر جہاں میران نے چونک کر ماں [...] دیکھا وہیں ملکانی نے بھی ایک دم اسے دیکھا اور اس سے پہلے کہ میرو یا ملکانی میں سے کوئی کچھ کہتا کنیزاں سونی کو گود میں لیے ان کے پاس آن موجود ہوئی۔

مکمل سفید بالوں والی سونی کی گہری سبز آنکھوں میں ملکانی کے لیے ڈھیر سارا پیار امڈ آیا تھا۔ ملکانی نے فوراً ہاتھ آگے بڑھائے تو وہ فوراً ہی کنیزاں کی گود سے ملکانی کے بازوؤں میں منتقل ہو کر ہمیشہ کی طرح سونے کی چوڑیوں سے بھری ملکانی کی کلائیوں پر منہ پھیرنے لگی۔

"مہربانو سے بات ہوئی؟" ماں کے ہمراہ کھانے کے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے سونی کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے کے ساتھ اس نے دریافت کیا۔

کنیزاں ان سے چند قدم پیچھے تھی۔

"ہاں ابھی کچھ دیر پہلے ہی فون آیا تھا دھی رانی کا۔ کہہ رہی تھی اس ہفتے نہیں آسکے گی۔"

"نہیں آسکے گی؟ لیکن کیوں؟" میرو چلتے چلتے ایک دم رکا اور رخ موڑ کر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

"اتنی پڑھائی کہاں سے آگئی اماں سائیں، پچھلے ہفتے بھی تو نہیں آئی تھی وہ۔"

"میران پتر۔۔۔! لڑکی ذات ہے اور پھر بہن ہے تیری۔ اتنی سختی ٹھیک نہیں ہوتی۔" اس کی پیشانی پر موجود سلوٹیں دیکھ کر انہوں نے بیٹی کی حمایت کرنا چاہی تھی کیونکہ بیٹے کے غصے سے وہ اچھی طرح واقف تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی تائید کے باعث اس کے غصے میں اضافہ ہو۔

"لڑکی بیوی ہو یا بہن، اسے اتنی زیادہ آزادی

دینا ٹھیک نہیں ہوتا، اور پھر آج کل یونیورسٹی کی لڑکیاں بہت تیز ہوتی ہیں اماں سائیں۔۔۔! آپ تو گھر میں رہتی ہیں نا آپ کو کیا پتا۔"

"مجھے سب پتا ہے پتر پر۔۔۔"

"پر یہ کہ بابا کے لاڈ پیار نے اسے ہم سب کے سر پر چڑھا دیا ہے اور بس۔"

سونی گھر والوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی جبھی آہستگی سے ملکانی کی گود سے نکلی اور خراماں خراماں کچن کی طرف چل دی۔

ملکانی کچھ دیر اسے جاتا دیکھتی رہیں پھر اچانک ہی نظر کچھ فاصلے پر کھڑی کنیزاں پر پڑی تو جیسے بھڑک ہی اٹھیں۔

"نی کم چورے، تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے، بڑا شوق ہے تجھے ہماری باتیں سننے کا؟"

"نہیں جی وہ۔۔۔ دراصل میں بھلا آپ دونوں سے آگے کیسے چل سکتی تھی جی، بس اسی لیے۔۔۔"

کنیزاں گھبرا کر ہکلا سی گئی۔

میران شاہ کے سامنے ملکانی کی ایک نہیں چلتی تھی یہ بات سبھی جانتے تھے۔ شاہ سائیں کے سامنے البتہ وہ لحاظ کر جاتا تھا جبکہ ملکانی تو میران شاہ کے منہ سے نکلی ہر بات کی تکمیل کو ہی اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتیں۔

مہربانو پڑھنا چاہتی تھی تو اسے ملکانی اور میران کی ہزار مخالفت کے باوجود بھی دوسرے شہر میں داخل کروایا گیا۔ اس معاملے میں بابا سائیں نے میران کی رائے کو ذرا اہمیت نہ دی تھی اور اس بات کا رنج اسے بہرحال ابھی تک تھا۔

"نی جا دفع ہو جا۔۔۔ اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو۔"

"جی۔۔۔ جی اچھا۔"

کنیزاں نے سر سے ڈھلکتا دوپٹا کانوں کے گرد اڑس کر سر پر جمایا اور وہاں سے نکل آئی۔ عصر کا وقت اپنی تمام تر اداسی کے ساتھ حویلی کی منڈیروں پر موجود تھا۔ وسیع و عریض حویلی جس میں موجود کمروں کی تعداد مکینوں سے دس گنا زیادہ تھی۔ طرزِ تعمیر میں تو شاہکار تھی ہی خاموشی اور سکوت میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔

خوب صورت رنگ و روغن سے مزین حویلی کی بلند و بالا دیواروں پر اکثر و بیشتر خاموشی کی حکمرانی ہوتی۔ البتہ مہربانو کی آمد سے حویلی کے کونے کونے میں بہار کا سماں ہوتا یوں بھی مزاجاً مہربانو، ملکانی اور میران شاہ کے بالکل برعکس تھی۔ حویلی میں کام کاج میں مصروف مزارعوں کی بیویوں یا بیٹیوں سے بھی وہ اسی طرح بات کرتی جیسے حسب نسب میں ہم پلہ ہوں۔

گو کہ یہ بات ملکانی اور میران کو پسند نہیں تھی مگر یہ عادات اسے بابا سائیں کی صفات میں سے ملی تھیں اور وہ اب تک انہیں سنبھالے ہوئے تھی۔

"چل آجا پتر۔۔۔! سچ کہوں تو بھوک نے ڈاہڈا (سخت) ستا رکھا ہے، میں تو بس تیرے انتظار میں بیٹھی رہی۔"

"او ہو اماں سائیں! کھانا کھا لیا کریں نا میرے بغیر۔" میران کو ایک دم ماں پر بہت پیار آیا تھا۔

"تیرے بغیر؟ ایک نوالہ نہیں اترتا حلق سے تیرے بغیر سمجھا نا۔" ملکانی نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی تو وہ تائید میں سر ہلاتا مسکرانے لگا۔

☆☆☆

عائشہ نے تقریباً چوتھی دفعہ ندرت کے کمرے میں جھانکا تھا لیکن وہ ابھی تک لیٹی ہی ہوئی تھی۔ جبھی وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ شام کی چائے پر امی، ابا، عائشہ بھی اس کا انتظار کر رہے تھے اس دفعہ بھی عائشہ کو یوں آتے دیکھ کر امی سے رہا نہیں گیا۔

"پہلے تو ندرت کبھی اتنی دیر تک نہیں سوئی۔ تم نے اسے جگایا تو ہوتا، وہ ٹھیک تو ہے نا۔"

"امی آپ کو پتا ہے نا، نیند سے جگانے پر اس کا موڈ کتنا خراب ہو جاتا ہے۔ بس اسی لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا۔" عائشہ کے آنے تک ابا نمازِ عصر ادا کرنے جا چکے تھے۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن کم از کم وہ اٹھ کر باہر یہاں لان میں بیٹھے۔ طبیعت بہل جائے گی، بلکہ چھوڑو سب، میں خود اسے لے کر آتی ہوں۔'' بات کرتے کرتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اسے جگانے کے لیے کسی کو جانا پڑتا بلکہ ہمیشہ وہ خود اپنے مقررہ ٹائم پر اٹھ جاتی اسی لیے آج سب کا حیران ہونا لازمی تھا۔

''ندرت بیٹا!'' بیڈ پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے انہوں نے پیار سے اس کے بالوں کو چہرے پر سے پرے ہٹایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''امی آپ۔۔۔؟'' کہنیوں کے بل اٹھ کر اس نے ٹیک لگائی تھی۔

''کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟ آج اتنی دیر تک سوتی رہیں۔''

''بس ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا، آپ چلیں میں پانچ منٹ میں فریش ہو کر آتی ہوں۔''

لمحہ بھر میں بیڈ سے نیچے اتر کر اب وہ سلیپرز پہن رہی تھی۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا لیکن جانے کیوں انہیں لگ رہا تھا کہ ندرت صرف اوپری طور پر اداکاری کر رہی ہے اور یہ سب کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ شاہ زین کے یوں کلاس سے اٹھ کر جانے کے بعد اسی لمحے ندرت کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت غلط کر بیٹھی ہے اور تب سے جیسے دل کسی بھاری سِل تلے دبا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پروفیسر خورشید کے چبھتے جملے، کلاس فیلوز کے طنزیہ فقرے اور پھر کینٹین میں سب کی ڈسکشن۔۔۔ وہ بہت شرمندگی محسوس کر رہی تھی کیونکہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا۔

''ارے امی! آپ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں۔'' باتھ روم سے نکلی تو امی کو ابھی تک اسی حالت میں بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''ہاں میں نے سوچا ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی لان میں جا کر اپنی کرسی سنبھالی۔ ندرت کے چہرے پر موجود پانی کے ننھے قطرے ہوا نے زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیے البتہ پلکوں کی باڑھ میں پناہ لیے قطرے ابھی تک کی سیاہی کا حصہ بنے ہوئے تھے۔

''لو بھئی تم جوس پیو۔'' عائشہ نے ندرت کی طرف جوس کا گلاس بڑھایا۔

''تھینکس بھابھی، ویسے اتنی گرمی میں چائے بھی ہمت کا کام ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں نا کہ

''گرم موسم میں گرم چائے بھی
بدمزاجوں کا پیار لگتی ہے''

''پیار تو پیار ہوتا ہے بدمزاجوں کا ہو یا خوش مزاجوں کا۔ اس میں رنگے سب رنگین ہو جاتے ہیں کہ اس کی بارش بن بادل کے دلوں پر یوں برستی ہے کہ بچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کیوں امی۔'' عائشہ بڑے مزے سے بات کرتے ہوئے امی کی تائید چاہی تو وہ سر جھٹک کر مسکرا دیں۔

☆☆☆

''شاہ زین بھائی! آج آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟'' ثمینہ نے کسی نیوز چینل سے نشر ہونے والے پروگرام میں گم شاہ زین کو دیکھا تو کچن میں جاتے جاتے رک گئی۔ صبح کے وقت شاہ زین کا گھر پر موجود ہونا، ٹی وی کے سامنے بیٹھا دکھائی دینا دونوں باتیں اچنبھے کا باعث تھیں۔

''ہاں آج مارننگ ٹیوشنز کی چھٹی تھی تو بس میں یونیورسٹی بھی نہیں گیا۔ ویسے بھی تین دن اکیڈمی میں سیمینار اٹینڈ کرتا ہے اس لیے یونیورسٹی تو تین دن نہیں جا پاؤں گا۔'' شاہ زین نے ریموٹ صوفے پر رکھ کر بازو ہوا میں بلند کرتے ہوئے جمائی لی تھی۔

''اوہ اچھا، میں بھی شاید کچھ طبیعت ٹھیک نہیں آپ کی، دیکھنے میں بہت تھکے ہوئے اور سست لگ رہے ہیں بلکہ ایسا کریں۔۔۔'' ثمینہ نے صوفے پر رکھے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا تھا۔ ''آپ اٹھ کر نہا دھو لیں تو فریش ہو جائیں گے پھر مل کر ناشتا کریں گے۔ اوکے۔'' اس کے حکم پر شاہ زین کو عمل کرنا ہی تھا کہ حکم عدولی کا جرمانہ ادا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ البتہ پانچ دس منٹ کا "Stay" اس نے لے لیا تھا۔

''بڑے بہن بھائیوں کے رعب اور دھونس کی کہانیاں تو عام ہیں لیکن کسی نے تمہارے جیسی سخت گیر چھوٹی بہن نہیں دیکھی ہو گی۔'' ثمینہ کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے شاہ زین نے لاڈ سے کہا تو وہ سر سہلاتی ہوئی مصنوعی خفگی کی ناکام اداکاری کرتے ہوئے ہنسنے لگی۔

☆☆☆

''تم نے واقعی بے چارے کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی یار! ٹھیک ہے اگر اس نے تمہیں لائبریری میں کچھ کہہ ہی دیا تھا تو تم بھی اکیلے میں اس کا بدلہ لے کر جوابی کارروائی کر دیتیں، مگر تم نے پوری کلاس کے سامنے اس کی بے عزتی کروا دی، میں دوست تو تمہاری ہوں لیکن بلیو می مجھے تم اس وقت بہت بری لگ رہی تھیں۔''

صبا نے بڑے نیوٹرل ریمارکس دیے تھے۔

''آج وہ مسٹر ہینڈسم نہیں آیا۔۔۔؟''

''رشتہ ڈھونڈ رہا ہو گا بے چارہ، یا کسی آنٹی کو پھنسانے اور جائیداد ہتھیانے کے طریقے سوچ رہا ہو گا۔''

بھرپور قہقہے کے ساتھ ان کے قریب ہی گھاس پر بیٹھتی دو لڑکیوں نے آپس میں بات کی۔

صبا نے ایک بار پھر شکایتی نظروں سے ندرت کو دیکھا جس کی بڑی بڑی آنکھوں کی سیاہ چلمن پل میں نیچے گری تھی۔ جب سے شاہ زین کلاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ ندرت کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سارا دن گھر میں بھی خود کو ملامت کرتی رہی تھی کہ اس نے یہ سب ٹھیک نہیں کیا۔ آخر ہر انسان کی ایک سیلف ریسپیکٹ ہوتی ہے اور انجانے میں وہ شاہ زین کو بے حد ہرٹ کر چکی ہے۔ اسی کیفیت میں وہ گھر پر تو امی اور عائشہ بھابھی کے سامنے کسی نہ کسی طور خود کو کمپوز کر رہی تھی لیکن صبا کے سامنے اب اس کا چہرہ مکمل طور پر دل کے احساسات کی ترجمانی کر رہا تھا جبھی دونوں کلاس بنک کیے لان میں بیٹھی تھیں۔

''میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے لیکن مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس بات پر کلاس میں اتنا تماشا بنے گا یا یہ بات اس حد تک اچھالی جائے گی۔۔۔ مجھے واقعی اس بات کا بہت افسوس ہو رہا ہے۔''

''مجھے پتا ہے کہ یہ سب خلافِ توقع ہوا ہے، بی ریلیکس۔'' صبا نے اس کے روئی کے گالوں سے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے تسلی دی لیکن یہ کیا۔۔۔ اتنی دیر سے صبا کی لعن طعن سننے کے دوران وہ بڑے سکون سے نظریں نیچی کیے بیٹھی رہی تھی لیکن محبت بھرے لہجے میں ادا کیے گئے محض چند الفاظ اسے رلا گئے تھے اور یہی بات صبا کو چونکا گئی تھی۔

''یار میں نے یہ سب کسی لمبی چوڑی پلاننگ کے تحت نہیں کیا بلکہ پتا نہیں کیسے اچانک۔۔۔'' اردگرد موجود چند دوسرے اسٹوڈنٹس کا سوچ کر اس نے آنسو صاف کرتے گال مسل ڈالے تھے۔

''کوئی بات نہیں خیر ہے یار ہو جاتا ہے کبھی ایسا بھی، بلکہ اسٹوڈنٹ لائف میں تو اکثر یہ سب چلتا رہتا ہے سو پلیز ڈونٹ وری۔'' صبا سے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا نہیں جا رہا تھا جبھی اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''نہیں صبا! مجھے کل سے ایک لمحے کو سکون نہیں ملا ہے۔ تم تو مجھے اچھی طرح جانتی ہو نا میں نے تو آج تک کسی بے زبان جانور کو تنگ نہیں کیا، میں۔۔۔ میں تو زمین پر گرے پتوں پر بھی پاؤں نہیں رکھتی کہ سوکھے ہوئے زرد پتوں کی فریاد مجھے بے چین کر دیتی ہے اور کل میں نے شاہ زین کی صرف اس لیے انسلٹ کروا دی کہ شاید وہ میرے سامنے حاضر جوابی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔'' بات کرتے کرتے ایک بار پھر اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

''تو اس کا پھر ایک ہی حل ہے۔'' کچھ سوچ کر صبا بولی۔ ندرت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تم شاہ زین سے اس واقعے کی معافی مانگ لو۔"

"ہاں یہ تو بہت اچھی بات ہے، حیرت ہے میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی۔" ندرت ایک دم مسکرائی تھی۔

"اس لیے کہ کچرا گھر میں صرف کچرا ہی وصول کیا جاتا ہے میڈم۔"

صبا کی بات پر اس نے فوراً ہاتھ میں پکڑی فائل صبا کے سر پر دے ماری جسے بڑی خوش دلی سے ہاتھ میں پکڑ لیا گیا۔ صد شکر کہ ندرت کی مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے کے دوران سامنے رکھی چیز نظر نہیں آتی اور جب آتی ہے تو خود اپنی بصارت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یہی کچھ ندرت کے ساتھ ہوا تھا۔ جواب سوچ رہی تھی کہ خوامخواہ سارا دن ٹینشن میں گزارا، آخر یہ بات اس کے دماغ میں کیوں نہیں آئی کہ اگر اسے اپنے فعل پر اتنی ہی شرمندگی ہے تو جا کر شاہ زین سے معافی مانگ لے۔ یوں بھی اس نے "انا" نام کی کوئی چڑیا اپنی ذات کے پنجرے میں قید نہیں کی تھی جبھی اس کے لیے اپنی غلطی پر معافی مانگنا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن یہ سب تو تب ممکن ہو پاتا جب شاہ زین اسے نظر آتا۔

اس روز کے بعد آج تیسرا چوتھا روز ہونے کو تھا لیکن شاہ زین کا دور دور تک کوئی پتا نہ ہونے کی وجہ سے ندرت یونیورسٹی آتی تو ہر روز اسے دیکھنے کی امید ٹوٹنے پر جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر اُدھر گھومتی رہتی۔ یہ خیال کہ وہ اس کی کی گئی گھٹیا ترین شرارت کی وجہ سے یونیورسٹی نہیں آرہا، اس سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ ہر لمحہ اپنے آپ کو ملامت کرتی رہتی کہ وہ جو خوامخواہ لڑکوں کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی کیونکر شاہ زین سے خود بات کرنے لائبریری میں اس کی ٹیبل تک جا پہنچی۔ پہلے روز نام پوچھنے کے بہانے اس کے ساتھ جان بوجھ کر ایسی گفتگو کی کہ وہ چڑ جائے اور آخر جب وہ بولنے پر آیا تو اس کی [illegible] تلملا گئی۔

انہی سب باتوں کو سوچتے ہوئے وہ کینٹین کی طرف جا رہی تھی کہ لڑکے لڑکیوں کے رش میں زبیر کاؤنٹر کی طرف رخ کیے کھڑا نظر آیا۔ صبا ابھی نوٹس کی تلاش سے واپس نہیں آئی تھی۔ ندرت نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر زبیر کے ساتھ بیٹھ کر ہی انتظار کرنے کا سوچ کر کاؤنٹر کی طرف چلی آئی۔

جانے کتنے سالوں کا پیاسا زبیر منہ سے پانی کی بوتل لگا کر جو شروع ہوا تو شاید ہٹانا بھول گیا۔ ندرت کو شرارت سوجھی۔

"اے مسٹر! تمہیں پتا ہے جو لڑکے غٹاغٹ کے پانی پیتے ہیں لڑکیاں اُن پر فٹافٹ فدا ہوجاتی ہیں۔" اس نے فائل سامنے والے کے چوڑے شانوں پر مارتے ہوئے کہا لیکن اس کے مڑتے ہی خود اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ہاتھ میں بوتل لیے شاہ زین اس کے سامنے تھا۔ اچانک اس کی فائل مارنے پر پانی اس کے منہ سے ہوتا شرٹ کے اگلے حصے کو بھی بھگوئے دے رہا تھا۔

"آ۔۔۔آ۔۔۔آپ۔" اس اچانک افتاد پر وہ ہکلا گئی تھی۔

"آپ زبیر ہیں؟" اپنے کیے گئے نہایت فضول سوال پر اس نے دل ہی دل میں خود کو ملامت کیا۔

"جی نہیں۔" شاہ زین نے شرٹ جھاڑتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی بوکھلاہٹ آج پہلی مرتبہ دیکھنے کو ملی تھی سو دیکھے گیا۔

"تو پھر یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" ایک انتہائی بے تکا سوال

"آپ زبیر ہیں؟"

"جی؟" وہ حیران ہو کر اُس کی قوت بصارت پر شبہ کرنے لگی تھی۔

"جی نہیں۔"

"تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہیں۔" اب کی بار سنجیدگی کے ایفل ٹاور پر کھڑے ہو کر سرد لہجے میں پوچھے گئے سوال پر اس نے غصے سے شاہ زین کو گھورا۔

"آپ ہر وقت اس طرح سڑے ہوئے رہتے ہیں یا آج کوئی خاص دن ہے۔"

اسے شاہ زین سے معافی مانگنا تھی یہ بات تو ذہن کے تاریک گوشے میں رضائی اوڑھے سو چکی تھی۔

"آپ ہر وقت اسی طرح لفٹ مانگتی رہتی ہیں یا آج کوئی خاص دن ہے۔" پرشوق ساحر آنکھیں اس کی چھوٹی سی ناک میں موجود زرقون کی لونگ اور اس کی آنکھوں کی چمک کا مقابلہ کر رہی تھیں۔

"لگتا ہے لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے آپ کو۔" سیر پر سوا سیر شاید ندرت سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"اچھا تو شاید آپ کا خیال ہوگا کہ میں آپ کو دیکھتے ہی پہلے سلام بجا لاؤں۔" طنز کا تیر مسکراہٹ کی کمان سے چھوڑا گیا تھا۔

"ارے واہ! آپ تو گاتے بجاتے بھی ہیں، میں تو سمجھی تھی صرف جگت بازی کرتے ہیں۔"

"پہلے نہیں تو اب سمجھ لیجیے کہ میں کسی کا بھی بینڈ منٹوں میں بجانے میں خاص مہارت رکھتا ہوں۔ اس بات کی تصدیق آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے۔" شاہ زین کی دل کش مسکراہٹ اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہی تھی۔

"ہونہہ آپ کی تو شکل ہی عزت کرنے والی نہیں ہے۔"

"جارج بش سے ملتی ہے کیا؟"

شاہ زین نے دل جلا دینے والی مسکراہٹ سے کہا تو اس کی برداشت جواب دے گئی اور پاؤں پٹخ کر واپس مڑی ہی تھی کہ زبیر اور صبا کو اپنے عقب میں پا کر مزید تپ گئی۔

"تم؟ کورنی واش کی رنگین کالی، کہاں گم ہو گئے تھے، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں نے تمہیں یہاں دیکھا تھا۔"

شاہ زین کا غصہ زبیر پر نکالتے ہوئے اس نے زبیر کے لمبے قد کو نشانہ بنایا تھا۔

"ہاں تو میں ابھی ابھی تو ذرا کر بابا سے کچوریاں لینے گیا تھا تاکہ تمہارے آنے سے پہلے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرلوں لیکن پلٹا تو۔۔۔"

ندرت اور شاہ زین کو باری باری دیکھ کر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ندرت تم نے۔۔۔" صبا نے اس کے کان کے قریب آکر سرگوشی میں جیسے کچھ یاد دلانا چاہا تھا۔

"ہاں ہاں پتا ہے مجھے، میں نے ہی کچوریاں کھانے کی خواہش کی تھی۔"

کھا جانے والی نظروں سے شاہ زین کو دیکھتے ہوئے اس نے صبا کی بات اچک کر جواب دیا اور شانوں سے ڈھلکتے دوپٹے کو مفلر کی طرح گلے میں ڈال لیا۔

شاہ زین ابھی تک ہاتھ میں پکڑی بوتل سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا اسے ہی دیکھ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کا ہاتھ اپنے شانے پر محسوس کرتے ہوئے مڑا۔

"کیوں سائیں کسی میڈم نے او کے کیا اپنے سر کا سائیں بنانے کے لیے یا۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر میران نے ایک نظر ندرت کو دیکھا اور پھر بولا۔

"ابھی تلاش کا سفر جاری ہے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ تلاش کا سفر جاری کیا، شروع ہی نہیں ہوا ابھی، اور دوسری بات وہ سب ایک مذاق تھا اور بس۔"

شاہ زین نے اتنی نرمی اور تحمل سے میران کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر جواب دیا تھا کہ ندرت اس کی قابل تحسین برداشت پر ستائشی نظروں سے دیکھے گئی اور تبھی اسے یاد آیا کہ اسے شاہ زین سے اس گھٹیا مذاق کی معافی مانگنا تھی۔

"ارے یار ایک لڑکی کے ہاتھوں سائیں تم مذاق بن گئے اور چپ رہے، لگتا ہے مردانگی کو گھر پر سلا آتے ہو؟"

مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سگریٹ سے سرمئی ہوتے ہونٹوں کو سکیڑ کر جانے آج میران کیا ثابت کرنے پر تلا تھا اور پھر حیرت کی بات یہ تھی کہ آج اس کے "چیلے" بھی اس کے ساتھ نہیں تھے جو ہمیشہ اس کے گرد دلہن کی سہیلیوں کی طرح رہا کرتے۔

"میرے دوست مردانگی یہی تو ہے کہ اپنی برداشت کو آخری حد تک آزمایا جائے خصوصاً تب جب آپ کے سامنے کوئی فی میل ہو۔ صحیح معنوں میں مرد تو وہی ہے نا جو اپنے غصے کو قابو میں رکھے۔" میران کی کہی گئی سخت بات کے جواب میں پھر وہی نرمی۔ ندرت جھنجلا گئی تھی۔

"میران بہتر ہے کہ تم اپنے کام سے کام رکھو، خوامخواہ بی جمالو بننے کی کوشش نہ کرو۔"

صبا نے ندرت کا ہاتھ بڑی زور سے دبایا۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے یہ بات کیوں کی۔

"میں بی جمالو نہ بنوں یعنی تم جب چاہے لڑکوں کی ہو جمالو کرتی رہو۔"

ہفتہ بھر پہلے ایوب کھوسہ سے انسپائر ہو کر بالوں کو پرم کروا کر ان کی چھوٹی سی پونی کو شہادت کی انگلی پر لپیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے میران اب براہِ راست ندرت سے مخاطب ہوا تھا۔

"ہو جمالو ہوئی بھی تو لڑکوں کی ہوگی اس لیے تم بے فکر رہو۔" صبا نے اس کے ہاتھ کو مزید دباتے ہوئے اپنی طرف کھینچ لیا۔ زبیر ان کے پیچھے پیچھے ہاتھ میں کچوریوں کا لفافہ لیے تیز قدموں سے چل دیا۔

چھٹی حس کا الارم جانے کیوں بجا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

"السلام علیکم اماں!" شاہ زین نے گھر میں داخل ہو کر ہاتھ میں پکڑی چند کتابیں میز پر رکھیں۔

"وعلیکم السلام بیٹا! آج تم جلدی آ گئے۔ خیریت تو ہے نا؟"

ماں ثمینہ کی قمیص کی ترپائی کرتے ہوئے ایک دم چونک کر پہلے اسے اور پھر سامنے لگی گھڑی دیکھنے لگی

تھیں۔ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری ثمینہ بھی گیٹ کی آواز سن کر کچن سے نکلی اور اس کے قریب چلی آئی، جلدی میں وہ ہاتھ میں پکڑے خالی گلاس میں پانی ڈالنا بھول گئی تھی۔

"بھائی آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ کیا آج شہروز نے ٹیوشن نہیں لی؟"

وہ اس کی تمام ٹیوشنز کے ٹائمنگز اور اسٹوڈنٹس کے نام وغیرہ سب سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ آج کی آخری ٹیوشن ایف ایس سی کے شہروز کی ہوتی ہے۔

"ارے ہاں بھئی آپ لوگ پریشان نہ ہوں میں بالکل ٹھیک ہوں، دراصل شہروز آج سے ٹیوشن نہیں پڑھے گا مجھ سے۔"

برآمدے کے ستون کے عقب میں رکھے ریک سے اس نے اپنے سلیپرز پہنے اور دوسرے جوتے وہیں رکھ دیے۔ اتنے میں ثمینہ تیزی سے کچن میں جا کر چولہے کی آنچ ہلکی کر آئی تھی۔

"نہیں پڑھے گا۔ لیکن کیوں بیٹا!" اماں نے قمیص ایک طرف رکھی اور مکمل متوجہ ہوئیں۔

"کوئی خاص بات نہیں، دراصل اسے ایک اور ٹیچر مل گیا ہے جس کی بورڈ میں بھی سنا ہے بہت واقفیت ہے۔ اور ٹیوشن پڑھنے والے نالائق سے نالائق اسٹوڈنٹس کو بھی کافی اچھے نمبر دلوا دیتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا! جو ہمیں مل رہا ہے وہی ہمارا نصیب ہے۔ دینے والے کی ذات اسے ہی زیادہ نوازے گی جو اپنے کام میں مخلص ہو۔ اس لیے تم فکر نہ کرنا یقیناً اس میں بھی اوپر والے کی طرف سے ہمارے لیے بہتری ہے۔"

"ہاں بھائی ایک در بند تو سو کھلا، اس لیے آپ بالکل ریلیکس رہیں۔"

ثمینہ نے قمیص شاپر میں ڈال کر دیوار میں بنے شیلف پر رکھتے ہوئے کہا تو وہ جو آج ندرت اور میران کی بات چیت سوچنے لگا تھا جواباً "ہوں" کر کے رہ گیا۔

ندرت، صبا اور زبیر کے جاتے ہی میران کے

تاثرات اسے کچھ اچھے نہیں لگے تھے۔

اماں اور ثمینہ ظاہر ہے اس بات سے ناواقف تھیں جبھی اس کے چہرے پر ڈیرہ ڈالے پریشانی کے تاثرات کو شہروز کی ٹیوشن سے تعبیر کرنے لگیں۔

"بھائی جو رزق ہماری قسمت میں لکھا ہے وہ ہمیں مل کر ہی رہے گا بلکہ قدرت خود ہمیں اس رزق کے وسیلے تک پہنچائے گی۔ اور جو ہمارے لیے نہیں ہے اس کے لیے پریشان ہونے کا بھلا کیا فائدہ۔"

ثمینہ کی بات پر وہ ایک دم چونکا اور پھر شرمندہ ہو گیا کہ وہ خوامخواہ ان دونوں کو ایک ایسی بات کے لیے پریشان کر رہا ہے جس کے لیے وہ خود صرف اللہ پر بھروسہ کیے مطمئن ہے۔

"بالکل صحیح کہا اور پھر جو ہماری قسمت میں نہیں ہے تو اس کا ایک ذرہ بھی ہمارا نہیں ہو سکتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھو تو نوالہ منہ کے قریب جا کر نیچے گر جائے، یا پھر کھانا کھانے کے بعد کلی کرنے سے نکلنے والے ذرات جو ہماری قسمت میں نہ ہونے کی وجہ سے منہ میں جا کر بھی واپس باہر آجاتے ہیں۔"

اسے یوں سوچ میں گم دیکھ کر اماں حقیقتاً پریشان ہو گئی تھیں۔

"ارے نہیں اماں مجھے ٹیوشن ختم ہو جانے کی کوئی پریشانی نہیں ہے اور پھر مجھے سو فیصد یقین ہے کہ جب تک آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بھی بیٹھ جاؤں تو غیب سے رزق آنے لگے گا۔"

"ارے بیٹا! کبھی میری سانسوں اور دعاؤں کی گنتی ہوئی نا تو دعاؤں کی تعداد ہی زیادہ نکلے گی۔" اسے مسکراتا دیکھ کر اماں اور ثمینہ نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔

"ویسے ہمارے گھر میں ایک قانون تو الٹا ہے اماں۔"

اماں کے بائیں طرف پڑے گاؤ تکیے کو کھینچ کر اس سے ٹیک لگاتے ہوئے شکایتی انداز میں بولا تو

اماں اور ثمینہ دونوں ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"اور وہ یہ ہے کہ عام طور پر گھرانوں میں دیر سے آنے پر چائے پانی نہیں پوچھا جاتا اور ہمارے گھر میں۔۔۔ آج میں جلدی آ گیا ہوں تو ثمینہ نے ایک گلاس پانی بھی نہیں دیا، بلکہ پیاس کا مزید احساس دلانے کے لیے خالی گلاس سامنے رکھ دیا ہے۔"

"جی ہاں اور وہ اس لیے کہ آج جب آپ گھر میں داخل ہوئے تو خود آپ کے چہرے پر کئی ٹیوب ویل چل رہے تھے۔ میں نے سوچا میں بھی گلاس بھر لوں۔" ثمینہ نے خجالت سے سامنے رکھا گلاس ہاتھ میں لیا اور کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق جواب دے کر کولر کی طرف بڑھ گئی۔

وقتی طور پر ثمینہ کی بات پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور نمودار ہوئی تھی لیکن بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ ندرت اور میران کے درمیان ہونے والا مکالمہ پھر سے ذہن میں تازہ ہو گیا۔

سرخ و سفید رنگت والی ندرت اور درمیانے قد اور سانولی رنگت کے حامل میران کو سوچتے ہوئے ذہن میں سالوں پہلے پڑھی گئی کہانی "معصوم شہزادی اور عیار جادوگر" کا عنوان یاد آتے ہی وہ ہڑبڑا ہی تو گیا تھا کہ سامنے ثمینہ ہاتھ میں گلاس لیے پانی کے چند چھینٹوں سے اس کا منہ دھلانے پر تلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

سیاست، دنیائے کاروبار کی فہرست میں صفِ اوّل کا وہ واحد کاروبار ہے جس میں سیاست دان عوام کو بے وقوف بنانے کی فیس بھی عوام ہی سے وصول کرتا ہے۔ نتیجتاً خود بی ایم ڈبلیو میں سیر و تفریح کرتا ہے جب کہ بے چارے عوام دال روٹی حاصل کرنے کی تگ و دو میں پیدل برس ہا برس جوتیاں چٹخاتے انہی کے نعرے لگاتے لگاتے مر جاتے ہیں۔ لیکن حیدر شاہ سیاست دانوں کے قبیلے میں منفرد اس لیے نظر آتے کہ وہ دل میں حقیقتاً غریب طبقے کا درد محسوس کیا کرتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمہ وقت ان

کی حالت میں بہتری لانے کے لیے کوشاں رہتے۔ شاہ سائیں ان جاگیرداروں یا وڈیروں میں سے ہرگز نہیں تھے جو اپنی حاکمیت ختم ہو جانے کے ڈر سے غریب طبقے کو دبا کر رکھنے میں اپنی آن بان کا تحفظ سمجھتے۔ آج بھی وہ اپنے اسی مقصد کی طرف قدم بڑھانے کی حکمت عملی ترتیب دینے کے بعد بڑے پرجوش انداز میں حویلی میں داخل ہوئے تھے۔

''ملکانی او ملکانی۔۔۔'' راہداری عبور کرنے کے بعد بیٹھک میں قدم رکھتے ہی انہوں نے پکارا تو زنان خانے سے بیٹھک میں داخل ہونے میں ملکانی سائیں نے لمحہ بھر دیر نہیں لگائی۔

''کیا بات ہے شاہ جی؟ آج تو میکوں بڑے خوش لگدے او۔''

ملکانی جی نے مسکراتے ہوئے اپنی کاجل سے بھرپور آنکھوں کو شاہ سائیں کے چہرے پر مرکوز کیا۔ جوان بیٹے اور بیٹی کے باپ تھے۔ سیاست اور کاروبار کے علاوہ کئی بکھیڑے تھے مگر پھر بھی صحت ایسی قابلِ رشک تھی کہ ملکانی سے تو عمر میں آدھے معلوم ہوتے۔

یوں بھی ملکانی ان سے تھیں تو دس برس بڑی ہی، مگر اب یہ دس برس دونوں کے بیچ دگنے لگا کرتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ملکانی جی خود کو ہمیشہ بناؤ سنگھار اور زیورات سے آراستہ رکھتے ہوئے شاہ سائیں کی توجہ اپنے تک ہی مبذول رکھنے کی تگ و دو میں لگی رہتیں کہ وڈیروں، جاگیرداروں کی دلی کیفیت کو وہ بخوبی سمجھا کرتی تھیں اور ''اندر'' کی خبر اُن تک پہنچانے کے لیے بھی ملکانی کا خاص بندہ ہمیشہ ان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا۔

''خوش تو میں ہوں مگر تم اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

شاہ سائیں نے ملکانی کی نظروں کا ارتکاز محسوس کرتے ہوئے پوچھا تو لپ اسٹک کی تہ تلے چھپے ہونٹ مزید پھیل گئے۔

''دیکھ رہی ہوں کہ میکو کتنا سوہنا بندہ دیا ہے رب نے۔''

ملکانی کی بات پر شاہ سائیں کا بلند قہقہہ فضا میں ابھرا تو وہ جھینپ کر خواہ مخواہ کلائی میں پہنی سونے کی چوڑیوں کی گنتی کرنے لگیں۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں شکر کیا کرو ملکانی شکر، چین کی نیند سویا کرو۔''

''ہوں۔۔۔ کاش! کہ ایسا ہو سکتا شاہ سائیں!'' ملکانی نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے کے تاثرات لمحہ بھر میں بدل گئے تھے۔

''کاش۔۔۔! رب نے میکو بہت کچھ بلکہ سب کچھ دے کر بھی خالی ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو شاید میں بھی چین کی نیند سو سکتی۔''

ملکانی کی اس بات پر شاہ سائیں نے چونک کر انہیں دیکھا اور ایک دوسرے کی آنکھ میں لکھی تحریر پڑھ کر دونوں ہی الجھ گئے۔

یاسیت گویا پَر پھیلائے اُن کے چہرے کی منڈیروں پر آ براجمان ہوئی۔

شاہ سائیں ذرا سی دیر میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے دکھائی دینے لگے تھے۔ ملکانی کا چہرہ بھی ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔

شاہ سائیں اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک سرد آہ کھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھے۔ انتہائی دل گرفتگی سے ملکانی کو دیکھا اور ان کے صوفے کی طرف بڑھے۔ شاہ سائیں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر ملکانی نے صوفے پر پھیلے دوپٹے کے کنارے کو سمیٹ کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑی تو وہ ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئے۔ اور اپنا ہاتھ خاموشی سے ان کے شانے پر رکھ دیا۔

''صبر۔۔۔ صبر بھلی عورت۔۔۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''جانتی ہوں شاہ سائیں! پر کیا کروں؟ دل سے یہ بات نکلتی ہی نہیں۔''

''اور نکلے گی بھی نہیں ملکانی! یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی۔ شاید اسی لیے میں اپنے دونوں بچوں اور خصوصاً میران کے لیے اتنا کچھ کرنا چاہتا ہوں کہ پھر اسے کچھ اور سوچنے کی نہ تو فرصت ہو اور نہ ضرورت۔''

''یہ سب ممکن ہے شاہ سائیں؟'' لہجے کی بے یقینی لفظوں پر حاوی تھی۔

''یہ دنیا ہے ملکانی! اور یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ اور یاد آیا۔۔۔'' شاہ سائیں نے بات کرتے کرتے اچانک ماتھے پر آہستگی سے ہاتھ مارا۔

''میں تو تمہیں بتانے یہ آیا تھا کہ بہت جلد فیکٹری کا افتتاح ہونے والا ہے۔ مشینری وغیرہ سب سیٹ ہو گئی ہے۔ بس آج کل میں اسٹاف کے لیے اخبار میں اشتہار دینے کا سوچا جا رہا ہے۔ کچھ اسٹاف دوسری فیکٹری سے وہاں شفٹ ہو جائے گا۔'' شاہ سائیں پُرجوش انداز میں ملکانی کو تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔ سو ملکانی کو بھی اپنا سابقہ موڈ بدلنا پڑا۔

''پر ایک بات چنگی طرح دھیان میں رکھنا۔''

شاہ سائیں نے سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''ساری لڑکیاں تا اکٹھی کر لینا اُدھر، آپ کا اعتبار بھی نہیں ہے کوئی۔''

دل کے خدشات ملکانی کی زبان پر آئے تھے کہ شاہ سائیں قہقہے کے ساتھ اپنی نوک دار مونچھوں کو سیٹ کرتے ہوئے ملکانی کے سر پر پیار سے چپت رسید کرتے کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

''کیوں بھئی خیریت؟ کیا تصویر کھنچوانے والے ہو؟'' یونیورسٹی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف نئی رنگ برنگی پھولوں کی مستطیل کیاریوں کے قریب زبیر اور صبا کو ساکت و جامد دیکھ کر ندرت حیران ہوئی۔

''تصویر نہیں لیکن تمہارے کان ضرور کھنچوانے والے ہو گئے ہیں۔''

اسے دیکھتے ہی صبا تشویش سے بولی۔

''کیا ضرورت تھی میران جیسے فضول انسان سے پنگا لینے کی، کہاں تو تم کسی سے بات تک نہیں کرتیں اور اب اُس تھرڈ کلاس انسان کی باتوں کے جواب دینا بھی ضروری ہو گیا تمہارے لیے۔''

زبیر نے بھی اس کی کلاس لے لی تھی۔ یوں بھی تینوں شروع سے اکٹھے پڑھتے آ رہے تھے۔ اسی لیے دھڑلے سے ایک دوسرے پر حق بھی جماتے تھے۔ اور اپنا دوستی کا فرض بھی نبھاتے تھے۔

''اوہو تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ خواہ مخواہ شاہ زین کو پٹیاں پڑھا رہا تھا ہونہہ۔۔۔ سید میران علی شاہ۔۔۔'' ندرت نے تنفر سے اس کا نام لیا۔

''اُس کے قد سے تو اس کا نام زیادہ لمبا ہے۔'' اپنی ہی بات پر ہنس کر اس نے ٹیوٹی کی شکل کے بیگ سے چیونگم نکال کر دونوں کی طرف بڑھائی اور خود بھی چبانے لگی۔

زبیر اور صبا بھی اس کی بات پر چیونگم چباتے ہوئے مسکرانے لگے تھے۔

''اچھا شاہ زین کو سوری کہہ دیا تھا یا سارا لڑائی جھگڑا کے آخر میں ایک ہی دفعہ کہو گی۔''

''سوری۔۔۔؟ ہاں وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا ایک تو اسٹوپڈ اتنا حاضر جواب ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا بات کے جواب میں کیا کہہ دے۔''

کلاس کی طرف جاتے کوریڈور میں مڑتے ہوئے وہ کل کی بات دوبارہ بتانے لگی جس کا آخری کچھ حصہ وہ دونوں براہِ راست دیکھ چکے تھے۔ اسی دوران شاہ زین کلاس میں داخل ہونے لگا تو پیچھے سے میران کی آواز سنائی دی۔

''ارے سائیں! ایک لڑکی سے مذاق بنوالیا اپنا، اور پھر بھی سینہ تان کے چلتا ہے۔ لگتا ہے ہمی کو وارث بننا پڑے گا۔'' مخصوص لہجے میں بات کرتا وہ یقیناً اپنے شتہ بالوں کے ساتھ اُن کے پیچھے ہی آ رہا تھا۔ جبھی ندرت نے کچھ سوچے سمجھے بغیر شاہ زین کو دور سے ہی آواز دے کر زوردار طریقے سے ہاتھ ہلاتے ہوئے ہیلو کہا تو زبیر اور صبا اس کی اچانک حرکت پر حیران رہ

گئے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ندرت شروع سے ہی Unpredictable رہی ہے۔ کس وقت کیا کر دے یہ پیشن گوئی کرنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ خود شاہ زین لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا سا گیا تھا لیکن پھر سنجیدگی سے ہیلو کہہ کر کلاس میں داخل ہو گیا۔ اپنی ذات کے اوپر چڑھائے گئے خود ساختہ خول میں پڑنے والی دراڑ نے بلاشبہ اُسے چونکا ضرور دیا تھا۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی سر!''

پروفیسر خورشید کا آج لیکچر ڈے تھا۔ نیا ٹاپک شروع کرتے ہوئے وہ ہمیشہ بھرپور طریقے سے اسٹوڈنٹس کو موضوع میں انوالو کرنے کی کوشش کرتے تھے اسی مقصد کے لیے وہ کلاس میں آکر بغیر وقت ضائع کیے پراجیکٹر استعمال کر کے لیکچر شروع کرنے ہی والے تھے کہ ندرت کی آواز پر انہیں رُکنا پڑا۔

''سر! مجھے ایک بات کرنا تھی۔''

''ناٹ ایٹ آل، آپ جانتی ہیں نا آج ڈسکشن ڈے نہیں ہے اس لیے آج ہم کچھ ڈسکس نہیں کریں گے۔''

''سوری سر! لیکن بات بہت اہم ہے۔ پلیز اونلی فیو منٹس (صرف تھوڑے سے منٹس)۔'' پروفیسر خورشید جانتے تھے کہ وہ ایک ذمہ دار لڑکی ہے۔ کسی بھی فضول بات کے لیے وہ یوں اصرار نہیں کرے گی۔ جبھی کندھے اچکا کر گہری سانس لیتے ہوئے چہرے کے تاثرات سے اسے بات کرنے کی اجازت دی تو اس نے سر جھکا کر شکریہ کہا اور بولی۔

''سر! کچھ دن پہلے کلاس میں شاہ زین کا جو مذاق بنا اور جس کی وجہ سے اب تک شاہ زین کو ٹکے ٹکے کے لوگوں سے باتیں سننا پڑتی ہیں، آئی وانٹ ٹو ٹیل کہ وہ سب میری شرارت تھی۔ جس کے لیے میں اس دن سے لے کر اب تک شرمندہ ہوں۔ اور جب تک یہ مجھے معاف نہیں کریں گے میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاؤں گی۔ آئی ایم سوری شاہ زین۔۔۔ رئیلی ویری سوری۔'' شاہ زین کی طرف دیکھ کر کہنے کے بعد

اس نے نظریں جھکالی تھیں۔ زبیر، صبا اور خود شاہ زین اس کی حرکت پر دم بخود تھا۔ لیکن اس کے کچھ بھی کہنے سے پہلے پروفیسر خورشید نے اپنا چشمہ اتار کر ڈائس پر رکھا اور بولے۔

''یہ آپ دونوں کا آپس کا معاملہ تھا جسے کلاس سے باہر بھی سلجھایا جاسکتا تھا لیکن اس کے لیے آپ نے کلاس کا وقت ضائع کیا۔''

''تو سر! دراصل شاہ زین کی انسلٹ پوری کلاس کے سامنے ہوئی تھی تو مجھے معافی بھی پوری کلاس کے سامنے ہی مانگنا تھی تاکہ سروتے جیسی شکلوں سے چھالیہ جیسے الفاظ نکلنا بند ہو جائیں۔'' اس کا اشارہ واضح طور پر میران کی جانب تھا۔

''ہوں۔۔۔'' پروفیسر خورشید نے ہنکارہ بھرا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا کہہ کر ڈائس سے چشمہ اٹھایا۔

اس تمام عرصے میں شاہ زین دم بخود اس پُراعتماد لڑکی کی طرف بس دیکھے ہی گیا۔ اس خواہش کے ساتھ کہ ایک بار وہ بھی اسے دیکھے، غصے سے، بےزاری، اکتاہٹ یا پھر مسکرا کر، دیکھے تو۔۔۔

لیکن وہ جان بوجھ کر اپنے پاؤچ سے سامنے رکھے پین کو ڈھونڈنے کی اداکاری کرتی رہی کہ ان سرمئی آنکھوں کی تپش براہِ راست برداشت کرنا اسے ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ سونے پر سہاگہ برق رفتاری سے دھک دھک کرتا باغی ہوتا دل۔

''واہ! لڑکے پٹانا خوب آتے ہیں۔'' کلاس کے سناٹے میں ابھرتی دھیمی آواز بھی کو بلند معلوم ہوئی تھی۔

''لڑکے پٹانا نہیں پٹانا بھی بہت ہی خوب آتے ہیں۔'' آج پہلی مرتبہ کسی نے یوں دلیری سے اس پر جملہ کسا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ میران ہی ہے اور میران کی بری قسمت یہ کہ اس کا مخصوص لب و لہجہ پروفیسر خورشید پر بھی اس کی شناخت واضح کر گیا تھا۔ اوران کے مخصوص طنزیہ لہجے میں جو درگت اس کی بنی تو وہ کسی زخمی سانپ سے کم ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

پتھریلی زمین پر میران شاہ کی جیب چھوٹے بڑے تمام پتھروں کو بھاری مگر مضبوط ٹائروں سے کچلتی جارہی تھی۔ کیونکہ حیدر شاہ کے سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے گاؤں تک پکی سڑک کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ مگر میران نے جان بوجھ کر دوسرے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ جیپ کی برق رفتاری سے اڑتے گرد و غبار میں شاید وہ اپنے اندر اٹھنے والے انسلٹ کے تمام بگولوں کا وجود ختم کر دینا چاہتا تھا جو ندرت کی باتوں سے اسے ہر طرف نظر آرہے تھے۔ چیلے نما دوستوں کے لاکھ روکنے پر بھی آج وہ رُکا نہیں تھا اور جبڑے بھینچتا ہوا غصے کی تمام شدت ایکسیلیٹر پر منتقل کر دی۔

''پروفیسر خورشید۔۔۔!'' دانت پیستے ہوئے ایک زوردار مکا اسٹیئرنگ پر مارا تھا۔

ویسے بھی جس طرح ندرت پر کمنٹ کرنے کے بعد پروفیسر خورشید نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اس سے کہیں زیادہ بے عزتی اسے ندرت کی مسکراہٹ میں محسوس ہوئی تھی۔

''اور یہ ندرت۔۔۔ سمجھتی کیا ہے خود کو؟'' غصے کی شدت حاوی ہوئی تو کھلی زمین کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے گاڑی کے ٹائروں کو جو گھمایا تو گولائی میں گھومتے اسٹیئرنگ نے اس کے گھومتے ہوئے دماغ کو بھی گویا شکست دے ڈالی۔

اسی دوران جیب کے اندر اس کے سیل فون نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو اسے اپنا ''شغل'' ترک کر کے فون کی طرف متوجہ ہونا پڑا جواب تک سیٹ کے نیچے پہنچ چکا تھا۔

اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد آخر آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے اس نے جھک کر فون اٹھایا۔

''کیا مسئلہ ہے؟'' دوسری طرف اس کا دوست تھا جسے اس کا کھردرا سا سوال سننا پڑا تھا۔

''کچھ خاص نہیں، ابھی گھر جانے کے لیے یونی سے نکلا تو سوچا ہیلو ہائے کرلوں۔''

وہ یقیناً آج ہونے والے واقعے پر بات کرنا چاہتا تھا لیکن میران کا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

''تو پھر ہوئی نا ہیلو ہائے۔۔۔ بس بائے۔''

بےزاری سے کہتے ہوئے میران نے بغیر کسی مروت کے فون بند کر دیا تھا۔

یوں بھی کوئی بچپن کی یا پرانی دوستی تو تھی نہیں، ابھی یونیورسٹی میں ہی ان کی دوستی ہوئی تھی جو یونیورسٹی کے ساتھ یا پہلے ختم بھی ہو جانی تھی کہ یہی میران شاہ کا دستور تھا۔ کوئی بھی اس کے ساتھ بہت زیادہ عرصہ نہیں چل پاتا تھا۔ کچھ تو میران کی خود کی برتری کی عادت تھی اور کچھ وہ خود ہی بہت زیادہ دوستیوں یا دوستوں کا پرسنل ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹی۔۔۔ کتنے ہی دوست بنے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دوستیاں ختم بھی ہو گئیں کہ میران کی دوستیاں محض وقت گزاری کے لیے ہوا کرتی تھیں۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ان کی اہمیت اور ضرورت بھی ختم ہو جاتی۔

☆☆☆

''شاہ زین نے تمہارا نمبر مانگا ہے کہو تو دے دوں۔۔۔ ویسے حرج تو کوئی نہیں ہے۔''

ابھی اسے پوائنٹ میں سوار ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ زبیر نے میسج کے ساتھ ساتھ اپنی رائے بھی روانہ کی۔ وہ جانتی تھی کہ پروفیسر خورشید کے پیریڈ سے لے کر لاسٹ پیریڈ تک شاہ زین ان تینوں کے آس پاس ہی موجود رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ یقیناً اس سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن دانستہ اس نے صبا اور زبیر کو ایک لمحے کے لیے خود سے الگ ہونے نہ دیا۔ یہی نہیں بلکہ شاہ زین کو بھی نظر انداز کیے رکھا یوں جیسے اسے خبر ہی نہیں کہ وہ وہاں ہے بھی یا نہیں۔

ایسا وہ کیوں اور کس خدشے کے تحت کر رہی تھی یہ بات خود اسے سمجھ نہیں آرہی تھی اور پہلے وہ خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہ رہی تھی جبھی بڑے بڑے حروف میں صرف "No" لکھ کر سینڈ کر دیا۔

"Stich on a time, saves nine" کچھ عقل کرلو۔"

کھٹ سے دوبارہ میسج آیا تو وہ بے اختیار موبائل کی ہلکی سبز اسکرین کو دیکھ کر ہنس دی۔ جانتی تھی کہ زبیر اب حق جتانے کی سیڑھی پر پاؤں رکھ چکا ہے۔ جبھی فی الحال جواب "Plz no, talk 2 u later" لکھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ پوائنٹ میں تو الگ ہی جہان آباد ہوا کرتا ہے جہاں زیادہ تر لڑکیاں دونوں انگوٹھوں کی مدد سے زوروں کی اسپیڈ میں اپنے عموماً "وقتی جذبات" الفاظ کی صورت اسکرین پر منتقل کر رہی تھیں کچھ میگزین میں مصروف تھیں تو کوئی ہیڈفون لگائے موسیقی کی دھن میں مست۔ اسی جائزے کے دوران زبیر کی کال آئی لیکن فی الحال وہ اس سے بھی شاہ زین کے متعلق بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی جبھی موبائل کو بجتے رہنے دیا اور صبا کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆☆☆

"بھابھی خیریت ہے آج کوئی آرہا ہے کیا؟"

شام سوا پانچ بجے کے قریب گھر میں داخل ہوتے ہی مختلف قسم کی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اس کا استقبال کیا تو وہ چونک گئی اور سیدھی کچن میں جا پہنچی جہاں امی ٹیبل پر رکھے بڑے سے باؤل میں ابلے ہوئے آلو، ہلکے فرائی مٹر، گاجر اور بند گوبھی مکس کر رہی تھیں۔

"ہاں آج ممی لوگ آرہے ہیں، اکمل آیا ہوا ہے نا چھٹیوں پر، تو میں نے سب کو شام کے کھانے پر بلا لیا۔" عائشہ نے ذرا جھک کر اوون میں رکھے ران کے گوشت کی رنگت تبدیل ہوتے دیکھی تو اوپر گولائی میں کٹے ٹماٹر، پیاز اور ادھ گلے ابلے چاول بکھیر کر دوبارہ اوون بند کردیا۔

"لیکن صبح تک تو اس دعوت کا نام ونشان نہیں تھا اگر آپ پہلے بتادیتیں تو میں لاسٹ پیریڈز لینے کے بجائے جلدی گھر آکر آپ کی ہیلپ ہی کروادیتی۔"

ندرت نے ایک نظر امی کو اور پھر عائشہ کو دیکھتے ہوئے کہا جو بریانی کے لیے گوشت بھون رہی تھی۔

"وہ دراصل پہلے ایسا کوئی پروگرام تھا نہیں بلکہ نیناں نے ہم سب کو انوائیٹ کر رکھا تھا مگر عین وقت پر ناصر نے منع کردیا کہ انہیں آج کہیں اور جانا تھا۔۔۔ اور پھر یہ مشورہ بھی انہوں نے ہی دیا کہ کہنا تو صرف مل بیٹھنے کا بہانہ ہی ہے نا، وہاں نہ سہی یہاں ہمارے گھر سہی۔"

ساری بات کرتے ہوئے وہ اُس ہنگامے کو بالکل گول کرگئی تھی جو ناصر کے نہ جانے پر کھڑا ہوا تھا۔

"اچھا چلیں اب جلدی جلدی بتائیں میرے لائق کیا خدمت ہے تاکہ میں بھی ہاتھ دھوکر چیزوں کے پیچھے پڑجاؤں۔" سنک کے ساتھ رکھے ہینڈواش سے ہاتھ دھوتے ہوئے اس نے ریلیکس موڈ میں کہا اور امی کو آرام کرنے کا کہہ کر کمرے میں بھیجنے کے بعد خود ان کے ساتھ جُت گئی۔

ایک تو کچن میں ایگزاسٹ فین کچھ پرابلم کررہا تھا اور پھر اوون اور چولہوں کی گرمائش، جب سارا کام ختم ہونے کے بعد وہ کچن سے نکلی تو چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ یوں بھی ابھی تک عائشہ کے گھر والے نہیں پہنچے تھے۔ جبھی جلدی سے فریش ہوکر لائٹ گرین اور لیمن کلر کے امتزاج کا ٹراؤزر شرٹ پہن کر باہر نکلی تو بلاشبہ آئینے ہی کو مبہوت کرڈالا۔

"ندرت پتا ہے کتنے ہی آئینے ملا کر تمہارے کمرے کا آئینہ تیار کروایا ہے ورنہ تو بے چارہ ایک جھلک پر تمہارے قدموں میں پڑا ہوتا۔"

ثروت آپا اکثر یہ جملہ کہتیں اور وہ ہنس دیتی لیکن اکثر ہی اُسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے جملہ ضرور یاد آتا۔ گیلے بالوں میں برش کرتے ہوئے اس نے ٹائم دیکھا۔ جلدی جلدی سامنے رکھے پرفیوم کا اسپرے کیا اور دوپٹا کندھے پر ڈالے باہر چلی آئی جہاں آنٹی انکل تو آچکے تھے لیکن اکمل ان کے ساتھ شاید نہیں تھا۔ جبھی اُن دونوں کو سلام کرکے عائشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بھابھی صرف آنٹی انکل ہی آئے ہیں کیا؟"

ڈرائنگ روم کے بائیں طرف رکھے نسبتاً چھوٹے صوفہ سیٹ کو اس نے بالکل نظر انداز کردیا تھا جہاں ناصر بیٹھے کسی سے گپیں لگا رہے تھے۔

"ارے نہیں تو اکمل بھی ہے۔۔۔ وہ اُدھر ناصر کے ساتھ۔" بھابھی نے گردن ناصر کی طرف موڑی۔

"ارے اکو تم۔۔۔؟" اتنے بڑے ہوگئے ہو، کیا تمہاری فوجی ٹریننگ میں ہر وقت الٹا لٹکا کے رکھتے ہیں یا تم درختوں کے ساتھ جھولتے رہتے ہو۔"

اکمل کو اتنے لمبے چوڑے انسان کے روپ میں دیکھنے کی یقیناً اسے توقع نہیں تھی جبھی اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ردِعمل بڑا واضح انداز میں سامنے آیا۔

جواب میں اکمل اپنی تعریف پر جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ندرت ابھی تک حیران سی اسے دیکھے جارہی تھی۔

"بھئی ندرت! اکو نہیں اکمل کہو، اتنے اچھے نام کو بگاڑنا مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

عائشہ بھابھی نے وہیں سے گردن موڑ کر مداخلت کی تو باقی بڑے بھی متوجہ ہوئے۔

"ارے بھابھی! میں اسے اکو کہوں یا ہکو بکو، یہ میرا اور اکو کا مسئلہ ہے۔ پلیز آپ بڑوں میں رہیں۔ کیوں اکو؟"

اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ ناصر بھائی کے ساتھ ہی سامنے بیٹھ گئی۔

"بالکل ندرت جی! آپ جو بھی کہیں مجھے منظور ہے کیوں کہ پھول کو کسی بھی نام سے پکاریں رہتا تو وہ پھول ہی ہے نا۔" اکمل نے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہوچاہے کاغذ کا یا گوبھی کا۔۔۔"

اپنی روانی میں وہ کہہ تو گئی لیکن ایک دم اکمل کی بات پر دل دھڑک سا گیا تھا اور تب ہی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دو سرمئی آنکھیں اس کے ذہن کے پردے پر آنمودار ہوئیں۔ کہ یہی تو اس دن لائبریری میں شاہ زین نے بھی کہا تھا۔ اور اس کے یاد آتے ہی دل عجیب سی کیفیت کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس نے سامنے بیٹھے اپنے سے چھوٹے اکمل کو دیکھا جو کل تک اس کے ساتھ گپیں مارا کرتا تھا۔ آج کتنا بڑا اور ڈیسنٹ لگ رہا تھا۔ فوج کی ٹریننگ نے اس کی شخصیت کو یوں نکھارا تھا کہ ہر ہر انداز سے ڈسپلن جھلکتا۔

لیکن پھر بھی ہزار کوشش کے باوجود وہ یونیورسٹی سے گھر میں داخل ہوتے ہی شاہ زین کو بالکل بھول چکی تھی۔ اب اکمل کی اس بات کے بعد چاہنے کے باوجود بھی اس کے خیال سے دامن چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکی اور چلتے پھرتے اسے سوچ گئی۔

☆☆☆

آج یونیورسٹی آتے ہوئے اس نے سوچ رکھا تھا کہ جاتے ہی شاہ زین سے بات کرے گی لیکن ہوا اس کے برعکس کہ آج کا شاہ زین شاید کل کی ندرت بنا اسے غیر محسوس طریقے سے نظر انداز کرتا رہا۔ خود زبیر نے بھی اُس سے کل کے متعلق کوئی بات نہیں کی تو وہ حیران ہوکر آخر خود ہی پوچھ بیٹھی۔

"زبیر کیا بات ہے کل تم کیوں بار بار میسج کررہے تھے؟" خدا خدا کرکے فری پیریڈ ملتے ہی وہ تینوں اپنے من پسند گوشے میں جا پہنچے تھے۔

"نہیں کچھ خاص نہیں ویسے ہی۔" زبیر نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے صبا اور ندرت کے سامنے پاپ کارن کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"ویسے ہی کا کیا مطلب؟ کل تو پوائنٹ میں فون پہ فون کررہے تھے۔ اور آج۔۔۔" وہ زچ ہوگئی تھی۔

"اچھا تو اس وقت زبیر کی کال آرہی تھی۔۔۔ تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔" صبا کی حیرت بجا تھی۔

"زبیر بتاؤ نا تم اس وقت کیا کہہ رہے تھے؟" ندرت کی جھنجلاہٹ عروج پر تھی کیوں کہ وہ زبیر کی بات سننے کے لیے بے تابی سے انتظار کررہی تھی تاکہ اس کی بات کے جواب میں اُن دونوں کو بتا سکے کہ وہ شاہ زین کے لیے کچھ منفرد محسوس کرنے لگی ہے۔ اسی لیے صبا کی بات کو نظر انداز کرکے زبیر کی طرف متوجہ رہی جو بڑے مزے سے پاپ کارن کھا تا

یونیورسٹی کی ''رنگینیوں'' سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''زبیر۔۔۔'' وہ چیخی۔

''توبہ ہے دنیا بھر میں سب سے زیادہ ڈھیٹ بندہ ڈھونڈنے نکلو تو آگے تمہی کھڑی ملو گی۔'' وہ یقیناً اپنی ''تفریح'' میں مداخلت پر بدمزا ہوا تھا۔

''کہا نا کچھ نہیں تھا کل۔''

''جاؤ دفع ہو جاؤ۔۔۔ نہیں بلکہ تم اپنی جولیٹ کے ساتھ عیش کرو میں ہی دفع ہو جاتی ہوں۔ ہونہہ۔۔۔ خوامخواہ ہر وقت کباب میں ہڈی بنی رہتی ہوں۔''

بڑبڑاتی ہوئی وہ اپنی چیزیں سنبھال کر اٹھی اور پاؤں پٹخ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

میران اپنے دوستوں کے ساتھ ندرت، زبیر اور صبا سے کافی فاصلے پر بیٹھا باتیں تو دوستوں سے کر رہا تھا مگر دھیان مکمل طور پر ندرت پر تھا۔ بڑی گہری نظروں سے وہ ان تینوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا جب جیب میں پڑے موبائل نے اس کے ادھر سے اُدھر بھٹکتے دماغ کو چونکا دیا۔

''سلام لالہ۔۔۔ کیا حال ہے؟'' دوسری طرف مہربانو ہمیشہ کی طرح خوش اخلاقی سے اس کا احوال دریافت کر رہی تھی۔

مگر دوسری طرف چونکہ اس کی بہن تھی سو فون پر ہی سہی مگر دوستوں کے سامنے بہن سے بات کرنا اس کی ''غیرت'' کے خلاف تھا۔ جبھی انہیں اشارے سے کچھ دیر میں آنے کا کہہ کر ان سے قدرے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

''میں ٹھیک ہوں تم سناؤ، اس وقت کیوں فون کیا؟''

''لالہ میں ایک ہفتے کے لیے گاؤں آ رہی ہوں، اماں سائیں کا فون نہیں مل رہا تھا اس لیے آپ کو کرنا پڑا۔''

''ہوں۔۔۔'' میران جیسے کچھ سوچنے لگا تھا۔

''تم پورے ایک ہفتے کے لیے گاؤں آ رہی ہو، وہ بھی ڈیورنگ داسیشن؟ ایسی کیا آفت آ گئی تھی؟''

میران ناخن کے بجائے کھال دیکھنے کا عادی تھا۔ اور بہن ہونے کی وجہ سے مہربانو اس کی عادت سے بخوبی واقف تھی اسی لیے اس کے لہجے کا کڑواپن نظر انداز کر گئی۔

''وہ لالہ دراصل۔۔۔ بہت دن ہو گئے ہیں آپ سے دور، تو بہت یاد آ رہی تھی سب کی۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے، میں اماں سائیں کو فون دیتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ مہربانو جواب میں کچھ کہتی جبکہ اس کے اللہ حافظ کہنے سے پہلے ہی اس نے ملکانی جی کا نمبر ملایا جو حسنِ اتفاق اسی وقت ریسیو بھی ہو گیا۔ سامنے ندرت کسی بات پر جھنجھلائی ہوئی تھی جبکہ زبیر اور صبا اسے تنگ کرنے کے موڈ میں معلوم ہو رہے تھے۔

ان تینوں کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے ایک دم ملکانی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''صدقے جاؤں پتر۔۔۔ سب خیر تو ہے نا؟ آج یونیورسٹی میں کیویں یاد آ گئی ماں کی؟'' حسبِ معمول ملکانی کی آواز میں بیٹے کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

''وہ آ رہی ہے آپ کی لاڈلی۔''

''مہربانو آ رہی ہے؟'' حیرت اور خوشی کا ملا جلا احساس تھا ان کی آواز میں۔

''چاچے بخش کے ساتھ خود بھی ضرور جانا اُسے لینے۔''

کسی بات پر ہاتھ میں پکڑی فائل ندرت نے زبیر کو ماری اور خود پاؤں پٹختی وہاں سے چل دی۔

''او پتر اپنی تلیم (تعلیم) کے لیے گئی ہے اُدھر، تو ایویں ای نا ہر بات پر شک کیا کرے، آخر بہن ہے تیری۔''

''ہونہہ۔۔۔'' ندرت کے جانے کے بعد صبا اور زبیر کے تالی مار کر ہنسنے پر میران تلخ ہوا تھا۔

''اماں سائیں! غیر لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور مزے کرنے کو آج کل لوگ تعلیم کا نام

دینے لگے ہیں۔ گھر سے اسکارف میں آنے والی کڑیاں یہاں گلے میں دوپٹا ڈالے گھومتی ہیں تو بھی آپ جیسی بھولی مائیں یہی کہتی ہیں ''ہماری بیٹی تعلیم حاصل کرنے گئی ہوئی ہے۔'' ملکانی سائیں نے بغیر مداخلت کے اسے بولنے دیا تھا۔

ویسے بھی میران کے لیے وہ ہمیشہ سے ایک بہترین سامع تھیں۔ ہر قسم کی بھڑاس وہ انہی کے سامنے نکالتا تھا اور وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنے جاتیں۔

اس کی کسی بھی بات سے اختلاف بھی وہ اس کا موڈ بھانپ کر کیا کرتیں ورنہ اکثر و بیشتر اس کی ہاں میں ہاں ملائے جاتیں۔

''اچھا پتر ٹھیک ہے میں خود چلی جاؤں گی بخش کے ساتھ۔۔۔ خوش؟''

ملکانی سمجھ گئیں کہ اس وقت اس کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں ہے جبھی بغیر کسی بحث کے اس کی بات تسلیم کر لی تو حسبِ توقع رہا۔

یعنی میران نے یکسر بدلے ہوئے لہجے میں اللہ حافظ کہنے سے پہلے اُن سے سوئی کا بھی پوچھا اور جلدی آنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے بڑے لائٹ موڈ میں بات چیت کا سلسلہ منقطع کیا۔

''لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔۔۔''

یہ مثل یقینی طور پر انسانی رویوں پر لاگو نہیں بلکہ اس کے برعکس لوہے کے لیے بھی ریشم کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے جو بلاشبہ نرمی میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ اور اسی نرمی کے ساتھ برداشت اور مستقل مزاجی کو بھی شاملِ حال رکھا جائے تو کوئی انسان ایسا نہیں، جس کا رویہ بدلا نہ جا سکتا ہو۔

اور ملکانی تو آخر پھر میران کی ماں تھیں جنہیں اس کے ہر قسم کے رویے کے سامنے ہر حال میں نرمی برداشت اور مستقل مزاجی کا دامن نہیں چھوڑنا تھا۔

کہ میران شاہ کی صورت میں اللہ نے اُن کی قسمت میں شاید ''تاحیات آزمائش'' لکھ دی تھی۔

☆☆☆

دھیرے دھیرے اترتے موسم خزاں کی افسردہ شام کے پروں پر دم توڑتی دھوپ میں آسمان پر روئی کے نرم گالوں نما بادلوں کو یہاں سے وہاں اپنے سنگ لیے نرم ہوا کے جھونکوں سمیت بابا کے لاڈلے درختوں اور ننھے پودوں سے موسم کی تابعداری میں خاک نشین ہوتے پیلے، سوکھے اور زرد پتوں کو دیکھتے ہوئے ان کے ہمراہ ہاتھ میں کتاب لیے چہل قدمی کرتی ندرت کے ذہن میں شاہ زین کا تصور بڑی مضبوطی سے براجمان تھا۔

کل وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا اور یقینی طور پر کچھ کہنا چاہتا تھا، یہ یقین ندرت کو بہرحال تھا لیکن کہیں کہیں یہ احساس بھی ضرور تھا کہ اس نے خوامخواہ نخرے دکھائے اور وقت گزر گیا اور چلو اس وقت نہ سہی تو بعد میں زبیر کے میسج کرنے پر اسے نمبر دینے کی اجازت تو دیتی تاکہ فون کا ہی انتظار رہتا۔

لیکن۔۔۔!

اس نے منہ بسورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی بند کتاب پر نرم ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی اور دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی۔

''اچھا خاصا ہینڈسم لڑکا ہے، پُرکشش اور ڈیسنٹ تو ہے ہی، سب سے بڑھ کر ہائیٹ کتنی زبردست ہے نا۔۔۔ اور پھر کیا ہے اگر وہ مجھے پسند کرتا ہو تو۔۔۔ اب میں اس کی سوچ پر پابندی تھوڑی لگا سکتی ہوں۔''

خوب صورت گلابی ہونٹ بڑی بے نیازی سے مسکرانے لگے تھے کہ وہ خود کلامی کے انداز میں شاہ زین کی ممکنہ کیفیات کا جائزہ جو لے رہی تھی۔ کتاب پر اب ایک مشفقانہ اندازِ محبت کے تحت ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کندھے اچکائے اور ہاتھ باندھ لیے۔

اُسی لمحے ہوا کا شدید جھونکا جانے کہاں سے آیا اور پتے ہوا کے سنگ پھڑپھڑاتے ہوئے یہاں سے وہاں اڑنے لگے۔

''اور ظاہر ہے آج بھی وہ مجھے یقیناً یہاں وہاں ڈھونڈ رہا ہوگا۔۔۔ بے چین ہو رہا ہوگا نا۔ مجھے بتانے کے لیے کہ میں اسے اچھی لگتی ہوں۔'' ایک

شرمگیں مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری جو خود اس کے لیے بھی اجنبی تھی سو فوراً چھپ گئی۔ کیوں کہ بلاشبہ وہ ایک نہایت بولڈ اور پر اعتماد لڑکی تھی۔ شرمانے لجانے جیسے "واقعات" اب تک اس کی زندگی میں رونما نہیں ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود اسے اس مسکراہٹ کے ساتھ دل میں اتر تی ایک عجیب اور نرالی سی کیفیت بڑی بھلی معلوم ہوئی تھی۔

"ویسے کل کو اگر وہ مجھ سے اپنی فیلنگز شیئر کرے، تو بھلا میں کیا کہوں گی۔"

"اممممممم۔۔۔"

دایاں ہاتھ ٹھوڑی پر ٹکائے شفاف آنکھوں میں موجود پتلیوں کو چاروں اور گھماتے ہوئے وہ پہلے سے اپنا جواب تیار کر لینا چاہتی تھی، تاکہ عین وقت پر ایک بار پھر وہ کچھ گڑبڑ نہ کر دے۔

یہی سوچتے ہوئے اس سے پہلے کہ وہ ایک قدم مزید آگے بڑھاتی جانے کہاں سے "کس می کوئیک" (Kiss me quik) کی کانٹوں بھری شاخ عین سامنے آن ابھری جس پر کہیں کہیں خال خال چھوٹے پتے اور ذرا ذرا فاصلے پر انتہائی خوب صورت ننھے منے سرخ پھول اُگے ہوئے تھے۔

شاہ زین کو دیئے جانے والے جواب پر "غور و فکر" کرتی ندرت سرخ پھول کو چھونے کی کوشش میں اچانک کانٹوں سے جا الجھی تو بے اختیار حلق سے ننھی سی چیخ برآمد ہوئی۔

"ندی! تم وہاں گھوم رہی ہو؟"

ناصر بھائی بابا کے کمرے میں موجود تھے وہیں سے اس کی آواز سننے پر کھڑکی سے پردہ سرکایا تو سامنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کو دباتی ندرت نظر آئی۔

"جلدی سے اندر آؤ۔" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آرہی ہوں۔" ندرت نے منہ بسورا۔

غصہ اسے کانٹے چبھنے سے کہیں زیادہ اتنا خوب صورت اور خوش کن خیال ٹوٹنے پر آیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ بابا کی دن رات کی محنت کے [illegible] اس شاہکار نما لان کو عبور کر کے لاؤنج تک پہنچتی [illegible] بھائی خود اس تک آن پہنچے۔

"کیا ہوا؟ درد زیادہ تو نہیں ہو رہا؟"

محض کانٹا چبھنے پر وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اُن کے یوں جان چھڑکنے کے انداز پر وہ مسکرادی۔

"نہیں بھائی۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس بے خیالی میں یونہی۔۔۔"

"بے خیالی؟ لیکن کیوں؟ کیا سوچ رہی تھیں تم؟" مناسب جواب کی تلاش میں وہ خاموش رہی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اب بابا کے کمرے میں موجود تھے۔ جہاں اماں مونگ پھلی اور چلغوزوں کے چھلکے اتار کر دونوں کو الگ الگ ایئر ٹائٹ میں منتقل کرتے ہوئے آتی سردیوں کے استقبال کی تیاری کر رہی تھیں۔

یوں بھی ان کے اس شہر میں سردیاں ڈرتے جھجکتے ہی آیا کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی خشک میوہ جات کا استعمال کر کے دل کو بہلایا اور ضرور سمجھایا جاتا کہ اب یہ موسم سرما کے دن ہیں۔

"کیا ہوا بیٹا! آج چلتے چلتے تم اُدھر کونے تک کیسے پہنچ گئیں؟" بابا کتاب کا ورق موڑ کر میز پر رکھتے ہوئے خود اس کے پاس چلے آئے تھے۔

امی نے اپنے سامنے ہی بیڈ پر بیٹھی ندرت کے ہاتھ کو ذرا آگے بڑھ کر دیکھا، روئی سے سفید اور بالکل روئی ہی کی مانند تھوڑی تھوڑی پھولی ہوئی ہتھیلیاں جہاں سرخی مائل تھیں، وہیں مخروطی انگلیوں کی پوروں پر کہیں کہیں دو تین جگہ پر سوئی برابر خون کے ننھے سے قطرے موجود تھے۔

"معاملہ اتنا سیریس نہیں ہے۔" امی دل کو تسلی دیتے ہوئے مطمئن ہو کر ایک بار پھر اپنے سابقہ کام میں مصروف ہو گئیں۔ ناصر بھائی البتہ بڑی تیزی سے کمرے سے ملحقہ باتھ روم سے ڈیٹول اور روئی کے علاوہ پلاسٹ بھی اٹھا لائے تھے۔

"اِدھر لاؤ ہاتھ، چندا احتیاط کیا کرو نا۔۔۔ دیکھو کیسے لکھو گی۔ یونیورسٹی کیسے جاؤ گی۔" ڈیٹول سے اب بہن کی انگلی کی پوریں صاف کرنے کے بعد ننھے ننھے پلاسٹ لگانے کے دوران وہ مسلسل اپنی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔

امی، بابا نظروں میں ناصر بھائی کے لیے بے تحاشا محبت لیے بس انہیں دیکھے ہی گئے۔

جن خوش قسمت لڑکیوں کے ناصر جیسے بھائی ہوں انہیں والدین کے نہ ہونے کا احساس کبھی اس شدت سے نہیں ہوتا ہوگا۔

ایک عجیب و غریب سا خیال اس کے ذہن میں آیا تو اس نے چونک کر بابا کو دیکھا۔ مبادا وہ اس کے ذہن کا یہ انوکھا فلسفہ پڑھ تو نہیں رہے۔

"اوہو بھائی! آپ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔۔۔ اور یہ۔۔۔" وہ ہنسی۔

"یہ دیکھیں امی! صرف کانٹے ہی تو چبھے تھے اور بھائی نے پلاسٹ تک لگا دیا ہے۔"

"تو اور کیا؟ ان کے اندر خوامخواہ جراثیم چلے جاتے تو بیمار نہیں پڑ جاتیں تم؟ بولو۔۔۔ کیوں بابا؟"

ندرت سے بات کرتے کرتے انہوں نے ایک دم بابا کی رائے لینا چاہی تو انہوں نے تائید میں گردن ہلادی۔ اسی دوران عائشہ کمرے میں داخل ہوئی۔

امی، بابا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جبکہ ناصر کے چہرے سے مسکراہٹ کا کوئی رشتہ معلوم نہ ہو رہا تھا۔ یوں بھی ناصر بھائی کے مزاج میں سختی کا عنصر زیادہ تھا۔ نا صرف گھر بلکہ خاندان بھر میں غصے کے تیز مشہور تھے۔ ہاں یہ الگ بات تھی کہ ندرت کو وہ ساری دنیا سے الگ ٹریٹ کیا کرتے تھے۔ اور وہ یوں کہ اکثر اوقات محسوس ہوتا کہ ندرت ان سے بڑی اور وہ چھوٹے ہیں۔ ندرت کے منہ سے نکلی ہر بات کو پورا کرنا شاید وہ خود پر فرض کر چکے تھے۔ چھوٹی بہن پر اس قدر پیار نچھاور کرنے کی عادت پر اکثر اوقات عائشہ کو اختلاف بھی ہوتا جو اکثر اس کے رویے اور بعض اوقات لفظوں سے ظاہر بھی ہوتا۔

"کیا ہوا ندرت خیر تو ہے؟" عائشہ نے اس کی سپید پوروں پر دو تین جگہ دائرہ نما پلاسٹ اور پاس بیٹھے ناصر بھائی کے ہاتھ میں ڈیٹول وغیرہ دیکھا تو حیران ہوئی۔

"جی بھابھی بالکل خیر ہے۔" ناصر بھائی نے ہاتھ میں پکڑی چیزیں عائشہ کی جانب بڑھائیں تو وہ ناسمجھی سے ایک بار پھر کچھ بولتے بولتے رکی۔

"تو پھر یہ سب۔۔۔؟" اشارہ اس کی انگلیوں اور ڈیٹول وغیرہ کی طرف تھا۔

"یہ سب ناصر بھائی کا پیار ہے اور بس۔" ندرت نے لاڈ سے ناصر بھائی کے کندھے پر سر رکھا تو وہ بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

عائشہ کی نظروں میں حسرت نما رشک کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔

☆☆☆

ہالا کے بنے خالص لکڑی کے خوب صورت فرنیچر سے مزین آج تو بیٹھک کی چھب ہی نرالی تھی۔ اور وہ یوں کہ خاندان کے چاروں افراد آج ایک ساتھ جمع تھے۔ ایسے مواقع ویسے بھی حویلی کے در و دیوار کو کم ہی دیکھنے کو ملتے۔ ملکانی تو گھر پر ہوتی ہی تھیں مگر شاہ سائیں کبھی باہر ہوتے تو کبھی میران، اور اگر وہ دونوں کسی وقت حویلی میں موجود ہوتے بھی تو مہربانو پچھلے ایک سال سے ہاسٹل میں مقیم تھی۔ اور پھر لاہور سے روز روز آنا بھی ممکن نہ تھا۔ جبھی عید تہوار کے علاوہ وہ مشکل سے دو ہفتے ہی گزار پاتی اور ایک دو دن کے لیے شاہ پور کا چکر ضرور لگا لیا کرتی۔

سونی حسب معمول ڈائننگ ٹیبل سے بیٹھک کے دو تین چکر لگانے کے بعد اب ملکانی کی گود میں موجود تھی۔ اور ملکانی کے پیار سے سہلانے پر آنکھیں بند کیے بازو پر سر رکھے ہوئے تھی۔

"کیوں میرو بیٹا، کیسی چل رہی ہے پڑھائی؟"

شاہ سائیں نے موبائل کی اسکرین کو اوپر موجود غیر محسوس ابھار کے ساتھ دباتے ہوئے لاک کیا اور

سنہری رنگ کے انتہائی نفیس فریم کی عینک کو سیاہ مخملیں ڈبیا میں رکھ کر بند کرتے ہوئے توجہ مہربانو پر مبذول کی جو میران کے ساتھ سونی کے متعلق گفتگو میں مصروف تھی۔

"بہت زبردست! اور آپ کے ڈونیشنز بھی پورے ٹائم پر مل جاتے ہیں ادارے کو۔

"ہوں۔۔۔ چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ اور ہاسٹل میں کوئی پرابلم ہو تو بتانا اس علاقے کا ایم پی اے اچھی جان پہچان والا ہے۔"

"جی ضرور۔" مہربانو نے مؤدبانہ انداز اپنایا۔

"ملکانی سائیں! کھانڑاں تیار ہے، لگادوں؟" کنیزاں نے حد درجہ احترام لہجے میں سموتے ہوئے پوچھا اور اجازت ملنے پر وہیں سے پلٹ گئی۔

☆☆☆

رات کچھ دیر امی بابا کے پاس بیٹھ کر دن بھر کی روداد سنانے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد عائشہ اور ناصر نے سونے کے لیے بیڈروم کا رخ کیا تو اندر داخل ہوتے ہی ناصر نے چائے کی فرمائش کی۔

"چائے؟ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو امی بابا کے ساتھ چائے پی تھی آپ نے؟"

عموماً وہ رات کو سوتے ہوئے چائے پینے سے گریز کیا کرتے تھے اسی لیے کھانا کھانے کے بعد امی بابا کے ساتھ چائے پیتے اور بس۔

ندرت کے لیے البتہ ہمیشہ کیپی چینو بنا کرتی تھی۔ اسی لیے عائشہ کا حیران ہونا لازمی تھا۔

"بس یار پتا نہیں کیوں آج سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ اس لیے سوچا چائے کے ساتھ ایک سر درد کی گولی بھی لے لوں۔۔۔ شاید آرام آجائے۔"

بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے تکیے سے ٹیک لگا کر انہوں نے کشن گود میں رکھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے تک تو سر درد کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ یہ ایک دم کمرے میں آتے ہی۔۔۔"

عائشہ کے لہجے میں ہلکا سا طنز در آیا تھا۔ بات کرتے کرتے وہ کمرے کے کونے میں رکھے ٹیبل کی طرف بڑھی جس پر ہمیشہ ہی ٹی بیگز اور الیکٹرک کیتلی کے ساتھ ننھے سے جار میں خشک دودھ دستیاب ہوتا۔

"سمجھا کرو نا۔ جب والدین اس عمر میں ہوں تو ان کے ساتھ صرف اپنی خوشیاں شیئر کرنی چاہئیں دکھ اور تکالیف نہیں، کیوں کہ دکھ سکھ کا ساتھی تو شریکِ سفر کی صورت میں ہمارے پاس ہوتا ہی ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"ہوں۔۔۔ بات تو ٹھیک ہے۔" عائشہ نے الیکٹرک کیتل آف کرتے ہوئے تائید کی پھر ایک نظر رخ موڑ کر ناصر کو دیکھا جو اسی کی طرف متوجہ یقینی طور پر چائے کا انتظار کر رہے تھے۔

"میں کل امی کی طرف جانا چاہتی ہوں آپ کا کیا خیال ہے؟"

چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے عائشہ بھی پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

"تو جاؤ، پہلے بھی روکا ہے تمہیں جو آج خصوصاً پوچھ رہی ہو۔"

گرما گرم چائے کی چسکی لینے کے بعد وہ بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں چاہتی ہوں کل ہم دونوں امی کی طرف جائیں۔"

"چلو ٹھیک ہے دونوں چلے جائیں گے، اور کچھ؟"

"اور میں۔۔۔"

"لیکن ہاں۔۔۔" ناصر نے چائے کی لی گئی چسکی تیزی سے حلق میں منتقل کرتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"کل تو میں نہیں جا سکتا۔"

"نہیں جا سکتے؟ لیکن کیوں؟"

چند لمحوں میں جواب کی تبدیلی پر عائشہ کا حیران ہونا تو بنتا تھا۔

"کیوں کہ مجھے یاد آگیا ہے کہ کل مجھے ندرت کے ساتھ جانا ہے۔ کہہ رہی تھی ثروت کے بیٹے کے لیے کوئی گفٹ وغیرہ لینا ہے۔"

"لیکن ناصر۔۔۔"

"بحث نہیں عائشہ، تمہیں معلوم ہے نا ندرت میری چھوٹی بہن مگر سب سے بڑی ترجیح ہے۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔ اور پھر میں تمہیں منع تو نہیں کر رہا ان شاء اللہ پرسوں آفس سے جلدی آجاؤں گا، تم چار روز رہنا، آرام سے تین چار گھنٹے گپ شپ کر کے آئیں گے۔" ناصر نے اپنے تئیں مسئلہ حل کر کے سارا نتیجہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا مگر شاید وہ ابھی تک مطمئن نہیں تھی۔

"آئیں گے سے کیا مطلب ناصر؟ ہم پرسوں وہاں رہیں گے ویسے بھی اگلے دن آپ کی چھٹی ہوگی۔"

"سوری عائشہ! تم چاہے ہفتہ بھر رہ لو لیکن میری طرف سے معذرت سمجھو۔"

خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ بولے۔

"لیکن کیوں؟ آپ کیوں نہیں رہیں گے وہاں۔۔۔ اتنے مہینوں بعد تو اکمل آیا ہے آپ اس کے لیے ایک رات نہیں رک سکتے۔ ثروت آپا کے شوہر نے تو بھی انہیں منع نہیں کیا۔"

"تمہیں پہلے بھی ہزار مرتبہ کہا ہے میرا دوسروں کے ساتھ موازنہ مت کیا کرو، ہر بندے کا الگ مزاج ہوتا ہے اور مجھے اچھا نہیں لگتا تو بس نہیں لگتا۔"

"لیکن اکمل۔۔۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، سمجھ کیوں نہیں آتی میری بات، اکمل آیا ہے تو کیا پھولوں کے ہار لے کر ساری رات کھڑا رہوں اس کے پاس، چار کے بجائے چھ گھنٹے بیٹھ جاؤں گا مگر رات کو واپس گھر آنا ہے۔۔۔ ویسے بھی جب تک امی بابا اور ندرت سے رات کو کچھ دیر باتیں نہیں کر لوں، تمہیں پتا ہے کہ مجھے نیند نہیں آتی۔ اور ابھی دو دن پہلے تو سب آئے تھے۔"

تحت لہجے میں بات شروع کرتے ہوئے انہوں نے آخر نرمی اختیار کی جو عائشہ کے مزاج کو سہارا دے گئی۔

"چار نہ چھ، آپ پرسوں وہیں رہیں گے میرے ساتھ اور میں کچھ نہیں جانتی۔"

"تم جانتی ہو یا نہیں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اب گھنٹے تو کیا میں چار، چھ منٹ کے لیے بھی تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا، تم نے جانا ہے تو شوق سے جاؤ۔"

ناصر کی ضد اور غصہ بھی مشہور تھا وہ اپنی طرف کی لائٹ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اور عائشہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی "آدھی کو چھوڑ ساری کو جائے آدھی بھی نہ پائے" کے مصداق دانت پیستی رہی۔

☆☆☆

فری پیریڈ تھا سو انجوائے کرنے اور گپ بازی کرنے کے لیے اسٹوڈنٹس کی مختلف ٹولیاں یہاں وہاں بکھری ہوئی تھیں۔ کسی نے کینٹین کا رخ کیا تو کوئی لائبریری کی طرف۔ کچھ اسٹوڈنٹس جو اساتذہ سے راہ و رسم بڑھانے کو کامیابی کی نوید سمجھا کرتے تھے وہ چند گروپ کلاسز کے عین نیچے فوٹو اسٹیٹ شاپ کے سامنے بنی راہداری میں موجود تھے۔ جہاں ایک قطار میں مختلف پروفیسرز، لیکچررز اور اسسٹنٹس کے آفسز موجود تھے۔

ان سب کے برعکس صبا اور زبیر ہمیشہ کی طرح سفیدے کے درختوں تلے اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھے۔ دونوں جب بھی اکیلے ہوتے اسی جگہ بیٹھا کرتے تھے۔ جس کی ایک وجہ تو یقیناً پرائیویسی تھی جب کہ دوسری یہ کہ یہ جگہ یونیورسٹی گیٹ سے نسبتاً نزدیک تھی اور ندرت جلد ہی ان کے پاس پہنچ جایا کرتی۔ آج بھی ہاتھ میں پاپ کارن کا پیکٹ پکڑے دونوں مکئی کے ان خوش رنگ دانوں کو کھانے کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے جب ندرت ذومعنی انداز میں انہیں دیکھتی ہوئی وہاں پہنچی اور بڑی ادا سے گویا ہوئی۔

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دل عشاق کی خبر لینا

پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

زبیر نے اس کے اشعار مسکراتے ہوئے جبکہ صبا نے قدرے جھینپ کر وصول کیے اور اس سے پہلے کہ اب وہ نثر میں بات کرتی زبیر بول اٹھا۔

گلوں کے کھلنے پر ہی منحصر نہیں محسن
ملے وہ جس میں وہی ہے بہار کا موسم

صبا کی طرف جاں نثار نظروں سے دیکھتے ہوئے زبیر نے یہ شعر یقیناً اس کے نام کیا تھا۔

یہ خواب ہے تو مجھے تھوڑی دیر دیکھنے دو
نہیں یہ شرط کہ تم بھی اسی اثر میں رہو
یہ شاخ شاخ جھکنا بھی کیا ضروری ہے
اگر سفیرِ وفا ہو تو اک شجر میں رہو

اگر یہ بات تھی تو پھر صبا بھی کسی سے کم نہ تھی جبھی اس نے بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا تھا۔

"تم دونوں ویسے ہو تو بڑے تیز۔۔۔ بھئی واہ! ماننا پڑے گا۔" ندرت نے دونوں ہاتھوں سے شاہانہ انداز میں تالی بجاتے ہوئے دونوں کو باری باری دیکھا تو دونوں ہی کے چہرے پر استفہامیہ تاثرات دیکھ کر مزید جل گئی۔

"ایک دوسرے کے گھر پر رشتے بھجوائے اور قبول کیے جا رہے ہیں اور مجھے بتایا بھی نہیں۔۔۔ شرم کرو تم دونوں، میرے لیے تو یہ بات ہی ناقابلِ یقین تھی جب پتا چلی۔۔۔"

"اوئے صبا! تم نے اسے بتایا نہیں۔۔۔"

"ایں۔۔۔ زبیر! تم نے بات نہیں کی تھی ندی سے؟"

دونوں کی زیر لب مسکراہٹ دیکھ کر وہ مزید تپ گئی۔ اس سے پہلے کہ چہرہ تمتما اٹھتا معاملے کی سنگینی دیکھ کر زبیر اور صبا نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آخر صبا نے حقیقت بتانا چاہی۔

"ندی مقصد تم سے چھپانا نہیں بلکہ ڈائریکٹ منگنی پر بلا کر سرپرائز دینا تھا اور بس۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ بچو سرپرائز تو میں دوں گی اب۔" ان کی شرارت جان کر اسے بھی شرارت سوجھی تھی۔

☆☆☆

"شاہ زین ایک منٹ۔۔۔" کانفرنس روم کی طرف جاتے جاتے وہ ندرت کی آواز پر ایک دم پلٹا اور اسے تیز قدموں سے اپنی طرف آتے دیکھ کر رک گیا۔ سیاہ پٹیالہ شلوار کے ساتھ نہایت مختصر سی سرخ رنگ کی قمیص پہنے بلا مبالغہ وہ شاہ زین کی آنکھوں کو چندھیائے دے رہی تھی۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" قریب سے آتی ندرت کی آواز نے اس کی محویت کو توڑا۔

"خیریت۔۔۔؟"

"کل آپ نے زبیر سے کیا کہا؟"

"میں نے؟" اس نے حیرت سے ندرت کو یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

"نہیں آپ کے پڑوسی نے، ظاہر ہے آپ سے ہی پوچھ رہی ہوں۔" لفظوں کو اپنے غصے سے دانت کے اندر چباتے چہرے کے تاثرات کو نرم رکھتے ہوئے اس نے سامنے کھڑے شاہ زین کو دیکھا جو کیمل کلر کی پینٹ اور نیوی بلیو شرٹ میں انتہائی ڈیشنگ لگ رہا تھا۔

"اوہو لی بی! آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ میں کیوں زبیر سے کچھ بھی کہنے لگا۔" وہی نرم لہجہ جو شاہ زین کا خاصہ تھا۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ شاید آپ نے کچھ نہیں کہا اور اگر نہیں کہا تو کیوں؟" جو کچھ اس نے اندازہ لگایا تھا حقیقت اس سے برعکس نکلی تو لہجہ خود بخود کمزور پڑنے لگا کہ وہ تو جانے کیا کچھ سوچ کر آئی تھی۔

"دیکھیں یہ آپ کا اور زبیر کا پرابلم ہے مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہی ہیں؟"

"اس لیے کہ میں آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں۔" شاہ زین کو وہ پاؤں پٹخ کر بات منواتی بچی سی لگی تھی۔

"میری وجہ سے؟" ایک بار پھر ندرت اسے چونکا گئی تھی۔ لیکن دل خوش فہم کو زیادہ لفٹ نہ کرواتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ کو خوامخواہ ڈسٹرب ہونے کا پرابلم ہے تو سوری میں آپ کی پرابلم میں بالکل انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔"

"ہوں لیکن میں آپ میں انٹرسٹڈ ہوں، اینڈ دیٹس اٹ۔"

بالوں پر رکھے گوچی کے اسٹائلش گلاسز کو آنکھوں پر لگا کر اس سے پہلے کہ وہ واپس مڑتی شاہ زین نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

"کیا۔۔۔؟ آر یو سیریس؟" زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا واسطہ اتنی بولڈ لڑکی سے پڑا تھا۔

"یس ہنڈریڈ پرسنٹ۔۔۔ دراصل مجھے دل میں بات رکھنے کی عادت نہیں ہے اسی لیے۔۔۔

وہ شخص جیسا لگا منہ پر کہہ دیا اس سے
یہ دل کی بات تھی ہم سے منافقت نہ ہوئی

ابرو چڑھاتے ہوئے ندرت نے شعر پڑھا تو شاہ زین اس کی ادا پر ہنس دیا۔ آج پہلی مرتبہ ندرت نے اسے یوں ہلکا سا ہنستا ہوا دیکھا تھا۔ قہقہہ نہ مسکراہٹ صرف ہلکی سی ہنسی، جیسے اس کی بات کی تائید کر رہا ہو۔ جبھی ندرت ایک بار پھر گلاسز بالوں پہ لگائے اور آنکھیں پھیلا کر نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

عجیب کھیل ہے عشق کا، میں نے آپ دیکھا یہ معجزہ
کہ جو لفظ میرے گماں میں تھے وہ تیری زباں پہ آ گئے

دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے پرشوق نظروں سے ندرت کے الجھے الجھے تاثرات کو دیکھتے ہوئے اس نے جواباً شعر پڑھا تو ندرت کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ارے جی آپ کی یہ حاضر جوابی ہی تو ہمیں لے ڈوبی۔ کیسے پھر دوستی پکی؟" ندرت نے اپنا نرم و نازک سپید ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"ارے یار بڑھا ہوا ہاتھ تھامنے میں دیر نہ کر، ہو سکتا ہے یہ آفر محدود مدت کے لیے ہو۔" راہداری کے موٹے موٹے ستونوں کے پیچھے سے زبیر اور صبا برآمد ہوئے تب تک شاہ زین ندرت کی جانب سے دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام چکا تھا۔

"زبیر کے بچے تم یہاں کب سے کھڑے ہو؟" ندرت نے دانت پیسے۔

"ارے ارے ابھی باقاعدہ منگنی تو ہوئی نہیں تم بچوں کو بھی پکارنے لگیں۔ اللہ کا خوف کرو کیسی کیسی ترغیبیں دے رہی ہو ہمیں۔" زبیر نے شرارت سے صبا کو دیکھتے ہوئے معصوم بننے کی اداکاری کی تھی۔

"ہاں تم تو جیسے اللہ تعالیٰ کی گائے ہو نا۔۔۔"

"ہائے مار ڈالا ندرت! کاش! تم نے کچھ اور کہا ہوتا۔" زبیر نے سر پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"کاش! تم مجھے اللہ تعالیٰ کا بیل کہہ دیتیں لیکن تم نے تو۔۔۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"اور مجھے بھی تم دونوں سے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ ہمارے گروپ میں شاہ زین کا استقبال تم دونوں اس مسخرہ بازی سے کرو گے۔"

صبا نے دونوں کا دھیان شاہ زین کی طرف مبذول کروایا جو بڑی دلچسپی سے ان کی بات چیت سن رہا تھا۔

"ارے نہیں بھئی میرا دوست تو یہ اوّل روز سے ہی تھا۔ ہاں گروپ میں آج شمولیت ہوئی ہے۔" زبیر نے انکشاف کیا۔ "اور اس کا استقبال کینٹین جا کر پارٹی کرنے سے کریں گے۔ کیوں فرینڈز؟"

"یاہو۔۔۔" صبا اور ندرت نے ہوا میں مکا بلند کرتے ہوئے کہا اور کینٹین کی طرف چل دیں۔ زبیر اور شاہ زین نے بھی مسکراتے ہوئے ان کی تقلید کی۔ ندرت نے یقیناً اس کے پہلے جملے پہ دھیان نہیں دیا تھا ورنہ ایک بار پھر اس کی درگت بننا یقینی تھا۔

یہی وہ دن تھا جب ان کے درمیان دوستی کی ابتدا ہوئی۔ زبیر، صبا اور ندرت کے درمیان موجود اس دوستانہ ماحول نے شاہ زین کو بہت متاثر کیا تھا جبھی ان سب کے ساتھ مل کر شاہ زین کو لگا جیسے اس کی ذات میں موجود کسی دوست کا خلا بھر گیا ہو۔

اپنا آپ ایک دم مکمل سا لگنے لگا تھا۔۔۔
زندگی کبھی یوں اچانک دھنک رنگوں سے سج جائے گی۔ اس نے سوچا نہ تھا۔

خود ندرت کی بھی کیفیات کم و بیش یہی تھیں۔ چلبلی اور شوخ تو وہ تھی ہی لیکن اب تو اکثر یونہی بات بے بات مسکراتے ہوئے نظر آتی۔ گو کہ دل کی بات کہنے میں لڑکی ہونے کے باوجود اس نے پہل کی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ اب شاہ زین کی سرمئی آنکھوں میں ہلکورے لیتا خاموش سمندر بھی زیادہ دیر سکوت طاری رکھنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اپنے دل کی بات ندرت کو بتانے کے لیے اس دن شاہ زین نے زبیر سے اس کا نمبر مانگا تھا۔ مگر زبیر کے کچھ دن انتظار کرنے کا کہہ کر وہ محض اس کی طرف سے ملنے والے گرین سگنل کا منتظر تھا۔ مگر غیر متوقع طور پر ندرت نے اس کی مشکل آسان کردی۔

خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی
لوگ تسخیر ہو بھی سکتے ہیں
لفظ دل سے ادا کرے کوئی

اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوجے کے دل کی سلطنت بخوبی تسخیر کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

☆☆☆

پنک کلر کے ٹراؤزر شرٹ کے ساتھ پنک ہی سلیپرز پہنے کندھوں پر بکھرے بالوں کو سمیٹ کر پونی کی شکل دینے کے بعد ابھی وہ کچھ دیر پہلے ہی امی اور بابا کے کمرے سے اٹھ کر آئی تھی۔ ناصر بھائی اور عائشہ بھی وہیں موجود تھے۔ اس دن ناصر کے تلخ ہونے پر اس نے میکے جانے کا ارادہ بدل کر ان کے سامنے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ناصر کی مرضی اور خوشی کے بغیر کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور نہ ہی وہ ایسا کرنا چاہتی ہے۔ اور اس بات کو خود ناصر نے بھی بے حد سراہا تھا جس پر عائشہ کی گردن تن سی گئی تھی۔

''اندر آجاؤں؟''

عائشہ نے ندرت کے کمرے کے دروازے پر دستک دینے کے بعد رک کر پوچھا تو ہاتھوں پہ لوشن لگاتی ندرت خود لپک کر دروازے تک آگئی۔

''آئیں نا بھابھی! پوچھنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔'' دروازہ کھولے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کچھ تو اس کی رنگت گلابی یوں جیسی تھی اس پہ پہنے ہوئے گلابی ٹراؤزر شرٹ اور کمرے کی دیواروں پر موجود پنک پینٹ نے اپنا بھرپور عکس اس کے شفاف چہرے پر منعکس کر رکھا تھا۔

عائشہ آنکھ بھر کر بس اسے دیکھتی ہی گئی۔

''مجھے آواز دے لیتیں میں آپ کے پاس آجاتی۔''

''نہیں، وہ دراصل کل امی کی طرف دوپہر کی دعوت ہے۔ ثروت آپا بھی آئیں گی تم بھی چلو گی نا۔''

''اوہ بھابھی! سوری، دراصل مجھے بہت ضروری کام ہے آج کل۔ ورنہ سچ ضرور چلتی آپ کے ساتھ۔'' ندرت نے سچ کہا تھا۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ ظاہر طور پر ''اٹس اوکے'' کہنے والی عائشہ کو اس کے جواب نے خاصا مایوس کر دیا تھا۔

☆☆☆

آج وہ سب یونیورسٹی کے اسپیئر روم میں موجود تھے۔ ہیڈ کے ٹرانسفر کے سلسلے میں دیئے جانے والے لنچ کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا رنگا رنگ پروگرام بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ جو ہوتے ہوتے ایک اچھے خاصے ڈھائی تین گھنٹے پر مشتمل فیرویل پروگرام پر پھیل گیا۔ ہمیشہ کی طرح ندرت اس دفعہ بھی ہر کام میں آگے آگے تھی۔ اور آج اسی سلسلے کی فائنل ریہرسل کے لیے وہ سب اس کمرے میں موجود تھے جو عام طور پر ریہرسلز وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

''اوہو یہ ندیم بابا کہاں رہ گئے، کہا بھی تھا پہلے یہ روم صاف کردیں۔''

صبا نے ٹیبل پر بیٹھی ندرت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ آخری دنوں کی جھنجھلاہٹ نا صرف صبا کے لہجے بلکہ چہرے سے بھی ظاہر تھی۔

''ہاں میں نے بھی انہیں ابھی آدھ گھنٹہ پہلے کہا تھا۔۔۔ اس طرح تو لیٹ ہو جائیں گے۔'' ندرت نے زبیر کے ہاتھ سے چپس کا پیکٹ لے کر خود کھانے سے پہلے صبا اور شاہ زین کے آگے کیا۔

''ہاں پوائنٹ مس ہوگیا تو دو گھنٹے تک رکنا پڑے گا۔''

''اچھا رکو میں دیکھتا ہوں۔''

زبیر کے کہنے پر شاہ زین ندیم بابا کو ڈھونڈنے باہر نکلا تھا۔

''کیا ہم ندیم بابا کے انتظار میں ٹائم ضائع نہیں کر رہے؟'' ندرت نے صبا اور زبیر سے پوچھا تھا۔

''تو۔۔۔؟'' صبا اس کی بات کا مقصد نہیں سمجھ پائی تھی۔ زبیر بھی نا سمجھی سے چپس کھاتی ندرت کو دیکھنے لگا جو کچھ بھی کہنے کے بجائے جمپ لگا کر ٹیبل سے نیچے اتر کر کمرے سے باہر نکلی اور چند لمحوں بعد جب دوبارہ اندر داخل ہوئی تو ہاتھ میں جھاڑو بھی موجود تھی۔

''ندی تم پاگل تو نہیں ہو؟'' صبا اسے دیکھتے ہی چیخی۔

''کیوں؟ جو لوگ جھاڑو لگاتے ہیں وہ سب پاگل ہیں؟ اور کیا گھر پر ہم جھاڑو نہیں لگاتے۔''

''گھر کی بات اور ہوتی ہے، یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔''

''تو اس میں غلط کیا ہے بھئی، اور پھر صرف پیپرز وغیرہ ہی تو ہیں جو ڈسٹ بن ہونے کے باوجود اسٹوپڈ لوگ ادھر ادھر پھیلا جاتے ہیں۔''

زبان کے ساتھ ساتھ اب اس کے ہاتھ بھی رواں تھے۔ زبیر اور صبا بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

''عجیب بات بھی ہے کہ یہ روم ہمیں ریہرسل کے لیے دیا گیا ہے اس کے باوجود یہاں کوئی آیا ہی کیوں؟'' بات کرتے کرتے اس نے نظریں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں شاہ زین اندر آتے آتے اسے دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

نظریں ملنے پر شاہ زین نے گردن کے اشارے سے بغیر کچھ کہے اسے جھاڑو لگانے سے منع کیا تھا جس سے میکانکی انداز میں ندرت کے ہاتھ سے جھاڑو گر پڑا تھا۔

''وہ دراصل میں اس طرح کام نہیں کر پاتی نا تو سوچا میں ہی صاف کردوں۔''

چند لمحوں پہلے زبیر اور صبا کے سامنے ڈھیٹ بنی ندرت اب شاہ زین کے آتے ہی شرمندگی سے وضاحتیں دے رہی تھی۔

''ہاں بھئی ہماری تو اب کوئی ویلیو ہی نہیں رہی، کتنی دفع تمہیں منع کیا تھا پہلے۔'' زبیر نے شاہ زین کو اس کی اہمیت جتائی۔

''تمہاری ویلیو تھی ہی کب، جو تمہیں اس کے نہ رہنے کا افسوس ہو رہا ہے۔''

ندرت نے بیگ سے جوس کی بوتل کو نکال کر منہ سے لگائی۔

''کیا ہوا شاہ زین! ندیم بابا نہیں آئے کیا؟''

اس سے پہلے کہ شاہ زین صبا کی بات کا جواب دیتا، ندیم بابا اندر چلے آئے۔

''ندرت بیٹا! آپ لوگوں نے مجھے بلایا تھا؟''

''بابا! آپ نے ہمارا کمرہ صاف نہیں کیا، اسی وجہ سے دیکھیں ہم ابھی تک کچھ بھی نہیں کر پائے۔''

''لیکن میں نے تو سب سے پہلے اسی کمرے کو صاف کیا تھا۔ کیوں کہ سر کاظم نے مجھے سب گروپ لیڈرز کے ناموں کے ساتھ ان کمروں کی بھی لسٹ دی تھی جو آپ سب کو پچھلے ایک ہفتے سے الاٹ ہیں۔''

ندیم بابا نے ایک بار پھر جھاڑو پکڑی اور صفائی کرنے لگے۔

''اگر آپ صفائی کر چکے تھے تو روم کے باہر لگی لسٹ کے مطابق یہ روم بھی ہمیں الاٹ ہے تو پھر یہاں کون آیا تھا؟'' شاہ زین نے سوچتے ہوئے کہا۔

''لیکن روم تو ہمیں صرف دو گھنٹے کے لیے دیا گیا ہے نا اس سے پہلے کس کا نام ہے؟'' صبا نے بات کرتے کرتے دروازے کے باہر لگی لسٹ کو بغور دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے اندر چلی آئی۔

''ہمارے ٹائم سے پہلے یہ کمرہ فضا کے پاس ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے نام کو کاٹ کر اب میران اور

اس کے گروپ کا نام لکھا ہے۔"

"میران۔۔۔؟" ان تینوں کو حیرت ہوئی تھی کیوں کہ وہ اس فنکشن میں کچھ بھی پرفارم نہیں کر رہا تھا۔

"لیکن اسے کس چیز کی ریہرسل کرنا تھی؟" زبیر نے ندرت کی طرف دیکھا جو کہ شاہ زین کے ساتھ کمپیئرنگ کرنے کے ساتھ ساتھ اس پورے پروگرام کی آرگنائزر بھی تھی۔

"شاید اپنے بالوں کو لمبا کرنے کی۔۔۔"

ندرت نے چڑ کر جواب دیا کہ اس کے بالوں سے اسے انتہائی کراہیت محسوس ہوتی تھی۔

"دل تو چاہتا ہے کسی دن اس کے بال پکڑ کر ایسے کھینچوں کہ مطلوبہ حد تک لمبے ہو جائیں۔" ندرت کی بات پر اب بھی ہنسنے لگے تھے۔

یوں بھی میران کے بال پہلے ہرگز ایسے نہیں تھے۔ یہ تو اب کچھ ماہ سے اسے جانے کیا سوجھی تھی کہ بالوں کو مکمل درست انداز میں کٹوانے کے بجائے محض شیپ دے کر اب اس نے انہیں اس انداز میں ڈھال لیا تھا کہ گردن پر ہی سے پونی بننے لگی۔ یوں بھی جو شخص دل کو برا لگتا ہو اس کی ہر ہر بات بری معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ندرت کو ہمیشہ ہی اس کی پونی دیکھ کر عجیب الجھن سی ہونے لگتی۔

"بیٹا! میں اب جاؤں۔"

ندیم بابا ایک ہاتھ میں ڈسٹ بن اور بغل میں جھاڑو دبائے ان کی طرف متوجہ اور اجازت کے منتظر تھے۔

"ہاں بابا! اب آپ جائیں اور سوری آپ کو دوبارہ کام کرنا پڑا۔"

صبا کے کہنے پر بابا نے مسکراتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

یوں بھی ان لوگوں کا گروپ چوں کہ مختلف طریقوں سے لوئر اسٹاف کی مدد کرتا رہتا تھا اسی وجہ سے اُن کا ہر کام ترجیحی بنیادوں پر کیا جاتا۔

ندیم بابا کے جانے پر اپنے شولڈر بیگ سے چیزیں نکال کر سب کو دینے کے بعد اب وہ شاہ زین کے ساتھ مل کر کمپیئرنگ کو فائنل ٹچ دینے لگی تو زبیر اور بھی نیچر زبلی ہیومیز پر ترتیب دیے گئے اسکٹ کی ریہرسل کرنے میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

شاہ پور میں واقع اس عالی شان اور وسیع و عریض حویلی کا قدیم اور گھٹا ہوا ماحول گو کہ مہربانو کے لیے نیا نہیں تھا۔ شروع سے وہ اسی ماحول میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی تھی اور تب تک اسے بالکل بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ حویلی سے باہر کے باسیوں کی زندگی ان سے کس حد تک مختلف ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ سر پر ایک سا آسمان اور پاؤں تلے ساجھی زمین ہونے کے باوجود زندگی سب کے لیے یکساں نہیں ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شعور کی منزلیں طے کرنے کے بعد جب یہ حقیقت اس پر منکشف ہوئی ان دنوں وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہاسٹل میں مقیم تھی۔ نا صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ یہ ہماری کتاب زندگی بلاشبہ استعاروں کی زبان میں تحریر ہے اور جس کسی نے بھی استعاروں کی زبان کو جان لیا اس نے گویا زندگی کو اس کے اصل مفہوم کے ساتھ پالیا۔ لیکن زندگی کو اس کی حقیقت سمیت جان لینا اور پھر آگہی کی لہروں کا اسی حقیقت کے ساتھ سامنا کرنا اکثر و بیشتر کئی الجھنوں میں گرفتار کر دیتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ اب مہربانو کو حویلی سے۔ دل میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ جان بوجھ کر یہاں وہاں مصروف رہنا، ملکانی یا میران کے ساتھ گپ شپ کرنا اپنی سوچوں سے فرار کا ایک راستہ تھا۔ ذہن جیسے تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے کمرے کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کا پینٹ خوشنما اور کھلتے رنگوں کے پردے اور زندگی سے بھرپور رنگوں کے امتزاج سے بنی خوب صورت پینٹنگز نے نا صرف یہ کہ اس کے کمرے کا حلیہ ہی بدل ڈالا بلکہ خود اسے بھی اپنے کمرے میں آکر زندگی اس قدر بوجھل معلوم نہیں ہوتی تھی جتنی کمرے سے باہر قدم رکھتے ہی لگا کرتی۔ بعض اوقات جب ذہن میں موجود معاشرتی گرہیں، طبقاتی فرق کے ساتھ گھتم گتھا ہونے لگتیں تو کمرے کے ایک کونے میں عین کھڑکی کے سامنے رکھے ایزل پر موجود کینوس پر برش اور رنگوں کے ذریعے ان سوچوں کا کتھارسس کرتی۔

آج بھی وہ کھڑکی سے پردہ سرکائے ہاتھ میں برش لیے کھڑی تھی جب باہر سے میران کی جیپ آتی دکھائی دی۔ نظر اٹھا کر اس نے عین سامنے دو پینٹنگز کے وسط میں موجود خوب صورت وال کلاک کو دیکھا۔ سات بجنے والے تھے۔

"یعنی آج لالہ جلدی آگئے ہیں۔" مسکراتے ہوئے اس نے خود کلامی کی تھی۔ کیوں کہ میران اور شاہ سائیں کم کم ہی دیکھنے کو ملا کرتے تھے۔ اکثر کھانے پر صرف وہ تینوں ہی موجود ہوتیں یعنی وہ، ملکانی اور سونی۔۔۔

سونی کو بھی گھر میں ایک فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی اس کی پسند نا پسند کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا۔ نہلانے سے پہلے ملکانی اپنے سامنے کنیزاں سے اس کے لوشن کا مساج کرواتیں، ناخن نرم اور کھردرا ہونے سے بچانے کے لیے خصوصی طور پر مہینے میں دو مرتبہ پلاسٹک اسٹیم دلاتی اور صاف ستھری خوشبودار سونی کو بچوں کی طرح گود میں لیے پھرتیں۔

میران کو گھر آتا دیکھا تو اکٹھا کھانا کھانے کے خیال سے مہربانو نے برش رکھا اور واش روم میں جا کر ہاتھ دھونے کے بعد بیڈ پر پڑی چادر اٹھائی اور بکل کی طرح لپیٹ کر اس سے پہلے کہ باہر نکلتی، موبائل کو سائلنٹ پر کر کے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھنا وہ ہرگز نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

شاہ زین کے مزاج میں تبدیلی کیا آئی تھی۔ گھر جیسے رنگوں سے سج گیا تھا۔ آتے جاتے ثمینہ کی طرف سے چھوڑے جانے والے چٹکلوں کے جواب دیتا، شاہ زین اماں کو بے حد معصوم اور نیا نیا لگتا۔ اور اس خوب صورت تبدیلی کا شکر ادا کرنے کے لیے اب ان کے سجدے پہلے سے کہیں طویل ہونے لگے تھے۔

کم عمری میں ہی جس طرح اس نے انتھک محنت کر کے سارے گھر کی ذمہ داری اپنے سر پر لی تھی وہ بلاشبہ سب کے لیے مثال تھی۔ سارے محلے میں ان کے گھرانے کو نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور مائیں خصوصاً اپنے بچوں کو شاہ زین کی مثالیں دے کر انہیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش کیا کرتیں۔

پارٹ ٹائم ٹیوشنز دینا ہی یوں تو اُن کا روزگار اور زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے اور اپنے اور ثمینہ کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کا ذریعہ تھے مگر ان سب کے باوجود بھی شاہ زین محلے میں رہنے والے کسی بھی بچے سے ٹیوشن کی فیس نہ لیتا اور کسی بھی وقت کسی بھی مضمون میں پرابلم محسوس کرنے والے بچوں کو خوش دلی سے یوں سمجھاتا کہ پھر انہیں رٹا لگانے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

یہی وجہ تھی کہ دن ہوتی یا رات محلے والے ان کے کسی بھی کام کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔ اور ہر ممکن طریقے سے ان کی کوشش ہوتی کہ کسی طرح شاہ زین یا اس کے گھر والوں کے کام آکر تالی دونوں ہاتھوں سے بجانے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆

فیرول پروگرام میں اب بس ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ سبھی آئٹم ڈیٹیلز ندرت کے پاس تھیں ماسوائے میران کے۔ ابھی تک اس نے کسی کو بھی اپنی پرفارمنس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس لیے سبھی اس سرپرائز کے منتظر بھی تھے۔ رات کے کھانے کے بعد ندرت اپنے کمرے میں آئی تو دھیان میران کے سرپرائز آئٹم سے ہوتا ان سرمئی آنکھوں میں گم ہو گیا، ایک بار پھر اسے اپنا جھاڑو لگانا اور شاہ زین کا گردن کی ہلکی سی جنبش سے منع کرنا یاد آیا تو جیسے ہلکی ہلکی ٹھنڈ کا

احساس اپنے اندر اترتا محسوس ہوا۔ یوں بھی شاہ زین کچھ بھی کہنے، سمجھانے کے لیے لفظوں سے زیادہ اپنی ساحر آنکھوں کا استعمال کرتا یا پھر وہ تھیں ہی اتنی پرکشش کہ ان بولتی آنکھوں کے سامنے ندرت کو اپنا دل ساکت ہوتا محسوس ہوتا اور کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔

چند ہی دنوں میں وہ اس کی آنکھوں کے تاثرات کو اس قدر سمجھنے لگی تھی کہ بعض اوقات کلاس میں بھی خاموش رہ کر کئی باتیں کرلی جاتیں۔

اس سے پہلے کہ وہ یونہی حسب سابق شاہ زین کے خیالوں میں ہی سو جاتی۔ موبائل فون پر ہوتی بیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''مان لیا بھئی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، آج اتنا دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے اور تمہیں دیکھنے کا۔'' فون پکڑتے ہی ندرت نے اپنے احساسات بیان کرنا ضروری سمجھے تھے۔

''بس دیکھ لیں اسی لیے تو میں نے فون کرلیا، چلیں دیکھ نہ سہی لیکن بات تو اب ہم کر ہی لیں گے۔''

آواز سنتے ہی جیسے ندرت پر بجلی گری تھی۔ دوسری طرف اکمل تھا جو بغیر حیران ہوئے اسی کے انداز میں بول رہا تھا۔

''اکمل تم۔۔۔؟''

''جی ہاں سو فیصد۔''

''وہ دراصل میں نے تمہیں ٹھیک سے دیکھا نہیں تھا۔'' وہ مکمل طور پر گڑبڑا چکی تھی کہ شاہ زین کے لیے کہے گئے الفاظ اکمل اپنے لیے سمجھ رہا تھا۔

''لگتا ہے آپ کا بہت زیادہ دل چاہ رہا ہے مجھے دیکھنے کا۔'' لہجے میں اب کے شوخی نمایاں تھی۔

''نہیں وہ۔۔۔''

''کیا خیال ہے آن لائن ہو جاؤں؟''

''نہیں نہیں، وہ میرا مطلب تھا میں نے موبائل ٹھیک سے نہیں دیکھا، میں سمجھی شاید کسی اور کا فون ہے۔''

''یعنی آپ کا کسی اور سے بھی بات کرنے کا موڈ ہو رہا تھا؟''

''مجھے چھوڑو، تم آج بڑے موڈ میں لگ رہے ہو اس دن تو دولہا بنے جھینپ رہے تھے۔'' اب تک ندرت کی تمام حسیات جاگ چکی تھیں جبھی پہلے کی طرح دوستانہ موڈ میں بولی۔

''ہاں اس دن پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے، لیکن پھر بعد میں، میں خود اپنی ہی حالت پر خوب ہنسا۔''

''اوہ! رئیلی؟''

''تو اور کیا میں نے سوچا کہ یار مرد بن، ابھی سے شوہر نہ بن۔'' اکمل نے بڑے جان دار قہقہے کے ساتھ بات مکمل کی تو ندرت بھی ہنسی میں اس کا ساتھ دینے لگی۔

''ندرت! مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔'' چند لمحے پہلے قہقہے لگاتا اکمل اب مکمل طور پر سنجیدہ تھا سو ندرت کی حیرت فطری تھی۔

''مجھ سے؟''

''جی آپ سے، اصولاً تو یہ بات مجھے عائشہ آپی سے کرنا چاہیے تھی لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟''

''لیکن آج کل ان کی سوچ کا انداز کچھ بدل گیا ہے۔ جبھی میں نے سوچا کہ۔۔۔ آپ اس وقت فارغ تو ہیں نا؟''

بات کرتے کرتے شاید وہ جھجک گیا تھا۔

''تمہارے کمرے کا وال کلاک کیا ٹائم بتا رہا ہے؟''

''سوا بارہ۔۔۔ لیکن کیوں؟'' اس کے بے تکے غیر متعلقہ سوال پر اکمل حیران ہوا تھا۔

''اس لیے کہ رات کے سوا بارہ بجے میں فارغ ہونے کے باوجود سونے میں مصروف ہوتی ہوں۔''

''اوہ! یعنی میں آپ کا ٹائم ضائع کر رہا ہوں۔''

''نہیں، اٹس اوکے، تم بولو۔''

''ایسے نہیں، پھر کبھی۔''

''چلو جیسے تمہاری مرضی۔''

''کچھ دن بعد میری چھٹی ختم ہو رہی ہے اور واپس جانے سے پہلے مجھے آپ سے بات کرنا ہے ویسے۔۔۔''

''اچھا بابا بات بھی ہو جائے گی، ابھی تو جائیں۔'' ندرت نے جمائی لیتے ہوئے کہا تو اکمل نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ مگر ندرت اس کے بعد کتنی ہی دیر اس کے بدلے ہوئے دوستانہ لہجے کے بارے میں سوچتی رہی۔

گو کہ وہ دونوں بہت زیادہ فرینک تھے۔ ندرت سے چھوٹا ہونے کے باوجود دونوں کی نیچر مل جانے کی وجہ سے ان کی دوستی بھی گہری تھی۔ وقفہ آیا تو تب جب اسے اپنی آرمی ٹریننگ کے لیے گھر سے دور جانا پڑا۔ اس دن دعوت پر جہاں ندرت اسے پہچان نہیں پائی تھی وہیں وہ بھی چند لمحوں کے لیے اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

دو سال پہلے کی باربی ڈول پہلے سے کہیں زیادہ معصوم اور شوخ ہو گئی تھی۔ بات چیت میں چھپی شرارت مگر انداز کی سادگی اس پر حد سے زیادہ پر اعتماد نظر آنے والی ندرت نے منٹوں میں اکمل کو خاموشی کی چادر اوڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اسی عمل پر اسے عائشہ سے کافی ڈانٹ بھی پڑی۔ خود اس کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ زیادہ تر وقت مسکراتا جا رہا ہے جس کی وجہ ندرت کے برجستہ جملے تو تھے ہی مگر اس کی خاموشی کی بڑی وجہ ناصر بھائی اور خصوصاً بڑوں کا وہاں موجود ہونا تھا۔

ندرت نے کروٹ بدل کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کو دیکھا۔ شاہ زین سے بات کرنے کی خواہش ایک بار جاگنے لگی تھی۔ مگر رات کے اس پہر دل کو محض تسلی کرنے اور موبائل چارجنگ پر لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگی کہ کانچ سی آنکھوں میں چھپے نازک سپنے جانے کب سے اعادے کے منتظر تھے۔

☆☆☆

''رات تم سے بات کرنے کا بہت دل چاہ رہا تھا۔'' کینٹین کے عین سامنے موجود سنگی بینچ پر بیٹھتے ہوئے شاہ زین نے ایک برگر ندرت کو پکڑایا اور دوسرا اپنے لیے کھولنے لگا، زبیر اور صبا کا حصہ اس نے شاپر میں ہی رہنے دیا تھا۔

''سچ میرا خود بہت دل چاہ رہا تھا ایک دفعہ تو میں نے تمہیں فون کرنے کا سوچا بھی لیکن رات بہت ہو گئی تھی نا اس لیے بس سوچ کر ہی رہ گئی۔''

ندرت نے اپنا برگر کھانے کی بجائے اس کے شروع کرنے کا انتظار کیا اور پھر اس کے ہاتھ سے لے کر کھانے لگی۔

''ندی۔۔۔!'' شاہ زین کا انداز تنبیہی تھا۔

''فکر نہ کرو، پہلے میں تمہارے ساتھ کھاؤں گی، پھر تم میرے ساتھ کھانا۔'' جواباً شاہ زین خاموشی سے بس اسے دیکھے گیا۔

"سمجھا کرو نا محبت بڑھتی ہے اس طرح کھانے سے۔"

ندرت نے سرگوشی کے انداز میں یوں کہا کہ شاہ زین بے اختیار اس کے معصومانہ انداز پر مسکرا دیا۔

"ویسے ایک بات ہے۔"

"ہاں بولو۔" ندرت نے اس کی باری پر برگر اب اسے پکڑا دیا تھا۔

"مجھے فون کرنے کے لیے تمہیں رات کا خیال تھا اور خود اتنی دیر سے کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"اس وقت؟ ہاں تب تو اکمل کا فون آیا ہوا تھا۔"

"اکمل کون؟"

شاہ زین نے آج اکمل کا نام پہلی مرتبہ سنا تھا اسی لیے تعارف چاہا مگر اسی وقت صبا اور زبیر بھی آ موجود ہوئے جو باقی تمام کی طرح ڈین کے سامنے انفرادی طور پر اپنے اسکٹ کا فارمیٹ بتا کر آئے تھے۔

"آئی ہیو آ نیوز ڈیئرز!"

صبا نے آتے ہی بینچ پر بیٹھ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"واٹ نیوز؟" ندرت نے برگر دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے خود کولڈ ڈرنک کا سپ لیا تھا۔

"یہ کہ فیرویل لنچ کے بجائے اب ڈنر ہوگا۔"

زبیر کے انکشاف پر وہ دونوں حیران رہ گئے۔

"کمال ہے انگلی پکڑانے پر ٹیچرز تو پورا ہاتھ تھامنے لگے ہیں بھئی۔"

"فکر نہ کرو، تمہارا ہاتھ تو کوئی قسمت والا ہی تھامے گا۔ یہ ٹیچرز بے چارے تو بس یونہی ہیں۔" صبا نے ندرت کے ردِعمل پر ہنس کر کہا جس کی تائید گردن ہلاتے زبیر نے بھی کی۔

"کوئی کا کیا مطلب ہے؟ لگتا ہے نزدیک کی نظر کمزور ہے تمہاری۔" ندرت نے شاہ زین کو دیکھتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

"اس کا بھی قصور نہیں ہے۔ دراصل اسے زبیر کے علاوہ کوئی اور نظر آ ہی نہیں سکتا۔ ہے نا؟"

"بات تو سچ ہے مگر۔۔۔" صبا نے شاہ زین کو جواب دینا چاہا مگر ندرت نے جملہ اچک لیا۔

"بات ہے رسوائی کی۔"

"میں بھی رسوائی تو کبھی نہ کہتی۔" صبا نے چند لمحوں کے لیے برگر سے توجہ ہٹائی۔

"ویسے رات کی فیرویل پارٹی میں لڑکیاں شاید آنا اوائڈ کریں۔"

"ارے یار کیا بات کرتے ہو۔" زبیر شاہ زین کی بات پر اس کے کندھے پر تھپکی مارتے ہوئے ہنسا۔

"لڑکیاں تو خوشی سے بے قابو ہیں اس اناؤنسمنٹ پر۔"

"تم تو آ جاؤ گی نا آسانی سے؟" اصل میں اسے فکر تو ندرت کی تھی کہ شاید واپسی پر دیر ہو جانے کے خیال سے وہ نہ آ پائے۔ ندرت نے کچھ دیر سوچتے ہوئے شاہ زین کے ہاتھ سے کولڈ ڈرنک لے کر ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور دوبارہ بوتل اسے تھما کر بولی۔

"آ تو جاؤں گی لیکن شاید ناصر بھائی اعتراض کریں۔"

"پھر تو مشکل ہو جائے گا نا۔"

"ارے تم پریشان نہ ہو، بابا ہیں نا وہ بات کر لیں گے۔"

"اگر گھر میں کوئی پرابلم ہو تو بے شک نہ آنا، میں ہینڈل کر لوں گا سب۔"

"کمال ہے بھئی سارا انتظام اس نے کیا ہے، بھاگ دوڑ اسی کی ہے اور یہ نہ آئے۔۔۔" صبا کو شاہ زین کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

یہاں تین گھنٹے کی پارٹی کے لیے گھر میں تین دن کا تناؤ پیدا کرنا بھی تو عقل مندی نہیں ہے۔

"ایکسکیوز می۔۔۔! ایک بات کرنی تھی۔"

(باقی آئندہ)

فاخرہ گل

میرے ہمسفر کو خبر کرو

۲ دوسری قسط

یہ فزا تھی جو ٹیچرز پر ایک پیروڈی سونگ میں پرفارم کرنے والی تھی۔

"ہاں بولو۔" چاروں کا دھیان اب فزا کی طرف تھا۔

"وہ یار سوری میں کل پیروڈی نہیں کر پاؤں گی۔"

"نہیں کر پاؤں گی سے کیا مطلب؟" زبیر کا لہجہ سخت گیر تھا۔

"دراصل میں بہت شرمندہ ہوں لیکن رات کے وقت مجھے گھر سے اجازت نہیں ملے گی آنے کی۔"

تینوں نے باری باری شاہ زین کی طرف دیکھا تھا۔

"دوپہر ہوتی تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن۔۔۔"

"اچھا اچھا جاؤ، ندی تم خود کر لینا ہلکا پھلکا سا ڈانس ہی تو ہے اور سکھایا بھی تم نے ہی تھا۔" صبا نے فوری حل پیش کیا تو فزا مشکور نظروں سے دیکھتی واپس چلی گئی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے میں کر لوں گی۔ کسی اور کو سکھانے کا اب ٹائم بھی تو نہیں بچا۔" بات کرتے کرتے اسے شاہ زین کی نظروں کا ارتکاز ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو قریب بیٹھا شاہ زین بہت دور محسوس ہونے لگا۔

بولتی آنکھیں اب مکمل سکوت کی لپیٹ میں تھیں۔ بنا لفظوں کے وہ اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن کیا۔۔۔؟

ندرت نے ابرو چڑھاتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے پوچھا۔

"کیا اس پیروڈی کے بغیر پارٹی نہیں ہو سکتی؟" شاہ زین نے براہ راست لفظوں کا سہارا لیا تھا۔

"ہو سکتی ہے، کیوں؟"

"تو پھر اس کے بغیر ہی ہو گی، تم کوئی ڈانس وانس نہیں کرو گی سب کے سامنے۔"

نا صرف لہجہ اٹل تھا بلکہ انداز بھی۔

اس سے پہلے کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی اسے کنوینس کرنے کے لیے کچھ بھی کہتا، شاہ زین فوراً وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

آج صبح جاگتے ہی ندرت کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ آج کل یونیورسٹی میں بہت زیادہ مصروف ہو جانے کی وجہ سے کتنے دن ہوئے اس نے امی اور بابا کے ساتھ وہ پہلے جیسا وقت نہیں گزارا۔

کافی دن ہوئے اس نے بابا کے ساتھ ملکی و غیر ملکی سیاسی اور معاشی صورت حال پر بے لاگ تبصرہ کیا، نہ ہی امی سے جان بوجھ کر ان کے ماضی کی خوش گوار یادوں کو کریدا، نہ اپنے بارے میں بہت کچھ ان سے شیئر کر پائی اور نہ ہی ناصر بھائی کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلا اور تو اور ثروت آپا کے ننھے منے بیٹے کی غوں غاں سننے کے لیے ایک فون تک نہیں کر سکی۔

وہ تو ویسے اپنے شوہر کے ساتھ ہر دوسرے روز چکر لگا لیا کرتیں لیکن تب ندرت یونیورسٹی میں ہوتی اس لیے ملاقات نہ ہو پاتی۔

اور یہ ساری مصروفیت اس پروگرام کی وجہ سے تھیں جو بڑھتے بڑھتے اب ڈنر تک جا پہنچا تھا۔

ورنہ عام دنوں میں وہ کوشش کرتی کہ عائشہ کی گھر کے کاموں میں ضرور ہیلپ کروا دیا کرے۔ باوجود اس کے کہ ناصر بھائی کو اس کا یوں گھر میں کام کرنا پسند نہیں تھا کہ ان کے خیال میں یونیورسٹی سے اتنا تھک ہار کر آنے کے بعد گھر میں کام کاج کرنے کا کہنا ندرت کے ساتھ زیادتی تھی وہ بھی اس صورت میں

مکمل ناول



جب عائشہ سارادن گھر میں موجود بھی ہو۔

مگران سب کے باوجود وہ عائشہ کی ہیلپ ضرور کرواتی اور وہ بھی اس طرح کہ ناصر بھائی کو قطعاً علم نہ ہوا کرتا۔

لیکن حیرت تھی کہ پھر بھی جانے کیوں ندرت کو سامنے دیکھتے ہوئے عائشہ کے دل میں اکثر اوقات جلن ہی کا جذبہ سر اٹھاتا۔ اس کے برعکس ثروت آپا سے ان کی بہت اچھی بنتی تھی۔ ندرت سے شاید انہیں ایک مقابلہ کا سا احساس رہتا تھا۔ آخر کو وہ خوش شکل، خوش اندام اور خوش ادا بھی تھی۔ اس پر پہننے اوڑھنے کا شوق بھی تھا اور سلیقہ بھی۔ زندگی کو زندہ دلی سے گزارنے کی قائل تھی۔ اس نے بھی عائشہ کے کسی بھی معاملے میں بے جا مداخلت کی تھی اور نہ کسی بھی معاملے میں عائشہ کی اہمیت کم ہونے دی تھی۔

اور انہی باتوں کا احساس آج اسے آنکھ کھلتے ہی ہوا تو حسب معمول سب سے پہلے سائیڈ ٹیبل پر رکھے اپنے موبائل کو اٹھایا جہاں ہمیشہ کی طرح شاہ زین کا میسج اس کا انتظار کر رہا تھا۔

تمہیں کوئی اور دیکھے جلتا ہے دل
بڑی مشکلوں سے پھر، سنبھلتا ہے دل
کیا کیا جتن کرتے ہیں تمہیں کیا پتا
یہ دل بے قرار کتنا یہ ہم نہیں جانتے
مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا
ہمیں تم سے پیار کتنا۔۔۔

گزشتہ روز کے اپنے رویے کو شاہ زین نے بڑی خوب صورتی سے کشور کمار کے گیت کا سہارا لیتے ہوئے واضح کیا تو وہ بے اختیار مسکرادی۔ اور جواب لکھتے ہوئے چند لمحے سوچتے ہوئے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں صبح کی اوائل ٹھنڈی ٹھنڈی اور نرم ہوا کا ہلکا ہلکا لمس پھول پتوں کو گدگدائے دے رہا تھا۔

مجھے محسوس کر کے سوچتی ہوں
میں زندہ تھی کہ اب زندہ ہوئی ہوں

مسکراتے لبوں کے ساتھ نازک انگلیاں حرکت میں آئیں جواب سینڈ کرنے کے بعد بجلی کی سی برق رفتاری سے وہ واش روم گئی اور اسی رفتار سے باہر لا
میں جا پہنچی۔ جہاں بابا کے آسٹریلوی توتوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا کچھ دیر وا کر
کرنے کے بعد وہ ان کے پاس جا پہنچی۔ بابا نے ہمیشہ کی طرح پنجرہ بے حد صاف کر رکھا تھا۔ سو کچھ دیر توتوں کے لاڈ اٹھانے کے بعد امی کے پاس آ
جنہوں نے قرآن پاک بند کرتے ہوئے اس
پھونک ماری اور بس۔

برق رفتاری سے گھر کی صفائی ستھرائی جو شروع کی تو جالے تک اتار دیے۔ اپنے اور امی کے کمرے کی بیڈ شیٹس تبدیل کیں۔ اور بڑے مزے سے چہکتے ہوئے ان کی دوائیوں والی دراز بھی سیٹ کر دی۔

یوں بھی وہ اکثر اوقات صبح سویرے ہی اٹھنے کی عادی تھی کہ شروع سے امی، بابا نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال رکھی تھی کہ صبح جلدی اٹھنے والے کے کام اس کے پیچھے یعنی اختیار میں رہتے ہیں اور اسے کاموں کے پیچھے نہیں بھاگنا پڑتا، جبکہ اس کے برعکس دیر سے اٹھنے والا کاموں کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہے اور کام پھر بھی اس کے بس میں نہیں ہوتے اسی لیے بچپن سے اب تک صبح سویرے جاگ جانے کی اس کی عادت بے حد پختہ تھی۔

عائشہ ابھی اپنے کمرے میں ہی تھی جبھی ندرت کچن میں جا کر امی، بابا کے لیے گرما گرم چائے بنا لائی تھی۔ ساتھ ہلکے سینکے ہوئے چند ٹوسٹ بھی تھے۔ خود اس کے لیے تو چائے شجر ممنوعہ تھی اس لیے اپنے لیے ناشتا لینے کے لیے اسے پہلے چند لمحے تو فریج کا دروازہ کھول کر کھڑا رہنا پڑا تھا۔ ایک طرف مختلف قسم کے جام، مارملیٹ اور مایونیز کی مختلف شیشیوں کے ساتھ اس کا من پسند پائن ایپل اور کوکونٹ کا مکس جوس رکھا تھا۔ سو اپنے لیے اس نے ٹرے میں مایونیز بوائل ایگ اور جوس رکھا اور حسب عادت گنگناتے ہوئے امی کے کمرے تک جا پہنچی۔ ٹی ٹیبل پر ٹرے رکھنے کے بعد شاہی کنیزوں سا انداز اپناتے ہوئے بولی۔

"ملکہ عالیہ! اور جہاں پناہ!، اہتمام طعام آپ کا
حاضر ہے۔"

اس معصومانہ انداز پر بابا کو بے اختیار اس پر پیار آیا تھا۔ سو فوراً اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

"خدا میری شہزادی کو ہمیشہ خوش رکھے۔" بابا کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی تھی۔

خود امی بھی اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتیں اور آج جس طرح وہ یہاں سے وہاں مسکراتی، گنگناتی، چہکتی پھر رہی تھی تو وہ بھی اس کے لیے ہر قسم کی نظر بد سے بچنے کی دعا کر رہی تھیں، کہ خدا اسے حاسدوں کے حسد، شیطان کے شر، دشمن کے وار، نظر بد اور نیت بد سے بچا کر اپنی پناہ میں رکھے۔

"یارب اس کی آنکھ کی رونق
ہونٹ کی شوخی
تن کا جوبن
یارب اس کی آنکھ کا کاجل
گال کی سرخی
دل کی دھڑکن
یارب اس کے من کی خوشیاں
دل کی چاہت
روح کی راحت
اس کے سارے رشتے ناتے
سنگی ساتھی دوست وہ سارے
اس کے گھر کے پیڑ کے پتے
قدموں سے مس ہوتے ذرے
اس سے جڑی ہر شے ہر رشتہ
ہر لمحہ ہر گیت ہر نغمہ
اس کے سکھ کا ہر اک موسم
یارب سدا سلامت رکھنا۔"

امی بابا کو اپنے ہاتھوں سے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے خود ندرت نے بھی یہ وقت امر ہو جانے کی دعا کی تھی لیکن۔۔۔ وقت بھی کبھی ٹھہرا ہے بھلا!

☆☆☆

آج خلاف توقع ناصر بھائی گھر پر تھے
سب شام کی چائے
سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ناصر کیوں کہ اتوار کے علاوہ شاذ و نادر ہی اس وقت گھر پر ہوتے سو آج عائشہ نے چائے کے ساتھ کافی اہتمام کر ڈالا تھا۔ نا صرف یہ بلکہ سب کا موڈ خوش گوار جان کر ندرت کی شادی کی بات بھی چھیڑ ڈالی۔ جس نے امی اور بابا دونوں کو حیران کر ڈالا۔ البتہ ناصر کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بات ان دونوں کے درمیان پہلے بھی ڈسکس ہو چکی ہے۔

"بیٹا! ابھی تو اس کی پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی اور عمر بھی ابھی اتنی نہیں ہے۔" بابا کی نظروں نے بھی امی کی بات کی تائید کی تھی۔

"پڑھائی کا کیا ہے دو نہیں تو چار مہینوں میں ختم ہو جائے گی اور شادی کون سا کل کر رہے ہیں۔"

"کہتی تو عائشہ ٹھیک ہے اور جہاں تک عمر کی بات ہے تو ثروت اور خود عائشہ کی بھی تقریباً اسی ایج میں شادی ہوئی تھی۔"

عائشہ یقیناً ناصر کے سامنے رستہ ہموار کر چکی تھی جبھی اس کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی۔

"چلو دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں کچھ اس بارے میں بھی۔" بابا نے بات بدلنا چاہی۔

"سوچنا بھی کیا بابا، رشتہ تو گھر میں ہی موجود ہے آپ جب کہیں گے امی لوگ آجائیں گے۔" عائشہ کی بات پر امی اور بابا دونوں چونکے تھے۔ جو شاید ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی۔

"ماشاء اللہ اکمل کی ٹریننگ ختم ہونے والی ہے اس لیے ہم سوچ رہے تھے کہ۔۔۔" بات کرتے کرتے سامنے گیٹ سے ندرت اندر آتی دکھائی دی تو عائشہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

☆☆☆

عشا کی نماز کی ادائیگی کچھ تاخیر سے کرنا عرصہ دراز سے امی کا معمول رہا تھا۔ جس کی بنیادی وجہ رات کے کھانے کے بعد سب کا امی بابا کے کمرے

میں اکٹھا ہو کر گپ شپ کرتا تھی۔ یوں بھی رات کے کھانے کا کوئی مقررہ وقت تو تھا نہیں کہ یہ سب ناصر بھائی کے آفس سے واپس آنے پر منحصر ہوا کرتا۔

دوپہر کے کھانے کے اوقات میں ندرت اکثر و بیشتر یونیورسٹی میں ہوتی اور ناصر بھائی آفس۔ اس لیے رات کے کھانے میں سب کی موجودگی یقینی بنانے کے لیے اس وقت تک انتظار کیا جاتا جب تک ناصر بھائی آفس سے واپس نہ آجاتے اور ان کی جاب بھی بھی کچھ ایسی کہ گھر واپسی کا وقت مخصوص نہ تھا۔ جلدی آنے کا تو خیر تصور محال ہی تھا مگر کئی دفعہ دیر ہونا معمول بنتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی پرائیویٹ اداروں کے لیے تو مثل مشہور ہے کہ لیموں کی طرح ورکرز کو نچوڑ کر کام لیا جاتا ہے۔ بس اسی لیے ان کا دیر سے آنا بھی معمولات میں سے تھا۔ اور پھر جب وہ گھر پر آتے گرما گرم پھلکے نما روٹیاں اسی وقت تازہ تازہ توے سے اترا کرتیں کہ ہاٹ پاٹ کی رکھی روٹیاں نہ تو ناصر بھائی کو پسند تھیں اور نہ ہی ندرت کے حلق سے اترتیں جبھی گھر سے دس پندرہ منٹ کی دوری پر ناصر بھائی ہمیشہ سے ایک مس کال کر کے اپنی آمد کے بارے میں مطلع کر دیا کرتے۔ نتیجتاً ان کے آنے تک گرما گرم روٹیاں بھی تیار ہوتیں اور سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتے۔

چائے کا دور البتہ امی، بابا کے کمرے میں چلتا۔۔۔

ابھی کچھ دیر پہلے عائشہ، ناصر بھائی اور ندرت کمرے سے اٹھ کر گئے تو امی نے باتھ روم جا کر وضو کا اہتمام کیا اور ادائیگی نماز کے لیے جائے نماز سنبھالے کمرے کی بائیں سمت دیوار کے ساتھ قبلہ رخ کیے خالقِ حقیقی کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سر کو جھکا دیا۔

بابا چوں کہ نماز باجماعت پڑھا کرتے تھے اس لیے بیڈ کی کراؤن سے ٹیک لگا کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

''کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

نماز سے فراغت کے بعد جائے نماز لپیٹتے ہوئے امی نے بابا کو کتاب کے سرورق پر نظریں جمائے گہری سوچ میں گم پایا تو پوچھا۔

''اوں۔۔۔ ہوں۔'' بابا نے چونک کر امی کو دیکھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کتاب کے عنوان پر انگشتِ شہادت پھیرنے لگے۔

امی نے ہاتھ میں پکڑی جائے نماز الماری کے اندر رکھی اور سب سے اوپری شیلف میں قرآن پاک کے قریب رکھے سلور رنگ کے چمک دار ڈبے سے سبز موتیوں کی تسبیح ہاتھ میں لے کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''ندرت کے بارے میں سوچ رہے ہیں نا؟''

آخر تیس سالہ بے مثال رفاقت تھی، جبھی اُن کے بغیر بتائے سمجھ گئی تھیں کہ اُن کی خاموشی کی وجہ کیا ہے۔

''ہاں۔۔۔'' بابا نے کتاب سائیڈ پر رکھی اور چشمہ اتار کر کتاب کے اوپر رکھ دیا۔

''سوچ رہا تھا کہ آج عائشہ نے ندرت اور اکمل کے بارے میں بات تو پہلی مرتبہ کی ہے لیکن۔۔۔ ناصر اور اُس کی باتوں سے کیا تمہیں ایسا نہیں لگا جیسے۔۔۔ جیسے اپنے تئیں وہ یہ سب طے کیے بیٹھے ہیں۔'' لفظوں کے بھیس میں خدشات بول رہے تھے۔

''لہجوں اور رویوں کو بھلا آپ سے بڑھ کر کون پرکھ سکتا ہے۔'' امی مسکرائیں مگر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید گویا ہوئیں۔

''محسوس تو مجھے بھی یہی ہوا تھا جیسے عائشہ محض ہمیں اطلاع دینا چاہ رہی ہے، لیکن آپ خود سوچیں، فرض کیا کہ ندی اور اکمل کی شادی ہو بھی جاتی ہے تو اس میں بُرا کیا ہے؟'' بابا نے اپنی سوچتی نظریں امی کے چہرے پر مرکوز کیں۔

''آخر ہمیں تو ندرت کی شادی کرنی ہے نا۔۔۔ اور پھر اکمل میں مجھے تو ایسی کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ ہاں عمر میں ہماری ندی سے چھوٹا ضرور ہے، لیکن یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔'' امی نے بھی گویا

اکمل کے حق میں اپنا ووٹ دیا تھا۔

''اور ندرت۔۔۔؟'' بابا ابھی تک مطمئن دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

''ہاں اگر ندرت کی مرضی نہ ہو تو میں ضرور اس رشتے کی مخالفت کروں گی کیوں کہ ندرت کی مرضی بہرحال ہمارے لیے زیادہ اہم ہے۔''

''ہوں۔۔۔'' انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے آنکھوں کو دباتے ہوئے بابا نے گردن کو اثبات میں ہلکی سی جنبش دی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔

''مانا کہ اللہ نے مجھے تین دفعہ اولاد کی نعمت سے نوازا ہے۔ ثروت، ناصر اور ندرت، لیکن یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے لیے ندرت سے بڑھ کر اس دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میری جان، میرا مان۔۔۔ ندرت میری سب سے چھوٹی بیٹی سہی مگر۔۔۔ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ تم اس کی ماں ہو، ہمیشہ اس کے لیے بہترین ہی سوچو گی نا۔۔۔ لیکن پھر بھی خیال رکھنا جس طرح بھی جادوگر کی جان توتے میں بتائی جاتی تھی اسی طرح میری جان ندرت کی خوشی میں ہے اور اگر کبھی کسی بھی وجہ سے اس کے شاداب چہرے پر اُداسی اتری یا اس کی چمکدار آنکھیں آنسوؤں سے بھریں تو۔۔۔ تو میں جی نہیں پاؤں گا۔''

بابا نے کوشش تو کی تھی کہ گلوگیر لہجے میں ہی سہی اپنی بات مکمل کر پاتیں مگر ایسا ہو نہیں سکا تھا اور بالآخر ان کا گلا رندھ گیا۔

اور مرد ہونے کے باوجود ضبط کی کوشش میں ناکامی کے بعد آخر وہ رو دیے۔

باپ اور بیٹی کا رشتہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ بے مثال اور بھرپور محبت کی چاشنی سے گندھا۔۔۔

جب سے شام کو عائشہ نے ندرت کی شادی کی بات کی تھی اس کی رخصتی کے خیال سے ہی بابا کا دل بھر آیا تھا۔

کہ یہ مرحلہ والدین کی زندگی کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ جب اتنے سالوں لاڈ پیار سے پالنے اور کانچ کی طرح سینت سینت کر رکھنے کے بعد اپنے جسم کا سب سے نازک اور حساس حصہ حالات اور نصیب کے حوالے کر کے خود حالات خوش گوار اور نصیب اچھا ہونے کی دعاؤں میں لگ جاتے ہیں۔

جب کہ دوسری طرف ایک مناسب عمر میں اولاد زندگی کے نئے سفر میں قدم رکھ دے تو بلاشبہ اسے بھی والدین کی خوش قسمتی ہی تصور کیا جاتا ہے۔

امی نے اٹھ کر انہیں پانی دیا تو جیسے ان کے آنسوؤں میں ٹھہراؤ سا آگیا۔

خود اُن کا اپنا دل بھر آیا تھا، لیکن وہ بھی رو کر انہیں مزید کمزور نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یوں بھی شادی تو ثروت کی بھی ہوئی تھی مگر بابا کی یہ کیفیت تب بھی نہیں تھی مگر آج۔۔۔ اپنی ازدواجی زندگی کے تیس سالوں میں امی نے آج دوسری مرتبہ انہیں یوں بچوں کی طرح روتے دیکھا تھا۔

پہلی مرتبہ وہ اپنی والدہ کی وفات پہ یوں روئے تھے اور یا پھر اب۔۔۔

''اتنا سارا ابھی رو لیں گے تو ندی کی رخصتی پر کیا کریں گے؟''

امی نے کمرے کی فضا میں آہستگی سے پھیلنے والے بوجھل پن کو کم کرنا چاہا۔

''رخصتی پر میرے حصے کا بھی تم رو لینا، یوں بھی میرے ہر کام میں تو ففٹی پرسنٹ کا حصہ ڈالتی ہی ہو نا۔''

اُن کی بات پر امی مسکرا دی تھیں۔

''چلیں ٹھیک ہے۔ طے پا گیا کہ ندی کی رخصتی پر آپ کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں گرے گا۔۔۔ یہ ذمہ داری میری۔۔۔''

امی کی بات پر بابا بھی سر ہلا کر مسکرا دیے تھے۔

☆☆☆

آج ندرت بہت تھک گئی تھی اسی لیے کھانا کھانے کے بعد فوراً بیڈ پر لیٹ گئی کہ اس کا ارادہ آج

جلدی سونے کا تھا مگر ہوا اس کے برعکس، وہ اس لیے کہ ہمیشہ کی طرح لیٹتے ہی دو سرمئی آنکھیں بڑے والہانہ انداز میں دیکھتی ذہن کے پردے میں آنمودار ہوئیں۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد اُن ساحر آنکھوں کا والہانہ پن سکوت میں بدلنے لگا۔ ندرت نے آنکھیں کھول دیں۔

ایک ایک کر کے بہت سی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔

جب بھی آتی ہے تیری یاد مجھے سوتے میں
اک چنبیلی سی بکھر جاتی ہے چاروں جانب

موبائل کی ہلکی سبز اسکرین کے ذریعے اسے شاہ زین کا میسج ملا تھا۔ یعنی اتنی رات گئے وہ بھی جاگ رہا تھا۔ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ندرت نے اس کا میسج پڑھا اور سپید مخروطی انگلیاں اس کا جواب ٹائپ کرنے لگیں۔

چاروں جانب ہے میرے سرمئی آنکھوں کا حصار
سونا چاہوں بھی تو نظریں مجھیں سونے دیتیں

میسج بھیجنے کے بعد اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتی بجتے موبائل نے ایک بار پھر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"ہاں شاہ جی کیا حال ہیں؟" رات کے پچھلے پہر نرم ہوا کا جھونکا کھلی کھڑکی سے اُسے مہکا گیا تھا۔

"ارے یار میں تو ایک عام سا بندہ ہوں شاہ نہ کہا کرو۔" دوسری جانب شاہ زین تھا۔

"میرے لیے تو ساری دنیا سے بڑھ کر خاص ہو تو میں جو بھی کہوں۔"

"ہاں کچھ بھی کہہ لیا کرو لیکن شاہ نہیں، یہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا۔"

"تم صرف میرے ہو نا شاہ ہو؟"

"بالکل سو فیصد۔" لفظوں سے کہیں بڑھ کر اس کے لہجے نے تجدید کی تھی۔

"تو بس پھر میں تمہیں کچھ بھی کہہ کر مخاطب کروں منع مت کیا کرو۔"

"اوئے پاگل منع صرف اس لیے کرتا ہوں کہ یہ طرزِ تخاطب تم سید لوگوں کے جلیے ہی بجتا ہے۔"

"لیکن تم بھی تو شاہ کی آن ہو۔" وہ بھی ہارنے والی نہیں تھی۔

"اچھا بابا جو مرضی ہے کہو لیکن یہ بتاؤ ابھی تک جاگ رہی تھیں، کیوں؟"

"تم سونے جو نہیں دیتے۔" دوسری طرف سے بڑا اِٹھلا کر جواب آیا تھا۔ جس پر شاہ زین ہنس دیا تھا۔ جان بوجھ کر بات کو دوسری طرف موڑنا چاہا۔

"یار میں کوئی مچھر ہوں جو تمہیں سونے نہیں دیتا۔"

"تو اور کیا، یونیورسٹی میں بھی مجھ پر غصہ کرتے رہتے ہو اور گھر میں بھی خیالوں میں آ آ کر رعب جھاڑتے ہو۔"

"آج تمہیں برا لگا نا؟"

"بُرا تو نہیں لگا لیکن ہاں کچھ عجیب ضرور محسوس ہوا تھا۔"

"پتا ہے ندی۔۔۔!" چند لمحے دونوں کے بیچ خاموش رہی۔ یقیناً وہ لفظوں کا چناؤ کر رہا تھا۔

"شاید تم مجھے تنگ نظر یا Narrow minded سمجھو لیکن صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم ڈیپارٹمنٹ کے تمام لڑکوں کے سامنے معمولی سا ہی سہی لیکن ڈانس کرو۔ وہ تمہیں سراہیں یا ہوٹنگ کریں، کسی بھی صورت یہ بات میرے لیے قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی۔۔۔ تمہیں نہیں پتا ندی یہ لڑکے اور خصوصاً میران جیسے لڑکے، لڑکیوں کے لیے کیسے کیسے کمنٹس پاس کرتے ہیں۔۔۔ بس میں تمہیں سب کی نظروں سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں اور بس۔"

شاہ زین کی اِن باتوں سے ندرت کے دل میں اس کی قدر و منزلت کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

"اُس دن میں نے تمہیں جھاڑو لگانے سے بھی منع کیا کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی تم پر کوئی جملہ پھینکے اور ویسے۔۔۔" شاہ زین ایک بار پھر رُک کر شاید کچھ سوچ رہا تھا۔

"تم نے کبھی چینی کے سفید سفید برتن دیکھے ہیں؟"

"ہاں بہت دفعہ، لیکن یہاں اُن کا ذکر کہاں آ گیا۔"

"اس لیے کہ تمہارے ہاتھ چینی کے اُن برتنوں سے کہیں بڑھ کر سفید اور بے داغ ہیں اور یہ جھاڑو پکڑنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف میرا ہاتھ پکڑ کر بہت دور تک چلنے کے لیے بنائے گئے ہیں، سمجھیں؟"

"بہت اچھی طرح سرکار۔۔۔ بلکہ سرتاج!" شاہ زین کے سامنے اُس نے کبھی بھی زبان پر فلٹر استعمال نہیں کیا تھا، جو من میں آتا بول دیتی۔

"میرا خیال ہے ابھی کار ہی رہنے دو، جب سر کو تاج نصیب ہوا تو پھر یہ کہنا۔"

"شاہو۔۔۔! کیوں رہتے ہو اتنے محتاط؟" لہجے میں ایک دم ٹھہراؤ آیا تھا۔

"تمہارے جذبوں کی شدت سے ڈر جاتا ہوں نا، اس لیے۔"

"تم کیا ڈرو گے، ڈر تو اب مجھے لگ رہا ہے۔"

"خیریت؟ کیا ہوا؟" وہ اس کی آواز کے تاثرات محسوس کر کے گھبرا گیا تھا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھو، فجر ہونے والی ہے اور بھابھی شاید کچن میں پانی پینے آئی ہیں۔"

"تو تم کچن میں ہو؟" شاہ زین نے جان بوجھ کر ایسا سوال کیا کہ وہ ریلیکس ہو جائے۔

"یار میں تو کچن میں نہیں ہوں لیکن بھابھی لائٹ آن دیکھ کر چند ہی لمحوں بعد میرے روم میں ہوں گی۔" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر شام کو ملاقات ہوگی۔"

"سنو۔۔۔!"

"ہاں بولو۔"

"تمہارا مجھ پر مکمل اختیار ہے۔ جس چیز سے چاہو، رعب جما کر منع کر دیا کرو، تمہارا جتانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا؟ تو پھر دیکھو یاد رکھنا اپنے الفاظ۔۔۔ مکر نہ جانا۔۔۔"

"اِک واری کہہ جو دِتا رے سوہنیا۔۔۔"

ندی کے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"اور جناب صرف یہی نہیں بلکہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ آج مجھے شام کو بلیک کلر پہننا ہے کیوں کہ تمہارا فیورٹ ہے، ہے نا؟"

"واہ بھئی! تمہاری یادداشت کی تو داد دینی پڑے گی۔"

"داد کو چھوڑو اور میری فریاد سنو کہ اس سے پہلے کہ بھابھی کمرے میں آ کر لائٹ بند کریں تم فون بند کر دو۔"

"اوکے اوکے، ٹیک کیئر، ہاں، اللہ حافظ۔"

"یو ٹو اینڈ لو یو۔۔۔ اللہ حافظ۔"

آخری جملہ سرگوشی نما انداز میں کہتے ہوئے ندرت نے فون بند کیا تو دونوں جانب لبوں پر ایک مسحور کن مسکراہٹ کھل رہی تھی۔

انہی خیالوں میں ندرت نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی، فجر کا وقت تھا اس لیے سونا بے معنی تھا کہ اب سے کچھ دیر کے بعد یونہی اس کی آنکھ کھل جاتی تھی کہ یہ وقت وہ اکثر اوقات اپنے چھوٹے مگر خوش نما پھول، پودوں سے سجے لان میں گزارا کرتی۔ جہاں آسٹریلین طوطے یہاں سے وہاں پھدک کر اُس کا استقبال کرتے تو وہ بھی courtesy میں اُن کا پنجرہ وغیرہ صاف کر کے ننھی ننھی کٹوریوں میں تازہ پانی ڈالتی اور ساتھ رکھی گول مٹول ڈبیوں میں خوراک ڈال کر وہیں چہل قدمی کرنے لگتی۔

جبھی اس وقت دوبارہ لیٹنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اُس نے کھڑکی سے ذرا سا ہٹ کر ہوئے گلابی پردوں کو مکمل طور پر ہٹا کر کھڑکی کھول ڈالی۔

تازہ، نرم اور ٹھنڈی سبک خرام ہوا نے اُسے بے اختیار اپنے گرد بازو لپیٹنے پر مجبور کیا تھا۔ باوجود اس کے کہ ابھی سورج کی پہلی کرن کے زمین کو چھونے میں وقت تھا مگر مین گیٹ پر لگی ٹیوب لائٹ کی دودھیا

روشنی سے سارالان گویانور میں نہاتا محسوس ہورہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے عموماً چاندنی راتوں میں ہوا کرتا ہے۔

کھلی کھڑکی پر کہنیاں ٹکائے پنک ٹراؤزر، شرٹ میں ملبوس باربی ڈول سی ندرت اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ لائٹ آن دیکھ کر عائشہ کچن میں جانے سے پہلے اُس کے کمرے کی طرف سے گزرتے ہوئے اندر سے آتی آوازوں پر ٹھٹک کر باہر ہی رک گئی تھی اور ندرت کی طرف سے ادا کردہ آخری جملہ تو جیسے عائشہ کو جھنجوڑ کر رکھ گیا تھا۔

یعنی پہلے دو تین مرتبہ جس چیز کو اس نے اپنا وہم سمجھ کر ناصر کے سامنے انتہائی نرم اور مناسب لفظوں سے بیان کرنے کے باوجود اُن سے برہمی کا ہی اظہار سنا تھا وہ وہم نہیں حقیقت تھی۔

مگر اب تو وہم سمجھنے کی کوئی گنجائش باقی تھی ہی نہیں۔ تو ناصر کو کیسے بتایا جائے یہ بات اب عائشہ کے لیے بے حد اہم تھی۔

ایک تو اکمل کی جگہ کسی اور سے ندرت کا اس طرح بات کرنا اور پھر وہ ندرت جس کی وجہ سے اُسے کبھی بھی سسرال میں خودمختاری میسر نہیں آئی تھی کہ عائشہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو سسرال میں تن تنہا حکومت کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ ساس، سسر، نندیں، دیور سب اُن کی بات کو حکم کا درجہ دیتے ہوئے مانیں اور خود انہیں مشورہ تک دینے کی زحمت گوارا نہ کریں۔

یہ تھا ایک آئیڈیل سسرال کا بنیادی خاکہ جو عائشہ کے ذہن میں تھا۔

مگر یہاں حالات قدرے مختلف تھے کہ ساس سسر کی عزت بھی ماں باپ کی طرح کرنی ''پڑتی'' اور چھوٹی نند یعنی ندرت کو بھی بہنوں سا پیار دینے کی واضح ہدایات ملتیں۔ اس سب کے باوجود عائشہ کا بڑی بہو کا رتبہ اپنی جگہ معتبر تھا۔

کہ امی اور بابا یا ناصر ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو ایک رشتے میں مٹھاس برقرار رکھنے کی خاطر دوسرے رشتوں میں آہستہ آہستہ گھلتی کڑواہٹ کی پروا نہ کرتے۔ عائشہ کو ہر جگہ، ہر موقع پر اہمیت دی جاتی لیکن ہاں تن تنہا حکومت کا خواب ابھی اس کا پورا نہ ہوا تھا۔

اور پھر پتھر پر بھی پانی پڑتا رہے تو سیانے کہتے ہیں اس میں سوراخ ہو جاتا ہے تو پھر کہاں ایک انسانی دل۔

جبھی عائشہ نے ایک بار پھر کچھ سنی اور کچھ بُنی ناصر تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اب کی بار وہ الفاظوں کو پُراثر اور قابلِ یقین بنانے کے لیے ذہن میں کہانی کا پلاٹ تیار کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی کہ آج ناصر کو بھی جلدی جو جگانا تھا۔

☆☆☆

''جاگ بھی جائیں، صبح ہوگئی ہے۔۔۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔''

کروٹ کے بل لیٹے شاہ زین نے ایک چیخ نما آواز اپنے قریب سے ہی آتی محسوس کی تو پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

ثمینہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس کے کان پر جھکی ننھے سے منہ سے بھونپو نما آواز نکال رہی تھی۔ جبھی کہنیوں پر وزن ڈالتے ہوئے لمحہ بھر کی تاخیر کیے بنا اسے اٹھتے ہی بنی۔

''تم ٹھیک تو ہو۔ اگر میرے کان کا پردہ پھٹ جاتا تو۔۔۔''

''تو کیا، اماں سلائی مشین رکھے بیٹھی ہیں، چٹ پھٹتا، پٹ سلتا۔۔۔''

''تمہیں تو میں ابھی پوچھتا ہوں۔''

یونہی اسے ڈرانے کے لیے شاہ زین اُس کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ وہ حقیقتاً ڈر کر کمرے سے بھاگ گئی۔

کچھ عرصے پہلے اس گھر کے در و دیوار اس طرح کی شرارتوں اور قہقہوں سے قطعی ناواقف تھے مگر اب بات کچھ اور تھی۔ چھوٹی موٹی شرارتیں، شاہ زین اور ثمینہ کی پیار بھری نوک جھوک اور اُن دونوں کی خوشیوں میں خوش اماں کا شفقت بھرا مسکراتا

چہرہ۔۔۔ سب کچھ کتنا مکمل لگنے لگا تھا اب!

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے شاہ زین نے ایک بار پھر آنکھیں موند لی تھیں۔

مگر یہ کیا۔۔۔ پاؤں پر کسی کیڑے کے رینگنے کا سا احساس ہونے پر اُس نے فوراً ادا میں ٹانگ کھینچتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو ثمینہ کو کمرے سے باہر بھاگتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ اب وہ اسے مزید سونا تو ناممکن لیٹنے بھی نہیں دے گی۔ جبھی ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھتے ہوئے سلیپرز پہنے اور کمرے سے نکل کر برآمدے جا پہنچا جہاں اماں تخت پر سلائی مشین رکھے بیٹھی تھی۔

''اماں آج آپ پھر سلائی مشین رکھے بیٹھی ہیں اور آپ کو پتا بھی ہے کہ ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے۔'' موڑھا اٹھا کر اماں کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

''کچھ زیادہ کام نہیں تھا بیٹا! بس یہ ثمینہ کی قمیص ٹھیک کرنی تھی ذرا سی۔''

''مجھے دیتیں نا میں ٹیوشن کے لیے جاتے ہوئے ٹیلر کو پکڑا جاتا۔''

''ٹیوشن کیوں بھائی؟ آج یونی نہیں جانا کیا؟''

ثمینہ نے برآمدے کے آخر میں بنے کچن سے سر باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں آج صبح کی ٹیوشن بھی نہیں تھی کہ قاسم وغیرہ گھر پر نہیں ہیں اور یونی بھی نہیں جانا کیوں کہ شام کو پارٹی ہے۔''

''او مائی گاڈ۔۔۔ سوری بھائی! میں تو پھر خوامخواہ آپ کو جگاتی رہی۔''

اُس کی شرمندگی پر شاہ زین مسکرانے لگا۔

''مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ آج آپ شام میں جائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں تو ویسے بھی ابھی اٹھنے ہی والا تھا لیکن تم آج گھر پر کیوں ہو؟ کالج نہیں جانا کیا؟''

''نہیں بھائی آج ٹیچرز کی اسٹرائیک ہے اس لیے کالج بند ہے۔''

''اوہ اچھا۔۔۔''

''ثمینہ وہ دیکھو اوپر کونے میں۔''

اماں کی نظر اچانک ہی برآمدے کی چھت کے عین کونے میں لگے جالے پر پڑی تو کچن میں مصروف ثمینہ کو اُسی وقت آواز دے کر بلا لیا۔

یوں بھی یہ وہ واحد چیز تھی جس پر وہ کوئی کمپرومائز نہ کرتی تھیں۔ جس وقت جہاں نظر آئے سارے کام چھوڑ کر اُسے ہٹا دینا ہی ان کے نزدیک بہتر تھا۔

''ضرور کوئی جالا ہوگا ہے نا۔'' کچن میں ہی کھڑے کھڑے اُس نے خیال کی تصدیق چاہی۔ شاہ زین نے اس کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں یہ کچن صاف کرلوں اماں! پھر آتی ہوں۔''

''نہیں بیٹا! مکڑی جالا بُنے تو فوراً صاف کردو یہ گھر میں نحوست ہوتے ہیں۔ اپنے بسنے اور آباد رہنے کے لیے گھروں کا ویرانہ مانگتے ہیں اور۔۔۔ اور میں اس گھر کو سدا آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔''

اماں کی بات پر ثمینہ فوراً ہاتھ دھو کر جالے کو صاف کرنے کی نیت سے بڑھی۔ پہلے تو وہ محض صفائی کی نیت سے ہی جالے صاف کیا کرتی تھی لیکن آج اس نظریہ سے واقف ہونے کے بعد تو اب وہ کبھی بھی جالے تو کیا مکڑی کو بھی گھر میں داخلے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

☆☆☆

اپنے حصے کے خواب لکھتا ہوں
آگہی کے عذاب لکھتا ہوں
میرے اطراف ہے تماشا سا
اور میں اس کو سراب لکھتا ہوں
کھینچتا ہوں ملال در بدری
ہجرتوں کے عذاب لکھتا ہوں

مہربانو! بابا سائیں اور ملکانی کے ہمراہ کھانے کی

وسیع میز پر موجود تھی۔ کنیزاں کے ساتھ مل کر آج اس نے چکن گرلڈ شاشلک بنایا تھا۔ یوں تو اب تک کنیزاں کو بھی دیسی کھانوں سے ہٹ کر کافی دوسری چیزیں بنانا آگئی تھیں مگر مہربانو خود سے کچھ بنا کر دراصل بابا سائیں سے کچھ داد وصول کرنا چاہتی تھی مگر نا کام رہی کہ وہ آج میڈیا اور اخبار والوں پر اپنے غصے کا اظہار زیادہ کر رہے تھے اور کھانا کم کھا رہے تھے۔

"آج سے چند سال پہلے کا زمانہ ہی اچھا تھا جب صرف مصور ہی پنسل سے ہم سیاست دانوں کے اسکیچ بنایا کرتے تھے مگر آج۔۔۔ ہونہہ، یہ میڈیا والے لفظوں سے اپنی مرضی کا اسکیچ بنا کر عوام کو الو بنا رہے ہیں۔ بھاری رقوم کے بند لفافے حاصل کر کے بدکردار، نکمے اور جاہل لوگوں کے سر پر اونچے شملے والی پگڑیاں سجاتے ہیں اور کسی کی معمولی سی بات پسند نہ آنے پر عزتیں برباد کرنے میں بھی لمحہ بھر کا وقت نہیں لگاتے۔"

"کی ہویا۔۔۔ کج بتا دوی تے سہی نا۔"

ملکانی نے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی سونی کی پلیٹ میں بوائل چکن کے کچھ پیسز ڈالتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

سونی کے لیے یہ کرسی خصوصاً الگ سے بنوائی گئی تھی اور اس کی اونچائی ٹیبل کی سطح کے نا صرف برابر تھی بلکہ دونوں اطراف سیڑھی کی مانند اوپر چڑھنے کے لیے سپورٹ بھی موجود تھی۔ اسی لیے جب بھی کھانے کا وقت ہوتا سب کے ساتھ وہ بھی خراماں خراماں چلتی اپنی کرسی پر جا بیٹھتی۔ بلکہ کبھی کبھار دوسروں سے پہلے ہی حاضر پائی جاتی۔

مہربانو کے چہرے پر البتہ بوریت بھی تھی اور بے زاریت بھی۔

وہ ملکانی کو مخالف پارٹی کی طرف سے لگائے گئے غلط الزامات اور چند صحافیوں کو اپنے خلاف استعمال ہونے کے بارے میں کچھ تفصیلات بتا رہے تھے۔ مہربانو کو ان سب باتوں کو جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ یہ سب تو یوں بھی اخبارات اور دوسرے ذرائع سے سامنے آ ہی جاتا۔ لیکن وہ چاہتی تھی کہ اس وقت کم از کم تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر اس کی اس محنت کو سراہا جائے جو اس نے کچن میں خصوصاً شاہ سائیں کے لیے چکن گرلڈ شاشلک بناتے ہوئے کی تھی۔

لیکن۔۔۔ ایسا نہ تو کبھی پہلے ہوا تھا نہ آج ہوا۔ مہربانو کی خواہش آج پھر حسرت میں بدل کر دل ہی میں رہ گئی تھی۔

اس بلند و بالا حویلی کی یہی ریت رہی تھی۔ بڑی بڑی خواہشات تو منٹوں میں پوری کر دی جاتیں لیکن چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشات پوری کرنے میں کسی کو بھی دلچسپی نہیں تھی۔

شاہ سائیں نے گھر میں ہونے کے دوران کبھی کبھی گھر یا گھر والوں کی بات نہیں کی تھی۔

میران کی تو یوں بھی دنیا ہی الگ اور مہربانو کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

اور رہی بات ملکانی کی تو انہوں نے اپنی تنہائی کا علاج سونی کی صورت میں دریافت کر رکھا تھا اور پھر وہ شاہ سائیں کی "بیرونی ایکٹیوٹیز" کی کن سوئیاں لیتی رہتیں۔ یہی وجہ تھی کہ مہربانو کو یہ عمارت گھر کے بجائے صرف ایک خوب صورت طرزِ تعمیر کی حامل حویلی ہی لگا کرتی۔ جس کے در و دیوار سے اکتاہٹ میں اس کے ہاسٹل شفٹ ہونے کے بعد کمی ہونے کے بجائے مزید بڑھاوا ہی ہوا تھا۔ جس کی بڑی وجہ اس کی وہ روم میٹس تھیں جن کے گھرانے مالی حیثیت میں اس سے کم سہی لیکن رشتوں میں اپنائیت، خلوص اور پیار میں وہ اُس سے کہیں زیادہ آسودہ حال تھیں۔

ہاسٹل سے ملنے والی چھٹیاں گھر گزار کر آنے کے بعد کتنے ہی دن وہ اُن چند دنوں کی باتیں اور قصے دہراتی رہتیں جو وقت انہوں نے گھر میں اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ گزارا ہوتا۔ مل کر کھانے کھائے بھی جاتے اور پکائے بھی۔ کچن میں بیٹھ کر جو محفلیں سجتیں، بہن یا امی کے ساتھ شاپنگ، بھائیوں کے ساتھ گپ بازی، چھیڑ چھاڑ، شرارتیں

شرطیں، ابو کے ساتھ اپنی اسٹڈیز اور پھر فیوچر کی ڈسکشن۔۔۔ کتنا کچھ ایسا تھا جو اسے اپنی لائف میں مسنگ لگتا یا پھر کبھی کبھار اسے خود اپنا آپ ہی اس ماحول میں مِس فٹ لگتا۔

کبھی سوچتی کہ وہ پیدا ہی غلط گھر میں ہو گئی ہے اور اگر ہو ہی گئی تھی تو کاش ایک بہن اور بھی ہو جاتی تو کم از کم اتنا غباریوں سینے کے اندر ہی جمانہ ہوتا رہتا یہی سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی جہاں دو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھی۔

یعنی سائیڈ ٹیبل کی دراز کے اندھیرے میں موجود اس کے موبائل کی اسکرین پانچ منٹ بعد سائیلنٹ ہونے کے باوجود روشن ہو کر ان کمنگ (Incoming) کال کی اطلاع دینے والی تھی۔

کھانے کا موڈ تو ویسے ہی ختم ہو چکا تھا۔ جبھی اس نے بے دلی سے پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے شاہ سائیں اور ملکانی کو دیکھا جو مل کر اخبارات کے متعلق بجڑ اس نکال رہے تھے۔ سامنے رکھی ڈش میں خوب صورتی سے سجایا گیا چکن گرلڈ شاشلک اب تک ٹھنڈا ہو کر اپنی بے قدری کا رونا رو رہا تھا۔

نہایت افسردگی سے اس نے دونوں ہونٹ بھینچتے ہوئے کرسی پیچھے سرکائی اور چادر لپیٹتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

شاہ سائیں اور ملکانی گفتگو میں اس قدر مصروف تھے کہ مہر بانو کا اٹھنا تو دور سونی کی میاؤں بھی محسوس نہیں کر سکے تھے۔

☆☆☆

"واؤ امی! کتنا سکون ملتا ہے آپ سے آئل مساج کرواتے ہوئے، سچی دل تو چاہتا ہے کہ میں یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہوں اور آپ کی انگلیوں کی پوریں اسی طرح اپنا پیار مجھ تک منتقل کرتی رہیں۔"

سر کو پیچھے کی جانب کیے وہ امی کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی جبکہ وہ بائیں ہتھیلی کو کٹوری بنائے اُس میں آئل ڈال کر دائیں ہاتھ کی مدد سے اُس کے سر میں لگا رہی تھیں اور یہ آئل یوں بھی خصوصاً انہوں نے ندی کے لیے مکس کر رکھا تھا جس میں آملہ، زیتون، ناریل، سرسوں اور بادام کا تیل ہم وزن لے کر ایک بوتل میں محفوظ کر رکھا تھا۔ ندرت تو خیر ان چیزوں کی پروا کم ہی کرتی تھی مگر وہ خود بڑی باقاعدگی سے اُس کے سر میں ہفتے میں دو دفعہ ضرور مساج کرتیں۔ یوں بھی ہر قسم کی خشکی یا بالوں کے گرنے سے لے کر سست روی سے بڑھنے تک بالوں کے ہر مسئلے کا حل تیل کے اس مجموعے میں تھا اور ندرت تو اس بات کا اکثر اعتراف بھی کرتی کہ اس کے بال اگر ریشم سے نرم اور چمک دار ہیں تو اس میں تمام محنت صرف اور صرف امی کی ہے۔

"ماں ہو تو آپ جیسی۔" آنکھیں بند کیے ایک سرور کی سی کیفیت میں اُس نے کہا تھا۔

"ارے بیٹا! مائیں سب کی ایک ہی جیسی ہوتی ہیں مگر۔۔۔"

"اپنی اولاد کے لیے۔۔۔"

کمرے میں دستک دے کر داخل ہوتے ہوئے عائشہ نے گو کہ مسکراتے لبوں کے ساتھ جملہ مکمل کیا تھا مگر لفظوں کی کاٹ اُن دونوں کو ضرور محسوس ہوئی تھی۔ جبھی ندی نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

امی بھی استفہامیہ انداز میں عائشہ کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

"میری بات کو سیریس مت لیجیے گا پلیز۔۔۔ میں نے بس یونہی ذرا ماحول بدلنے کے لیے بات کی تھی۔"

وہ جو دل میں آیا کہہ تو چکی تھی اب تو محض رسمی کارروائی کر رہی تھی۔

"ماحول تو ہم یوں بدلنے کو تیار ہیں بھابھی۔" ندی نے اٹھتے ہوئے چٹکی بجائی۔ "لیکن بس دل نہیں بدلنے چاہئیں۔ کیوں امی؟"

وارڈ روب سے کپڑے نکالتے ہوئے اس نے امی کی طرف دیکھا جو باتھ روم میں ہاتھ دھونے کے بعد اب تولیے سے خشک کر رہی تھیں سو تائید میں سر

ہلاتے ہوئے مسکرا دیں۔

"اچھا یہ سب چھوڑو تم جا کر نہا لو میں استری کر دیتی ہوں۔"

عائشہ نے ندرت کے ہاتھ سے مغلئی طرز کی سیاہ فراک لیتے ہوئے دوستانہ پیش کش کی کہ وارڈ روب میں ہینگ ہوئی فراک استری شدہ تھی ہی بس چند جگہوں پر سلوٹیں تھیں جنہیں دور کرنا باقی تھا۔

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آئل لگوانے کے بعد تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد سر دھوتیں تا کہ کچھ اثر ہوتا۔"

"ہاں بھابھی! امی صحیح کہہ رہی ہیں اور پھر آپ کو بھی زحمت ہو گی میں خود کر لوں گی۔"

"ارے زحمت کیسی۔ ویسے بھی میں ابھی کپڑے ہی پریس کر رہی تھی اسی لیے تو تم سے بھی پوچھنے آ گئی۔"

عائشہ نے اس کی مزاحمت رد کی تو اسے فراک دیتے ہی بنی۔

"ویسے ایک بات پوچھوں ندی؟"

"نہیں بھابھی رہنے دیں۔" ندرت نے سپاٹ لہجے میں کہا تو عائشہ سمیت ایک دم امی بھی چونک گئیں کہ یہ انداز بیاں تو اس کا کبھی بھی نہیں رہا تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں نہیں، میرا مطلب تھا دو پوچھیں تین پوچھیں بھلا صرف ایک کیوں؟"

دونوں کو یوں حیران ہوتے دیکھ کر وہ شرارت کو مزید برقرار رکھنے کا ارادہ بدل کر فوراً بولی تھی۔

"ندرت۔۔۔!" امی نے اُسے تنبیہی انداز میں آنکھیں دکھانا ضروری سمجھا تھا۔

عائشہ کے تاثرات البتہ معمول کے تھے۔

"کہاں تو تم نے کبھی بلیک کلر کے کپڑے خریدے بھی نہیں اور کہاں اب پارٹی کے لیے اپنی اس اکلوتی فراک کا انتخاب کر لیا۔ پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

ندرت نے اس غیر متوقع سوال پر چونک کر عائشہ کو دیکھا تو ضرور مگر اس کے چہرے کے ذو معنی تاثرات سمجھنے سے البتہ قاصر رہی تھی۔

"ارے بھابھی! اس کیوں کا جواب دینے بیٹھی نا تو آپ کا گھنٹہ ڈیڑھ ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے پھر سہی۔"

تیل لگے بالوں کو سمیٹ کر وہ باتھ روم میں جا گھسی تو عائشہ خوب صورت سیاہ فراک پر سفید رنگ کے نفیس انداز میں کیے گئے مکیش کے کام کو دل ہی دل میں الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

☆☆☆

ملکانی سائیں ٹھنڈی ہوتی شام میں شہتوت کے درخت تلے بچھے تخت پر بیٹھی منشی جی کو حساب کتاب کے کھاتوں سے متعلق اہم ہدایات دینے میں مصروف تھیں۔ سونی اُن کی خوب صورت سی کڑھائی والی چادر کے ایک کونے پر بیٹھی اس پر جا بجا لگے ہوئے ننھے ننھے شیشوں میں سے شاید اپنا عکس ڈھونڈ رہی تھی۔ گردن میں جھولتے عمدہ اور اعلا قسم کے چمڑے کا انتہائی نفیس پھول نما لاکٹ اس کے سفید بالوں سے بھرے نرم نرم وجود پر بلاشبہ انتہا کا خوب صورت لگتا۔

یہ لاکٹ شاہ سائیں خصوصاً دبئی سے سونی کے لیے لائے تھے۔

"کنیزاں۔۔۔ نی کنیزاں۔۔۔"

سونی کو ہلکا سا کھجاتے دیکھ کر ملکانی نے کنیزاں کو بلایا تو وہ آن کی آن میں اُن کے سامنے آ کھڑی ہوئی کہ وہ ہمیشہ اُن کے آس پاس ہی موجود رہا کرتی تھی۔

"جا اندر جا کر سونی کی الماری سے اس کا اسپرے اٹھا لا۔ دیکھتے نئی کتنے مچھر کاٹ رہے ہیں اسے۔"

ملکانی سائیں اب سونی کو گود میں لے کر بڑے پیار اور شفقت سے اس پر ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"ابھی لائی۔"

کنیزاں کے حویلی کی اندرونی سائیڈ رخ کرتے ہی اندر سے میران باہر کی طرف آتا دکھائی دیا۔ پہلے سے کہیں زیادہ خوش اور ہمیشہ کے برعکس

نہایت پرجوش!

ملکانی نے دیکھا تو پکارلیا۔

"جی۔۔۔آپ نے بلایا مجھے؟"

"صدقے جاواں۔۔۔۔اج میرا پتر بڑا ای خوش لگ رہا ہے۔ خیر تے ہے نا؟" اُن کی بات پر میران قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

ملکانی سائیں نے کھاتوں کا رجسٹر کھولے ان دونوں کی طرف متوجہ منشی صاحب کو دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا کہہ دیا۔

"ویسے عجیب بات نہیں ہے۔ پریشان نظر آؤں یا خوش آپ کا "خیر تے ہے نا" وہیں موجود رہتا ہے۔"

"ہاں تے فیر اور کیا کہوں؟ چل چھوڑ یہ بتا خیر تے ہے نا؟" لاشعوری طور پر ایک دفعہ پھر ملکانی کے منہ سے وہی الفاظ نکلے تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔

"دراصل آج یونیورسٹی میں پارٹی ہے نا تو بس اسی لیے ذرا پرجوش ہو رہا ہوں کہ کافی انتظار کے بعد اتنا انجوائے کرنے کا موقع ملے گا آج۔"

سوئی پر نظریں جماتے ہوئے اب وہ مکمل سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"اچھا پتر ایسا کریں۔۔۔دیر ہو جائے تو گھر نا آئیں، اُدھر ہی شہر والے فلیٹ میں سو جائیں۔۔۔ اچھا؟"

"جی اچھا۔اب جاؤں؟"

"ہاں جا پتر، تیرا اللہ رکھا اے۔"

ملکانی سائیں سے اجازت ملنے پر انگلی پر چابی گھماتا وہ گیٹ کی طرف بڑھتا آج شام کو ہونے والے ڈنر کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

موم کی سیڑھی پر چڑھ کے چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

☆☆☆

اور وہی ہوا اور ویسا ہی ہوا جیسا عائشہ نے سوچا اور پھر چاہا۔ ندرت کی سیاہ فراک استری زیادہ گرم ہو جانے کی وجہ سے "اتفاقاً" جل گئی تھی۔ اور وہ اب منہ بسورے چپ چاپ تھی کہ نہیں چاہتی تھی عائشہ کو کچھ بھی کہے۔

"امی مجھے آج ہر قیمت پر بلیک کپڑے ہی پہننے ہیں۔"

وہ گود میں استری سے جلی ہوئی فراک لیے بھی بیٹھی تھی۔ جب کہ امی جلتی پر پانی ڈالنے کا فریضہ سر انجام دینا چاہتی تھیں۔

"بیٹا عائشہ نے کوئی جان بوجھ کر تو نہیں جلائی تمہاری فراک، اتفاقاً تم سے بھی جل سکتی تھی۔"

"امی بات فراک کی نہیں اس کلر کی ہے۔ کیوں کہ میرے پاس بلیک کلر میں کوئی پارٹی ڈریس نہیں ہے۔"

"تو کیا آج بلیک کلر کے علاوہ یونیورسٹی گیٹ سے اندر جانے نہیں دیں گے؟"

امی اب خائف نظر آنے لگی تھیں۔

"دیکھو یہ ہلکا انگوری رنگ تم پر کتنا سوٹ کرے گا۔ اُس پر یہ چھوٹے چھوٹے میچنگ ٹاپس بھی عائشہ ساتھ ہی رکھ گئی ہے۔"

"مگر امی۔۔۔"

"دیکھو ندرت! تمہیں معلوم ہے نا کہ ناصر کو تمہارا رات کے وقت یونیورسٹی جانا پسند نہیں تھا۔ تمہارے ابا بھی ناصر کے ساتھ بحث سے گریز کرتے ہیں۔ اُس پر عائشہ ہی نے ناصر سے بات کر کے اُسے سمجھایا تھا۔" امی نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔

"اور اب اگر تم کپڑوں کی وجہ سے شور مچاؤ گی تو یقیناً اُسے برا محسوس ہوگا۔"

"امی دراصل۔۔۔"

"میں نے کہا نا آج یہ پہن جاؤ پھر بازار سے سیاہ رنگ کے اور کپڑے لے آنا، خوش؟"

بڑی بڑی آنکھوں میں ہچکولے کھاتی ناراضی کی لہر پر صلح کا بادباں لہراتے ہوئے اس نے کپڑے اٹھا تو لیے مگر دل کا اضطراب اپنی جگہ جوں کا توں قائم تھا۔

☆☆☆

چاہے سارے شہر میں اس وقت شام ہو چکی تھی مگر یونیورسٹی کے اندر تو شاید دن ابھی ہی چڑھا تھا۔ چاروں طرف بکھرتے رنگ، اُڑتے پھرتے قوس قزح سے آنچل، خوشبوؤں سے معطر نفوس اور اُس پر ڈیک پر بجتا میوزک۔ چھوٹی سی فیرویل اچھی خاصی پارٹی کا روپ دھار چکی تھی۔ ناصر بھائی ندرت کو چھوڑ کر گئے تھے اور لینے بھی اُنہی کو آنا تھا۔

عائشہ کے منتخب کردہ ہلکے انگوری رنگ کے کپڑوں میں ملبوس جب وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے نزدیک پہنچی تو بلا مبالغہ سب پلکیں جھپکانا بھول گئے۔ سرخ وسپید رنگت کو یہ لائٹ سا کلر مزید ابھار رہا تھا۔ اس پر اُس کی خوب صورتی، جسے کسی بھی قسم کے میک اپ کی بھی ضرورت نہ رہی تھی اور سب سے بڑھ کر اُس کا وہ انداز جسے دیکھ کر لگتا کہ شاید وہ اپنی خوب صورتی سے واقف ہی نہیں ہے۔ نہ تو غرور اور نہ تک چڑھا سر دسارویہ۔

"تم تو واقعی فارز لگتی ہو یار!" صبا نے ملتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"ہاں تو تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں فار مادہ ہوں۔۔۔یار! ہر لڑکی کی طرح میں بھی فار، فر ہی ہوں کیوں کہ ہر مادہ، نر اور نر، مادہ کے لیے ہے۔"

اس کی کی گئی وضاحت پر صبا سمیت وہاں موجود دوسری لڑکیاں بھی ہنسنے لگی تھیں۔ جب کہ وہ شاہ زین کے نظر نہ آنے پر اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو یہاں وہاں گھمارہی تھی۔

"شاہو نہیں آیا ابھی تک؟"

"کب سے آیا ہوا ہے لیکن تم ذرا لیٹ ہو۔"

"اچھا؟ پھر تو وہیں اسٹیج کے ریڈی روم میں ہوگا؟"

اور اس سے پہلے کہ وہ اسٹیج کی طرف قدم بڑھاتی، ریڈی روم کے دروازے پر کھڑے شاہ زین نے بڑے پرجوش انداز میں ہاتھ ہلایا۔

آف وہائٹ کرتا شلوار میں ملبوس شاہ زین آج واقعی بڑا شاہانہ تاثر دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ہلانے پر ندرت مقناطیسی انداز میں جیسے اُس کی طرف کھنچتی ہی چلی گئی۔ انداز میں اتنی بے خودی تھی کہ وہ محسوس ہی نہ کر پائی کہ سب لوگوں کی مرکز نگاہ ہونے کی وجہ سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کی جارہی ہے۔

میران جو اس کے ایک ایک انداز کو اپنے موبائل میں قید کر رہا تھا۔ شاہ زین کی طرف یوں اس کے بڑھتے قدم اور بے تابی دیکھ کر بھڑک ہی تو اُٹھا تھا۔ آج سے پہلے شاہ زین اور ندرت کے درمیان موجود تعلق کو سبھی کلاس فیلوز نے محض وقتی ساتھ سمجھا تھا مگر آج۔۔۔ جبھی میران نے اپنے دوستوں کو یہ تاثر عام کرنے کا کہا تھا کہ ندرت اور شاہ زین اکثر یونیورسٹی اوقات میں باہر ایک ساتھ دیکھے گئے ہیں۔

اوائل ساعتوں سے ٹکرایا گیا محض ایک جملہ چند زبانوں سے ہوتا خود بخود ایک کہانی کی شکل اختیار کر جائے گا۔ یہ بات میران بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

"تم تو آج بلیک کلر پہننے والی تھیں نا۔"

شاہ زین نے اُسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی چہرے پر اُبھرتے شرمندگی کے تاثرات نے شاہ زین کو بات بدلنے پر اُکسا دیا۔

"اچھا ہی ہوا نہیں پہنا، کیوں کہ اس رنگ میں تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

ندرت اس کی بات پر ہنس دی۔

اونچا لمبا شاہ زین جسے آج سے پہلے اُس نے کبھی کرتا شلوار میں نہیں دیکھا تھا۔ آج دیکھا تو چاہنے کے باوجود اس کی تعریف کرنے پر جھجک سی گئی۔

وہ ندرت جو کبھی منہ میں آئی بات کو روکنے کی زحمت نہ کرتی آج دل میں ہوتی اُتھل پتھل نے اس کی زبان کی برق رفتاری اور طبیعت کی بولڈنیس کو جھجک کی چادر میں چھپا دیا تھا۔ دراز قد، بانکا سجیلا شاہ زین آج ایک گبرو جوان کے روپ میں اس کے دل کو بڑے عجیب انداز میں دھڑکائے دے رہا تھا۔ اُس پر

نفاست سے کٹے بال، گھنی مونچھیں اور سب سے بڑھ کر سرمئی آنکھیں، جن میں دیکھنے سے آج ندرت یقینی طور پر کترا رہی تھی۔

کمپیئرنگ کرتے وقت شاہ زین کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کے وجود سے اٹھتی ارمانی کی بھینی بھینی اور مسحور کن خوشبو اپنے اندر سموتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کیا تھا۔ یہی نہیں ریڈی روم میں میوزک ٹونز سیٹ کرواتے شاہ زین پر اس نے کتنا ہی کچھ پڑھ کر پھونک ڈالا۔

''یار! میں تو ویسے ہی تمہارا ہوں۔ دم وغیرہ کر کے کیا محبوب کو حقیقتاً قدموں میں گرانے کا ارادہ ہے۔''

''تمہاری جگہ تو میرے دل میں ہے لیکن۔۔۔''

''لیکن۔۔۔۔؟''

''آج تمہاری محبت کے سامنے مجھے اپنا دل چھوٹا پڑتا محسوس ہو رہا ہے۔ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں یہ میں نہیں جانتی لیکن ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اب تمہارے بغیر زندگی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔''

شاہ زین نے بڑی گہری نظروں سے سامنے بیٹھی ندرت کو دیکھا جس کے جذبے اس کے چہرے کی طرح ہی نہایت شفاف تھے۔ خوب صورت بالوں کے ہالے میں اس کے چہرے کی چھب دیکھنے کے لائق تھی اس پر وہ فطری معصومیت۔۔۔

شاہ زین کا دل ڈولنے لگا تھا۔

''شاہو کیا تم بھی میرے لیے اپنے دل میں کچھ انوکھا محسوس کرتے ہو؟''

ندرت اب محبت کی اُس منزل پر تھی جہاں جذبے اپنے ہونے کا اظہار مانگتے ہیں۔ جہاں انداز کا والہانہ پن اور آنکھوں سے جھلکتی وارفتگی لفظوں کو گواہ بنانا چاہتے ہیں۔ سو اُسی لمحے شاہ زین کے دل میں جانے کیا آیا کہ اس کا سرخ و سپید روئی کے گالوں جیسا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں یہ بتانے کے لیے مجھے آج تک ایسے الفاظ ہی سمجھ نہیں آئے جو تم سے میرے جذبوں کی شدت کی تصدیق کروا پاتے۔ ہر لفظ ہر جملہ مجھے بہت چھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ میرا دل جانتا ہے کہ میں تم سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں۔''

ندرت اس کے لہجے کی گمبھیرتا میں مبہوت ہوئے بیٹھی تھی کہ اس نے ہاتھ میں پکڑے پین سے اس کے ہاتھ پر لکھنا شروع کر دیا۔

''ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی
زندگی چاہتا ہو جیسے

اس سے بڑھ کر کوئی مثال میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' شاہ زین کے لکھے گئے خوب صورت الفاظ نے ندرت کی زندگی کو نیا مفہوم حقیقتاً اسی لمحے بخشا تھا۔

''کچھ اللہ کا خوف کرو۔'' صبا جیسے بولائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''اور یہ لو۔۔۔'' صبا نے ہاتھ میں پکڑی کاجل کی چھوٹی سی ڈبیا سے انگلی پر کاجل لگا کر دونوں کے کان کے نیچے لگاتے ہوئے کہا۔

''اوہو لیکن یہ سب کیا ہے؟'' ندرت ناسمجھی سے بولی۔

''بجی تم لوگ اسٹیج پر ایک ساتھ اتنے خوب صورت لگ رہے ہو کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کوئی تم دونوں کو نظر ہی نہ لگا دے۔''

صبا نے پردہ ہلکا سا ہٹا کر اسٹیج پر دیکھا۔ ٹیچرز کی عادت پر مشتمل تنقیدی مشاعرہ مزاح کا پیرہن لیے سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیرے ہوئے تھا۔

''ارے واہ! ایسے ہی کوئی نظر لگا دے گا۔ یہ دیکھو۔''

شاہ زین نے جیب سے سیاہ ڈوری کا بنا بریسلیٹ نکالا جس میں جابجا سفید موتی لگے تھے۔

''یہ میں خاص طور پر آج کے دن کے لیے لایا ہوں کیوں کہ کسی کی نظروں کا اعتبار مجھے بھی نہیں ہے۔''

ندرت کی دائیں کلائی میں بریسلیٹ پہناتے ہوئے شاہ زین نے کہا تو صبا کی نظر ہتھیلی پر لکھے لفظوں پر پڑی اور وہ لمحہ اس کے موبائل میں ہمیشہ کے لیے قید ہو گیا۔

اسی لمحے میران لڑکی کے گیٹ اپ میں اپنے دوست کے ساتھ ریڈی روم میں داخل ہوا تھا کہ نیکسٹ سرپرائز آئٹم اُس کا تھا اور اب اُسے یہاں بیٹھ کر سابقہ آئٹم کے ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ اس کے چیلے البتہ کھڑکی سے باہر کیمرہ لیے پوری طرح چوکس تھے۔

تینوں نے میران کی آنکھوں سے جھلکتی غراہٹ کو فوراً محسوس کیا تھا۔ جبھی اپنے اپنے کاموں میں معروف ہو گئے یوں بھی شاہ زین، زبیر اور صبا کے علاوہ کسی کے بھی سامنے ندرت سے بہت زیادہ فرینک ہو کر بات نہیں کرتا تھا اور خصوصاً میران کے سامنے اُس کا رویہ بہت ہی محتاط ہوا کرتا کیوں کہ وہ کسی بھی معاملے میں ندرت کا نام زبان زدِ عام ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

گھر کا ماحول کچھ عجیب سا لگنے لگا تھا۔ عائشہ تھی تو اکمل کی بہن مگر پہلے کی نسبت اب اتنی بدل گئی تھی کہ اکثر وہ بھی ہنس کر اسے اپنی بہن ماننے سے انکار کرتے ہوئے صرف ناصر بھائی کی مسز یا ندی کی بھابھی کہا کرتا۔ سسرال سے آنے کے بعد جس طرح وہ اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھی اپنی ''حق تلفی'' اور سسرال میں ''جائز حقوق'' کے نہ ملنے کا رونا رویا کرتی وہ وقت اکمل کو بھی کبھار پریشان کرنے لگتا۔

کیوں کہ شادی سے پہلے تک عائشہ کے خیالات قدرے مختلف تھے اور تب وہ سوچتا کہ کیا واقعی لڑکیاں شادی کے بعد اس قدر بدل جاتی ہیں۔ کیوں کہ باوجود اس کے کہ عائشہ کا سسرال ایک مثالی گھرانہ تھا، جہاں رشتوں کا تقدس بھی برقرار تھا اور قدریں بھی پائی تھیں۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگی تھی تو وہ فیملیز جہاں حقیقتاً بہوؤں کو ناکوں چنے چبوائے جاتے تھے وہاں صبر کا مظاہرہ کرنے کو کہتے۔ جس سے عائشہ کو اُن کے سامنے اپنی ہار تسلیم کرنا ہی پڑتی۔ اسی لیے آج کل جب گھر میں اکمل کے رشتے کی بات گردش کرنے لگی تو وہ گھبرا سا گیا تھا۔ کیوں کہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی لڑکی اس گھر میں آئے جو ذہنی طور پر میچور نہ ہو۔ اشارتاً خاندان کی ایک دو لڑکیوں کے بارے میں گھر میں بات ہوئی بھی مگر وہ صاف کنی کترا گیا۔

یوں بھی اپنے لیے شریکِ سفر کا انتخاب تو وہ کر ہی چکا تھا مگر اس کی اجازت ملنے کا پابند تھا اور جب تک اس کی طرف سے کوئی گرین سگنل نہ ملتا یقیناً وہ گھر میں کسی بھی طرح کی بات کرنے کا مجاز نہ تھا۔ البتہ اتنا وہ ضرور کہہ چکا تھا کہ لڑکی کا انتخاب وہ کر چکا ہے اس لیے وہ سب خوامخواہ تگ و دو نہ کریں۔ مگر عائشہ کے ذہن میں جو کیڑا رینگ رہا تھا وہ اسے چین لینے دیتا تو چپ رہتی نا۔

جب سے اُس کا شک، حقیقت کا انکشاف بن کر ظاہر ہوا تھا جلے پیر کی بلی بنے کسی طرح بھی چین نہیں مل رہا تھا۔

اکمل کو رد کیے جانا اُس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور اب بس اُس کے ذہن میں یہ بات ایک ضد کی طرح موجود تھی کہ وہ ندی کو کسی اور کا نہیں ہونے دے گی۔ اکمل کے سامنے بھی ڈھکے چھپے الفاظوں میں اس نے کچھ باتیں کر کے اُس کا ردِ عمل جاننے کی کوشش کی اور نتیجتاً اس کے چہرے پر جھلکتی پریشانی نے اسے باور کروا دیا کہ ندی کے متعلق یہ چند ہی باتیں سن کر اس کے وجیہہ چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔

اکمل کے انہی تاثرات نے گویا عائشہ کے ذہن میں پنپتے ارادوں پر ایک مہر ثبت کر دی تھی۔ عائشہ کی اسی طرح کی باتوں کی وجہ سے اکمل ذہنی طور پر اپنی بہن سے بہت دور ہو گیا تھا کیوں کہ اب اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز بدل چکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی شادی کے معاملے پر بھی عائشہ سے کچھ ڈسکس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تاوقت یہ کہ کچھ فائنل نہ ہوا اور اب ندی کے متعلق یہ سب کچھ سننے کے بعد وہ حقیقتاً عائشہ کے لفظوں سے نہیں بلکہ اس کے لہجے پر چونک گیا تھا۔ جس انداز میں وہ یہ سب اس سے شیئر کر رہی تھی وہ انداز نہ تو اسے اچھا لگا تھا اور نہ ہی مثبت اور ویسے بھی اکمل کی ندرت کے ساتھ اس حد تک بے تکلفی تھی کہ آپس میں ہر طرح کی بات کی جاسکتی تھی۔

یہ درست تھا کہ اس کی ٹریننگ کے پیریڈ میں اتنی زیادہ بات چیت نہ ہونے کی وجہ سے کچھ تکلف ضرور بیچ میں آگیا تھا، مگر یہ بھی اکمل کی طرف سے ہی تھا۔ ورنہ ندرت تو اس دن بھی اُسی بے تکلفی اور خوش مزاجی سے ملی تھی جیسے پہلے وہ لوگ ملا کرتے تھے۔ ناصر بھائی کی موجودگی میں بھی کھانا کھانے کے بعد وہ صوفے پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی بلکہ یہی نہیں باتوں باتوں میں ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر تالی مارنے کا شغل بھی جاری تھا۔ لیکن کوئی بھی معترض نہ ہوا کیوں کہ ایک تو ان کے گھر کا ماحول کچھ آزاد تھا دوسرا سبھی اس کی معصومیت اور سادہ دلی سے واقف تھے۔

ہاں سب نے اسے مصنوعی خفگی سے دیکھا ضرور اور وہ بھی تب جب بچپن کی طرح اکمل شرارتاً اپنا پیا ہوا جوس کا گلاس اس کے گلاس سے بدلتے ہوئے پکڑا گیا اور ندی نے اردگرد موجود لوگوں کی شرکت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس کا کان مروڑ ڈالا اور بڑے فخر سے "انکشاف" کیا کہ جناب اب میں بڑی ہوگئی ہوں اور کوئی مجھے پاگل نہیں بنا سکتا۔

یہ الگ بات تھی کہ سب کے متوجہ ہوجانے پر کھسیا کر بیٹھتے ہوئے وہ اکمل ہی کا جوس اٹھا کر پی گئی تھی۔

ندی کی یہی معصومیت سب کے دل میں گھر بنائے ہوئے تھی اور اب عائشہ کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر وہ حقیقتاً پریشان ہوگیا تھا اور جلد از جلد ندی سے بات کر کے نہ صرف اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا بلکہ اُسے بھی خود اپنی بہن سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرنا چاہتا تھا کیوں کہ وہ اس کی شفاف آنکھوں کو گدلا ہوتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جبھی اس معصوم پری کے لیے دعا کرتے ہوئے گاڑی نکالی اور فون کا سہارا لینے کے بجائے خود اس کے سامنے بات کرنے کا سوچا۔

دعا ہے میری
کہ زندگی کی بھی بہاریں
محبتوں سے یہ نم ہوائیں
تمہارے دامن سے کھیلیں ہردم
کہ زندگی کے ہر ایک پل سے
ہزاروں خوشیاں کشید کر کے
تم اپنے اندر سمیٹ لو سب
کسک کوئی بھی رہے نہ باقی
تمہارے دل میں
دعا ہے میری

☆☆☆

عائشہ، امی اور بابا کو ان کے کمرے میں کھانا دے کر بابا کی میڈیسن ڈھونڈ رہی تھی۔ یوں تو ان کی ادویات ان کے بیڈ کے ساتھ ہی موجود سائیڈ ٹیبل میں وہ خود بڑی ہی ذمہ داری سے رکھا کرتے تھے مگر چند روز سے بخار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے خود ندی ہی انہیں بڑی باقاعدگی سے وقت مقررہ پر دوائی دے کر جانے کہاں رکھتی تھی۔ اسی لیے عائشہ اب ہر ممکن جگہ پر وہ دوائی کا شاپر دیکھ رہی تھی۔ ناصر بھائی آج آفس میں کام کی زیادتی کی وجہ سے دیر سے گھر آنے کا کہہ گئے تھے۔ جبھی عائشہ نے امی اور بابا کو ان کے کمرے میں ہی کھانا دے دیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ حقیقتاً مسئلہ کام کی زیادتی کا نہیں بلکہ اس ذہنی توڑ پھوڑ کا تھا جو عائشہ کی کچھ سنی اور کچھ بنی کہانی سننے کے بعد سے جاری تھی اور یہی وجہ تھی کہ چند روز سے وہ رات کو دیر سے ہی آرہے تھے کیوں کہ چاہنے کے باوجود وہ اپنی اس لاڈلی بہن کا سامنا نہیں کر پا رہے تھے جس کے ساتھ بیٹھ کر امی بابا کے سامنے گپیں مارنے اور دن بھر کی روداد ڈسکس کیے بنا انہیں نیند نہیں آتی تھی۔

امی بابا تو دوا لینے کی خاطر چند نوالے لے ہی لیا کرتے تھے مگر وہ اس بات سے قطعی طور پر لاعلم تھے کہ ان کی غیر موجودگی کے باعث ندی اب رات کا کھانا کھائے بغیر سونے لگی ہے۔

چند دن تو یوں گزر ہی گئے تھے مگر آج ندی بھی باقاعدہ طور پر لڑائی کرنے کا ارادہ کر چکی تھی اور آج رات تو اسے دیر سے آنا ہی تھا مگر کل میدان جنگ سجنے والا ہے اس بات کا تہیہ وہ اپنے طور کیے بیٹھی تھی اور صبح اُس کے ارادے سے آگاہ ہونے کے بعد بابا بھی مسکرا دیے تھے۔

"امی۔۔۔! آپ دونوں نے کھانا کھایا؟"

بابا کو دلیہ کھلانے کے بعد امی نے ٹرے رکھی ہی تھی کہ کمرے میں موجود لینڈ لائن پر ندی کی متفکر سی آواز سنائی دی۔

"ہاں بیٹا! میں بھی کھا چکی ہوں اور تمہارے بابا بھی۔"

اس کے اس قدر خیال رکھنے پر ان کے دل میں ندی کے لیے جیسے محبتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ اور صرف آج نہیں، اکثر دوپہر کے کھانے کے وقت جب وہ یونیورسٹی ہوتی تب بھی ہمیشہ فون پر اُن کے کھانا کھانے اور دوا لینے کے متعلق ضرور پوچھا کرتی۔

"اچھا چلیں ٹھیک ہے مجھے ذرا دیر ہوجائے گی۔ ناصر بھائی آئیں گے نا لینے؟"

"ہاں ان شاء اللہ ٹائم پر پہنچ جائے گا۔"

"اوکے امی! لیکن ہاں میرے آنے تک تو بابا سو جائیں گے، آپ پلیز ان کا ٹمپریچر ضرور چیک کر کے لکھ دیجیے گا۔"

"ہاں اچھا بیٹا! خوش رہو۔"

امی نے فون بند کرنے کے بعد بابا کو دیکھا جو کئی دن سے ہلکا ہلکا بخار رہنے کے باعث نقاہت کے مارے آنکھیں بند کر کے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

عائشہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں پر لوشن کا مساج بھی جاری رکھے ہوئے تھی جب گیٹ کے باہر گاڑی کے رکنے کی آواز اور پھر بیل سن کر چونک گئی۔ کیوں کہ ناصر کے آنے میں تو ابھی وقت باقی تھا اور یوں بھی آج اُنہیں ندرت کو لینے یونیورسٹی جانا تھا اور وہ عائشہ کو بتا کر گئے تھے کہ آج وہ ندرت سے ان تمام معاملات کے بارے میں پوچھیں گے جن کے بارے میں وقتاً فوقتاً عائشہ انہیں بتاتی رہی تھی۔ دل میں بال تو ضرور آ گیا تھا مگر یقین کرنا اب تک انہیں مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اسی ذہنی کشمکش میں چند دن گزارنے کے بعد بالآخر آج انہوں نے ندی سے دوستانہ انداز میں تمام بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"ارے تم؟"

مین گیٹ کھولتے ہی اکمل پر نظر پڑی تو اس کی اچانک اور بنا بتائے آمد پر عائشہ کا حیران ہونا لازمی تھا۔

"ہاں آپی۔۔۔ دراصل ندی سے کچھ باتیں کرنا تھیں اسی لیے سوچا کہ فون کے بجائے گھر ہی آجاؤں۔ آپ کے ہاتھوں کی مزے دار سی چائے بھی مل جائے گی اور بات بھی ہوجائے گی۔"

دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اندر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے وہ بولا تو عائشہ کو اپنے دل پر جیسے بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"میرا بھائی جس لڑکی کے لیے وقت کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے اپنے دل کی بات کہنے آیا ہے وہ تو اسے کسی قابل ہی نہیں سمجھتی۔۔۔ سمجھتی تو یوں کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہوتی۔

لیکن نہیں۔۔۔ اگر میرے بھائی نے اس سے محبت کی ہے تو پھر حق بھی اسی کا ہے اور میں اس کا حق کسی اور کو چھیننے نہیں دوں گی۔"

"کیا ہوا آپی؟ چائے کے لیے دودھ نہیں ہے

کیا ہوا جو یوں پریشان ہو رہی ہو۔"

اکمل نے اس کی بے خیالی بھانپ لی تھی جبھی لان کے درمیان بنی روش پر ہی رک گیا۔

"ارے نہیں پاگل، یہ بات نہیں ہے، دراصل ندی گھر پر نہیں ہے۔"

"گھر پر نہیں ہے؟" وہ چونکا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے کچھ یاد سا آیا۔

"اوہ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا، آج تو کوئی فنکشن ہے نا یونی میں؟"

"ہاں دیر سے ہی آئے گی۔۔۔ آؤ تم اندر آؤ۔"

"نہیں آپی، کل آؤں گا آنٹی، انکل کو سلام کہیے گا۔" اُس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

"اچھا سنو! ایسا کیوں نہیں کرتے۔ تم ندی کو یونیورسٹی سے گھر چھوڑ دو، رستے میں بات بھی کرلینا۔"

"ارے ہاں، آئیڈیا تو اچھا ہے، چلیں ٹھیک ہے میں اُسے پک کرلیتا ہوں۔"

عائشہ نے مسکراتے ہوئے اُسے اللہ حافظ کہہ کر گیٹ بند کیا۔ ایک لحاظ سے تو وہ مطمئن تھی کہ اچھا ہے آج ناصر بھائی اور ندی کے درمیان بات نہیں ہو پائے گی اور چند روز مزید اسی طرح گزر جائیں گے مگر دوسری طرف خوشی یہ بھی تھی کہ بر وقت ایک اچھی بات دماغ میں آئی اور اکمل ندی کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہ سب کہہ سکے گا جس کے لیے وہ گھر تک آیا تھا۔

اور عائشہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اکمل کو ندی کی یونی جانے کا کہا تو گویا اسے تو ایک انجانی خوشی نے آگھیرا تھا۔ کیوں کہ وہ اُس سے عائشہ کے بدلتے رویے کے متعلق یقیناً گھر میں یوں کھل کر بات نہ کر پاتا اور پھر آج وہ ندی سے اپنی شادی کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا۔

ندرت نے واپسی کا ٹائم دس بجے کا دے رکھا تھا اور وقتِ مقررہ پر پہنچنے کی کوشش میں وہ گاڑی کو تقریباً اڑاتا ہوا یونیورسٹی گیٹ تک پہنچا تھا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد جو ٹائم دیکھا تو وقت ساڑھے دس بجے سے بھی اوپر ہو چلا تھا۔ اکثر لڑکیاں جا چکی تھیں اور کچھ ابھی تک ٹیبل کے اردگرد بیٹھی ڈنر کے ساتھ تبصروں کا بھی تبادلہ کیے جا رہی تھیں۔

یوں بھی اکمل کوئی پہلی دفعہ اس ڈیپارٹمنٹ میں نہیں آیا تھا جو انجان ہوتا۔ ایک دو مرتبہ پہلے بھی وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ اس لیے ناواقف بہرحال نہیں تھا۔ لیکن ہاں یہ ضرور تھا کہ اس وقت اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آرہا تھا جو کہ شناسا ہو۔ یہی سوچ کر کہ کہیں ندی کسی دوسری جگہ کھڑی انتظار نہ کر رہی ہو اس نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ یقیناً فون سائیلنٹ پر تھا یا پھر وہ بہت رش والی جگہ پر تھی، جبھی کئی دفعہ مسلسل بیل ہونے کے باوجود نہ تو فون بند کیا گیا اور نہ ہی ریسیو ہوا۔

اسی تلاش بسیار کے دوران اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ قدموں سے وہ آگے کی طرف چلا جہاں ہر کوئی آپس میں یوں چہ میگوئیاں، تبصرے اور گفتگو کر رہا تھا جیسے یہاں آج کوئی فنکشن نہیں دنگل ہوا ہو اور اب سب ہی ریفری کے فیصلوں اور کھلاڑیوں کے داؤ پیچ پر اپنی اپنی عقل کے مطابق تبصرے کر رہے تھے۔ اس نے ایک گروپ کو بیل سے ڈھکے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھا تو وہیں چلا آیا۔

"ارے اکمل تم۔۔۔ یہاں؟" زبیر اور صبا دونوں ہی اُسے جانتے تھے مگر یوں اچانک اسے اپنے درمیان دیکھ کر حیران ہو گئے تھے۔

"میں ندرت کو لینے آیا تھا، لیکن کہیں نظر نہیں آرہی۔"

اکمل کے پوچھنے پر دونوں نے ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں کچھ پوچھا۔

"آج تو پارٹی تھی نا، مگر آپ لوگ تو ایسا لگ رہا ہے الیکشن ہار کر کھڑے ہیں۔"

"پتا نہیں تم سے یہ بات کرنی بھی چاہیے یا نہیں۔"

زبیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو اکمل کی تمام حسیات لمحہ بھر میں بیدار ہو گئیں۔

"آپ لوگوں کے لیے میں نیا نہیں ہوں، بچپن سے آپ دونوں میری نیچر سے واقف ہیں پھر آج۔۔۔ آپ کا اس طرح کہنا۔۔۔ ندرت کہاں ہیں؟"

کچھ کہتے کہتے اسے ایک دم معاملے کی حساسیت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔

"ارے یار ایسا کچھ نہیں ہے وہ دراصل۔۔۔"

زبیر نے میران اور ندرت کے درمیان ہونے والی تلخی کی روداد شروع سے بیان کی۔

"ہاں وہ سب تو سمجھ میں آگیا، لیکن آج بھی کچھ ہوا ہے کیا؟" وہ بے صبرا ہوا جا رہا تھا۔

"آج میران نے ندرت کا گیٹ اپ کر کے انتہائی گھٹیا اسکٹ پیش کیا تھا۔ جس میں اپنے ایک دوست کو شاہ زین کا روپ دے کر اسے ندرت کے پیچھے آنے والے دم ہلاتے کتے سے تشبیہ دے ڈالی۔"

"کیا۔۔۔؟" اکمل اس قدر گھٹیا حرکت پر حیران ہوا تھا۔

"صرف یہی نہیں بلکہ اشارتاً یہ سب کہنے کے بجائے اس نے براہِ راست خود کو ندرت اور دوست کو شاہ زین کہہ کر متعارف کروایا۔"

"How Dere him" اکمل کی آنکھیں سرخ ہونے کو تھیں۔ مگر ٹریننگ کے دوران سکھائے گئے قوانین وضبط کے باعث اس نے خود کو بہرحال کمپوز کیے رکھا۔

"سبھی نے اس کے اس فعل کو بہت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس پر ندرت کا یہ کہنا کہ تیسری جنس کے افراد کیوں کہ میوزک کی بیٹ پر خود کو ظاہر ہونے سے نہیں روک پاتے اسی لیے آج میران کی اصلیت بھی سب کے سامنے آگئی ہے، اسے آگ ہی لگا گیا۔ اسی معاملے پر بات بڑھ گئی اور وہ چاروں ڈین کے آفس میں ہیں۔"

صبا نے تھکے تھکے انداز میں بات مکمل کی۔

"اچھا ہوا آج ناصر بھائی نہیں آئے، ہم دونوں کو یہ ٹینشن بھی تھی۔" زبیر نے کہا تو اکمل نے گہری سانس لی۔

"ڈونٹ وری، میں ندرت کے کہے بغیر گھر جا کر کچھ نہیں کہوں گا۔"

زبیر اور صبا نے مشکور انداز میں اسے دیکھا۔ کیوں کہ ناصر بھائی کے غصے سے وہ دونوں ہی واقف تھے۔

اسی دوران ندرت اور شاہ زین سامنے سے آتے نظر آئے تو وہ تینوں ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اکو؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

نزدیک آکر ندرت نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"ناصر بھائی ذرا بزی تھے تو عائشہ آپی نے مجھے آپ کو لینے کے لیے بھیج دیا۔"

اکمل کے جواب پر ندرت نے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اُن تینوں کو دیکھا جو یقینی طور پر آفس میں ہونے والی کارروائی جاننے کو بے تاب تھے۔

"میران کا ایڈمیشن کینسل کر دیا گیا ہے۔"

"کیا؟" صبا اور زبیر کو حیرت ہوئی تھی جبکہ اکمل کے تاثرات خاصے کمپوز تھے۔

"ہاں۔۔۔ اُسے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔"

شاہ زین نے ندرت کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔

"یہ سب اچھا نہیں ہوا ندی۔۔۔!" صبا شاید آنے والے خطرے کی چاپ محسوس کر رہی تھی۔

"جانتی ہوں۔" وہ پانچوں آہستہ روی اور تھکے تھکے قدموں سے داخلی گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"لیکن میں نے تو کبھی بھی ایسا نہیں چاہا تھا مگر۔۔۔ تم خود سوچو کتنے واہیات طریقے سے اس نے میرا مذاق اڑایا، شاہو کو دُم ہلاتے کتے جیسا متعارف کروایا اور میں نے تو پھر بھی اسے کچھ نہیں کہا،

یہی سوچا تھا کہ ڈین سے جا کر بات کروں، مگر بیک اسٹیج دیے جانے والے میرے کمنٹس کو خود اس نے اچھالا نا۔"

"ڈونٹ وری ندی! بی ریلیکس، ہم سب جانتے ہیں کہ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔" شاہ زین نے بھی ندرت کو تسلی دی۔

"وہ اس وقت زخمی سانپ کی طرح ری ایکٹ کرے گا، اس لیے ہر بات کے لیے تم ذہنی طور پر تیار رہو، سمجھیں؟" زبیر بولا۔

"وہ جو کچھ کرنا چاہے کرتا پھرے، میرے لیے یہی بات کافی ہے کہ میرے گھر والے مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ میں کیا ہوں، اس لیے دنیا کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے جب میرے امی، بابا اور بھائی میرے ساتھ ہیں۔"

"اور ہم بھی ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہیں۔" شاہ زین کے کہنے پر ندرت ہلکا سا مسکرائی۔ اکمل اب تک خاموشی سے تمام صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ جانتا تھا کہ خود کو ریلیکس ظاہر کرنے والی ندرت اندرونی طور پر کس قدر ڈپریس ہوگی کہ یہی اس کی بچپن سے عادت بھی تھی۔ اس کی وجہ سے کسی کو ڈانٹ پڑتی تو خود بھی اپ سیٹ رہتی اور سوچتی کہ کاش! وہ معاف کر دیتی تو دوسرا بچہ ڈانٹ کھا کر منہ بسورے نہ بیٹھا ہوتا اور پھر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو اپنے کھلونے اٹھا کر اسے دیتی۔ لیکن اب بات قطعی مختلف تھی۔ کئی بار نظر انداز کرنے کے باوجود میران کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور یوں بھی صرف ندرت ہی وہ پہلی لڑکی نہیں تھی جسے میران نے تنگ کیا ہو، اکثر لڑکیاں ڈین کے پاس جا کر اس کی شکایتیں کرتیں اور وہ محض وارننگ پا کر مزید سینہ تان کر چلنے لگتا۔ مگر تابوت میں آخری کیل اس وقت ٹھونکی گئی جب ڈین نے اس کے لمبے چوڑے حسب و نسب کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے کالج سے بے دخل کر دیا۔ اس ضمن میں پروفیسر خورشید کی گواہی نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ جن کی موجودگی میں بھی میران کلاس میں جملہ کسنے سے باز نہیں آیا تھا۔

اور اُس رات جب سب اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے تو سبھی کے دل بوجھل تھے مگر ظاہری طور پر وہ سبھی اپنی اس کیفیت کو دوسروں سے چھپائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

"ہوسکتا ہے اماں بھائی پارٹی کے بعد ٹیوشن دینے چلے گئے ہوں۔"

ثمینہ نے صحن میں بچھی چارپائی پر بے چینی سے پہلو بدلتی ماں کو دیکھ کر تسلی دینا چاہی تھی۔

"اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور پہلے سے بتا دیتا۔۔۔ بس اللہ خیر کرے، فون بھی نہیں کیا اُس نے۔"

"اماں فون تو تب کرتے اگر چارجنگ ہو پاتی، رات بھر لائٹ ہی نہیں تھی اس لیے یقیناً اُن کا فون بند ہے۔"

اماں نے اس کی بات پر خاموشی سے گردن ہلائی۔ نظر تھی کہ بار بار بھٹک کر مین گیٹ تک جا پہنچتی۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گرنے کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی تھی۔

سر پر تاروں بھری چادر کی طرف نظر کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر شاہ زین کی خیریت کی دعا کی تھی اور پھر جس طرح کے حالات تھے اس وجہ سے پریشانی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اسی اثناء میں بیل ہوئی تو اپنے اپنے خیالات میں گم ثمینہ اور اماں ہڑبڑا سی گئیں۔

"بھائی آ گئے۔" ثمینہ نے برق رفتاری سے جا کر گیٹ کھولا تو شاہ زین رات کے اس وقت اماں کو صحن میں موجود پا کر شرمندہ ہو گیا۔

"معاف کیجیے گا اماں، دیر ہو گئی۔"

اندر جانے کے بجائے وہ بھی وہیں اُن کے گھٹنوں پر سر رکھے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

"معافی تلافی بعد میں۔۔۔ لیکن یہ تو بتائیں اتنی دیر کیسے ہو گئی اور پارٹی کیسی رہی؟"

"ثمینہ۔۔۔!" اماں نے اُسے تنبیہی نظروں سے دیکھا تھا۔

"بیٹا! کتنی دفعہ سمجھایا ہے، باہر سے آنے پر فوراً سوال جواب نہ شروع کر دیا کرو۔"

شاہ زین کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے ثمینہ کو سمجھایا ضرور مگر اندر آتے شاہ زین کے تاثرات دیکھ کر وہ بھی چونک ضرور گئی تھیں۔

آتے جاتے ثمینہ سے چھیڑ چھاڑ، خوش گپیاں اور قہقہے جواب اس کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوتے لگے تھے آج پھر شاید اسے ادھورا چھوڑ رہے تھے۔ اماں نے یہ سب سوچا ضرور مگر شاہ زین سے کچھ بھی پوچھنے سے احتراز برتا۔

"اٹھو بیٹا، آؤ اندر چلتے ہیں۔۔۔ ثمینہ بھائی کے لیے روٹی بنا لو۔"

"نہیں امی، بھوک نہیں ہے مجھے۔"

"امی آپ بھی نا۔۔۔ بھئی بھائی آج ڈنر پارٹی میں گئے تھے، کھا پی کے آئے ہوں گے۔ ہے نا بھائی۔"

اندر جاتے جاتے ثمینہ نے تائید چاہی تھی۔ مگر جواب میں شاہ زین نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ میران کی نیچر اب تک اسے کافی حد تک سمجھ آ چکی تھی اسی لیے ہزار طرح کے وسوسے اور خدشات خودرو جھاڑیوں کی طرح ذہن کی پرسکون زمین کو گھیرنے لگے تھے۔ کچھ دیر تو دل ہی دل میں یہ ساری بات دبانے کی کوشش کی مگر آج تک اُس نے اپنی ہر پریشانی اماں کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی کہ اُن کا ساتھ اس کے لیے بڑا مضبوط سہارا ثابت ہوتا۔ سو آج بھی وہ اٹھا اور سیدھا اماں کے کمرے تک جا پہنچا جہاں اماں اور ثمینہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ آہستہ قدموں سے چلتا شاہ زین خاموشی سے بیٹھ کر اُن کے پاؤں دبانے لگا تو اماں نے آنکھیں کھول دیں۔ ثمینہ بھی اٹھ بیٹھی تھی کہ شاہ زین کا یہ انداز دن کے سمجھا دیتا تھا کہ وہ شدید پریشانی میں ہے اور سکون چاہتا ہے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟ پریشان ہو؟"

"جی اماں!"

"کیا کوئی بدمزگی ہو گئی پارٹی میں؟"

اماں نے براہِ راست سوال کیا تو اُس نے چونک کر سر اوپر اٹھایا اور گہرا سانس لے کر لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔

"اماں وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔"

کچھ لمحے بعد شاہ زین نے بولنا شروع کیا تو اول روز ندرت سے نام پوچھنے سے لے کر آج تک کا احوال بنا کچھ بھی چھپائے کہہ ڈالا نہ صرف یہ بلکہ اُس نے اپنی اور ندرت کی دلی وابستگی کے متعلق بھی سب بتا دیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو کس حد تک چاہتے ہیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو ثمینہ خوشی سے اچھلنے کودنے لگتی کہ گھر آنے والی بھابھی، شاہ زین کے دل کو چھو چکی ہے لیکن اس وقت معاملہ ظاہر ہے مختلف تھا سو خاموش بیٹھا رہنا ہی مناسب خیال کیا۔

اماں نے حسب عادت شاہ زین کی مکمل بات سننے کے بعد دھیمے لہجے اور نرم لفظوں میں اُسے دلاسا دینا شروع کیا تو وہ جیسے ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔

☆☆☆

یونیورسٹی کے احاطے میں طلوع ہونے والی نئی صبح چمکیلی ہونے کے باوجود گرد آلود محسوس ہو رہی تھی۔

میران یونیورسٹی سے نکالا جا چکا تھا مگر اس کے چیلے بہرحال موجود تھے۔ ندرت اور شاہ زین اتفاق سے اکٹھے ہی یونیورسٹی گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو کئی چبھتی نظروں نے ان کا استقبال کیا۔

زبیر اور صبا ہمیشہ کی طرح نت نئے پھولوں سے مزین مستطیل کیاریوں کے پاس ان کا انتظار کر رہے تھے اور یہی ان سب کی روٹین تھی جو بھی پہلے آتا وہ یہیں موجود رہ کر باقی سب کا انتظار کرتا اور پھر اکٹھے ہونے پر قدم آگے بڑھائے جاتے۔

"فون کیوں بند تھا رات کو؟" صبا نے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

"بس یار! ایک تو ویسے ہی اتنا لیٹ ہو گئے تھے پھر گھر جا کر میں ذرا اکیلا رہنا چاہتی تھی۔"
"مجھے معلوم تھا اسی لیے میں نے چاہنے کے باوجود رات کو کوئی میسیج نہیں کیا۔"
شاہ زین اُس کے مزاج سے بخوبی واقف ہے، اس بات کا یقین ندرت کو بہت پہلے سے تھا۔
"تمہارے میسیجز میں نے صبح پڑھ لیے تھے۔"
"آنٹی کو کچھ بتایا؟"
"نہیں۔"
"بتا دینا چاہیے تھا، انکل اور آنٹی کو ہر بات کا علم ہونا چاہیے۔"
زبیر نے بڑا مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ شروع سے ہی وہ ندرت کو یہی کہتا کہ ناصر بھائی یا ثروت آپا کو کچھ بتاؤ یا نہ بتاؤ مگر گھر سے باہر ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی امی، بابا سے ضرور شیئر کرلیا کرو۔ اس طرح انسان کئی چھوٹی بڑی پرابلمز سے بچ جاتا ہے۔
اور زبیر کی یہی بات اُس نے گویا گرہ سے باندھ لی تھی اور روزانہ گھر جا کر جب تک "الف" سے لے کر "یے" تک امی بابا کو بتانہ لیتی اسے سکون نہ ملتا۔
"میرے جانے تک وہ دونوں سو چکے تھے، تمہیں پتا ہے نا امی زیادہ دیر جاگ نہیں پاتیں اور بابا کو ویسے ہی کئی دنوں سے بخار ہو رہا ہے، بس اسی لیے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا، آج بتا دوں گی۔"
ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی چاروں کے قدم گویا باندھ دیے گئے تھے۔ نا سمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے نظریں نوٹس بورڈ پر جارکیں جہاں ایک اخبار کا تراشا بیچوں بیچ لگا آنے جانے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ جس میں ندرت کو سیاہ بریسلیٹ پہناتا شاہ زین اپنی والہانہ مسکراہٹ سے ندرت کو دیکھتا تصویر میں قید تھا، ہتھیلی پر دونوں کے جذبوں کی عکاسی کرتا شعر بھی اس اخباری تصویر کا نمایاں حصہ تھا۔
"دو پیار کے پروانوں کا راہ میں آنے والا ہر پتھر ہٹا دینے کا عزم۔"

سفید پڑتے چہروں اور ساکت آنکھوں کے ساتھ تفصیل پڑھنے پر معلوم ہوا کہ میران کی طرف سے ان دونوں کی وجہ سے یونیورسٹی اور خصوصاً ڈیپارٹمنٹ کا ماحول خراب ہونے کی شکایت پر بجائے اس کے کہ ان دونوں کے خلاف کارروائی کی جاتی، شکایت کرنے والے میران کو ہی یونیورسٹی سے نکال باہر کیا گیا۔ جس پر میران نے اعلا حکام سے انصاف کی اپیل کرتے ہوئے اپنا تعلیمی سال بچانے کی بھی درخواست کی ہے۔
وہ سب جانتے تھے کہ میران جیسے انسان کے لیے یہ ڈگری وغیرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ سب کرنے کا مقصد انصاف مانگنا نہیں بلکہ ان دونوں کو بدنام کرنا تھا جس میں وہ مکمل کامیاب ہو گیا تھا کہ جس جگہ یہ نوٹس بورڈ موجود تھا اُسے اسٹوڈنٹس کی زبان میں یونیورسٹی چوک کہا جاتا تھا جہاں سے چار مختلف ڈیپارٹمنٹس کی طرف رستہ نکلتا اور چاروں ڈیپارٹمنٹس کے نوٹس بورڈز ایک دوسرے کی متضاد اطراف ہونے کی وجہ سے اکثر اسٹوڈنٹس کا رش رہتا۔ اسی لیے میران کے چیلوں نے صرف ایک نوٹس بورڈ کے بجائے وہی تراشا چاروں طرف آویزاں کر دیا تھا۔ تاکہ جنگل کی آگ کی طرح یہ بات سب تک پہنچنے میں تاخیر نہ ہو۔
"یہ۔۔۔ یہ سب۔۔۔ کیا تماشا ہے یہ؟"
زبیر یہ سب دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا تھا اور یہی حال یقیناً ان تینوں کا تھا، لیکن ایک بار پھر شاہ زین کا ضبط اُن سے جیت گیا تھا۔
"کول ڈاؤن یار! یہاں پر کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر کرنے سے مزید تماشا بنے گا، بہتر ہے کہ ہم ڈیپارٹمنٹ ہیڈ سے بات کریں۔"
"ہاں زبیر! شاہ زین ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے۔ بات مزید بگڑ سکتی ہے۔"
"مزید؟" ایک تو وہ پہلے ہی تپا ہوا تھا اُس پر صبا کی بات پر مزید گرمی کھا گیا۔
"یعنی ابھی کسی بھی "مزید" کی گنجائش باقی ہے؟

تمہارے خیال میں؟"
"زبیر کام ڈاؤن۔"
ندرت کے کہنے پر اس نے اپنا تمام تر غصہ بند مٹھیوں اور جبڑوں پر منتقل کیا تھا۔
"ندری تم پریشان تو نہیں ہونا۔"
"بالکل بھی نہیں۔ بلکہ میں تم سب سے بھی کہوں گی کہ اتنا مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"کیا مطلب؟" ڈیپارٹمنٹ ہیڈ کے آفس جانے سے پہلے سارے تراشے اتار لیے گئے تھے اور اب وہ چاروں راہداری سے گزر رہے تھے جب صبا نے حیرت سے پوچھا۔
"بھئی مطلب یہ کہ ڈین کے آفس تو ہم جا ہی رہے ہیں اس کے علاوہ مجھے اور کسی کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے کیوں کہ میرے گھر والے مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ میں ایسا کوئی بھی قدم نہیں اٹھا سکتی جس سے ان کی عزت پر حرف آئے۔"
کندھے اچکا کر بڑے لاپروا انداز میں جواب دے کر وہ اُسی اعتماد سے آگے بڑھ رہی تھی جو اس کا خاصہ تھا۔ چہ میگوئیاں، سرگوشیاں اور اشارے شاید اُسے نظر ہی نہیں آرہے تھے۔
"لیکن یار دنیا کی نظریں۔۔۔"
"دنیا کی نظریں چاہے برچھی ہوں یا تلوار، میرے پاس اپنوں کی ڈھال ہے جو مجھ پر ہونے والا ہر وار پہلے خود پر سہہ جانے کی خواہش بھی رکھتے ہیں اور طاقت بھی۔ کیوں شاہو؟" ننھی سی ناک میں چمکنے والی زرقون کی لونگ آج ندرت کی آنکھوں کی چمک کو مات دینے میں واضح طریقے سے کامیاب ہوئی تھی کہ اس کا لہجہ چاہے کتنا ہی مضبوط اور پرعزم ضرور تھا مگر جھیل جیسی آنکھوں میں وہ چمک مفقود تھی جو شاہ زین سے بات کرتے ہوئے ایک دم ہی اُن میں کوند آئی۔
"بے شک ندی! میں بڑی بڑی باتیں تو نہیں کر سکتا، نہ ہی میں تم سے تارے توڑ لانے کا وعدہ کروں گا لیکن ہاں تمہارے اپنوں کی یہ ڈھال کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا۔ یہ وعدہ رہا۔"
"تم بھی تو میرے اپنے ہونا؟" آج پھر ندرت کو تائید تازہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔
"جی نہیں کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔" انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہہ کر شاہ زین نے اُن کے بڑھتے قدموں کو رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔
"میرا مطلب تھا میں تو بہت اپنا ہوں، ہے نا؟" اپنی ازلی دھیمی سی ہنسی کے ساتھ اُن سب کی غصیلی نظروں کے جواب میں شاہ زین کو فوری وضاحت دینا پڑی تھی۔

☆☆☆

یہ کہنا کہ ندرت پر اس واقعے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا بالکل غلط ہوگا۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ان سب باتوں سے بڑھ کر وہ اس لیے پریشان تھی کہ وہ ان سب کی پریشانی کا سبب بن گئی تھی اور وہ بھی ان دنوں میں جب کہ فائنل ایئر کے امتحانات سر پر تھے۔ اسی لیے اُن کے سامنے سارا دن خود کو کمپوز کرنے کی کوشش میں جب تھکنے لگی تو گھر کا رخ کیا کہ اُس کے آنے تک اخبار نہیں آیا تھا اور اب اُسے جا کر اُن سب کے سامنے یہ سارا معاملہ رکھنا تھا۔
جون جولائی کا حبس زدہ موسم، اُس پر لڑکیوں سے کھچا کھچ بھری بس میں بیٹھنا جہاں رش کی وجہ سے ہوا کا ایک جھونکا بھی اندر داخل ہونے کی جرأت نہ کرتا۔ اکثر اوقات تو دروازے کے بالکل قریب کھڑی لڑکیاں باہر بھی جا گرتیں مگر اس کے باوجود وہ خود کو چیلنجر ثابت کرنے کی کوشش میں وہیں کھڑی بھی ضرور ہوا کرتیں۔
اللہ اللہ کر کے ندرت کا اسٹاپ آیا تو وہ صبا کو اللہ حافظ کہہ کر لڑکیوں کی طعنے دیتی آنکھوں کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے تیزی سے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔
آج یونیورسٹی میں گزارا گیا دن ندی کو اپنی اب تک کی زندگی کا مشکل ترین دن معلوم ہوا تھا۔ اپنے اندر ہوتی جنگ کو دوسروں کے سامنے صرف اس لیے

ظاہر نہ کرنا کہ وہ اس کی وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ آج انتہائی دشوار معلوم ہوا تھا۔

بس سے اتر کر گھر تک جاتے جاتے اس کے ذہن کے پردے پر ایک بار پھر میران سے جڑے تمام واقعات ایک ایک کر کے نمودار ہوتے جا رہے تھے۔ خس کم جہاں پاک کے مصداق اس کا ایڈمیشن کینسل ہونے پر اس نے جو سکھ کا سانس لیا تھا وہ محض پانی کا جھاگ ثابت ہوا اور بس۔

اس کا خیال تھا کہ گھر جا کر وہ ناصر بھائی اور بابا کے ساتھ مل کر میران کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتے ہوئے ہتک عزت کا کیس فائل کرے گی کیوں کہ ایک ہی رات میں اور صرف اخبار کی خبر کے نتیجے میں جس طرح آج یونیورسٹی میں اُسے اپنے اور شاہ زین کے —— ہوٹلوں میں جانے اور ایک ساتھ وقت گزارنے کی باتیں، تصدیق کرنے کی غرض سے سننے کو ملی تھیں وہ —— نہ صرف اس کے لیے ناقابل برداشت تھیں بلکہ یقینی طور پر گھر والے بھی ایسے شخص کو سزا دینے کو بے تاب ہوں گے جن کی وجہ سے اُس کا نام اور تصویر یوں بک اسٹالز پر رکھے اخباروں کی زینت بنا۔

اور مسئلہ صرف اس کا نہیں تھا بلکہ اسے یہ بھی فکر لاحق تھی کہ شاہ زین کے گھر کا دارومدار جن ٹیوشنز پر ہے ان میں سے کئی ٹیوشنز فی میل اسٹوڈنٹس کی بھی تھیں اور اگر ہونے والے اس غیر متوقع فعل پر اُن اسٹوڈنٹس کے والدین اُسے اُن کے گھر آنے اور ٹیوشن پڑھانے سے منع کر دیں تو یقیناً یہ شاہ زین اور اس کی فیملی کے لیے معاشی طور پر ایک دھچکا ثابت ہوگا۔ اس بات پر دھیان جاتے ہی اسے شاہ زین سمیت اس کے تمام فیملی ممبرز کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ جن سے وہ آج تک ملی تو نہیں تھی لیکن شاہ زین کی نسبت سے اُسے ان سے ایک خاص لگاؤ ضرور محسوس ہوتا۔

یوں بھی سچی محبت کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس سے جڑی تمام خوبیوں، خامیوں حتیٰ کہ اس سے جڑے تمام رشتوں سے بھی محبت ہو جائے۔ اسے یاد تھا ایک دن یونیورسٹی میں اپنے لیپ ٹاپ پر اس نے شاہ زین سے اس کا گھر دیکھنے کی خواہش کی تھی اور گوگل (google) کی مہربانی سے نظر آنے والا اس کے گھر کا گیٹ بھی ندی کو اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے جانے کب تک اور کہاں تک چلتی رہتی کہ اپنے گھر کا گیٹ سامنے نظر آنے پر خیالوں کا تسلسل ٹوٹا اور گہری سانس کے ذریعے اندر کی تمام تھکن کو باہر نکال پھینکنے کے بعد دایاں پاؤں اندر رکھتے ہوئے اُس سلطنت میں داخل ہوگئی جہاں کی شہزادی تصور کی جاتی تھی۔

☆☆☆

سپنے بُننے والی لڑکیو!
ایسے انوکھے خواب نہ دیکھو
نازک سی اک گڑیا جیسے موم قدم
اور تپتی جھلستی ریت کا رستہ
جن کے عوض تعبیر ملے
سپنے بُننے والی لڑکیو!
خوابوں کی دنیا میں بے شک
کوئی باؤنڈر، نگراں یا ناصح نہیں ہے
پنچھی، ندیا، پون کی مانند
بلاشبہ آزاد ہو تم
اتنا لیکن ذہن میں رکھنا
بیرن دھوپ میں خواب جلیں تو
موم پگھلنے لگتا ہے
اور یہ جھلسے پاؤں اگر
ننگے بھی ہوں۔۔۔
پاس کوئی مرہم بھی نہ ہو
پھر تپتی ریت پہ چلنا سوچو
کتنا مشکل ہوتا ہے
سپنے بُننے والی لڑکیو!
ایسے انوکھے خواب نہ دیکھو۔۔۔

دیکھا جائے تو مہربانو کی اداس آنکھوں نے کوئی ایسا ناممکن خواب نہیں بنا تھا جس کی تعبیر نہ مل سکتی ہو۔۔۔ "توجہ" صرف اور صرف توجہ، ہاں اسی چار لفظی احساس کا تو خواب آج کل اس کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ کیوں کہ گھر میں سب ہی اُس سے محبت کرتے ہیں۔ اس بات کا یقین تو اسے تھا ہی، وہ جانتی تھی کہ ماں باپ اور بھائی بھی اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ لیکن شاید رویوں میں اس پیار کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ دکھ بس اسی کا تھا۔

یہی بات وہ محسوس تو شروع سے کرتی تھی لیکن اپنے "حسب نسب" کی وجہ سے "عام" لوگوں سے میل جول نہ ہونے کی وجہ سے اس احساس میں وہ شدت نہیں تھی جو اب ہاسٹل میں اپنی روم میٹس سے اُن کی باتیں سننے کے بعد خیالات میں در آئی تھی۔ اپنی زندگی بالکل روکھی پھیکی اور نمائشی لگنے لگی تھی اسے۔

گاؤں میں محض ملکانی ہونے کی وجہ سے سبھی اسے انتہا درجے کی عزت دیتے۔ نہ صرف یہ بلکہ سید ہونے کی وجہ سے اس عزت کے ساتھ عقیدت کا پھول جو جڑا تو پھر ہمیشہ اسے کوئی بلند شے ہی سمجھا گیا۔ بچپن میں تو خود اسے ان چیزوں کا شعور نہیں تھا بلکہ اپنے ماحول ہی کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو دیکھنے کے لیے ہمیشہ اس کی نظر رحم بھری ہی ہوا کرتی۔ اسے یاد تھا کہ ہاسٹل آنے سے پہلے تک وہ یہی سمجھتی رہی کہ تمام لوگوں کے مقابلے میں وہ واقعی بلند ہے۔ باقی تمام لوگ کسی بھی طرح اس کی برابری کے نہیں اور پھر ستم پر ستم یہ کہ وہ بلندی کے جس مینار پر موجود تھی وہاں کسی کو بھی سر اٹھا کر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

لیکن بڑے بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ دوستی انسان کی ذات پر ضرور اثر ڈالتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ اچھے دوست بنائے جائیں تا کہ ایک تو یہ کہ اگر آپ کا تعارف کروانے کے لیے دوستوں کا نام بھی استعمال کیا جائے تو باعث عزت و وقار ہو اور دوسری بات یہ کہ اُن سے اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو، اچھے اثرات ضرور بالواسطہ آپ کی زندگی پر اثر انگیز ہوں گے۔

اس بلندی پر بہت تنہا ہوں
کاش میں سب کے برابر ہوتی

زندگی کے اس موڑ پر جبکہ اس کے —— ذہن و دل بدلتے نظریات کی کشمکش میں ہوتی اس کی ذات کی تربیت اور معاشرتی حقائق کی جنگ کے سامنے بے بس نظر آنے لگے تھے۔ اُسے کوئی ایسا ہمدرد درکار تھا جس سے وہ اپنی ذات کی آگہی کے متعلق بات کرے۔ اُسے بتائے کہ اب اُس کے اندر ایک واضح تبدیلی آ رہی ہے۔ اُسے اپنے لیے چھوٹی ملکانی کے بجائے محض مہربانو سننا اچھا لگتا ہے۔ وہ مزارعوں اور کمیوں کی بیٹیوں سے بھی اُسی طرح باتیں کرنا چاہتی ہے جیسے شہر میں سب سے کرتی ہے جہاں کوئی بھی اسے خاص سمجھ کر عزت و تکریم کے مینار پر بٹھا کر تنہا نہیں کرتا اور۔۔۔ اور جہاں اُسے اس بلند و بالا اور وسیع و عریض حویلی سے کہیں زیادہ سکون اپنے اس کمرے میں ملتا ہے جہاں وہ اپنی دوسری دو روم میٹس "میری" اور "کنول" کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ تینوں مکمل طور پر مختلف بیک گراؤنڈز سے آنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر گھل مل گئی تھیں کہ لگتا بچپن کی سہیلیاں ہیں۔

یہ اور دوسری ڈھیر ساری باتیں وہ ملکانی سائیں سے کرنا چاہتی تھی مگر اُن کے پاس ہر وقت میران کی باتوں کے سوا اور کوئی موضوع نہ ہوتا۔ وہ کبھی ان کے پاس بیٹھتی تو میران کے شکار کے قصے، گاؤں والوں پر رعب کے واقعات یا پھر شاہ سائیں کی سیاست اور بعض اوقات ان کی ذات پر شکوک و شبہات کا اظہار دبے لفظوں میں کرنے کے علاوہ ان کے پاس مہربانو کی باتیں سننے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

اور تب مہربانو کو ملکانی سائیں پر بھی ترس آتا۔ اسے احساس ہوتا کہ وہ بھی تو تنہا اور اکیلی ہیں اور وہ بھی اس مینار پر کھڑی ہیں جہاں سے وہ نیچے اترنے کی سعی میں مصروف ہے۔ اُن کا بھی تو دل چاہتا ہوگا کسی سے دکھ سکھ کرنے کا۔۔۔ سو وہ چپ چاپ خاموشی سے گردن ہلاتی ان کی باتیں سنتی جاتی۔

یوں بھی شاہ سائیں سے عمر میں بڑی ہونے کی وجہ سے بھی ایک عدم تحفظ کا احساس تھا جو وہ مہربانو کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

ہم انسان چاہنے نہ چاہنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ پانی کی لہروں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح اکیلی لہر کا وجود کوئی حیثیت، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنی ذات کے اظہار اور اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لیے دوسری لہروں کا ساتھ بہرحال ضروری ہوتا ہی ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کا بھی اکیلا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، اسے خوشی، غمی یا کسی بھی کیفیت میں دوسرے انسان کی ضرورت محسوس ہوتی ہی ہے۔ اپنا دکھ سکھ شیئر کرنے کے لیے اکثر اوقات انسان متلاشی نظروں سے کسی ہمدرد اور مخلص کی تلاش میں رہتا ہی ہے اور ذرا سی محبت پا کر خلوص کا احساس ہوتے ہی اندر کا تمام غبار نکال باہر کرتا ہے۔

یہی حال ملکانی سائیں کا تھا۔ وہ مہربانو سے ساری باتیں کہہ کر خود کو ہلکا کر لیتیں یہ جانے بغیر کہ اس کا دل کا بوجھ ابھی تک وہیں کا وہیں ہے۔

انہی سب باتوں کی وجہ سے مہربانو نے طے شدہ پروگرام سے چند روز پہلے ہی واپس شہر جانے کا ارادہ کرلیا۔

چل بلھیا، چل اوتھے چلیے جتھے سارے ہوون انّھے
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے، تے نہ کوئی سانوں منّے

☆☆☆

"ارے واہ۔۔۔ آج تو کمال ہوگیا ناصر بھائی! شام سے پہلے ہی چاند نظر آرہا ہے۔" لان عبور کرکے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہی آج خود سے پہلے ناصر بھائی کو گھر میں موجود دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم گئی تھی۔

اور خوشی کے اسی احساس کے زیر اثر وہ یہ نوٹ کرنا قطعاً بھول ہی گئی تھی کہ آج صرف اور صرف ان کا اس وقت گھر میں ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی بلکہ امی عائشہ اور سب سے بڑھ کر بابا جو بخار سے پھنکنے کے باوجود سب کے ساتھ وہاں یوں خاموشی سے موجود تھے جیسے کسی کے گھر جوان اور حادثاتی موت کا پرسہ دینے کی نیت سے آئے ہوں۔ اسی دوران اس کی آواز سن کر کچن سے برآمد ہوتی ثروت آپا نے تو جیسے اس کی چیخیں نکال دیں۔ ننھے رضا کو گود میں لیے اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس آتیں، شولڈر بیگ صوفے پر اچھال کر وہ خود ان کی طرف لپکی اور رضا کو گود میں لے کر اس کے پھولے پھولے سے گالوں پر پیار سے چٹکی لے کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ صبح سے حواسوں پر چھائی پریشانی تو اسے یاد ہی نہیں رہی تھی۔

"مجھ سے تو ایک چاند کی خوشی سنبھالے نہیں جا رہی تھی کہاں یہ تین تین چاند۔۔۔"

رضا کی ننھی منی گلابی انگلیوں سے اپنے ریشمی بالوں کو چھڑواتے ہوئے اس نے ناصر کی طرف دیکھا۔

"اتنی ہی بھولی سمجھتے تھے ہم تمہیں، لیکن لعنت ہے ہماری سوچ پر۔"

ناصر نے انتہائی درشت آواز میں ندرت کی توقع کے برعکس جواب دیا تو وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں بات کے پس منظر تک جا پہنچی۔

"بھائی وہ۔۔۔"

"بھائی؟ نام لے کر بلاؤ مجھے نام لے کر۔۔۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو امی، بابا کے ساتھ وہ بھی سہم گئی۔

"بھائی سمجھتیں تو عزت کو یوں اخباروں میں اچھلنے نہ دیتیں۔ اس گھٹیا اور سڑک چھاپ لڑکے کے ساتھ ہوٹلوں میں نہ گھومتیں۔۔۔"

"بھائی یقین کریں جھوٹ ہے یہ سب۔" تمام تر ہمت جمع کر کے وہ بولی تو ضرور مگر ناصر آج اس کی کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔"

"ناصر۔۔۔ بیٹا! ذرا دھیمے لہجے میں بات کرو تو بہتر ہوگا۔ آخر بہن ہے تمہاری۔" بابا نے نقاہت بھرے انداز سے بڑے بکھرے اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں التجا کی۔

"دھیما کیا اور سخت کیا، میں تو اس سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا، اس جیسی بہنوں کو تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔"

ندرت جسے کسی نے سخت لہجے میں کبھی مخاطب نہیں کیا تھا آج اس نفرت آمیز لفظوں کی تاب نہ لا کر لڑکھڑاتے ہوئے بابا کے پاؤں پر گر پڑی۔

بے لوث اور سچے رشتوں سے مزین اپنوں کی ڈھال ٹوٹنے لگی تھی۔۔۔

بابا نے اسے اپنے ساتھ بٹھانا چاہا مگر وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھی ان کے گھٹنوں پر سر رکھے ماں کے چہرے پر موجود بے بسی کو دیکھے گئی۔

یقینی طور پر وہ سب کافی دیر سے بیٹھے یہی بات کر رہے تھے۔ اس بات کا اندازہ ندرت نے امی کے ستے ہوئے سرخ چہرے اور آنکھوں کے پپوٹوں کے بوجھل پن سے لگایا تھا۔

"ندرت بتاؤ کیا ہے یہ سارا معاملہ، میرے سسرال والے بھی آج صبح سے مجھ سے سب کچھ پوچھ رہے ہیں۔۔۔ تم از کم میرا تو سوچتیں نا، کس طرح فیس کروں گی دنیا والوں کو کیا بتاؤں گی سب کو کہ وہ لڑکا کون ہے اور تم کیوں اس کے ساتھ ہر روز ہوٹلوں میں نظر آتی تھیں؟"

ثروت آپا کو اس سے زیادہ اپنی ازدواجی زندگی کی فکر لاحق تھی۔

"تم کسی کو کیا بتاؤ گی؟ عائشہ سے پوچھو جس نے اکثر اسے رات رات بھر فون پر باتیں کرتے سنا ہے۔۔۔ میرا تو خون کھول رہا ہے دل چاہتا ہے ابھی اسی وقت اس کا بھی خون کر دوں اور اس کے عاشق کا بھی۔"

ندرت اپنے بالوں پر بابا کے آنسو محسوس کرتے ہوئے کرب وضبط کی آخری منزل پر تھی۔ یوں بھی ابھی اس کی آنکھوں کی جھیل ویران اور خشک تھی۔ سکتے کے عالم میں رنگ بدلتے رشتوں کو بس دیکھے ہی جا رہی تھی۔

"ناصر!" امی جو آج ایک ہی دن میں بوڑھی لگنے لگی تھیں اپنی نحیف آواز میں اعتماد سموتے ہوئے بولیں۔

"مجھے اور تمہارے بابا کو ندرت پر آج بھی اتنا ہی اعتماد ہے جتنا کل تھا۔ نہ ہم اس سے کوئی تفتیش کریں گے نہ پوچھ گچھ۔"

"تمہاری ماں ٹھیک کہتی ہے کیوں کہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ کر کوئی بھی فیصلہ سنا دینا کوئی عقل مندی نہیں ہے۔" بخار کی شدت کی وجہ سے ابا نے بمشکل بات پوری کی۔

"ہاں بابا آپ دونوں بھی ٹھیک کہتے ہیں اور آپ کی بیٹی بھی، لیکن یاد رکھیے گا دنیا والوں کے پاس تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کا وقت کبھی نہیں ہوتا۔"

ناصر نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا اور کارپٹ پر رکھے رضا کے کھلونے کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا۔ عائشہ بھی رکی نہیں اور اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ ثروت آپا نے چند لمحے ساکت وجامد ندرت کو دیکھا اور پھر اس کے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گئیں رضا فوراً اپنے کھلونے کی طرف لپکا تھا۔

"کتنا اعتماد کیا تھا تم پر۔۔۔ اور کیا صلہ دیا تم نے۔"

ان کے لہجے میں طنز نہیں تھا لیکن تاسف ضرور تھا، کچھ کھو دینے کا دکھ ان کے چہرے پر صاف نظر آرہا تھا اور یہی انداز ندرت کو اندر تک گھائل کرتا گیا۔

"اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ تمہیں ان سب باتوں کا کچھ ملال کوئی دکھ بھی نہیں ہے، ندامت کا ایک آنسو تمہاری آنکھ سے نہیں ٹپکا۔۔۔ یہ محبت ہے تمہیں ہم سے کہ ہماری عزت کے جنازے پر تمہاری آنکھ تک نہیں بھیگی۔"

ندرت نے ان کی بات پر بابا کے گھٹنے سے سر اٹھایا تو محسوس ہوا کہ بخار کی شدت اس قدر تیز تھی کہ خود ندرت کا دایاں گال سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً بابا کی طرف متوجہ ہونا چاہا مگر ثروت آپا یقیناً اس کی خاموشی پر زچ ہو رہی تھیں تبھی اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ

ڈالا۔

''میں تم سے پوچھتی ہوں کیوں پرزہ پرزہ کر دیا ہمارے اعتماد کو۔۔۔؟ بولو۔۔۔ میں کہتی ہوں بتاؤ مجھے۔۔۔''

''ہاں ہاں میں مانتی ہوں کہ پرزہ پرزہ کیا ہے اعتماد، لیکن میں نے نہیں آپ لوگوں نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں میرے اُس اعتماد کی جو مجھے آپ سب پر تھا۔۔۔ یہی اخبار میں یونیورسٹی میں دیکھ کر آئی ہوں۔ لیکن میرے قدم مضبوط تھے، کسی کے سامنے نظر جھکا کر نہیں چلی، کیوں؟ کیوں کہ مجھے اعتماد تھا آپ پر، بھائی پر کہ دنیا والے چاہے مجھے کچھ بھی کہیں لیکن ہر مشکل وقت میں میرے اپنے میرے دفاع کے لیے موجود رہیں گے مگر یہاں۔۔۔ ہونہہ! ارے قتل کے مجرم کو بھی صفائی کا موقع دیے بغیر پھانسی کی سزا نہیں سنائی جاتی لیکن آپ لوگوں نے تو مجھے لفظوں سے سنگسار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

بات کرتے کرتے ندرت کا گلا ضرور رندھ گیا تھا مگر آنسو پھر بھی اس کی اجازت کے منتظر تھے اور یوں بھی وہ بچپن سے ہی امی بابا کے علاوہ اور کسی کے سامنے رو کر خود کو کمزور دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

''ندرت تم اعتماد۔۔۔'' ثروت آپا ابھی تک اپنے موقف پر قائم تھیں۔

''اعتماد، اعتماد، اعتماد۔۔۔ پتا بھی ہے آپ کو اس لفظ کا مفہوم؟ کو ایجوکیشن میں تعلیم دلوانا اعتماد نہیں ہوتا ثروت آپا۔۔۔! اعتماد وہ ہوتا ہے جو میرے امی بابا نے مجھ پر کیا، کہ جب دنیا والوں کے ساتھ میرے اپنے بہن بھائی مجھ پر بہتان باندھ رہے ہیں تو ان دونوں نے مجھ سے کوئی بھی صفائی مانگے بنا صرف میری خاموشی پر بھی اعتماد کیا۔ اس بات پر یقین رکھا کہ یہ سب ایک من گھڑت کہانی ہے اور بس۔''

ثروت آپا نے رضا کو اٹھایا اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''امی بابا کبھی اس چار دیواری سے باہر نکلیں، لوگوں کی باتیں سنیں تو پھر میں دیکھوں کہ کیسے قائم رکھتے ہیں اپنا اعتماد۔۔۔ تمہیں تو کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔۔۔ پہلے خوب صورتی میں پورے خاندان سے الگ تھیں اب کردار کی رنگینیوں میں بھی منفرد ہو گئی ہو، چرچے پہلے بھی ہر طرف تھے اور آئندہ بھی رہیں گے۔''

ثروت آپا بڑبڑاتی ہوئی آگ اگلتی گیسٹ روم کی طرف چل دیں جو شادی سے پہلے اُن ہی کا کمرہ ہوا کرتا تھا۔

سسرال والوں کے سوالات کی بوچھاڑ نے اُن کے سامنے بہن کی محبت اور جذبات سب دھندلا دیے تھے۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ سسرالیوں کے سامنے عزت کیسے بچائی جائے اور ظاہری طور پر کوئی بھی راہ سجھائی نہ دینے پر وہ اس قدر جھنجھلائی ہوئی تھیں کہ کمرے میں آتے ہی رضا کو بیڈ پر پٹخ کر اس کے رونے کی پروا کیے بغیر جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمرے کے چکر کاٹنے لگیں۔

☆☆☆

ملکانی سائیں کے کہنے کے عین مطابق اس رات دیر ہو جانے کی وجہ سے میران نے گھر جانے کے بجائے شہر والے فلیٹ پر ہی رکنے کا جو فیصلہ کیا تو اب تک وہیں موجود تھا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ ملکانی سائیں کا بہت فرماں بردار بیٹا تھا بلکہ بات تو دراصل یہ تھی کہ وہ فرماں برداری بھی اپنی مرضی سے ہی کیا کرتا تھا۔ جو بات اسے اچھی اور قابلِ عمل لگتی اسے مان لیا کرتا جبکہ جو بات اچھی نہ لگتی وہ ملکانی سائیں کو اس کی ماننی پڑتی۔

سو اس دفعہ بھی اگر وہ رات شہر ہی میں رک گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ ملکانی سائیں کی طرح راستے کی ویرانی سے اندھیرا ہو جانے کی وجہ سے ڈر گیا تھا بلکہ اسے دوسرے روز اخبار میں تفصیلی خبر چھپوانے کا انتظام کرنا تھا۔

یوں بھی اخبار مالکان کے مقرر کردہ عہدیدار عموماً اس قسم کی خبریں چھاپنے کے لیے کسی بھی قسم کی تحقیق یا چھان بین کر کے حقائق کی بنیاد پر کام کرنے کا تردد نہیں کیا کرتے بلکہ انہیں تو محض فرسٹ پیج، لاسٹ پیج پر مقام اور سطروں کے تعداد کے مطابق اپنے چارجز سے غرض ہوتی ہے اور بس۔ ہاں البتہ بعد میں اگر کوئی باقاعدہ ثبوت کے ساتھ ان کی خبر کو جھوٹا قرار دے کر اخباری دفتر جا پہنچے تو کہیں کسی کونے میں ننھی سی تردید لگا کر خود کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے یہ امر یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ اس خبر سے ملحقہ افراد کی زندگی پر کیسے تاثرات مرتب ہوئے۔

دوستوں کا وہی ٹولہ جو یونیورسٹی میں اس کے چیلوں کا کام کیا کرتا، فلیٹ میں بھی شاہ جی، شاہ جی کہتے ہوئے ہر طرح کی آسائشوں سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

نہ صرف یہ بلکہ میران کی خواہش کے عین مطابق ندی اور اس کے گروپ کے تمام تاثرات بمعہ اپنے ایڈیشن بتا کر وہ یہ بھی ثابت کر رہے تھے کہ ان کا تیر عین نشانے پر لگا ہے۔ اور یہی بات میران کے لیے یقینی طور پر باعث تسکین بھی تھی کیونکہ ندی نے جس طرح اسے تیسری جنس کہا تھا وہ اس کی غیرت پر کھلا طمانچہ تھا۔ اور انہی لفظوں کا انتقام لینے کے لیے وہ چاہتا تھا کہ جس طرح یونیورسٹی میں ندی کے کمنٹس سن کر سب نے سرگوشیاں اور چہ میگوئیاں کی تھیں اس سے کہیں بڑھ کر اب ندی کو لوگوں کے طعنے اور بھانت بھانت کی باتیں سننے کو ملیں تب اسے سکون آئے، قرار آئے اور بھٹکتی سوچوں کو منزل ملے۔ کیوں کہ اس رات ایڈمیشن کینسل ہونے کا وقت گویا اس نے کانٹوں پر گزارا تھا۔ اور اب وہ چاہتا تھا کہ ہر لمحہ سہنے والی کانٹوں کی چبھن بمعہ سود ندی کو لوٹا کر حساب چکتا کر دے۔

☆☆☆

''بہت برا ہوا ہے یہ سب۔''

شاہ زین کی زبانی میران کے ردعمل کے بارے میں جان کر اماں بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ ثمینہ بھی کل پہننے کے لیے کپڑے پریس کرنا چھوڑ کر اُس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''کسی لڑکی کے ساتھ اس طرح اخباروں میں نام اچھلنا تو شریف اور باکردار لڑکوں کے لیے بھی گالی تصور کیا جاتا ہے، کجا اُس معصوم بچی کی تصویر تک چھپوا دی۔''

ندرت کے لیے اماں ثمینہ جیسا درد اور پیار محسوس کر رہی تھیں۔

''بھائی اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''تمہاری بات کا بھی برا مان سکتا ہوں کیا؟''

''نہیں وہ۔۔۔'' لفظوں کے آگے ہچکچاہٹ کی باڑھ در آئی تھی۔

''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

''وہ بھائی میں سوچ رہی تھی کہ اگر یونیورسٹی میں اس طرح کی پرابلمز تھیں اور چاہے نہ بھی ہوتیں مگر آپی کو آپ کے ساتھ ذرا احتیاط۔۔۔ میرا مطلب ہے ریزرو رہنا چاہیے تھا۔ تاکہ کسی کو کچھ بھی کہنے کا موقع ہی نہ ملتا۔''

شاہ زین نے چونکہ ندرت سے متعلق ہر بات اس کے بی ہیور سے لے کر فرینکنس تک اماں سے ڈسکس کی تھی اسی لیے ثمینہ نے جھجکتے ہوئے اپنی سوچ کا بڑی ایمان داری سے اظہار کر دیا تھا۔

''میں تمہاری بات سے ضرور ایگری (agree) کرتا اگر وہ صرف میرے ساتھ فرینک ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ میں تو مرد ہونے کے باوجود ہمیشہ اس کے ساتھ محتاط رویہ اختیار کیے رہتا تاکہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے لیکن اماں۔۔۔!''

اس نے اماں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔

''اُن کے گھر میں یہ سب باتیں قابلِ اعتراض نہیں ہیں ورنہ وہ اکمل یا زبیر کے ساتھ بھی ریزرو رہتی، بلکہ اپنے گھر والوں کے سامنے بھی اُن کے ساتھ اوٹ پٹانگ شرارتیں کرتی رہتی ہے۔''

''لیکن اب ہوگا کیا؟'' ثمینہ پریشانی میں ہاتھ مسلتی ہوئی بولی۔

''شیرانی صاحب نے آج سے اپنی دونوں

بیٹیوں کی ٹیوشن سے بھی منع کر دیا ہے۔۔۔ یقیناً دوسرے ٹیوشنز پر بھی یہ بات اثر انداز ہوگی۔"

شاہ زین نے گہری سانس لی تھی۔

بہت سارے دکھ ایک ساتھ کنڈلی مارے سانپ کی طرح ذہن میں براجمان ہو رہے تھے۔ کئی خواب چکنا چور ہونے کو تھے۔۔۔

سوچا تو اس نے یہ تھا کہ فائنل ایگزیم کے بعد ڈگری ملنے پر اچھی نوکری مل جائے گی تو ندرت کے گھر والوں سے بات کرے گا۔ لیکن اب تو فائنل ایگزیم دینا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ کیوں کہ وہی ٹیوشنز جن سے وہ نہ صرف گھر کے اخراجات چلا رہا تھا بلکہ اپنے تعلیمی خرچ بھی پورے کر رہا تھا اب وہی آسرا ساتھ چھوڑنے کو تھا۔

اور سب سے بڑھ کر ندرت کی ذات پر اڑائے گئے کیچڑ کا دکھ اسے مارے ڈال رہا تھا جو اپنی طرح سب کو صاف دل کا سمجھتی تھی۔ آج جانے اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔

ویسے بھی وہ آج یونیورسٹی میں پریشان اور مضطرب تھی۔ یہ بات ندرت باوجود اپنی شان دار اداکاری کے شاہ زین سے چھپا نہیں پائی تھی۔ یوں بھی اس کی رسائی ندرت کی آنکھوں سے لے کر اس کے ذہن اور دل تک تھی۔ جبھی تو وہ اکثر بن کہے اس کے احساسات سمجھ لیا کرتا اور چوری پکڑے جانے پر ندی کے ہاتھوں "کتابوں" کے وار سہتا۔

اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے بے اختیار شاہ زین کا دل اس سے بات کرنے کو چاہا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ خود کو اکیلا ہرگز نہ سمجھے ہر طرح کے اچھے برے وقت میں وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہے۔ یہی خیال آتے ہی اُس نے موبائل لیا اور برآمدے میں آ گیا۔ فون کر کے وہ ندی کو اپنے ساتھ کی یقین دہانی تو کروانا چاہتا تھا مگر یہ احساس بھی باعثِ تقویت تھا کہ اس کے گھر والے کسی بھی موڑ پر ندرت کا سب سے بڑا سہارا اور دنیا کی چبھتی نظروں یا طنزیہ جملوں کے آگے ایک ایسی مضبوط دیوار ہیں جس کی اینٹ اینٹ میں گارے اور مٹی کی جگہ اعتبار، محبت، یقین کا استعمال کیا گیا ہے۔

☆☆☆

تہمتیں تو لگتی ہیں
روشنی کی خواہش میں
گھر سے باہر آنے کی کچھ سزا تو ملتی ہے
لوگ، لوگ ہوتے ہیں
ان کو کیا خبر جاناں
آپ کے ارادوں کی خوب صورت آنکھوں میں
بننے والے خوابوں کے رنگ کیسے ہوتے ہیں
دل کی گود آنگن میں پلنے والی باتوں کے
زخم کیسے ہوتے ہیں
کتنے گہرے ہوتے ہیں
کب یہ سوچ سکتے ہیں
ایسی بے گناہ آنکھیں
گھر کے کونوں کھدروں میں چھپ کے کتنا روتی ہیں
پھر بھی ہر کہانی سے
اپنی کج بیانی سے
اس قدر روانی سے
داستاں سناتے ہیں
اور یقین کی آنکھیں
سچ کے غم زدہ دل سے لگ کے رونے لگتی ہیں
تہمتیں تو لگتی ہیں
روشنی کی خواہش میں
تہمتوں کے لگنے سے
دل سے دوست کو جاناں
اب نڈھال کیا کرنا
تہمتوں سے کیا ڈرنا
تہمتیں تو لگتی ہیں

شیکسپیئر کہتا ہے کہ انسان برف کی مانند صاف شفاف اور بے داغ ہو پھر بھی تہمت سے نہیں بچ سکتا۔ اور یہی کچھ ندی کے ساتھ ہوا تھا۔ خیر باہر جو کچھ ہوا سو ہوا مگر گھر میں امی، بابا کے علاوہ باقی سب کا رویہ اب تک اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ ان کے سامنے بیٹھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

ویسے بھی بلاشبہ والدین کی مثال اس شجر سایہ دار کی سی ہوتی ہے جہاں تھکے ہارے، بھٹکتے تپتی جھلستی دھوپ اور گرم ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچ کر ٹیک لگا کر جب بھی بیٹھیں ساری تکان دور ہو جاتی ہے۔

حالیہ انٹرنیشنل سائیکو جیکل سروے میں یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ڈپریشن کے وہ مریض جنہیں دن کا کچھ حصہ اپنے والدین کے ساتھ گزارنے دیا گیا دوسرے مریضوں کی نسبت جلدی روبہ صحت ہوئے۔

میران سے اول روز الجھنے کے واقعے سے لے کر آج تک ہونے والی ہر بات اس نے بنا آنسوؤں کی شدت کو روکے امی اور بابا کے گوش گزار کی، گو کہ وہ روزانہ انہیں ہر بات تفصیل سے بتایا کرتی تھی مگر اس معاملے میں ندی کا خیال تھا کہ دونوں خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔ اسی لیے پہلے روز بتائی گئی مختصر سی بات پر ان کا ردِ عمل دیکھ کر اس نے آئندہ کے لیے اس ذکر کو گول کرنے کا سوچا۔ البتہ شاہ زین کے متعلق وہ امی کو آگاہ کر چکی تھی۔ روز ہونے والے چھوٹے موٹے واقعات اور نئے نئے چٹکلے بھی وہ پولیس کے روزنامچے کی طرح روزانہ کی بنیاد پر اُن کے سامنے ڈسکس کرتی مگر شاہ زین کے ساتھ اس کے تعلق کو غلط رنگ دے کر دنیا بھر کے سامنے اچھالے جانا ان کے لیے یقیناً اذیت کا باعث بن رہا تھا اور اپنی شہزادیوں سی بیٹی کا یوں رونا بابا کے دل کو دہلائے دے رہا تھا۔

"میں۔۔۔ شاید تمہارا گناہ گار ہوں۔"

آنسوؤں کو بمشکل آنکھوں کے بجائے حلق کی جانب منتقل کرتے ہوئے بابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ ناسمجھی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ گردن دائیں سے بائیں حرکت کرتے ہوئے ان کے الفاظ کی نفی کر رہی تھی۔

"ہاں بیٹا۔۔۔! شاید میں تمہارا مقدمہ ناصر کے سامنے صحیح طریقے سے لڑ نہیں سکا، ورنہ اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ۔۔۔ میرے سامنے۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے۔۔۔ وہ تمہیں یوں۔۔۔" مزید ان سے بولا نہیں گیا تھا کہ گلا رندھ گیا، لگتا تھا جیسے گلے میں کوئی پھانس تھی۔۔۔ جیسے کوئی چیز گلے میں اٹک گئی ہو اور اس کا نگلنا مشکل ہو رہا ہو۔ تیز دھار آلہ انہیں شاید اندر ہی اندر کاٹ رہا تھا۔

بعض اوقات زندگی میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب غیر حاضر، ان دیکھی اشیاء، اچانک پیدا ہونے والی غیر یقینی صورت حال اچھے خاصے مضبوط اعصاب کے مالک کو بھی اتنا بے بس اور لاچار بنا دیتی ہے کہ انسان خود اپنی ذات کے اڑتے بکھرتے پرزوں کو بھی یکجا کرنے کی کوشش میں ہانپنے لگتا ہے۔

بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بابا کی سانسوں کی غیر معمولی آمد و رفت، نتھنوں کی ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ اور لاشعوری طور پر آنکھیں میچنے کی کوشش اُن کے اندر ہوتی تباہی کے آثار سے بخوبی آگاہ کر رہی تھی۔

"نہیں بابا! ایسا نہ کہیں۔۔۔ اور اپنے دل سے حالیہ واقعات سے متعلق ہر وہم نکال دیں۔۔۔ کیا قسمت سے بھی کوئی لڑ سکا ہے؟ یہ سب میرا نصیب تھا اور مجھے مل کر ہی رہنا تھا۔" چند ہی گھنٹوں میں وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سنجیدہ اور مدبر لگی تھی بابا کو۔ جس کے چہرے پر خزاں کا کوئی موسم ٹھہر سا گیا تھا۔ بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں دکھ ہی تھا اور اتنا دکھ تھا کہ ان کی شفافیت ماند پڑ گئی تھی اور پھر بابا کے لیے اس سے بڑھ کر تکلیف دہ لمحہ بھلا اور کون سا ہوتا جب ان کی لاڈوں پلی بیٹی کی آنکھیں رونے کی شدت سے سوجن کا شکار ہو چکی تھیں۔ سرخی مائل گالوں پر آنسو آبشار کی طرح پھسل پھسل کر اس کی گود تک بھگو رہے تھے۔ لمحہ بھر اس کو یوں دیکھا تو لاکھ ضبط کے باوجود گرم گرم آنسو جو رخسار پر گرے تو پھر گرتے ہی چلے گئے۔

بخار کی شدت میں بھی لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

بابا کی یہ حالت دیکھ کر چند لمحے تو امی حسرت و یاس کی تصویر بنے انہیں دیکھتی رہیں۔ ذہن کچھ بھی

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری، مفلوج ہوا محض دل کے سہارے پر تھا اور دل وہ جو شاید آنکھ بنا آنسو بہار ہا تھا۔

"اور پھر۔۔۔"

ندی نے کچھ کہنے کے لیے گھٹنوں پر رکھی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر بابا کو دیکھا تو ان کا سرخ چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے لیے بابا کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا زندگی کا پہلا موقع تھا۔ ریت کی عمارت کی مانند شکستہ نظر آنے والے بابا اس کے ہیں یہ حقیقت تسلیم کرنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اُسی لمحے بابا نے آنکھیں کھولیں اور اُسے یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر فوراً آنسو پونچھ کر امی سے پانی کے لیے کہا تو وہ سوالیہ نظریں لیے انہیں ہی دیکھتی رہی۔

"اپنے بابا کو کمزور نہ سمجھنا، اپنی بیٹی کے لیے دنیا کی ہر طاقت سے لڑنے کا حوصلہ ہے مجھ میں، اور تم دیکھنا۔۔۔" امی سے گلاس لے کر چند گھونٹ پانی کے حلق میں اتارنے کے بعد وہ دوبارہ بولے۔ "ناصر نے تمہارے بجائے دنیا والوں کی جھوٹی باتوں کا اعتبار کیا ہے نا۔۔۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔۔۔ بلکہ۔۔۔ بلکہ شکل نہیں دیکھوں گا کبھی اس کی۔"

"اسی بات کا تو دکھ ہے۔۔۔ کہ وہ مجھ سے ایک بار کچھ پوچھتے تو سہی، میری بات تو سنتے، مگر۔۔۔" بابا کی خشک آنکھیں دیکھ کر ایک بار پھر وہ بولی مگر اب خود اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ اعتبار کا ماتم کرتے کرتے اب اس کی آنکھوں میں محض ویرانیت تھی اور بس۔۔۔ مگر جیسے ہی وہ ناصر بھائی کا نام لینے لگی بنجر آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگی ہی تھیں کہ امی نے اسے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔

یوں بھی جب کسی بھی گھر پر مشکل کی گھڑی آئے تو فیملی ممبرز میں سے کوئی ایک ایسا ضرور ہوتا ہے جو اپنا دکھ اور کرب دل میں دبا کر دوسروں کو تسلی دیتا ہے اور انہیں سہارا دینے کے لیے آگے بڑھ کر سر پر ہاتھ رکھتا اور گلے لگاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ایک ہی بیڈ پر موجود ان تینوں کے ہی دل و ذہن آندھیوں کی زد میں تھے پھر بھی امی نے ہمت کرتے ہوئے سنبھالا، پہلے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑیں اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں بے آواز روئی اور اپنے گلابی ہونٹوں کو بڑی بے رحمی سے دانتوں سے کچلا، ندی کو گلے لگا کر اس کے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ ندی، جسے اپنے ساتھ یہ سب ہونے کا دکھ تو تھا ہی مگر اس سے کہیں زیادہ دکھ اسے بابا کو یوں دیکھ کر ہو رہا تھا۔ جن کے چہرے پر سنجیدگی، کرب اور ضبط کا ملاپ اس کے لیے انتہائی دردناک تھا۔ ناصر بھائی کے سامنے یوں سر جھکائے، کمزور سے لہجے میں اس کے دفاع کرتے بابا اور غضب ناک ہوتے ناصر بھائی کا جارحانہ اور اتنا غیر متوقع رویہ اسے اندر ہی اندر گویا کاٹ رہا تھا۔

ماں کی گود کی گرمی محسوس ہوئی تو ایک بار پھر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ندی۔۔۔! میری جان، اگر تمہارے رونے سے مسئلہ حل ہوسکتا تو ہم بھی تمہارے ساتھ مل کر رو لیتے نا۔"

"امی آج۔۔۔ میں اکیلی ہوگئی ہوں۔۔۔ بالکل اکیلی۔"

اس کی بات پر بابا نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"یعنی ہم بڈھا بڈھی تمہارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے؟"

بابا نے حتی الامکان لہجے کو مضبوط اور خوش گوار بناتے ہوئے کہا تو وہ فوراً اُن کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر ہچکیاں لے کر رونے لگی، شہزادیوں سی آن بان اور مزاج والی ان کی لاڈوں پلی بیٹی آج کس قدر آنسو بہا رہی تھی۔۔۔ یہ بات گویا ان کا سینہ چیرنے کو کافی تھی۔

"نہیں بابا۔۔۔! آپ دونوں ہی تو میرا سب کچھ ہیں، میری دنیا تو آپ دونوں کے دم سے ہی آباد ہے نا، آپ کے بغیر۔۔۔ میرا کوئی نہیں ہے۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔"

ضبط کا آتش فشاں پھٹ چکا تھا اور لاوا آنسوؤں کی صورت رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"تو بس پھر اب چپ کرو۔۔۔ مزید مت رونا اب۔"

"جی بابا! اب نہیں روؤں۔۔۔" جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"ایسا کرو، اگر ضرور رونا ہی ہے تو کل رو لینا، لیکن۔۔۔" چند لمحے رک کر بابا نے اپنی سانس بحال کی تھی۔

"ادھر دیکھو۔۔۔"

ندرت کے ساتھ امی نے بھی ان کے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔

"صرف آخری دفعہ۔۔۔ سمجھیں؟"

ہتھیلی کی پشت سے ندرت نے لمحہ بھر میں آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"نہیں بابا! نہ ابھی نہ کل، بہت رو لیا میں نے اب اور نہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" بابا نے دھیمی آواز میں اسے سراہا۔

"اور ویسے بھی امی جنہیں ہمارے رونے کی کوئی پروا ہی نہیں ہے اُن کے لیے رو رو کر خود کو اور اپنے پیاروں کو ہلکان کرنے کا کیا فائدہ۔۔۔ ہمارے آنسو جن کے دل پر گرتے ہیں انہیں تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ ہے نا بابا؟"

بابا نے اس کی بات کے جواب میں محض گردن ہلانے پر اکتفا کیا تو ندرت ان کے پاؤں دبانے لگی۔ اپنے اعتبار کا ماتم کرتے کرتے اسے اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ اس واقعے کی وجہ سے وہ دونوں اُس سے کہیں زیادہ پریشان ہوں گے اور بجائے اس کے کہ وہ ان دونوں کو تسلی دے یا ہمت دلائے خود انہیں اسے سنبھالنا پڑ رہا ہے۔ بس یہ سوچتے ہی اُس نے اُن دونوں کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنا چاہا تھا۔

☆☆☆

میرے ساتھ چلنے والے تیری جستجو کے صدقے
بڑی سخت منزلیں ہیں کہیں تھک کے رک نہ جانا

عائشہ کے باآواز بلند شعر پڑھنے پر ناصر بھائی نے چونک کر دیکھا۔ انداز نا سمجھنے والا اور سوالیہ تھا۔

"میسج سینڈنگ فیل۔۔۔ ہونہہ!"

عائشہ نے موبائل ناصر کی طرف بڑھاتے ہوئے نخوت کا اظہار کیا تھا مگر ناصر نے موبائل تھامنے کے بجائے بے رخی سے رخ موڑ لیا کہ جب سے وہ لاؤنج میں صوفے پر رکھے ندرت کے شولڈر بیگ میں سے آئی میسج بیپ سن کر موبائل نکال کر لائی تھی تب سے اس کا ایک ایک حصہ کھنگال رہی تھی۔ پہلے تو صبا کا میسج تھا اور اس کے بعد اب اس میسج کی ڈیلیوری رپورٹ تھی جو اس نے پوائنٹ میں بیٹھے بیٹھے شاہ زین کو کیا تھا مگر نیٹ ورک پرابلم کی وجہ سے اُس تک پہنچ نہیں پایا۔ اور اب اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر موبائل اپنی الماری میں رکھتی اس کی وائبریشن پر فوراً متوجہ ہوئی کہ بیل تو وہ پہلے ہی آف کر چکی تھی۔ سامنے شاہ زین کا نام نظر آتے ہوئے اس نے ابرو چڑھاتے ہوئے پہلے ناصر کو بتایا اور پھر اس کی ہدایت کے عین مطابق فون ریسیو کیا۔

"ہیلو"

"جی کون؟" برآمدے میں موجود اماں کے مخصوص تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے شاہ زین اس غیر مانوس آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"ندرت!"

"ندرت۔۔۔؟" اُسے حیرت ہوئی تھی کیوں کہ ندرت ہمیشہ فون ریسیو کرنے پر السلام علیکم کہا کرتی اور پھر اس کی آواز کو تو وہ لاکھوں میں بھی پہچان لیتا۔ اسی لیے رابطہ منقطع کر کے دوبارہ نمبر ملانے کا سوچا۔

"سوری شاید غلط نمبر مل گیا ہے۔"

"تم شاہ زین ہی ہو نا؟" اپنے بھائی کے مقابل اس انسان سے وہ جلد از جلد ملنا بھی چاہتی تھی۔

"جی ہاں۔"

"تو بھی تو میں کہہ رہی تھی کہ ندرت سے بات کرنی ہے؟"

شاہ زین اُن کی بات کے گھماؤ پھراؤ سے الجھنے لگا تھا۔

"میں عائشہ ہوں، ندرت کی بھابھی۔"

"اوہ اچھا، السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔۔۔! ایسا ہے کہ ندرت تو ابھی کچھ مہمانوں کے ساتھ بزی ہے لیکن ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں اگر تمہارے پاس ٹائم ہو تو۔۔۔" لہجے کا تیکھاپن بلاشبہ اپنے عروج پر تھا۔

"جی۔۔۔ مجھ سے؟"

"ہاں ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں اگر ابھی آجاؤ تو اچھا ہے۔"

"لیکن اتفاق سے مجھے آپ کے گھر کا نمبر وغیرہ معلوم نہیں ہے۔"

"تو ایسا ہے نا کہ تم شوبی ریسٹورنٹ پر آجاؤ، گھر پر ویسے بھی امی، بابا کے پاس مہمان بیٹھے ہیں، ہم بھی وہیں آجاتے ہیں۔"

"چلیں ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔"

وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ گفتگو اور اس کے بعد ملاقات کس تناظر میں ہے۔ آج صبح کے بعد وہ یہ سب اس طرح ہونے کی توقع نہیں کر پا رہا تھا۔ طرح طرح کی مختلف سوچیں، واہمے اور خدشات اسے چاروں طرف سے گھیرنے لگے تھے، اور یوں بھی جب بہت ساری سوچیں انسان کو گارے مٹی کی طرح اوڑھنے لگتی ہیں تو وہ روزن مانگتی ہیں۔ جبھی اٹھنے سے پہلے اُس نے ایک بار پھر ندرت کو فون کرنے کا سوچا مگر پھر اس کے مصروف ہونے کا خیال دل میں آتے ہی ارادہ بدل دیا۔ اور اماں کو ساری بات سے آگاہ کرنے کے بعد صحن کی دیوار کے ساتھ کھڑی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور شوبی ریسٹورنٹ کی جانب بڑھنے لگا۔

☆☆☆

"دیکھیں آپ ذرا دھیمے لہجے میں بات کریں تو بہتر ہوگا۔ یوں بھی میرے خیال میں آپ کافی [illegible] ہوئی نیچر کے ہیں۔"

اپنی آواز اور لہجے کو حتی المقدور نرم رکھتے ہو[ئے] شاہ زین نے ناصر بھائی کو بھی ٹھنڈا کرنا چاہا تھا جو مبالغہ لاوا اُگل رہے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ ثروت [آپا] کے الفاظ بھی زہر میں بجھے نشتروں سے کم نہ تھے۔

"تمہاری بہن کی تصویریں یوں اخباروں میں [چھپ]... معلوم ہو کہ اچھے اچھوں کی سلجھی ہوئی نیچر کیسے الجھ [جاتی] جاتی ہے۔"

ندرت کی باتوں سے اُس کے گھر والوں کا [illegible] گیا خیالی ہیولا شاہ زین کے دماغ میں بکھرنے [لگا] تھا۔

"اب تو جو ہوا سو ہوا، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ [illegible] سے نہیں وہ پچھلے دو ڈھائی سالوں سے میرے [illegible] سے منسوب ہے اور اب بس چند ہی دنوں میں وہ ا[کمل] کے ساتھ بیاہی جائے گی، فائنل ایگزیم بھی مشکل [illegible] ہے کہ دے۔"

"اکمل۔۔۔!" اس نام سے شاہ زین کے ذ[ہن] میں ایک زوردار جھماکا ہوا تھا۔

اُس رات دیر تک فون بزی رہنے کی وجہ [illegible] ندرت نے اکمل ہی بتائی تھی اور ابھی دو دن پہلے رات کو وہی اس کو لینے بھی آیا تھا۔

کسرتی بدن کا حامل لانبا چوڑا اکمل جسے دیکھ[تے] ہی اس کے فوجی ہونے کا پتا چلتا تھا اور پھر ا[کثر] اوقات ندرت اپنی اور اس کی شرارتوں کے احوال [illegible] بڑے مزے سے اُس کے ساتھ شیئر کرتی۔

"تمہیں یہاں بلانے کا مقصد صرف یہی سمجھا[نا] تھا کہ جو کچھ گل تم کھلا چکے ہو وہ کافی ہیں۔ اب ا[س] پودے کو مزید پانی دینے کی جرأت نہ کرنا۔" نا[صر] بھائی نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھ[تے] ہوئے گویا دھمکی دی تھی۔

"دیکھیے آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں ایسا [illegible]" منتشر ہوتے خیالات کے ہجوم سے حواسوں کو بڑ[ی] مشکل سے بحال رکھنے کے بعد اس نے معاملہ کلیئر کر[نا] چاہا تھا۔

"غلط اور صحیح کا فرق سیکھنے نہیں آئے ہیں یہاں، بس تمہیں جو سمجھانا تھا سمجھا لیا آگے کے نتائج کے ذمہ دار تم خود ہی ہوگے۔" ثروت آپا نے ہاتھ اور منہ کے تاثرات سے اسے جانے کو کہا تھا۔

"وہ تو میرا بھائی ہی ہے جو اسے اپنا لے گا ورنہ تو لوگ داغ لگے پھل کی طرف بھی نہیں دیکھتے، کجا تمام عمر کا ساتھی۔"

عائشہ کی بات سننے کے بعد وہ رکا نہیں تھا۔ دھواں دھواں ہوتے چہرے پر ساری کہانی لکھی صاف نظر آرہی تھی، سو یوں ہی بلا مقصد ویران سڑکوں پر بائیک لیے گھومتا رہا۔

"کیا یہ سب درست تھا جو ان تینوں نے کہا؟"

ذہن اور دل دونوں کسی صورت اُن کی باتوں کی تائید کرنے پر راضی نہ تھے کہ ندرت کے معصوم چہرے پر لکھی ہر تحریر کا نقش اس کی آنکھوں میں ابھی تک قائم تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اعتبار ابھی موجود تھا جو اُسے ندرت کی ذات پر تھا۔ جبھی کچھ سوچ کر موٹر سائیکل ایک ٹی اسٹال کے سامنے روکی جو شاید کچھ دیر پہلے تک نوجوانوں کے لیے وہیں بیٹھک کا کام دیتا ہو مگر اب لکڑی کے دروازے پر لگا تالا قرب و جوار میں موجود درختوں کی طرح اسے بھی پراسرار بنا رہا تھا۔

آمنے سامنے رکھی لکڑی کی مقفل بینچوں میں سے ایک پر بیٹھ کر اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ندرت کے پہلے میسج سے لے کر اب تک کے تمام میسجز پڑھتے ہوئے ایک بار پھر میسج ٹائپ کرنے لگا۔

☆☆☆

بچھڑنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے مشورہ کرنا
محبت میں کوئی بھی فیصلہ ذاتی نہیں ہوتا

مستقبل کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے دوران میسج کی بیپ پر عائشہ نے فوراً شعر پڑھ کر اُن دونوں کو سنایا تو ناصر کی رگیں تن گئیں، ثروت آپا نے بھی گاڑی سے باہر دیکھنے کو ترجیح دی تھی۔ یوں بھی شاہ زین کا میسج کرنا حسب توقع تھا اسی لیے پہلے سے ٹائپ شدہ میسج کو send کرنے میں عائشہ نے لمحہ بھر دیر نہیں لگائی تھی کہ اُن دونوں کے درمیان ہونے والے میسجز کے تبادلے کے ساتھ ساتھ صبا اور زبیر کے میسجز سے ساری کہانی اُن کے سامنے آگئی تھی کہ دونوں میں دوستی کی ابتدا کس طرح ہوئی اور یہی بات عائشہ کو مزید تپا رہی تھی کیوں کہ اکمل کو چھوڑ کر ندرت کا کسی اور کی طرف متوجہ ہونا جبکہ گھر والوں کا بھی اس طرف نمایاں جھکاؤ ہو، عائشہ کے لیے ہرگز قابلِ معافی فعل نہیں تھا۔ جبھی اُن تینوں کا خیال تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر ندرت کی شادی کر دی جائے اور ابھی یہی بات انہیں گھر جا کر امی بابا کو بھی بتانی تھی۔

☆☆☆

رات گئے جب وہ تینوں گھر لوٹے تو مین گیٹ بند کرنے کے بعد لان عبور کر کے گھر کے اندر قدم رکھنے کی ہمت تینوں کی جواب دے گئی تھی۔ چند لمحے ناسمجھی کی کیفیت میں وہیں کھڑے منجمد اعصاب کے ساتھ ایک دوسرے کو بس دیکھے ہی گئے۔ لگتا تھا حواس جیسے سو گئے ہیں۔ ایک پل کے لیے ناصر کو لگا جیسے وہ غلطی سے کسی اور گھر کا دروازہ کھولے اندر آگئے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے ندرت کی دل ہلا دینے والی رقت آمیز آواز نے انہیں جگا دیا۔

ذہن و دل میں آنے والے مختلف واہموں کو جھٹکتے ہوئے کوریڈور اور پھر لاؤنج عبور کرنے کے بعد وہ جیسے ہی امی بابا کے کمرے تک پہنچے، چوکھٹ پر ہی شیشہ بنے کھڑے رہ گئے۔

چہرے پر ازلی سکون لیے رات کے اس پہر بابا انہیں بڑی خاموشی سے چھوڑ کر چلے گئے۔ ندرت اُن سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی تو امی پر سکتہ طاری تھا۔

صبح اخبار گھر میں آنے سے اب تک وہ بہت برداشت کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو آنے لگتے تو فوراً ہی بڑی بے دردی سے دوپٹے سے مسل دیتیں اور شاید اب شوہر کے جانے سے ان کا ضبط جواب دے

گیا تھا مگر پھر بھی آنسو نہ بہے بلکہ آنکھیں پتھرا گئیں۔

یک ٹک بابا کو دیکھتے ہوئے اُن کی حالت دیکھ کر ڈر لگنے لگا تھا۔ ندرت بھی انہیں جھنجوڑتی تو کبھی بابا سے چھوڑ کر نہ جانے کی فریاد کرنے لگتی۔

خود ثروت آپا اور ناصر بھائی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ عائشہ فوراً امی کا سکتہ توڑنے کی کوشش کرنے لگی تو ناصر بھائی بابا کے پاؤں پکڑ کر بڑی شدت سے رو دیے۔ ثروت آپا کے بین گویا گھر کے درو بام ہلائے دے رہے تھے۔

کل تک جو گھر ہنستا بستا اور خوشیوں کا گہوارہ تھا آج کچھ الگ ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ لگنے والی نظر لگ چکی تھی۔ کان کے نیچے لگائے کاجل یا سپید ہاتھوں پر پہنائی گئی کالی بریسلیٹ کچھ کام نہ آسکی تھی۔

امی، بابا کی برسوں پرانی پروئی گئی تسبیح کے دانے بس اب بکھرنے کو تھے۔

☆☆☆

شاہ زین رات دیر سے گھر لوٹا تو ثمینہ اور اماں بڑی بے تابی سے اُس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ انہیں کچھ بھی بتائے بغیر سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ثمینہ نے کچھ پوچھنا چاہا تو اماں نے اسے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ یوں بھی وہ کبھی بھی کسی بات کی کھوج نہیں لگاتی تھیں بلکہ شاہ زین یا ثمینہ کو پورا وقت دیتیں کہ ان کے کچھ بھی دریافت کرنے سے پہلے وہ خود ساری بات اُن کے گوش گزار کر دیتے۔

"بھائی یونیورسٹی نہیں جانا کیا؟ دیکھیں کیا ٹائم ہو رہا ہے، جلدی اٹھیں۔"

ثمینہ کے جگانے پر شاہ زین نے کروٹ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"بھائی آپ۔۔؟" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"تم چلو میں بس ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔" شاہ زین نے کسلمندی سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا تو خاموشی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

شاہ زین نے اس کے جاتے ہی ایک بار موبائل دیکھا، گمان غالب تھا کہ شاید ندرت کی طرف سے کوئی رابطہ ہوا ہو، لیکن گمان گمان ہی رہا۔۔۔

سیدھے لیٹتے ہوئے خالی نظروں سے اب چھت پر لگے پنکھے کی جانب دیکھے چلا جا رہا تھا۔ جو کے پر ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہیں۔ ایک دوجے کے بغیر جن کا نہ تو کوئی وجود ہے نہ ہی پہچان مگر سچ تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کو پانے کی خواہش میں تمام تر توانائی خرچ کرنے کے باوجود دوری ہی اُن کا مقدر بنی رہتی ہے کہ ساتھ رہ کر بھی اُن کے درمیان قائم فاصلے کو ختم نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ لاحاصل سفر ان کے ناکارہ ہونے تک اسی جدوجہد اور ا کے ساتھ جاری وساری رہتا ہے۔

"بھائی آجائیں نا ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

ثمینہ نے کچن سے ہی آواز لگائی تو اس کے خیالوں کی تان ٹوٹی۔ گہری سانس لے کر نہ چاہتے ہوئے سلیپرز پاؤں میں اڑس کر فریش ہونے کے بعد وہ کچن میں پہنچا تو اماں اور ثمینہ اس کے انتظار میں تھیں۔ اسے دیکھ کر ثمینہ نے فوراً چائے چولہے پر رکھ اور دیوار کے ساتھ رکھے ٹیبل پر سے ہاٹ پاٹ اٹھا کر شیلف پر منتقل کرنے کے بعد ٹیبل موڑھے پر بیٹھے شاہ زین کے آگے لا رکھی جس کے ہاتھ میں خلاف معمول آج موبائل بھی موجود تھا۔

آنکھیں رت جگے کا پتا دے رہی تھیں تو چہرے کی اداسی دل کے بوجھل پن کی خبر بنا پوچھے بتانے کو تیار معلوم ہو رہی تھیں۔

اماں نے نظر بھر کر شاہ زین کو دیکھا جو بچپن میں انتہائی خوش مزاج ہونے کے باوجود والد کی وفات کے بعد یوں سنجیدہ ہوا کہ پھر کسی نے اسے شرارت کرتے یا ہنستے نہ دیکھا۔ اب کئی سالوں بعد وہ خوش تھیں کہ اس کے اندر ایک بار پھر وہی زندہ دل شاہ زین بے دار ہونے لگا ہے مگر اب شاید ایسا نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر پہلے کی طرح قہقہے لگاتا اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح زندگی کی دل فریبیوں کو محسوس کر

جذبوں کی نرم اور چمکیلی دھوپ پر کہر جمنے لگا تھا۔

اب جب کہ اس کی مسکراہٹ نے پہلی اڑان بھری ہی تھی کہ حالات کی تیز دھار قینچی نے پھر سے اس کے پر کاٹ دیے۔

"بیٹا ناشتا کر لو۔" اسے یوں خاموش دیکھ کر اماں کا دل کٹنے لگا تھا۔

"نہیں اماں دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ ویسے بھی آج یونیورسٹی جانے کے بجائے گھر پر ہی ہوں اس لیے بعد میں جب دل چاہا کھا لوں گا۔"

دھوپ دبے قدموں گیٹ سے ہوتی ہوئی اب آہستہ آہستہ پورے صحن میں پھیلنے لگی تھی۔ چائے تیار ہونے کے بعد ثمینہ نے چولہا بند کر کے چھت پر لگا پنکھا آن کیا تو چولہے کے حدت سے کچن میں ہو جانے والی معمولی سی گرمی کا اثر زائل ہونے لگا کہ ایگزاسٹ فین کا کام شیلف کی طرف موجود کھڑکی بخوبی نبھا دیا کرتی تھی۔

چائے میز پر رکھتے ہوئے ثمینہ نے شاہ زین کو دیکھا جو بغیر پلکیں جھپکائے موبائل اسکرین کو یوں دیکھ رہا تھا کہ جیسے میسج آنے پر اگر اُسی لمحے نہ دیکھا گیا تو وہ از خود ڈیلیٹ ہو جائے گا۔

یوں بھی اب اُس سے رہا نہیں جا رہا تھا اسی لیے شاہ زین سے رات ہونے والی ملاقات کے بارے میں پوچھنا تو چاہا مگر اس سے پہلے ہی شاہ زین نے اِن باکس کھول کر ندرت کا موصول ہونے والا آخری میسج ثمینہ کی طرف بڑھایا تو وہ نا سمجھی سے موبائل ہاتھ میں پکڑے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ پڑھ لو اور اماں کو بھی سنا دو۔" لہجہ گویا برسوں کی تھکن کی بکل مارے ہوئے تھا۔

ثمینہ نے بے یقینی سے پہلے اسے اور پھر اماں کو دیکھ کر میسج پڑھنا شروع کیا۔

"شاہ زین۔۔۔ جانتی ہوں کہ آج تم پریشان ہو گے، میرے گھر والوں سے جس انداز اور ماحول میں تم نے ملنے کا سوچ رکھا تھا، آج اُس کے برعکس ہوا اور جو کچھ انہوں نے تمہیں کہا اصل میں سچ بھی وہی ہے، تم سے محبت کا ڈراما صرف زبیر اور صبا کے ساتھ لگائی گئی شرط جیتنے کے لیے تھا اور بس۔۔۔ اگر اخبار میں تصویر چھپنے کا واقعہ نہ بھی ہوتا تو اب ہم تینوں مل کر تم پر قہقہے لگا رہے ہوتے اور میں شرط جیتنے پر تمہاری ہی موجودگی میں اُنہیں ٹریٹ بھی دیتی، یہ میرا اُن سے وعدہ تھا۔

ثمینہ نے موبائل اسکرین سے نظریں ہٹا کر اماں کو اور پھر شاہ زین کو دیکھا جو فرش پر نظر گاڑے سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔

"اور اس شرط کے بارے میں وہ تمہیں میری اجازت کے بغیر نہیں بتائیں گے یہ اُن کا مجھ سے وعدہ تھا۔ شاید اب میں کبھی یونیورسٹی نہ آؤں کیوں کہ چند روز بعد میری اور اکمل کی شادی ہو رہی ہے۔ ہر زبان پر تمہارے ساتھ میرا نام آنے کے باوجود اکمل مجھے اُتنی ہی شدت سے چاہتا ہے جتنا کہ وہ پہلے مجھے پانے کو بے تاب تھا اور اس بات کے لیے میں اُس کی احسان مند ہوں، لیکن ہاں شاید تمہارا دل دکھانے کی سزا کے طور پر میری یوں پورے شہر میں رسوائی بھی ہوئی لیکن۔۔۔ خیر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا اور پلیز آئندہ کسی بھی طریقے سے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

مرد ہونے کے باوجود شاہ زین کی سرمئی آنکھیں بھیگنے کو تھیں۔ اماں کے تسبیح کرتے ہاتھ تھم گئے تھے۔ چاہتے ہوئے بھی وہ شاہ زین سے تسلی کے دو بول نہیں بول پا رہی تھیں کہ خود ان کے دل کو بے حد ٹھیس پہنچی تھی کوئی یوں ان کے بیٹے کے جذبات سے کھیلے یہ بات انہیں سخت اذیت سے دوچار کر رہی تھی۔

"اماں۔۔۔!"

شاہ زین کے پکارنے پر انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"پریشان نہ ہوں پلیز یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔"

"کیا تم افسردہ نہیں ہو؟" اماں کے پوچھنے پر وہ مسکرانے لگا تو ان کا دل کٹ کے رہ گیا۔ کیوں کہ اس

کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے دکھ سے وہ بخوبی واقف تھیں۔

"ہوں افسردہ، بلکہ بہت افسردہ ہوں۔" وہی صاف گوئی جو اُس کا خاصہ تھی۔

"لیکن اماں افسردہ تو انسان تب بھی ہو جاتا ہے جب کوئی بہت قیمتی اور سینت سینت کر رکھی جانے والی ہماری پسندیدہ چیز ٹوٹ جائے، وہ پودا جس کی خوشبو بہت عزیز ہو اور جس کا خیال رکھنے میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں مگر وہ اچانک ہی دن بہ دن مرجھانے لگے اور یا پھر۔۔۔" شاہ زین نے گہرا سانس خارج کیا۔

"ہمارا کوئی عزیز اس دنیا سے چلا جائے۔۔۔۔ افسردہ تو ہم ہوتے ہیں لیکن آخر کب تک۔۔ چند ہی دنوں میں ہم پھر اپنے آپ اور دنیا میں مگن ہونے لگتے ہیں۔"

"بھائی سچ کہا آپ نے، وہی لوگ جن کے نہ ہونے کا تصور بھی ہمارے لیے سوہان روح ہوتا ہے بعد میں بعض اوقات تو ان کی یاد تک دل سے محو ہو جاتی ہے۔"

"پس ثابت یہ ہوا میری پیاری اماں کہ دل کو اس تعلق کے ٹوٹنے پر رنج تو بہت ہے مگر دو تین دن سے زیادہ اس کا اثر نہیں رہے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

ایک بار پھر وہ مسکرایا تھا۔

کیوں کہ اماں کی خاموشی سے ان کا دکھ صاف ظاہر تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے بھی دکھی ہوں۔ حالاں کہ حقیقت تو یہ تھی کہ تعلق ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ ہاں البتہ دل کی کرچیاں ضرور بکھر گئی تھیں۔ مگر یہ سب ہونے کے بعد بھی، اپنے جذبات شرط کی نذر ہونے کے باوجود وہ اب تک اُسی مقام پر کھڑا تھا جہاں آج سے دو روز پہلے تھا۔

ندرت کی طرف سے واضح اعتراف اور ساری حقیقت بیان کرنے کے بعد بھی اس کے دل میں ندرت کے خلاف نفرت یا کدورت کا شائبہ تک نہ تھا دماغ ندرت کے اس سارے رویے کو اس کی عزتِ نفس پر کھلا حملہ قرار دیتا تو دل نفی کر کے ٹال دیتا کہ ہو سکتا ہے یہ سب ندرت کے لیے دل لگی ہو مگر اس کے لیے یہ سب دل کی لگی تھا جسے نہ تو بھلایا جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ بھولنا چاہتا تھا۔

دماغ کی طرف سے بیان کردہ مضبوط دلائل کے جواب میں دل طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے ہوئے ندرت کو خود سے دور نہ کرنے کی فریاد کرنے لگا تو شاہ زین نے فیصلہ دل کے حق میں سناتے ہوئے ندرت کو وہیں قیام کی اجازت دے ڈالی۔ اب یہ الگ امر تھا کہ دل کی بکھری ہوئی کرچیاں سمیٹنے میں کتنا وقت درکار ہوتا۔

تیرے معاملے میں خود میرا دل
میرے مدِ مقابل ڈٹ گیا ہے

☆☆☆

"پُتر! ابھی تو کچھ دن باقی ہیں نا چھٹیوں کے؟"

"ہیں تو۔۔۔ لیکن میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

"اوپر کیوں؟ یہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں نا۔"

مہربانو نے جب سے ملکانی سائیں کو اپنے واپس جانے کے ارادے سے آگاہ کیا تھا وہ جھنجھلاہٹ کا شکار تھیں۔ وہ واپس ہاسٹل جا رہی ہے باوجود اس کے کہ ابھی اس کے طے شدہ پروگرام کے مطابق اُس کے جانے میں چند روز باقی تھے اور وہ پہلے ہی اپنا سامان باندھ رہی ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

"ماں جی! دراصل میری اور کنول بھی واپس آچکی ہیں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ چلی جاؤں تا کہ مل کر اسٹڈیز بھی کر لی جائے۔"

"نا تو یہ بات آنے سے پہلے پتا کوئی نہیں تھی کہ انہوں نے کب واپس آنا ہے۔" اُن کا مطمئن ہونا ذرا مشکل تھا۔

"پتا ہوتا تو میں یقیناً آپ سے پہلے ہی کہہ دیتی کہ مجھے جلدی جانا ہے۔"

"ہوں۔۔۔" ملکانی سائیں نے پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھا جو اپنے ساتھ لائے گئے اٹیچی میں

موٹی موٹی کتابیں اچھی طرح سیٹ کرنے کے بعد اب اوپر کپڑوں کو ہینگرز کے سمیت رکھتی جا رہی تھی۔ یہ وہ کپڑے تھے جو اس نے اس دفعہ خریدے تھے ورنہ ہاسٹل سے وہ ہمیشہ صرف چند کتابیں ہی لایا کرتی تھی۔

"کونٹ (اکاؤنٹ) میں پیسے ہیں یا شاہ جی سے کہہ کر اور ڈلوا دوں؟"

"نہیں، ضرورت نہیں ہے ابھی۔" اٹیچی بند کرتے ہوئے سرسری سا جواب دے کر اس نے ہینڈ بیگ میں موبائل کا چارجر، پرفیوم اور ہینڈ لوشن ڈال کر اس کی زِپ بند کی اور صوفے پر ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"مجھے صرف آپ سب کی ضرورت ہے ماں جی، روپوں پیسوں کی نہیں۔"

"روپے پیسے کی قدر پتر اُن سے پوچھ جن کے پاس نہیں ہے۔ تجھے کیا پتا چند ہزار روپوں کے لیے صرف اور صرف چند ہزار کے لیے لوگ اپنی بیٹیاں تک بیچ دیتے ہیں۔ اور انہیں کچھ پروا نہیں ہوتی، نہ اپنی بیٹی کی زندگی کی اور نہ اس کی آبرو کی، بس اپنی عیش کی زندگی بچانے کے لیے سودے پہ سودا کرتے چلے جاتے ہیں جھلیے۔"

"ہاں ماں جی! کچھ لوگ عزت بچانے کے لیے بیٹیوں کو قتل کر دیتے ہیں، کہیں عیش و آرام کی زندگی بچانے کی خاطر بیٹی کا سودا کرتے ہیں تو کہیں جائیداد بچانے کے لیے بیٹی کو زندہ۔۔۔۔"

"تیرا دماق (دماغ) تو خراب نہیں ہو گیا۔۔۔ او تو مری بیٹی ہو کر مجھے طعنے دے رہی ہے ابا سائیں کے۔۔۔"

جائیداد بچانے کی خاطر ہی ان کے ابا سائیں نے کئی برس صرف اس لیے ان کی شادی نہیں کی کہ اپنے خاندان میں ان کی عمر کا کوئی لڑکا موجود نہیں تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ جائیداد ان کے گھرانے سے باہر نکلے۔ اسی وجہ سے شاہ سائیں کے جوان ہونے کا انتظار کیا گیا اور جب وہ شادی کی عمر کو پہنچے تو ڈھلتی عمر کی ملکانی کو ان کے ہمراہ رخصت کر دیا گیا۔

یوں بھی وہ ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور انہیں خاندان سے باہر بیاہنا ان کی روایات کے خلاف ہوتا جبھی تمام بچوں میں سے نسبتاً بڑے شاہ سائیں سے انہیں بیاہ دیا گیا۔

ان باتوں سے مہربانو اور میران بھی اچھی طرح واقف تھے جبھی ملکانی کا خیال تھا کہ وہ انہیں ہی طعنہ دے رہی ہے۔ حالاں کہ حقیقت اس سے کہیں برعکس تھی۔ مہربانو کو تو بس اپنی کہی گئی بات میں سے ان کا روپوں پیسوں والی بات کو نوٹ کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کا خیال اور خواہش تھی کہ ملکانی سائیں اس کی کہی ہوئی بات کے پہلے حصے کو نوٹ کر کے پیار کا اظہار کرتیں لیکن۔۔۔۔

خواہش خواہش ہی رہی اور خیال، خیال۔

جو وہ کہنا چاہتی تھی، شاید وہ سب باتیں ملکانی اور دوسرے لوگوں کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھیں، ان کے نزدیک انسانوں کا نعم البدل روپیہ ہی تھا۔ مگر مہربانو کے اس خیال سے وہ لوگ ہرگز اتفاق نہیں کرتے تھے اور یہیں سے ان کے ذہنوں میں اختلاف ہونے لگتا۔

"ماں جی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آئی ایم سوری اگر آپ کو برا لگا تو۔۔۔"

"ماں جی نہ کہا کر مجھے، سیدھا اماں سائیں کہہ کر بلایا کر، اللہ جانے کتنے نویں نام میرے لیے ڈھونڈتی رہتی ہے ہر وقت۔"

وہ مسکرا دی تھی ان کی بات سن کر۔

"اور ہاں یہ انگریزی نا، شہر چھوڑ کر آیا کر سمجھی۔"

"جی اماں سائیں!"

مسکراتے ہوئے اس نے کہا تو وہ بھی مسکرا دیں اور اٹھ کر کمرے سے نکلنے سے پہلے کچھ یاد آتے ہوئے مڑیں۔

(باقی آئندہ)

فاخرہ گل

میرے آئینوں کو خبر کرو

''پتر! شاہ سائیں یا میران کے آنے تک حویلی سے نہ جائیں۔''

''لیکن بابا سائیں تو دو تین دن سے حویلی میں نظر نہیں آئے اور۔۔۔''

''ہاں آج رات تک آجائیں گے اور میران' رب جانے کیوں ابھی تک شہر والے فلیٹ پر ہے۔''

''آپ فون کریں نا، اب میں اس کے آنے کے انتظار میں بیٹھی تھوڑی رہوں گی۔''

''او پتر۔۔۔! کوئی بات نئیں، کسی کم (کام) سے ہی ٹھہر گیا ہوگا نا، پوچھوں گی تو ایویں ای غصہ کرے گا، بس خریت (خیریت) سے ہو، مجھے تو یہ دکھ لگ جاتا ہے نا۔''

اسی دوران مہربانو کو کھڑکی سے میران کی جیپ مین گیٹ کے اندر آتی نظر آئی تھی۔

''اماں سائیں، بھائی آگیا۔''

''آگیا ہے؟ او ماں صدقے، ماں واری، میرا پتر آگیا ہے۔''

آن کی آن میں ملکانی سائیں کے چہرے پر بے پناہ چمک ابھری تھی۔ بیٹے کی آمد کی خوشی اُن کے چہرے پر رقصاں دیکھ کر مہربانو بھی مسکرائی تو ضرور مگر دل ساتھ دینے سے انکار کر رہا تھا۔ جبھی عجیب نظروں سے ملکانی کو جاتے دیکھتی رہی اور پھر کھڑکی کی طرف مڑ گئی، جہاں میران کی آمد پر تمام ملازمین لمحہ بھر میں چوکنا ہو چکے تھے۔

☆☆☆

زندگی کھیل ہے اور کھیل میں اگر
چوٹ لگ جائے تو رونا کیسا
کچھ نہ پانے پہ شکایت کیسی
کچھ نہ پایا تو پھر کھونا کیسا

زندگی ندی کے لیے ایسی ہی پہیلی ثابت ہوئی تھی، کب اس کے ساتھ کیا ہو جائے۔۔۔ وہ بڑی ہی بے یقینی کا شکار رہنے لگی تھی، وقت سے بھی اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ ساری زندگی ساتھ رہنے اور اپنی جان اس پر نچھاور کرنے والے رشتے اب انجان بن چکے تھے تو بھلا اور کسی کا وہ کیا یقین کرتی اور پھر وقت کا۔۔ جو بھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا، جو ہمیشہ ساتھ رہنے والوں کو بھی پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانے کا عادی تھا اور پھر پچھلے چند روز سے پے در پے ہونے والے تمام ناخوشگوار واقعات نے اس کی زندگی مکمل طور پر بدل کر رکھ دی تھی۔

اور سب سے بڑھ کر بابا کی یوں اچانک وفات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا اور یہی واقعہ جیسے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔

یوں بھی وہ اس کے لیے صرف باپ کا رول ہی ادا نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اس کے لیے سب ہی کچھ تو تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک جس طرح انہوں نے ندی کو ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا اس کی مثال پورے خاندان میں نہیں ملتی تھی۔ باپ بیٹی میں دوستوں جیسا پیار تھا اور انہی کے دیے گئے مان کے بل بوتے پر ہی اس کی ذات میں بلا کا اعتماد نظر آتا۔

اس کی ہر چھوٹی سی چھوٹی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے والے بابا اسے اب کبھی نظر نہیں آئیں گے۔ وہ زندگی بھر ان کا لمس محسوس نہیں کر پائے گی۔۔۔ یونیورسٹی سے واپسی پر لان میں پائپ ہاتھ میں لیے پودوں کو پانی دیتے ہوئے بھی نہیں، صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے بھی نہیں، رات کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بھی نہیں۔۔۔ کیا واقعی اب وہ آسمان کے اُس پار، اس سے دور بہت دور چلے گئے ہیں۔

بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اس نے کھلی کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا، دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ کلیجہ منہ کو آنا اور جگر چھلنی ہونا جیسے محاورے اسے اب سمجھ آئے تھے۔

کھڑکی سے نظر آتا ہمیشہ تازہ اور سرسبز و شاداب لان جسے صبح اٹھ کر دیکھتے ہی روح میں زندگی اور تازگی کی ایک نئی لہر سرائیت کرنے لگتی تھی اب اجڑا ہوا تھا۔

سامنے دائیں طرف دیوار کے بالکل ساتھ نل اور ساتھ ہی پانی کی موٹر موجود تھی۔ نل کے اوپر موجود پائپ بخار آنے سے ایک روز پہلے بابا نے ہی رکھا تھا سو تب کا اب تک وہیں رکھا تھا۔

سامنے ہی آسٹریلین توتوں کے پنجرے میں پانی کی کٹوریاں سوکھی اور پنجرے میں انتہائی گند موجود تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بابا کتنے شوق اور محبت سے یہ توتے لائے تھے۔ اب ان کی یہ حالت دیکھ کر اس نے چاہا کہ لان میں جا کر اُن کا پنجرہ ہی کم از کم صاف کر دے اور انہیں کچھ کھانے کو دے مگر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانے سے خواہش حقیقت کا روپ دھارنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور وہ وہیں نیچے کارپٹ پر بیٹھی تو پھر بیٹھتی ہی چلی گئی۔ اس بار خود اسے اپنی ہی حالت پر رونا آگیا تھا۔ یہ سب اس کے ساتھ جانے کیا ہو رہا ہے اور اب آگے زندگی میں کیا ہونے والا ہے۔ سر سے سائبان چھن ہی چکا تھا اب تو بس ظاہری طور پر دیواریں کھڑی تھیں اور دیواریں بھی وہ جو مسلسل آندھیوں کی زد میں تھیں اور اپنی کمزور بنیادوں پر بھی تکیہ کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

یہ سب باتیں مل کر اسے رلائے دے رہی تھیں باوجود اس کے کہ دھاڑیں مار مار کر رونے کی وجہ سے آواز ساتھ چھوڑ گئی تھی اور جسم ہر وقت بے دم سا محسوس ہوتا رہتا مگر امی کے علاوہ کوئی بھی اسے گلے لگا کر تسلی دینا گوارا نہ کرتا۔ ان کے علاوہ کوئی کندھا ایسا نہ تھا جس پر سر رکھ کر وہ اتنا روتی کہ ذہن و دل کی تمام کثافت آنسوؤں کے سنگ بہہ نکلتی۔

کوئی سایہ اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
مرجاؤں گا اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
ساونلی رت میں خواب جلے تو آنکھ کھلی
میں نے دیکھا اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
اب کے موسم یہی رہے تو مرجائے گا
اک اک لمحہ اچھے سائیں، دھوپ بہت ہے
کوئی سایہ آگ میں جلنے والوں پر بھی
کوئی دھیان اچھے سائیں دھوپ بہت ہے
اچھے سائیں مان لیا دنیا ہے روشن
لیکن یہ کیا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے
کون تھا جس سے دل کی حالت کہتا میں
کس سے کہتا اچھے سائیں دھوپ بہت ہے

وہ ندرت جس کی خوش مزاجی کے ساتھ ساتھ خوش لباسی بھی اپنی مثال آپ تھی اب الجھے بالوں اور ملگجے کپڑوں میں چپ چاپ امی کے کمرے میں بیٹھی انہیں نماز اور قرآن پاک پڑھتے دیکھتی رہتی۔ سجدے میں جا کر کتنی ہی دیر روتی ہوئی ماں کو دیکھتی تو دل چاہتا زندگی ایک سلیٹ ہوتی تو ایک پل کی تاخیر کیے بنا سب مٹا کر رکھ دیتی۔ صبح یا رات کو آفس آتے جاتے ہوئے اچانک کبھی لاؤنج یا کچن میں ناصر بھائی سے آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ واپس پلٹ جاتے اتنی دفعہ سامنا ہونے کے باوجود کوئی دستِ شفقت نہ بڑھا تھا جس کے تلے وہ خود کو محفوظ اور پرسکون خیال کرتی۔

ثروت آپا، ناصر بھائی، عائشہ بھابھی سمیت تمام لوگ اسے بابا کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ خاندان کے وہ تمام لوگ جو پہلے کبھی اس کی خوب صورتی اور خوبیوں کے معترف تھے اب اس کے لیے ''شکل مومناں کرتوت کافراں'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اس کی طرف انگلیاں اٹھا رہے تھے اور کیوں نہ اٹھاتے جب خود ثروت آپا اور ان کے ساتھ عائشہ بھابھی بین کرتے ہوئے لوگوں سے مخاطب تھیں کہ بابا اخبار میں بیٹی کی تصویر چھپنے کا صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ نظروں کے تیر اور زبان کے نشتر، ہمہ وقت ندرت پر چلتے ضرور مگر وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھی کہ یہ سب باتیں یا رویے

محسوس کر پاتی۔

اس کے سر سے تو چلچلاتی دھوپ میں سائبان چھن گیا تھا۔

وہ جو امی بابا کے اعتماد کے سہارے ساری دنیا سے مقابلہ کرنے کو تیار تھی اب اس کی ہمت بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔۔۔۔ بہت کمزور پڑ گئی تھی وہ۔۔۔

یوں بھی جنہیں اپنوں کا ساتھ حاصل ہو وہ زمانے کی تلخیاں اور مصائب ہنس کر جھیل جانے کی بھی قوت رکھتے ہیں مگر اکیلا بندہ سرسراتے پتوں کو چھیڑتی نرم ہوا سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔

اور یہ بھی سچ تھا کہ اب امی کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو اکیلا ہی جان رہی تھی کہ ناصر بھائی کا بدلا ہوا رویہ اسے اُسی شام بہت کچھ سمجھا گیا تھا جب وہ یونیورسٹی سے جلدی گھر آ گئی تھی۔

اُسی شام شاہ زین سے ملنے کے بعد عائشہ نے صبا کو بھی ندرت ہی کے موبائل سے میسج کر دیا تھا کہ ہوسکتا ہے کچھ روز کے لیے رابطہ نہ ہو پائے کیونکہ وہ ماحول تبدیل کرنے اور ذہنی سکون کے لیے کچھ دن ثروت آپا کے پاس رہے گی۔ جواباً صبا نے اسے ٹینشن نہ لینے اور مکمل ریسٹ کرنے کا کہا تھا۔

☆☆☆

"بیٹا ان کی شوگر تو نارمل سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے اور جہاں تک مجھے لگتا ہے کہ پرہیز بھی باقاعدگی سے کرتی ہیں پھر ایک دم۔۔۔؟"

ڈاکٹر نے اماں کی شوگر چیک کرنے کے بعد تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ بول نہیں پایا۔ اماں کی شوگر نارمل لیول سے کہیں زیادہ ہے اس کا اندازہ اسے بھی ان کے چہرے کی سوجن اور سر درد کی شدت سے ہو گیا تھا۔

"اماں جی ٹینشن نہ لیا کریں کسی بھی بات کی۔۔۔ آپ کو پتا ہے نا شوگر کی ایک نمایاں علامت بہت زیادہ ٹینشن بھی ہے۔۔۔ خوش رہا کریں۔"

ڈاکٹر نے پہلے سے استعمال کردہ دوائی کی مقدار اور اوقات کو چند روز تک بڑھا کر لینے کی ہدایت کی ساتھ ذہنی سکون کی بھی گولی لکھ دی تھی۔

"اور پھر جن ماؤں کے اتنے قابل اور سلجھے ہوئے بچے ہوں ان پر تو پریشان ہونا واجب ہی نہیں۔۔۔ کیوں اماں جی درست کہہ رہا ہوں؟"

ڈاکٹر شفیق نے ہلکے پھلکے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

اپنے نام کا ان پر اس قدر اثر تھا کہ اکثر مریض گھر سے روہانسے آتے اور ان سے ملنے اور باتیں کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے واپس لوٹتے۔ شہر کے چند قابل ڈاکٹرز میں شمار ہونے کے باوجود غرور کی چڑیا کو بھی اپنے نزدیک پر تک مارنے کی اجازت نہ دیتے تھے اور شاہ زین کے والد کو تو وہ یوں بھی اپنا محسن خیال کرتے تھے کہ میڈیکل کالج میں داخلے کے وقت اُن کے پاس فیس دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے شاہ زین کے والد نے ہی انہیں نہ صرف اس وقت فیس کی رقم دی بلکہ واپس لینے سے بھی انکار کر دیا۔

ان کے اسی احسان کے پیش نظر وہ کبھی بھی ان سے فیس نہ لیتے تھے کہ بقول ان کے اگر اس وقت اللہ کی ذات شاہ زین کے والد کو وسیلہ نہ بناتی تو وہ آج ہرگز ڈاکٹر نہ بن پاتے۔

کلینک سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اماں کو رکشے میں بٹھایا اور رکشے والے کو کچھ دیر انتظار کرنے کا کہہ کر دوائی لینے کی غرض سے میڈیکل اسٹور میں داخل ہوا ہی تھا کہ ہاتھ میں دوا کا شاپر پکڑ کر باہر نکلتے پروفیسر خورشید سے ملاقات ہو گئی چونکہ وہ یونیورسٹی میں ہونے والے تمام معاملات سے واقف تھے اسی لیے جب انہوں نے شاہ زین سے اس متعلق بات کرتے ہوئے چند دن سے یونیورسٹی نہ آنے کا پوچھا تو ہمدرد جان کر اس نے اس واقعہ کے ردعمل کے طور پر ٹیوشنز کے ختم ہونے کا بتا کر آج کل نئی ٹیوشنز ڈھونڈنے کی مصروفیت بتا ڈالی۔

ندرت کے بغیر اس کا یونیورسٹی جانے کا دل نہیں چاہتا تھا، یہ بات وہ بڑی خوب صورتی سے چھپا گیا

تھا۔ "میری نظر میں ایک جاب تو ہے اگر تم کرنا چاہو تو۔۔۔"

پروفیسر صاحب نے اس کی پرابلم محسوس کرتے ہوئے مخلصانہ آفر کی تھی۔

"کیوں نہیں سر! جاب کیسی بھی ہو میں کرنے کو تیار ہوں کیونکہ محنت کرنے میں مجھے کبھی شرم محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن ایک بات ہے۔۔۔"

پروفیسر صاحب اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک دم چونکے اور چہرے پر سوالیہ تاثرات لیے اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

"سر میں شارٹ کٹس کی بدولت پیسہ کمانے سے محنت اور جدوجہد کے رزق حلال کو ترجیح دیتا ہوں۔"

"شاباش بیٹا! بہت خوشی ہوئی تمہارے خیالات جان کر۔" وہ مسکرائے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ جاب کے ساتھ ملنے والی ممکنہ مراعات یا تنخواہ کے متعلق پوچھنا چاہتا ہے مگر اپنے خیال کا غلط ثابت ہونا انہیں متاثر کر گیا تھا۔

"تم ایسا کرنا کل صبح میرے گھر آ جانا۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

رکشے والے کے پکارنے پر اس نے صبح وقت پر پہنچنے کا وعدہ کرتے ہوئے شکریے کے ساتھ ان سے اجازت لی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا رکشے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

عمر بھر کو داغ دے جاتی ہے ادنیٰ بھول بھی
جرم ثابت ہو نہ ہو الزام پھر الزام ہے

اور آخر کار زندگی نے ایک بار پھر سست روی سے ہی سہی مگر آگے کی طرف قدم بڑھانے شروع کیے تو ندرت کے دل میں سب سے پہلے شاہ زین سے بات کرنے اور اس کے ساتھ اپنے اندر کا دکھ شیئر کرنے کا خیال آیا اور تبھی ندرت کو محسوس ہوا کہ اس نے کئی روز سے موبائل نہیں دیکھا۔ اپنے کمرے میں تلاش بسیار کے بعد وہ امی کے پاس آئی جو اذان ہونے کے انتظار میں قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو آیت مبارکہ ختم کرنے کے بعد قرآن پاک بند کر دیا۔

سفید شلوار دوپٹے کے ساتھ پرنٹڈ قمیص پر بالوں کی ڈھیلی سی پونی۔ ندرت کے چہرے پر آج انہیں سرخی اور سفیدی پاؤں پسارے بیٹھی معلوم ہو رہی تھی۔

"بیٹا کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"امی وہ۔۔۔ دراصل میرا موبائل پتا نہیں کہاں ہے؟"

"یہیں کہیں ہوگا، جانا کہاں ہے۔"

"لیکن میں نے ہر جگہ ڈھونڈا ہے مگر نہیں ملا۔ پی ٹی سی ایل نمبر سے کال کر کے دیکھا تو بیل جا رہی ہے مگر ریسیو نہیں ہو رہا۔"

اسی دوران مغرب کی اذانوں کی آواز چاروں طرف سے آنے لگی تو دوپٹا سر پر جمائے وہ ایک دم خاموش ہو گئی تاکہ عقیدت و احترام سے اذان سنی جا سکے۔

اور یہی بات بچپن سے امی بابا نے سکھائی بھی تھی کہ اذان شروع ہونے پر اگر جملہ ادھورا بھی رہتا ہے تو چھوڑ دو اور صرف اذان کی طرف دھیان دو۔ آج بھی حسب عادت وہ اذان سن تو خاموشی سے رہی تھی لیکن دھیان مفقود تھا۔ ذہن میں اس روز کی فلم چل رہی تھی جب وہ آخری دن یونیورسٹی گئی تھی۔ واپسی پر پوائنٹ میں اس نے شاہ زین کو میسج کرنے کے بعد موبائل بیگ میں ڈالا تھا اور اور پھر۔۔۔ پھر گھر کے قریب پہنچ کر موبائل پر ہی ٹائم دیکھا تھا اور دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔ یعنی موبائل گھر پر ہی تھا اور اتنے دنوں سے چارج بھی مسلسل ہو رہا تھا۔ اسی لیے اس کے کال پر بیل تو جا رہی تھی مگر ریسیو نہیں کیا گیا۔

"مانا کہ گھر میں ہے مگر۔۔۔"

"آؤ بیٹا! نماز پڑھ لیں۔" اذان ختم ہونے پر امی نے جائے نماز بچھاتے ہوئے اسے بھی بلایا تو وہ ابھی ابھی ہی نماز کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

پروفیسر خورشید کے توسط سے شاہ زین کو ایک گارمنٹ فیکٹری میں اسسٹنٹ کوآرڈینیٹر کی جاب مل گئی تھی۔ یہ ایک مشہور و معروف کمپنی تھی جن کی مین برانچ تو شہر کے وسط میں قائم تھی مگر اب آرڈر اور ڈیمانڈ بڑھنے کے پیش نظر فیکٹری کی ایک اور برانچ شہر سے تقریباً باہر قائم کی گئی تھی۔ جگہ کا ریٹ کم ہونے کے باعث ایک وسیع و عریض رقبے پر فیکٹری تعمیر کروانے کے بعد اب کام شروع کیا گیا تھا۔ وقتی طور پر تو مین برانچ کے لوگ یہاں نہ صرف کام کر رہے تھے بلکہ نئے لوگوں کو بھی سکھا رہے تھے۔ اسی لیے یہاں ایسے ایمان دار اور محنتی لوگوں کی اشد ضرورت تھی جو جلد از جلد کام سیکھ کر خلوص نیت سے اپنی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

شہر سے دور ہونے کے باعث آفس ممبرز کو رہائش کی سہولت بھی دی گئی تھی جبکہ ورکرز روزانہ کی بنیاد پر ہی آیا جایا کرتے اور اب شاہ زین کو بھی فیکٹری کے نزدیک مہیا کی گئی رہائش گاہ استعمال کرنا تھی بصورت دیگر ٹریفک نارمل رفتار سے چلنے کے باوجود اسے صرف آنے میں ہی دو ڈھائی گھنٹے لگ جاتے البتہ ثمینہ کو اب کالج جانے کے لیے پوائنٹ بس کو استعمال کرنا تھا۔

وہ گھر جس میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا، اماں نے شادی کے بعد پہلا قدم رکھا، چھوڑنا مشکل تو تھا مگر رزق کے حصول کے لیے یہ ناممکن امر بھی اماں کی پرزور تائید سے ممکن ہو گیا کہ ان چند روز میں شاہ زین کی جو کیفیت اماں نے دیکھی تھی وہ ان کے لیے اس اذیت سے کہیں بڑھ کر تھی جو انہیں یہ گھر چھوڑنے پر ہوتی۔ جبھی شاہ زین کے ایک دو بار منع کرنے کے باوجود انہوں نے وہاں شفٹ ہونے کی بھرپور حمایت کی کیونکہ وہ کسی بھی طرح شاہ زین کو اس کیفیت سے باہر نکالنا چاہتی تھیں جس میں وہ پچھلے کئی روز سے جکڑا ہوا تھا۔ یوں بھی انسان کے لیے ہر طرح کے دکھ اور پریشانی سے پیچھا چھڑانے کا بہترین طریقہ ہی یہ ہے کہ وہ مصروف ہو جائے سو اماں بھی اسے مصروف دیکھنا چاہتی تھیں۔

خود شاہ زین کے لیے یہ گھر چھوڑنا اتنا آسان نہ تھا اور وہ بھی ایسی صورت میں جب وہ اس گھر میں تو ہی مرتبہ ندرت کو چلتے پھرتے، اماں سے خوش گپیاں کرتے، کچن میں ثمینہ کے ساتھ کھانا بناتے، صحن میں اس کا انتظار کرتے، برآمدے میں کوئی کتاب پڑھتے اور اپنے کمرے میں اس کی کی گئی کسی محبت بھری بات پر شرماتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

لیکن اپنی ذات کے لیے وہ خود سے جڑے ان رشتوں کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا جو اس کی ایک آہ پر درد سے بلبلا اٹھتے تھے سو آج جب وہ تینوں آخری دفعہ اس گھر کو دیکھ رہے تھے تو گھر کے ساتھ ساتھ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آخری دفعہ ندرت کو بھی الوداع کہنے کے لیے ایک بار پھر فون کا سہارا لیا مگر کوئی بھی رسپانس نہ ملنے پر میسج ٹائپ کرنے لگا۔

دل تو بوجھل تھا ہی اس پر آنکھوں میں تیرتی نمی نے اسکرین کو بھی دھندلا دیا تھا۔

☆☆☆

"ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی شل ہیں شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

لاکھ چاہنے کے باوجود میں تمہاری یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا۔ تم نے چاہے مجھے بساط کا ایک مہرہ ہی سمجھا ہو مگر میرے دل کے سنگھاسن پر اب بھی تمہارا ہی راج ہے اور آئندہ بھی کبھی کوئی یہ جگہ نہیں لے پائے گا، میرے جذبات کو محض ذریعہ تفریح سمجھ کر یقیناً تم نے مجھے ہرٹ کیا لیکن میرا دل اب بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں کہ وہ سب محض ایک مذاق تھا اور اگر ایسا تھا بھی تو میرے لیے وہ لمحات جو کبھی تم نے میرے ساتھ گزارے ساری زندگی پر محیط رہیں گے۔۔۔ کہ تمہارے علاوہ اس دل کو نہ تو کسی کی طلب ہے اور نہ ضرورت۔۔۔۔

سمجھو نہ سمجھو

ہمیشہ تمہارا۔۔۔ شاہ زین۔"

رات ناصر بھائی کے آفس سے لوٹنے پر عائشہ بھابھی نے موبائل ان کے سامنے بڑھا دیا تھا، سامنے موجود پیغام پڑھ کر ناصر بھائی کے جسم کا تمام خون گویا چہرے پر آ کر رک گیا تھا۔ چاہنے کے باوجود عائشہ کے اس عمل پر نہ تو وہ اسے جھڑک سکتے تھے اور نہ ہی ندرت کو مزید برا بھلا کہنا چاہتے تھے کہ شادی کے بعد شروع شروع میں عائشہ ہر کام میں ندرت کی پسند کو ہی حرفِ آخر سمجھنے پر اکثر ناصر سے اختلاف کرتی بھی تو سخت لہجے میں اسے ٹوک کر یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ۔

"اپنے ذاتی فیصلوں میں تم جو چاہو کرو میں مداخلت نہیں کروں گا، لیکن ہاں بات جب گھر کی ہو تو اس میں ندرت کی ہی پسند کو مقدم رکھا جائے گا جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی کیونکہ ندرت مجھے اپنی پسند ناپسند کیا بلکہ زندگی سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔"

دیواروں پر ہونے والا پینٹ ہو یا عائشہ کے بیڈ روم کے علاوہ تمام گھر کی سیٹنگ، پردوں کے کلر کا انتخاب ہو یا کسی دعوت کا مینیو، ندرت کے اوکے کرنے تک ہر کام رکا ہی رہتا اور گو کہ ندرت ہر کام میں بھابھی کے مشورے کی منتظر رہتی مگر اس سب کے باوجود عائشہ ذہنی طور پر خود کو مظلوم تصور کرتی کہ جس کی اپنے گھر میں اتنی سی بھی وقعت نہیں کہ وہ کوئی فیصلہ خود کر سکے۔ تن تنہا حکمرانی کرنے کا خواب ہی درحقیقت دوسروں کو زیر کرنے کی خواہش کا سبب بنتا ہے اور یہی کچھ آج کل عائشہ بھی کر رہی تھی۔ نہ صرف بلکہ اکمل کے علاوہ کسی اور کو چاہنے کا بھی کفارہ اب ندرت کے ذمے واجب الادا تھا جسے شاید اسے ادا کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

ندرت اپنے کمرے میں بچھے لائٹ پنک کارپٹ پر موجود بلیک اٹالین اسٹائل کاؤچ پر اپنی زندگی میں ہونے والی پے در پے تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب عائشہ بھابھی دستک کا تکلف کیے بغیر ہاتھ میں اپنا موبائل لیے اندر آئیں۔

"اکمل کا فون ہے تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

اس کے ہاتھ میں موبائل دے کر کوئی بھی جواب سنے بغیر وہ واپس مڑنے سے پہلے پھر بولیں۔

"فون بند کرتے ہی واپس میرے کمرے میں دے جانا۔"

ندرت نے اثبات میں گردن ہلائی تو وہ طنزیہ نظروں سے دیکھتی واپس چلی گئیں۔

"اکو!"

"کیا حال ہے ندرت جی؟"

"میرا خیال ہے کہ تم سوچ سکتے ہو کیا حال ہوگا۔"

ندرت کے جواب میں وہ کچھ بول نہیں پایا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ندرت کا دکھ شیئر کرنا چاہتا تھا مگر نہ تو وہ اس دن کچھ بول پایا تھا جب اس نے بابا کی تعزیت کے لیے اسے فون کیا تھا اور نہ ہی اس کے پاس آج الفاظ تھے جب وہ ایک دوست کی حیثیت سے اسے اپنے پن کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

"خاموش کیوں ہو گئے؟"

"دراصل بچپن سے ہی آپ ہر بات میں مجھے سمجھاتی تھیں نا، گو کہ ہماری عمروں میں اتنا فرق نہیں ہے لیکن پھر بھی کھیل میں ہارنے کے بعد، کوئی کھلونا ٹوٹنے پر یا کبھی امتحان میں کم گریڈ آنے پر ہمیشہ آپ نے مجھے سمجھایا۔ میرے رونے کے تسلسل کو توڑ کر ہنسنے پر مجبور کیا۔۔۔ صرف میری خوشی کی خاطر میرے ٹوٹے کھلونے لے کر اپنے مجھے دیے مگر آج۔۔۔"

اکمل نے رک کر گہری سانس خارج کی تھی۔

"آج میں آپ کی اداسی کم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔"

چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی کی نذر ہوئے۔

"پتا ہے اکو۔۔۔" ندرت کی آواز نے خاموشی توڑی۔

"میں اداس نہیں ہوں لیکن ہاں شدید کرب ضرور ہے ایک اذیت ہے جو دن رات میرے ساتھ ہے۔۔۔ یا یوں کہہ لو کہ میرا حال تو اُس انسان کی طرح ہے جو رات کو اپنے بھرے پرے خاندان کے

ساتھ خوش وخرم سوئے اور سوتے میں ہی گھر کی چھت گر جائے۔"

"ندرت جی۔۔۔!" اکو نے اس کا گلا رندھا محسوس کر لیا تھا جسے وہ بڑی خوب صورتی سے چھپا گئی۔

"ہاں اکو تصور کرو کہ چھت گرنے سے اس کے جیتے جاگتے سب رشتے ختم ہو جائیں اور وہ انسان ملبے تلے کراہ رہا ہو۔۔۔ زندہ تو ہو مگر اپنے پیاروں کے ساتھ موجود ہونے کے باوجود ان کے چھن جانے پر اس طرح نوحہ کناں ہو کہ خود اس کا دم گھٹنے کو ہو۔۔۔"

"ندرت جی پلیز! مت کہیں ایسا۔۔۔ سنبھالیں خود کو۔" ندرت کے لہجے کی سوگواریت پر وہ تڑپ اٹھا تھا۔

"یہ سچ ہے اکو۔۔۔ بلکہ یہی تو اصل سچ ہے کہ اعتماد کی مضبوط ڈھال ٹوٹنے پر بھی رشتے اور ان کا مان ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ کرچیاں پلکوں سے سمیٹنے پر اکثر آنکھوں میں کانچ سے چبھنے لگتے ہیں۔"

اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھیں بھیگ ضرور گئی تھیں مگر آنسو ان کے کنارے تک آ کر رک گئے تھے اور یقینی طور پر تادم اجازت انہیں اسی ساحل پر منتظر رہنا تھا۔

"ندرت جی پلیز خود کو سنبھالیں نہ صرف اپنے بلکہ آنٹی کے لیے۔۔۔ کیونکہ وہ آپ کو اس طرح دیکھیں گی تو اُن کا دکھ دوگنا ہو جائے گا اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنا دکھ آپ سے چھپانے کی کوشش میں وہ خود کو کوئی روگ لگا بیٹھیں۔۔۔ اور پتا ہے نا یہ روگ انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح یوں کھوکھلا کر دیتا ہے کہ ارد گرد موجود لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ پتا چلتا ہے تو تب جب دیمک کا کھیل ختم ہو چکا ہوتا ہے۔"

یہی بات وہ کافی دنوں سے خود کو سمجھانے کی کوشش میں تھی۔ مگر اکمل کے کہنے پر ایک دم دل میں اتر گئی تھی کہ اپنے لیے نہ سہی مگر امی کے لیے اسے خود کو سنبھالنا ہی ہوگا۔

اور اپنی ذات کو پھر سے یکجا کرنے کا سفر وہ شاہ زین کے ساتھ شروع کرنا چاہتی تھی جبھی فوراً سے بھی پہلے شاہ زین سے بات کرنے اپنے موبائل کی طرف ذہن دوڑانے لگی۔

☆☆☆

ملکانی کا خوشی سے نہال چہرہ اور اکلوتے بیٹے پہ واری صدقے جاتی کاجل لگی آنکھیں۔۔۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آنکھوں کے ذریعے اسے اپنے دل میں اتار لیں۔ زندگی کا تصور میران کے بغیر انہوں نے کیا ہی کب تھا۔ حویلی میں ملازموں کی کھیپ موجود ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی بھی اسے ملازموں کے سر پر نہیں چھوڑا تھا۔ بیٹی ہونے کے باوجود وہ مہربانو سے تو بعض اوقات لاتعلق رہ لیتی تھیں مگر میرو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ ہی رہا کرتا۔

اسی لیے اب جو چند دن اسے دیکھے بغیر گزرے تو انہیں بھلا چین کب آیا تھا۔ ان دنوں میں نہ تو وہ اپنی عزیز از جان سونی پر دھیان دے پائیں اور نہ ہی حویلی کے دیگر معاملات پر، دھیان تھا تو صرف اپنے لختِ جگر کا، جسے وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہونے کے باوجود بار بار ٹیلی فون کر کے اس کا غصہ مول نہیں لینا چاہتی تھیں۔

جبھی اب اسے اپنے سامنے پا کر اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں۔

"پتر! اتنی دیر لگا دی، ماں کی کوئی یاد نہیں آئی۔"

شاور لینے کے بعد فریش ہو کر اب وہ ملکانی کے پاس بیٹھا تھا۔

"کیوں نہیں اماں سائیں! آپ کی محبت کی کشش ہی تو ہے جو اتنی جلدی آ گیا، ورنہ شاید کچھ دن اور شہر میں رکتا۔"

"ویسے پتر! خیر تو تھی نا۔ ایسا کیہڑا (کون سا) ضروری کام تھا؟"

ملکانی کی بات پر وہ لحظہ بھر چونکا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بھنوؤں پر انگشتِ شہادت

پھیرتے ہوئے بولا۔

"بس کچھ ادھار لوٹانا تھا اماں سائیں! اُسی میں ٹائم لگ گیا۔"

"او پتر! مجھے سمجھ نہیں آئی۔" ملکانی اُس کے الفاظ سے کہیں زیادہ اس کے لہجے میں الجھ گئی تھیں۔

"پر چلو جو ہوا سو ہوا۔۔۔ اب تو فیر حساب برابر ہو گیا ہے کہ نہیں۔"

"حساب تو اماں سائیں برابر ہو گیا ہے مگر دل کو سکون نہیں مل رہا ابھی تک۔"

کنیزاں سونی کو نہلا کر ملکانی سائیں کے پاس چھوڑ کر گئی تو میران نے ان کی گود سے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس کے نرم و ملائم سفید بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ بھی ابھی اتنی دیر پانی میں کھیلنے کے بعد اب آغوش کا لمس پا کر اس کے ساتھ ہی لگ گئی۔

"لے تے فیر پتر یہ کون سی بات ہوئی۔ جتنا ادھار تھا اس سے کچھ زیادہ کر کے لوٹانے سے دیکھیں دل کو کیسا سکون ملے گا۔"

"کچھ زیادہ کر کے؟" سونی کو سہلاتا ہاتھ اک دم رکا اور اس نے چونک کر ملکانی سائیں کو دیکھا۔

"آہو نا، پانچ کو دس کر کے دے دے واپس، نئیں تو اٹھ (آٹھ) کر دے۔"

بات کے پس منظر سے بے خبر وہ محض مشورے ہی دیئے جا رہی تھیں مگر ان کا مشورہ حقیقی معنوں میں میران کے دل کو چھو چکا تھا۔

وہ ندرت جس نے اس کا کیریئر تباہ کر دیا۔ ساری یونیورسٹی کے سامنے اس کی اتنی انسلٹ ہوئی کہ کس قدر بے عزتی سے اسے یونیورسٹی سے نکال باہر کیا گیا۔ کیا یہ سب محض اخبار کی ایک خبر کے مقابلے میں کم تھا؟ وہ تو ظاہر ہے پہلے کی طرح ہی یونیورسٹی بھی آنے لگی، ڈگری بھی لے لی اور کل کو شادی کر کے ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے گی۔

مگر اس کا کیا۔۔۔ گو کہ یہ ڈگری متوسط طبقہ کے لوگوں کی طرح اس کی زندگی کی کامیابی اور روزی روٹی کمانے کی پہلی سیڑھی نہیں تھی۔ وہ خود چاہتا تو پوری یونیورسٹی کی بنیاد رکھ سکتا تھا کہ شاہ سائیں کے سیاسی اثر و رسوخ کے باعث نہ تو منظوری لینا کوئی دشوار گزار عمل تھا اور نہ ہی پھر اس یونیورسٹی کی رجسٹریشن کروانا۔

بلکہ اس کا المیہ تو کچھ اور تھا۔ جو لوگ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ہوں، عام طور سے ان کے منہ سے باتیں بھی "میں" کی نکلتی ہیں جن کا فائدہ ان کی ذات کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ تانبے کے ظاہری چمک دمک والے چہرے اور لوہے سا دماغ جو پل بھر میں تپ کر سامنے والے کی عزت اتارنے میں لمحہ بھر نہیں لگاتے اور یہ سب اس لیے کہ دوسروں کے سامنے شرمندگی کا احساس کیا ہوتا ہے وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ جب بھرے مجمع میں کسی کو رسوا کیا جائے تو وہ آنکھیں نیچے کر کے کھڑے ہوتے ہوئے سامنے والے کو عزت نہیں دے رہا ہوتا، اسے درست ہونے کا سرٹیفکیٹ نہیں دے رہا ہوتا بلکہ وہ بے چارا تو زمین پر نظر گاڑے اس میں سما جانے یا لمحہ بھر میں اس ہجوم سے غائب ہو جانے کے معجزے کی لاحاصل خواہش میں گرفتار ہوتا ہے۔

اور اب جب ندی کی وجہ سے وہ احساسِ ذلت کا شناسا بنا تھا تو اس کے اندر لگی آگ دن بدن ٹھنڈی ہونے کے بجائے مزید بھڑک رہی تھی۔ انتقام کا جو دھارا اب اس کے خون میں رچ گیا تھا۔ اُسے وہ کسی طور نشیب کی طرف بہنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ تاوقتیکہ وہ ندی کو خود اپنے سامنے شکست خوردہ حالت میں نہ دیکھ لے۔

فیوجی یامہ پہاڑ میں کئی دنوں سے لاوا جمع ہو رہا تھا اور لاوا جتنا پرانا ہوتا اتنا ہی خطرناک اور نقصان دہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

دن سہانے تلاش کرتے ہو
گم خزانے تلاش کرتے ہو
وہ پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے

جو زمانے تلاش کرتے ہو

وہ بات جو وہ خود کئی روز سے اپنے آپ کو سمجھانا اور باور کروانا چاہتی تھی وہ اکمل سے بات کرنے کے بعد بغیر کسی دقت کے اس کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی اور یہ بات وہ بھی جانتی تھی کہ آخر کب تک اسی طرح زندگی گزرے گی۔ پچھلے دنوں میں جو کچھ بھی ہوا قطع نظر اس کے کہ اچھا تھا یا برا مگر وہ سب ہو چکا، اب آگے کے بارے میں سوچنا ہی ہوگا۔

امی جو بابا کے انتقال کے بعد ایک دم ہی ضعیف لگنے لگی تھیں انہیں اس کا ساتھ چاہیے تھا۔ ناصر بھائی کے رویے نے ان کے اندر جو توڑ پھوڑ کی تھی اس کا مرہم لگانے باہر سے کوئی نہیں آئے گا۔ یہ فرض ندی کا تھا اور اسے نبھانا تھا۔

اپنی ذات کی خاطر نہ سہی تو امی کے لیے سہی اسے زندگی کی طرف لوٹنا تھا اور وہ بھی اس انداز میں کہ اللہ کے حکم سے اسے زندگی دینے والی ہستی کی آنکھوں میں پھر سے زندگی نظر آنے لگے۔ یوں بھی یہ بات وہ اپنے دل کو کسی حد تک سمجھا چکی تھی کہ اپنے پیاروں سے لگائی گئی امیدوں کی مثال بھی بعض اوقات جہاز چلاتے کیپٹن کی سی ہوتی ہے اور ذرا سی غلطی سے نہ صرف خود امیدیں دم توڑ دیتی ہیں بلکہ اس امید سے پیوستہ تمام جذبات و احساسات بھی مردہ ہو جاتے ہیں۔

ایک گہری سانس لے کر آخر کار آج وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اب فوراً سے پہلے شاہ زین سے بات کرنا چاہتی تھی۔ نا صرف یہ بلکہ وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ دل کا سارا بوجھ اس کے ساتھ شیئر کر کے اسے بتانا چاہتی تھی کہ اب رشتوں پر سے اس کا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ بابا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اپنی ذات کے ڈانوا ڈول ہو جانے کا سارا قصہ اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اس بات کا اعتراف کرنا چاہتی تھی کہ اب اسے شاہ زین کے ساتھ، اس کے احساس کی کس قدر ضرورت ہے مگر۔۔۔

موبائل تھا کہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔۔

آج وہ ہر حالت میں موبائل ڈھونڈ لینے کا عزم کر کے سب سے پہلے اپنی وارڈ روب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ایک ایک چیز کھنگال لینے کے بعد جھنجلاہٹ میں مزید اضافہ ہوا تو بے موسم کے کپڑوں کے لیے مختص کی گئی کپ بورڈ کے پاس کمرے سے ملحق چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں جا پہنچی۔ جہاں اس کے آج کل استعمال میں نہ آنے والے جوتے، ہینڈ بیگز، نصاب کی پرانی کتب، منرل واٹر کی بوتلیں، جوس کے چند ڈبے اور اس کے بہت فیورٹ چپس ڈسپوزایبل پلیٹس اور گلاس کے ساتھ موجود تھے۔

جوس اور چپس بابا نے خاص طور پر اس کے ننھے سے اسٹور میں اس لیے رکھوائے تھے تاکہ پڑھتے ہوئے معمولی سی بھوک محسوس ہونے پر اسے کچن نہ آنا پڑے۔

مگر ظاہر ہے موبائل ہوتا تو ملتا بھی۔ نفاست سے تہ کیے گئے کپڑے کپ بورڈ میں اب ایک عجیب ہی منظر پیش کر رہے تھے۔

لینڈ لائن فون سیٹ تو بابا کی وفات کے بعد ہی امی بابا کے بیڈ روم سے ناصر بھائی کے بیڈ روم تک جا پہنچا۔ یہ الگ بات ہے اس کی ایک ایکسٹینشن ڈرائنگ روم میں حسب سابق موجود تھی۔ مگر وہاں سے شاہ زین کو فون کرنا اس کے لیے قطعی طور پر ناممکن تھا۔ امی بابا نے ویسے بھی کبھی موبائل فون استعمال ہی نہیں کیا تھا کہ فون سیٹ تو ہمہ وقت کمرے میں موجود رہتا ہی تھا۔ سو جس سے بات کرنی ہوتی وہیں سے نمبر گھما کر بات کر لی جاتی۔ مسئلہ تو دراصل اب پیدا ہوا تھا جب زندگی کے رنگ ڈھنگ انداز سب بدلے گئے تھے مگر موبائل کا نہ ملنا اس کے لیے کسی معمے سے کم ہرگز ثابت نہیں ہو رہا تھا جبھی کچھ سوچتے ہوئے اسٹور سے نکل کر کمرے میں آئی۔

موبائل خریدنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ پاکٹ منی کی مد میں ایک معقول رقم ناصر بھائی سمیت بابا کی طرف سے بھی ملا کرتی مگر ان حالات میں وہ موبائل خرید کر کوئی نیا ہنگامہ کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بھی اس کی اولین ترجیح اپنا ہی موبائل ڈھونڈنا تھا جس کی خاص بات وہ تمام میسج ہسٹری تھی جس میں شاہ زین اور صبا اور زبیر وغیرہ کے میسجز بھی موجود تھے۔

کچھ دیر سوچ بچار کے بعد اس نے ڈائریکٹ عائشہ بھابھی سے موبائل کے بارے میں دریافت کرنے کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے مگر اس سے پہلے ہی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سرخ سنہری رنگت کی جگہ سرسوں کے پھول سی زرد اور مرجھائی ہوئی اپنی ہی صورت دیکھ کر ٹھٹک گئی اور رک کر بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر گویا حقیقت ہونے کا یقین کرنا چاہا۔

"یہ میں ہوں؟" کہیں اندر سے جیسے تصدیق کرنے کے انداز میں پوچھا گیا۔

اپنی ہی آنکھیں آج اسے اجنبی لگنے لگی تھیں۔

اس کی آنکھوں کے لیے خاندان بھر میں کانچ سی آنکھوں کی تشبیہ دی جاتی تھی۔

آج اپنی آنکھوں میں تیرگی ڈیرے ڈالے معلوم ہو رہی تھی۔ چمک گویا آنکھوں میں اداسی اوڑھے سو چکی تھی۔ اسی لمحے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ شاہ زین بلا اجازت اس کے ذہن کے پردے پر آنمودار ہوا، جیسے چق کے اس پار ہی تو کھڑا تھا۔

اس روز جب یونیورسٹی میں پیپل کے پیڑ کے نیچے باتیں کرتے ہوئے اس نے زبیر اور صبا کے سامنے ندی کو حاضر جوابی میں ایک بار پھر پیچھے چھوڑ دیا تو وہ مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تینوں کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی تھی۔ تب زبیر اور صبا کے قہقہوں کے دوران شاہ زین نے پیپل کا پتا اٹھا کر اس پر کچھ لکھنے کے بعد جو ندی کے سر پر رکھا تو وہ پھسل کر اس کی گود میں جا گرا۔

لوگ ٹکرا کے در و بام سے مرتے نہ اگر
دیکھ لیتے وہ کہیں تیری سمندر آنکھیں
یہ شرارت بھرا لہجہ تو میری عادت ہے
تو ہر بات پہ یوں نم نہ کیا کر آنکھیں

پیغام پڑھ لینے کے بعد سے اب تک وہ پیپل کا پتا اس کے پاس محفوظ تھا۔۔

مگر آنکھوں کا سمندر اب خشک ہونے کو تھا۔

مزید سوچوں کو ذہن میں آنے سے روکنے کی کوشش میں اس نے سست روی سے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور عائشہ بھابھی کے پاس جانے کو قدم بڑھا دیئے۔

☆☆☆

فیکٹری کی طرف سے مہیا کردہ گھر بلاشبہ شاہ زین کے سابقہ گھر سے کئی درجے بہتر تھا۔ یوں بھی بنیادی فرق طرزِ تعمیر کا بھی تھا۔ تین درمیانے سائز کے کمرے آگے برآمدہ، برآمدے کے ایک کونے پر کچن سامنے صحن اور برآمدے اور صحن کو بائیں طرف سے ملاتا باتھ روم، یہ وہ گھر تھا جہاں شاہ زین کے والد اس کی والدہ کو بیاہ کر لائے۔ ان کی شادی سے پہلے گھر کو رنگ و روغن بھی کیا گیا تھا اور چھت اور دیواروں کو ازسرِ نو تعمیر تو نہیں کیا گیا مگر ہاں اس جگہ کو ٹھیک ضرور کیا گیا۔ جہاں ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ مگر اپنے سلیقے، قرینے اور طبیعت کے سلجھاؤ سے شاہ زین کی والدہ نے اس مکان کو یوں گھر کا روپ دیا کہ محلے کی تمام خواتین کو یہاں آ کر اُن سے باتیں کر کے سکون ملا کرتا۔

یہی وجہ تھی کہ جب اُن لوگوں کی گھر منتقلی کی خبر محلے والوں کو ملی تو سبھی کے دل میں بے چینی کی لہریں اٹھیں کہ ایک کے بعد ایک پڑوسن تصدیق کی غرض سے ان کے گھر چلی آئی۔

یہی نہیں بلکہ جس روز وہ انہیں الوداع کہہ کر آنے لگے تو شدتِ جذبات سے وہ خود پر تو ضبط کرنے میں کامیاب رہیں مگر اہلِ محلہ کی آنکھیں نم ہونے سے نہ روک پائیں۔

"اے راشدہ! ہم رہیں گے تو اسی شہر میں نا، کبھی تم لوگ آ جانا، کبھی ہم ملنے آ جائیں گے اور پھر دیکھو، گھر کو نہ تو کرایہ پر دیا ہے نہ ہی بیچا ہے۔ اسی لیے تاکہ جب دل چاہا یہاں آ کر دو چار دن رہ بھی لیں

گے۔"

پلو سے آنکھیں مسلتی راشدہ کو انہوں نے تسلی دی مگر کس دل سے یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔

"آمنے سامنے گھر ہونے اور ایک شہر میں گھر ہونے میں تو بہت فرق ہوتا ہے نا، کہاں تو یہ کہ جب دل چاہا اٹھ کر آپ کے پاس آبیٹھی اور کہاں تو یہ کہ آپ کے پاس آنے کے لیے ایک دو دن پہلے سے سوچا جائے۔"

بات تو سچ ہی کی تھی راشدہ نے۔ روز ملنے اور ہفتے مہینے بعد ملنے والے تعلقات کی نوعیت میں بہت فرق ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے روز کھائی جانے والی گندم کی روٹی روزانہ استعمال کے بعد بھی جی اوبنے کا باعث نہیں بنتی اور حضرتِ انسان کئی برسوں سے مسلسل گندم بغیر کسی اکتاہٹ کے استعمال کیے چلے جا رہے ہیں۔

اس کے برعکس کوئی منفرد خوراک کھا کر لطف ضرور آتا ہے، جی خوش بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات اسے دوبارہ کھانے کی خواہش بھی جنم لیتی ہے مگر اس طرح کہ مل جائے تو اچھی بات، نہ ملے تو اس کے بغیر بھی زندگی گزر سکتی ہے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

البتہ گندم کی روٹی کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن تو نہیں مگر ہاں مشکل ضرور محسوس ہوتا ہے اور وہ اس لیے کہ ہم اسے اپنی روزمرہ روٹین میں عادت بنا چکے ہوتے ہیں۔ یہی حال راشدہ کا بھی تھا۔

اپنا ہر دکھ سکھ شیئر کرنے کے لیے اس کے پاس شاہ زین کی والدہ کی صورت میں جو ایک ہمدرد موجود تھا اور جن سے روزانہ ملے اور باتیں کیے بغیر اسے چین نہ ملتا تھا۔ اُن کے دور جانے کا احساس راشدہ کے لیے بلاشبہ کٹھن تھا۔

مگر ظاہر ہے کہ جو تھا سو تھا۔

اب اگر اس جگہ پر موجود ان کے حصے کا رزق ختم ہو چکا تھا تو ان کو وہاں سے جانا ہی تھا۔

سو بھاری دل اور نم آنکھوں کے ساتھ آخر کار وہ اس گھر میں منتقل ہوئے جو ان کے ذاتی گھر سے بے حد مختلف تھا۔

شہر سے قدرے ہٹ کر بنائی گئی فیکٹری سے دس پندرہ کلومیٹر دور یہ رہائشی کالونی صرف اور صرف فیکٹری ہی کے اسٹاف کے لیے مختص کی گئی تھی۔ شہر سے دور ہونے کی وجہ سے چونکہ ٹریفک کا بہاؤ قدرے کم تھا اس لیے پندرہ کلومیٹر تک کا یہ فاصلہ طے کرنے میں کوئی خاص وقت نہ لگتا۔ ورکرز کی اکثریت کا تعلق نزدیکی گاؤں سے تھا جب کہ باقی لوگوں کو شاہ زین کی طرح شہر سے اپوائنٹ کیا گیا تھا۔

بیس پچیس گھروں پر مشتمل یہ رہائشی کالونی بجلی، پانی، گیس جیسی سہولیات سے تو آراستہ تھی لیکن ڈاکٹرز، اسکول جیسی ضروریات کے لیے شہر ہی کا رخ کرنا پڑتا۔

دو بیڈ رومز پر مشتمل اس گھر میں قدم رکھتے ہی جیسے شاہ زین کو بے حد گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ کمرے بے حد کشادہ نہ سہی مگر اس کے ذاتی گھر سے بڑے ضرور تھے۔ پھر بھی وہ کھل کر سانس نہیں لے پا رہا تھا سو اندر داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے کھڑکیاں کھول کر تازہ ہوا کو اندر آنے دیا۔ سامنے چند اور گھر بھی موجود تھے اور ان تمام گھروں کے ارد گرد حفاظتی اقدامات کے طور پر بڑی سی دیوار بنا کر ایک حصار سا قائم کر دیا گیا تھا۔ کالونی کے اندر آنے کے لیے ایک بڑا سا آہنی گیٹ اور اس کے باہر بیٹھا مسلح چوکیدار۔

یعنی اس ایریا کو رہائشی علاقے میں تبدیل کرنے کے لیے باقاعدہ حکمتِ عملی ترتیب دی گئی تھی اور مکینوں کی حفاظت کا بھی خاص خیال رکھا گیا تھا۔ یہ بات یقیناً باعثِ تقویت تھی۔

تینوں بڑی خاموشی سے گھر کا جائزہ لے رہے تھے۔ شاہ زین تو پہلے بھی یہاں آ کر دیکھ چکا تھا مگر ثمینہ اور اماں پہلی دفعہ آئی تھیں۔ اس لیے خاموشی سے گھر کو دیکھ رہی تھیں یا شاید آج وہ الفاظ ذہن کی زنبیل میں کہیں گم ہو گئے تھے جو خاموشی توڑنے کا وسیلہ بن پاتے۔ بالآخر شاہ زین نے ابتدا کی۔

"ثمینہ کیسا لگا یہ نیا گھر؟"

چلتے ہوئے اب وہ تینوں کچن میں موجود تھے۔

"بہت اچھا ہے بھائی! اور جو اگر کوئی کمی ہوئی بھی تو وہ ہمارے رہنے سے دور ہو جائے گی۔"

اداس تو تینوں ہی تھے مگر تینوں ہی اس بات کو ظاہر نہ کرنے کی کوشش میں تھے۔

"ہاں یہ تو ہے، تمہارے ہوتے ہوئے بھلا کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔۔۔"

"شکریہ بھائی۔"

شاہ زین کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ثمینہ نے اس کی بات کو کمپلیمنٹ (compliment) سمجھ لیا تھا۔

"سوائے دماغ کی۔"

"بھائی۔۔۔!" اس کی بات کا مفہوم جان کر ثمینہ چیخ اٹھی تھی۔

"اماں دیکھ رہی ہیں نا آپ، بھائی کیا کہہ رہے ہیں۔"

ثمینہ شاہ زین کو بغور دیکھتی ماں کے سامنے فریاد گزار تھی۔ جو جانتی تھیں کہ وہ محض ان کے سامنے خود کو مطمئن، پرسکون اور ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی مصنوعی اداکاری میں مصروف ہے اور بس۔

جس کی سرمئی آنکھیں اس کے چہرے کے تاثرات سے بالکل بھی اتفاق کرتی نظر نہیں آ رہیں اور باوجود اس کے کہ وہ جانتی تھیں اس کا دل اداس ہے مگر پھر بھی وہ اس کے عمل کو مصنوعی قرار دے کر اس کی تردید نہیں کرنا چاہتی تھیں، کیونکہ خوش رہنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بندہ مصنوعی طریقے سے دل کے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود خوش رہنے کی کوشش کرے۔ خوش رہنے کی چند روزہ مصنوعی اداکاری ہی سے دل پر لگنے والی اداسیت کی تہ میں دراڑ پڑنے سے ذہن پر جو مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ بلاشبہ موڈ بدلنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے تھے۔

"درست ہی تو کہہ رہا ہے نا، دماغ ہوتا تو نئے گھر اور بھائی کی جاب کی خوشی میں چائے کے ساتھ کچھ بنا کر ہمارا منہ نہ میٹھا کروا رہی ہوتیں۔"

اماں نے بھی شاہ زین کی طرف داری کی تو منہ پھلانے کے بجائے ثمینہ نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

"ارے ہاں، اس بات کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔"

ان ہی قدموں پر گھوم کر اس نے چولہا جلایا اور عین چولہے کے اوپر بنی کیبنٹس میں سے بائیں طرف کی کیبنٹ کھول کر چند ہی منٹوں میں تیار ہو جانے والی پھینیاں نکالیں، دودھ ابلنے کے لیے رکھا، ٹرے میں باؤل رکھے اور اس پھرتی پر تائیدی نظروں سے اماں کو دیکھنے لگی جنہوں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا کر اس کی چالاکی کو سراہا۔

☆☆☆

اک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر
پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں
غیر بن کے ملتے ہیں
دوست دار لہجوں میں
سلوٹیں سی پڑتی ہیں
عمر بھر کی چاہت کا آسرا نہیں ملتا
دشت بے یقینی میں راستہ نہیں ملتا
پھول رنگ وعدوں کی
منزلیں سکڑتی ہیں
راہ مڑنے لگتی ہے
بے رخی کے گارے سے
بے دلی کی مٹی سے
فاصلوں کی اینٹوں سے اینٹ جڑنے لگتی ہے
خاک اڑنے لگتی ہے
واہموں کے سائے سے

عمر بھر کی محنت کو
پل میں توڑ جاتے ہیں
بھیڑ میں زمانے کی ساتھ چھوٹ جاتے ہیں
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی اجنبی سے لگتے ہیں
غیر بن کے ملتے ہیں۔۔۔

☆☆☆

کمرے کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اس نے کھول تو لیا مگر سامنے بیڈ پر ٹریک سوٹ پہن کر بیٹھے ناصر بھائی کو دیکھ کر گویا وہیں بت بن کر بس کھڑی ہی رہ گئی۔

آلتی پالتی مار کر بیڈ پر بیٹھے ناصر بھائی ہاتھ میں تیل کی شیشی پکڑے ہوئے تھے جب کہ ان کے عین عقب پر گھٹنوں کے بل بیٹھی عائشہ بھابھی بائیں ہاتھ کی کٹوری بنائے دائیں ہاتھ کی پوروں سے اُن کے سر میں مساج کر رہی تھیں۔

ندی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

''ندی تو شاید آج کچھ بزی ہے آپ کے سر میں مساج میں کر دیتی ہوں۔''

ماضی کی چق ہٹاتے کچھ خیالات ''حال'' میں بھی اپنا حصہ ڈالے ہوئے تھے۔ لاؤنج میں چینل سرچنگ کرتے ناصر بھائی، ہاتھ میں اخبار کھول کر پڑھنے کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے اخبار پرے سے نظریں ہٹا کر دھیمی سی پرشفقت مسکراہٹ کے ساتھ فرداً فرداً سب لوگوں پر نظر ڈالتے بابا، صوفے پر بیٹھ کر سامنے ٹی ٹیبل پر آج دوپہر کے مینیو کے حساب سے رکھی گئی سبزی، آلو، پیاز وغیرہ کاٹتی امی، کارپٹ پر کتابیں پھیلائے فلور کشن پر بیٹھ کے صوفے سے ٹیک لگا کر موبائل پر باتیں کرتی ندی اور ہاتھ میں تیل کی شیشی پکڑے عین ناصر بھائی کے دائیں طرف اُن کی اجازت کی منتظر عائشہ بھابھی۔۔۔

وقت کی چق ذرا سا کیا سرکی ماضی بالکل حال لگنے لگا تھا۔

''نا بابا نا، مجھے تو تم معاف رکھو۔''

ناصر بھائی مصنوعی خوف کا اظہار کرتے عائشہ بھابھی کے ہاتھ سے تیل کی شیشی لیتے تو بابا کی مسکراہٹ گہری پڑ جاتی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا، نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔''

عائشہ بھابھی منہ بناتیں تو امی سبزی سے لمحہ بھر دھیان ہٹا کر اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوتیں۔

''ناصر بیٹا، عائشہ مساج کرنا چاہ رہی ہے تو کروالو، منع کیوں کیا؟''

''امی مجھے تو گنجا ہو جانا منظور ہے مگر میں اس سے مساج نہیں کروا سکتا۔''

عائشہ بھابھی منہ بسور کر پہلے ناصر بھائی کو اور پھر امی کو دیکھتیں۔ اسی دوران ندی بھی اپنا موبائل پیچھے صوفے پر رکھ کر ان سب کی طرف متوجہ ہوتی۔

''بھائی ایسا تو نہیں ہے کہ بھابھی مساج کے بہانے اپنے ناخنوں سے آپ کا سر چھیل دیتی ہیں۔''

ربڑ بینڈ اتار کر ڈھیلی ہوتی پونی کو ندی نے ایک بار پھر ذرا ٹائٹ کر کے باندھتے ہوئے کہا تو اس کی بات پر سبھی کا مشترکہ قہقہہ سا بلند ہوتا۔

''ارے نہیں ایسی بات نہیں ہے مگر جو سکون ندی سے مساج کروانے میں آتا ہے وہ بات عائشہ میں کہاں۔''

عائشہ بھابھی سلاد کے لیے کاٹی گئی گاجر اٹھا کر منہ میں ڈالتیں اور تنبیہی نظروں سے ناصر بھائی کو دیکھتیں تو انہیں وضاحت کرنی ہی پڑتی۔

''آخر کو میری پیاری سی لاڈلی بہن جو ہے اور بہن بھی وہ جس کے مقابلے کا پوری دنیا میں کوئی نہیں۔''

''آئی ریئلی لو یو بھائی، لو یو، لو یو، لو یو سو مچ۔''

ناصر بھائی کی بات پر ندی خوشی سے اٹھ کر ناصر بھائی کے صوفے کے عقب میں کھڑی ہوتے ہوئے ان کی گردن کے گرد بازو حمائل کرنے کے ساتھ ساتھ لو یو کا ورد کرتی جھومنے لگتی۔

عائشہ بھابھی کی مسکراہٹ اور امی، بابا اور ناصر

بھائی کے قہقہے جو فضا میں بکھرتے تو دیر تک چہرے پر شگفتگی چھوڑ جاتے۔

''کیا بات ہے ندی! کوئی کام ہے؟''

وقت کی چق حالات کی تیز ہوا کے چلنے سے چند لمحے پھڑپھڑاتے رہنے کے بعد ایک بار پھر دروازے پہ جا لگی تو ماضی کے تمام خوشگوار لمحات پھر سے اوجھل ہو گئے۔

سامنے بھی تو حال کی پتھریلی زمین پر کھڑی ندی، جس کے پاؤں بھی ننگے تھے اور ساتھ کسی مہربان وجود کا احساس تک بھی نہ تھا۔

چند لمحے تو وہ کوئی بھی جواب دینے سے قاصر رہی۔

ناصر بھائی کے چہرے پر جس طرح اسے دیکھتے ہی ناگواریت ابھری تھی وہ احساس ندی کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اسی احساس کے تحت اسے لگا جیسے زبان آج اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ گوشت کا لوتھڑا ہی بے حس و حرکت زبان اس کے لاکھ چاہنے کے باوجود بھی ہلنے جلنے پر آمادہ نہ تھی۔

وہ زندہ تھی، اپنے قدموں پر کھڑی اپنا آپ خود سنبھالے ہوئے تھی۔ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ یہ سب اتنا ہی سچ تھا جتنا سمندر کا پرسکون ہونا۔

ہم میں سے کوئی بھی یقیناً سمندر کے پرسکون ہونے کے بارے میں دو رائے نہیں رکھتا۔ مگر اس امر سے بھی سبھی واقف ہیں کہ یہ صرف ظاہری طور پر نظر آنے والی سمندر کی سطح ہے اور بس! اس کی تہ میں کتنے طوفان پلتے ہیں عام طور پر اس بات کو جاننا شاید اتنا ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔

دل دریا سمندروں ڈونگے
کون دلاں دیاں جانے ہو

(دل دریا، سمندر جیسے گہرے ہوتے ہیں اور دلوں کے حال بھلا کون جانتا ہے۔)

ظاہری طور پر وہ خاموش آنکھیں اور سنجیدہ چہرہ لیے ان کے سامنے تھی۔

وہ ناصر بھائی جو ندی کو دیکھے بغیر خود کو نامکمل تصور کرتے تھے آج اسے دیکھتے ہی چند لمحے ناگواریت سے منہ پھیر کر بیٹھے رہنے کے بعد آخر کار اٹھ کر کمرے سے ہی نکل گئے تھے۔

عائشہ بھابھی نے باتھ روم جا کر ہاتھ دھونے کے بجائے ہتھیلی میں باقی بچ جانے والا تیل کریم کی طرح ہاتھوں پر لگاتے ہوئے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''بھابھی! میرا موبائل کہاں ہے؟''

وہ ان سے کسی بھی طرح کی کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے تمہید باندھنے کا تکلف کیے بغیر ڈائریکٹ اپنے مقصد کی بات کر کے اب جواب طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی، جو حیرت سے آئی بروز سکیڑتی اب بیڈ سے نیچے اتر رہی تھیں۔

رسماً، تکلفاً یا مروتاً بھی انہوں نے ندی کو اندر آنے کا نہیں کہا تھا۔ سو وہ اسی طرح بیچ دروازے کے کھڑی تھی جیسے ناصر بھائی کے جانے کے لیے رستہ چھوڑنے کی غرض سے کھڑی ہوئی تھی۔

''تمہارا موبائل؟ پوچھ تو ایسے رہی ہو جیسے مجھے دیا تھا کبھی۔''

''میں نے آپ کو دیا تو نہیں تھا مگر مجھے مل بھی تو نہیں رہا۔''

محتاط لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے اس نے جواب دیا تو عائشہ بھابھی سر جھٹک کر مسکرا دیں۔

پنک ٹراؤزر اور شرٹ پہنے اس نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔ ورنہ صبح جاگنے کے بعد فریش ہو کر سب سے پہلے وہ یہ ڈریس (جسے وہ نائٹ ڈریس کے طور پر استعمال کرتی تھی) تبدیل کرتی اور پھر ناشتے کی میز پر آتی۔

مگر یہ تب کی بات تھی جب گھر کے سبھی افراد ایک ساتھ ناشتے کی غرض سے ڈائننگ ٹیبل تک آتے۔ اب تو حال یہ تھا کہ ندی کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس وقت ناصر بھائی گھر پر ہیں ورنہ ان کے کمرے میں ہرگز نہ آتی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب کچھ بھی نہیں ہے بھابھی! لیکن اس دن یونیورسٹی سے آنے کے بعد سے لے کر اب تک مجھے موبائل نہیں ملا، گھر کے نمبر سے کال بھی کر کے دیکھ لیا، فون باقاعدگی سے چارج ہو رہا ہے تو آخر گھر میں ہی کسی کے پاس ہے نا۔"

"ہاں تو گرا ہوا ہوگا ادھر اُدھر کہیں صوفوں وغیرہ کے پیچھے۔"

لاپروائی سے کہتے ہوئے انہوں نے خود کو مصروف ظاہر کرنے کی غرض سے بیڈ شیٹ پر موجود چند سلوٹوں کو بڑی دلجمعی سے درست کرنا شروع کیا۔ یوں جیسے اس وقت ان سلوٹوں کا دور ہونا ہی دنیا کا اہم ترین کام ہے۔

"کہیں گرا ہوتا تو اب تک تو بیٹری ختم ہو جانے کی وجہ سے بند پڑا ہوتا نا۔"

"تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو؟"

جھک کر بیڈ شیٹ ٹھیک کرنے کے دوران انہوں نے اس کا چہرہ دیکھنے کے بجائے ذرا سی گردن موڑ کر چند ثانیے کے لیے نظریں اس کے سپید پاؤں میں پہنے ہیلو کٹی (Helo kitty) کے سلیپرز پر ٹکا میں۔

"بھابھی! کاش آپ نے اسی طرح رشتوں میں جنم لیتی سلوٹوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہوتی۔"

تن دہی سے بار بار بے شکن بیڈ شیٹ پر ہاتھ پھیر کر اب نادیدہ سلوٹوں کو دور کرتی عائشہ بھابھی کے سامنے آخر اس کی زبان سے شکوہ پھسل ہی گیا سو پوچھی گئی بات نظر انداز کر گئی۔

"رشتوں میں سلوٹیں خود تمہارے کرتوتوں سے پیدا ہوئی ہیں ندی! تم نے اعتماد توڑا ہے سب کا، یونیورسٹی کا کہہ کر ہوٹلوں میں عیاشی کرتے ہوئے تو تمہیں ان رشتوں کا خیال کبھی نہیں آیا ہونہہ اور اب مجھے مشورے دے رہی ہو۔"

"بھابھی! میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ یہ سب ایک من گھڑت کہانی ہے، جھوٹ ہے سب، اور یاد رکھیں جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، جب گرتا ہے منہ کے بل گرتا ہے۔"

"چلو مانا کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر اسکینڈل کے پَر ضرور ہوتے ہیں اور تمہارا یہ اسکینڈل خیر سے بڑی تیز پرواز کرتے ہوئے نا صرف خاندان بلکہ ہر جاننے والے کے گھر میں بڑی شان سے اترا ہے۔"

طنز کرنے میں وہ اتنی ماہر ہیں، یہ اندازہ بھلا پہلے کب تھا کسی کو۔

"اور اب وہ سب لوگ جو پہلے تمہاری خوب صورتی کی باتیں کرتے تھے نا، اب اخباروں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہاری خبر پڑھتے اور سب کو سناتے ہیں۔"

"مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں، لوگوں کے سامنے تو فرشتہ بن کر بھی آجاؤ تو تنقید کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ میرا دل اور سب سے بڑھ کر میری ماں کا اعتبار میری ذات پر ابھی تک قائم ہے تو مجھے کسی اور کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تم لوگوں کے دل میں ناصر کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔"

ندی نے بات کرتی عائشہ کی نظروں کے تعاقب میں گردن موڑی تو سامنے کھڑے ناصر بھائی کو دیکھ کر ایک دم چونک گئی۔

چہرے کی تنی ہوئی رگیں اور بھینچے ہوئے جبڑے بتا رہے تھے کہ مکمل گفتگو نہ ہی مگر آخری بات وہ ضرور سن چکے تھے۔

شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ ندی اب تک واپس جا چکی ہوگی جبھی اپنے کمرے میں دوبارہ آئے تو ضرور، مگر اسے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر کسی کی بھی پروا نہ ہونے کا اعلان سن کر وہیں رک گئے۔

"مجھ پر موبائل کا الزام لگانے کے بجائے اپنے ہی کمرے میں ڈھونڈو، ورنہ لینڈ لائن استعمال کر لو، ایسا بھی کون سا پرائیویٹ فون کرنا ہے تم نے جو موبائل کے بغیر سب کے سامنے نہیں ہو سکتا۔"

لوہا گرم دیکھ کر عائشہ بھابھی نے ایک اور ضرب ماری تھی۔

ناصر بھائی کا یوں ایک دم پھر سے اس کے عقب میں موجود ہونا اور ان کی موجودگی میں عائشہ بھابھی کا اس طرح کی بات کرنا۔۔۔

ندی کو لگا جیسے کمرے میں نیم کے ڈھیر سارے پتوں کی کڑواہٹ ایئر فریشنر کی جگہ لے چکی ہو۔ پل بھر میں جیسے فضا میں ترس اور رحم کی ملی جلی آہیں، رسوائی اور بے عزتی کے ساتھ مل کر سسکیاں لیتے ہوئے ہولے ہولے بین کر رہی ہوں۔

پھر اس کے بعد وہ رکی نہیں اور انہی قدموں پر واپس پلٹ گئی۔

ادب کی بات ہے ورنہ منیر سوچو تو
جو شخص سنتا ہے، وہ بول بھی تو سکتا ہے

☆☆☆

گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہم دم میرے دوست
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ تیرے دل کی تھکن
میری دل جوئی میرے پیار سے مٹ جائے گی
گر میرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر تیرا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہم دم میرے دوست

جم خانہ سے واپسی پر ٹینا ثانی کی دل میں اترتی آواز اور فیض احمد فیض کے خوب صورت الفاظ اکمل کو مزید بے چین کیے دے رہے تھے۔ ندی بھی اس جم خانہ کی مستقل ممبر تھی۔ جواب یونیورسٹی میں دیر سے آف ہونے کے باوجود روز نہیں مگر ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور یہاں آیا کرتی تھی۔ اپنی خوش مزاجی سے نہ صرف جہاں بھی تھی اس جگہ کی جان کہلاتی بلکہ اکثر عمر رسیدہ خواتین و حضرات بھی اس کے بڑے فین تھے اس لیے کہ وہ اُن کے لیے بہترین سامع ثابت ہوا کرتی تھی۔ آج جم خانہ جا کر اکمل کو ندی کے بارے میں بڑے متضاد تبصرے سننے کو ملے تھے۔

ان تمام لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کے نزدیک یہ سب باتیں معیوب نہ تھیں مگر اس کے باوجود وہ لوگ بھی اس کے یوں "چوری چھپے" اور "غلط بیانی" کر کے شاہ زین کے ساتھ گھومنے اور اِدھر اُدھر جانے پر خائف تھے۔

یوں بھی چونکہ سبھی جانتے تھے کہ اکمل اور ندی میں عائشہ بھابھی کی وجہ سے رشتہ داری بھی ہے سو سبھی نے اس کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے بات شروع کر کے ایک دفعہ پھر تمام حالات و واقعات دوہرانا شروع کر دیے کہ مبادا اکمل ان سب سے ناواقف ہو۔

واقعی کہنے والے درست کہتے ہیں کہ مارنے والے کا ہاتھ تو پکڑا جا سکتا ہے مگر بولنے والے کی زبان نہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ چپ چاپ منہ میں گھنگنیاں ڈالے ان کی باتیں سنتا رہا ہو۔ ان سب باتوں کی اکمل نے بھرپور طریقے سے تردید کرتے ہوئے بھی افواہوں کو رد تو کر دیا تھا مگر جانتا تھا کہ جس طرح کے تاثرات ان کے چہرے پر ابھرے تھے ان سے ہرگز اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کی تردید پر یقین کرتے ہوئے آئندہ اس بات کو زیرِ بحث نہیں لائیں گے۔

ندی کے بارے میں اس طرح کی باتیں سننے کے بعد بس پھر اس کا جی ہی نہیں لگا کہ وہاں مزید رکتا۔ حالانکہ گھر سے آج وہ گولف کھیلنے کی نیت سے آیا تھا مگر آتے ہی یہ سب سن کر اب اس کا جی اوب گیا تھا سو کچھ دیر یونہی سرسبز و شاداب گھاس کے اطراف میں رکھی گئی سنگی بینچ پر بیٹھنے کے بعد گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور اب یونہی بلا مقصد ٹینا ثانی اور فیض کی ہمراہی میں دھیمی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے مسلسل ندی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود اس وقت وہ ذہنی دباؤ محسوس کر رہا تھا تو ندی کا کیا حال ہوگا۔ یہ سوچ اسے فی الحال اسٹیئرنگ گھر کی طرف موڑنے سے روک رہی تھی کیونکہ وہ کچھ دیر اسی سوچ

کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

ندی سے ہونے والی ٹیلی فونک بات چیت میں اس کا شکستہ لہجہ اکمل کو بے چین کر رہا تھا۔ جب تک وہ یہاں رہا تھا ندی کی سپورٹ اسے ہر معاملے میں حاصل رہا کرتی تھی کہ وہ خود تو بچپن میں ذرا جذباتی سا واقع ہوا تھا۔ مگر ندی اس سے تھوڑی بڑی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اس کے دفاع کے لیے آن موجود ہوتی اور اب جبکہ کل اس کی واپسی تھی تو وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ ایسا جو پھر سے اس کے چہرے کی مسکراہٹ لوٹا دے۔

کل چونکہ اس کی واپسی تھی اس لیے عائشہ بھی اس سے ملنے اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ ایسے میں جبکہ عائشہ ندی کے مخالفین میں سرِ فہرست تھی تو ندی سے دوستی کا تعلق، عائشہ کے خون کے رشتے پر غالب آ گیا۔ عائشہ ہمیشہ ندی کے خلاف ممی کے سامنے زہر ہی اگلا کرتی، فلاں رشتہ دار اب یہ کہہ رہا ہے فلاں وہ۔۔۔ اسی وجہ سے اکمل اب عائشہ اور ممی کی گفتگو کے دوران وہاں کم ہی موجود رہتا اور اگر بیٹھا ہوتا تو ان دونوں کو ندی کے بارے میں یہ سب کہنے کی اجازت نہ ہوتی۔

یوں بھی اکثر اوقات تعلق، رشتوں سے جیت بھی تو جاتے ہیں نا۔

ایسا بھی تو ہوتا ہے نا کہ خون سے بڑھ کر الفاظ کا تعلق ہمیں عزیز تر لگنے لگتا ہے۔

شاید اس لیے کہ خون کے رشتوں میں انتخاب ہمارا نہیں ہوتا، ہمیں انہیں محض قبول کرنا یا اپنانا پڑتا ہے کیونکہ ہم رشتہ داروں کا انتخاب خود نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس باقی تعلقات ہماری چوائس اور ہمارے ذہنی معیار کے مطابق ہوتے ہیں اس لیے دور ہو کر بھی نزدیک لگتے ہیں۔ ان سے ملنے اور بات کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ ہمارے اوپر کسی بھی طور مسلط نہیں کیے گئے ہوتے بلکہ ہمارا انتخاب ہوتے ہیں۔

گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہمدم میرے دوست

روز و شب شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، ستاروں کے گیت
گر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہم دم میرے دوست

ٹینا ثانی انتہائی جذب کے عالم میں فیض کے کہے گئے لفظوں سے بھرپور انصاف کر رہی تھی۔ سو اکمل نے کچھ سوچا اور گاڑی کا اسٹیئرنگ ندی کے گھر کو جاتے رستے کی طرف موڑ دیا۔

☆☆☆

ملکانی سائیں پچھلے دس پندرہ منٹ سے سوئی کو گود میں لیے اس کے نرم و ہموار ناخنوں پر سوفٹن لوشن کا مساج کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ کسی ننھے بچے کی طرح اُس سے باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ لوشن وہ شہر کے مشہور ترین Veterinary سے سوئی کے ناخنوں کو نرم رکھنے کے لیے لائی تھیں تاکہ اسے گود میں لینے یا اس کے ساتھ کھیلنے کی صورت میں کسی کے ہاتھوں اور بازوؤں پر اسکریچز نہ پڑیں۔

وہ بھی بڑے پُرسکون انداز میں اپنی گہری سبز آنکھوں کو ملکانی پر مرکوز کیے جیسے ان کی تمام باتیں سمجھ رہی تھی۔ جبھی تھوڑی دیر بعد ہلکی آواز میں میاؤں کہہ کر ان کی باتوں کا جواب بھی دیتی۔ کچھ دیر سوئی کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد ایک نظر وال کلاک پر ٹائم دیکھا اور پھر اسے گود سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گو کہ صبح صادق کا وقت تھا مگر وہ اسی وقت اٹھ جایا کرتی تھیں اور پھر آج شاہ سائیں گاؤں آنے والے تھے سو اب انہیں کچن میں جا کر سب سے پہلے کھانے کا جائزہ لینا تھا مگر بیڈ روم سے نکلنے سے پہلے ایک دم باہر کو اٹھتے قدم سنگھار میز کے سامنے جا کر تھم گئے۔ تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔

آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لپ اسٹک، گالوں پر ہلکا سا غازہ۔۔۔

میک اپ کوئی بہت زیادہ تیز تو نہیں تھا مگر پھر بھی انہیں آئینے میں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے انہوں نے میک اپ ہلکا ہلکا سا کیا نہ ہو بلکہ ماسک کی طرح چپکا رہا ہو۔ حالانکہ ایسا تھا تو نہیں پھر انہیں ایسا کیوں لگ رہا تھا۔

بے چینی سے وہ آنکھوں میں الجھن لیے اپنے سوال کے جواب کے لیے وہیں شیشے کے سامنے ہی کھڑی رہیں۔

دونوں ہاتھوں میں طلائی انگوٹھیاں دائیں کلائی میں چار کشمیری جڑاؤ کنگن اور بائیں کلائی میں انتہائی نفیس بل دار خوب صورت سونے کی چودہ چوڑیاں، کانوں میں تین منزلہ ڈھولکی جھمکے اور گلے میں جھولتا ڈائمنڈ کا لاکٹ۔

پھر ایسا کیوں تھا کہ انہیں اپنے چہرے پر مصنوعی پن محسوس ہوا۔

سوئی کمرے میں ادھر اُدھر گھومنے کے بعد اب ملکانی سائیں کے پاس کھڑی تھی۔

کچھ دیر یونہی جب ان کے ساتھ کھڑی رہی اور اس کے بعد میاؤں کی آواز نکال کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تو ملکانی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی اور تبھی انہیں آئینے میں نظر آتے اپنے عکس میں واضح تبدیلی نظر آئی۔ ایسا لگا جیسے ماسک چٹخنے لگا ہو۔

سو گردن کو اوپر نیچے حرکت دینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہونٹوں کو کھل کر مسکرانے کی اجازت دی تو اپنا وجود آپ اٹھانا بھی سہل لگنے لگا۔

باوجود اس کے کہ آنکھوں کی خشک دھرتی ہنوز اداس تھی نگران کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کم از کم آج شاہ سائیں کے ساتھ وہ اپنے اس دکھ کو شیئر کر کے ایک بار پھر ان آنکھوں کو آنسوؤں کی بارش سے سیراب کر لیں گی جس دکھ کا ذکر وہ خود سے تنہائی میں بھی کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔

شاہ سائیں کے آنے میں کچھ وقت باقی تھا اور ملکانی سائیں نے سب سے پہلے کچن میں جا کر ان کے لیے تیار کردہ ناشتے کو اپنے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر رکھوانا تھا اور پھر دوپہر کے کھانے کے متعلق ہدایات دے کر حویلی کے وسیع و عریض اور کشادہ برآمدوں کے چپس کے پختہ فرش پر چہل قدمی کرتے ہوئے ان کا انتظار بھی کرنا تھا۔

جس دن انہوں نے شہر سے گاؤں آنا ہوتا اسی طرح علی الصبح آیا کرتے۔ سو ملکانی سائیں نے بلوچستان کی باریک شیشے دار کڑھائی کی جڑاؤ چادر ایک بار پھر سیٹ کر کے کندھوں پر پھیلائی اور سوئی کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔

☆☆☆

اے دل
اے نادان
تجھ کو سونا کر گئے
بس
دو دن کے مہمان

شاہ زین کتنی ہی دیر سے بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹا سامنے موجود ندی کو بس دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ آخری روز وہ واقعی نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی اور پھر واقعی نظر لگ بھی گئی۔

اس پر پڑنے والی کوئی نظر ایسی نہ تھی جو پھسل گئی۔ جس نے دیکھا بس یک ٹک دیکھتا ہی رہا۔ جہاں گئی سب کی گردنیں سورج مکھی کے پھول کی طرح اس طرف خود بخود مڑتی چلی گئیں۔ کتنے ہی یونیورسٹی فیلوز اس کی کانچ سی آنکھیں اپنی طرف اٹھنے کی خواہش کرتے مگر وہ جنگل کی مغرور ہوا کی صورت کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ خوش اخلاقی تو اس کا خاصہ تھی مگر جہاں کوئی اس سے آگے بڑھنے لگتا فوراً ٹرین کے ایمر جنسی گارڈ کی طرح سرخ جھنڈی دکھا کر وہیں رک جانے اور آگے نہ بڑھنے کا واضح اشارہ کرتی۔

اس رات کا ایک ایک لمحہ شاہ زین کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے ہوئے تھا۔ اسے لگتا جیسے ندی کا عکس اس کے دل پر مرتسم ہونے کے بجائے وجود کی کسی اور گہرائی پر نقش ہوا تھا۔ یوں جیسے کہ یادداشت کے صفحے پر اس کے نقش کو لوح پر اتار کر رقم کیا گیا تھا اور اب سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے بس اسی کا چہرہ آنکھوں میں گھومتا رہتا۔

بلاشبہ اُسے زندگی اللہ نے عطا کی تھی مگر زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح گزارنا اُسے حقیقی معنوں میں ندی نے ہی سکھایا تھا۔

اُس سے دوستی ہونے کے بعد شاہ زین نے زندگی کو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے جیا تھا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ندی نے زبیر اور صبا کے ساتھ نا صرف نئے آنے والے اسٹوڈنٹس کو بے وقوف بنانے کا پلان بنایا بلکہ ناراض ہوجانے کی جذباتی دھمکی دے کر شاہ زین کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھا۔

دو سرخ و سپید مومی ہاتھوں کی انگلیاں چق کی بیرونی سائیڈ پر نمودار ہوئیں اور آن کی آن چق کی اندرونی سائیڈ کا تمام منظر بہار کے خوش رنگ پھولوں کی طرح تروتازہ ہوگیا۔

''دیکھیں یقین کریں میں فرسٹ ایئر فول نہیں ہوں۔ میں تو کتنے سالوں سے۔۔۔''

''اچھا تو تم کتنے سالوں سے فول ہو؟''

زبیر نے سامنے کھڑے ''شکار'' کو جواب دیا اور باقی لوگوں کی شکلوں کا جائزہ لیا۔ بھی ایک سے بڑھ کر ہے ہوئے تھے۔

''نہیں میرا مطلب تھا کہ میں تو دو سالوں سے پڑھ رہا ہوں۔''

''سالوں سے پڑھ رہے ہو؟ کیوں یہ سارے پروفیسرز کس چیز کی تنخواہ لیتے ہیں جو تم نے پھر بھی اپنے ''سالوں'' سے ہی پڑھنا ہے۔''

ندی نے جان بوجھ کر سامنے کھڑے لڑکے کو تنگ کرنے میں اپنا حصہ ڈالا۔

''دیکھیں میں پرانا اسٹوڈنٹ ہوں اور جانتا ہوں کہ یہ سب آپ چاروں کا پیسے بٹورنے کا طریقہ ہے۔''

دیکھنے میں انتہائی پڑھا کو ٹائپ اُس لڑکے نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ صاف کرنے کے لیے چشمہ اتارا اور آنکھیں اور پیشانی صاف کرنے کے بعد دوبارہ ناک پر ٹکا لیا۔

''غلط فہمی ہے تمہاری، ورنہ ہم تو کسی کے چیسلا کر میلی آنکھ سے نہیں دیکھتے۔''

صبا نے چہرے پر غصیلے تاثرات جماتے ہوئے ڈپٹا۔

''اور کیا، ہم تو ہاتھ، منہ، کان، آنکھ سب دھو دھو کر آتے ہیں۔''

ندی نے ننھی سی ناک پر موجود زرقون کی نوزپن پر خارش کرتے ہوئے اپنے سمیت ''چاروں'' کی ''صفائی'' پیش کی۔

''میں دوسرے ڈیپارٹمنٹ کا ضرور ہوں مگر آپ نے تو مجھے اکثر دیکھا ہے نا پہلے۔''

آخری امید کے طور پر زیرِ عتاب لڑکے نے ندی کے ساتھ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ایک ٹانگ پیچھے کی طرف موڑ کر پاؤں دیوار پر ٹکائے ایک ٹانگ پہ کھڑے شاہ زین کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ اوائل نومبر کی نیم گرم دھوپ کی طرح پھیلی تھی۔

اور یقینی طور پر شاہ زین کے لیے اس کا مخاطب کرنا غیر متوقع تھا جبھی یوں سب کا اس کی طرف متوجہ ہونا اسے لمحے بھر کے لیے گڑبڑا گیا۔ مگر پھر گہری سانس لے کر پہلے تو دونوں پاؤں متوازن جگہ پہ رکھے اور پھر بولا۔

''ہاں تم جاؤ۔۔۔''

شاہ زین کے کہتے ہی ندی نے فوراً اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے غلطی کا احساس دلایا مگر ندی کی انگلی میں موجود خوب صورت سی انگوٹھی اس دباؤ کے نتیجے میں زور سے چبھنے کے باوجود شاہ زین نے نہ تو کوئی ردِعمل ظاہر کیا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا ہی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

''صبور۔۔۔ صبور نام ہے میرا۔''

اس کے تنِ مردہ میں تو جیسے جان پڑ گئی تھی سو فوراً بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

''زیادہ ہمدردیاں مت دکھاؤ، یار کیا کرتے ہو شاہو۔''

صبور کے جانے کے بعد دیوار کی طرف رخ کر کے ندی نے اسے سمجھایا۔

صبا اور زبیر نے بھی اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ خاموشی سے ان کی دیگر کارروائیاں دیکھتا گیا۔

کسی کو دونوں پاؤں باندھ کر کیٹ واک کرنے کا کہا گیا تو کسی کو مختلف سیاست دانوں کی نقل اتارنے کا، کسی سے پھونک مار کر بلب بجھانے کی فرمائش کی گئی تو کسی کے سر پر کتابیں رکھ کر اسے چلنے کا آرڈر جاری کیا گیا۔

اور بعد میں سب کے چلے جانے پر خود سب کی نقل اتارتی اس قدر ہنسی کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہی سرخ و سپید مومی ہاتھ، ہنستے ہنستے بھیگ جانے والی آنکھیں جو صاف کرنے لگے تو چق ایک دم ہی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

شاہ زین نے ایک دم آنکھیں کھولیں اور سینے پر موجود یادوں کی بھاری سِل کو گہری سانس لے کر ہٹانے کی سعی کرنے لگا مگر ناکامی ہوئی۔ حیرت کی بات تھی کہ ندی جو آج تک صرف ایک شرط کی خاطر اس کے جذبات سے کھیلتی رہی کبھی بھی منفی احساسات کے زیرِ اثر اسے یاد نہ آئی تھی۔

جب بھی یاد آتی دل اسی طرح اس پر محبتوں کے خزانے نچھاور کرنے کو تیار نظر آتا جس طرح اس رات اس کے ہاتھوں میں بریسلیٹ پہناتے ہوئے تھا۔

اسے ابھی تک ندی سے نفرت نہیں ہو پائی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے دل ہی دل میں بھی برا بھلا نہ کہہ پاتا تھا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آخری دفعہ ملتے ہوئے گو کہ اخبار میں چھپی ہوئی خبر کے پیشِ نظر پریشانی تو ضرور تھی مگر محبت کی گرہ ان دونوں کے دلوں میں بے حد مضبوطی سے لگی ہوئی تھی اور شاید محبت کے ان ہی رابطوں اور استعاروں کے باعث (جو کہ ان دونوں کے دلوں میں باہم موجود تھے) ساون کے اندھے کی طرح شاہ زین کسی دوسری سمت دیکھ ہی نہ پاتا یا شاید دیکھ کر آنکھیں چرا لیتا۔

بہرحال جو بھی تھا سچ تو یہ تھا کہ جس طرح حادثاتی موت کے بعد مرنے والے کو جب تک دیکھ نہ لیا جائے۔ دل ایسی اطلاعات پر یقین نہیں کرتا، مانتا نہیں تاوقتیکہ آخری دیدار نہ کر لیا جائے بالکل اسی طرح سب کچھ سن لینے اور خود ندی کی طرف سے کیے گئے میسجز کے باوجود پتا نہیں کیوں اسے ندی کی محبت خالی کنویں کی بازگشت کی طرح معلوم ہوتی۔ جو جتنی دفعہ آواز کے روپ میں کنویں کی دیواروں سے ٹکراتی اتنی ہی شدت سے بازگشت کے روپ میں واپس آکر سماعتوں کو سیراب کر ڈالتی۔

ندرت سے کی گئی محبت اسے صبح صادق کے وقت پھولوں پر پڑتی وہ شبنم معلوم ہوتی جس کا کسی پتی کو خود پر بوجھ محسوس نہ ہوتا۔ جبھی ظاہری طور پر ناتا ٹوٹ جانے اور ندی کی طرف سے شرط جیت جانے کے بعد اسے دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال باہر کرنے کے باوجود یہ سچ تھا کہ اسے اب بھی ندی سے محبت تھی۔

البتہ فرق تھا تو یہ کہ اس کا روپ بدلنے پر شاہ زین اندرونی طور پر خود کو کسی جنگلی قیدی کی طرح مجبور اور بے حال سمجھنے لگا تھا۔ رہائی کی آس میں آنکھوں سے ہوتی آنسوؤں کی بارش سے جس نے دل کے ریگزاروں میں ابھی تک محبت کے مرغزار اُگا رکھے تھے۔

تم جو چاہو تو بھلا دینا گئے پل کی طرح
میری بات اور ہے میں نے محبت کی ہے

☆☆☆

آج رات اکمل کی واپسی تھی اسی لیے عائشہ بھابھی کل کی آئی ہوئی ابھی تک وہیں موجود تھیں۔ ایسا بہت ہی شاذ ہوتا جب وہ رات بھر رکنے کے ارادے سے آتیں ورنہ تو ان کے آنے کے ٹائمنگز اس طرح کے تھے کہ صبح ناصر بھائی آفس جاتے ہوئے انہیں اتار جاتے اور واپسی پر طے شدہ وقت کے عین مطابق وہ تیار رہتیں اور ان کی گاڑی کے ہارن سے ہی فوراً

باہر نکل آتیں۔

ممی ڈیڈی سے ناصر بھائی کی تفصیلی ملاقات عید تہوار پر ہی ہوا کرتی۔

وہ اس گھر کے داماد تھے یہ بات انہیں ہمیشہ "یاد" رہتی تھی۔ اسی لیے انداز میں کچھ تو دامادوں سے نخرے تھے اور کچھ قدرتی طور پر طبیعت میں غصے کا عنصر زیادہ۔

اسی لیے ملنے جلنے میں ذرا احتیاط برتا کرتے۔ یوں بھی ان کا خیال تھا کہ دامادوں کو سبزی بیچنے والوں کی طرح ہر روز آواز لگا کر اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بجائے ڈاکیے کی طرح کبھی کبھار آنا چاہیے تاکہ اس کے آنے کے انتظار میں دن گنے جائیں۔ اس کی آمد کا گمان گزرنے پر سارے کام چھوڑ کر مین گیٹ کی طرف جانے میں جلدی کی جائے اور اسے دیکھ کر پوری دلچسپی اور شوق سے اس کی بات چیت سنی بھی جائے۔

یوں تو یہ اور اس طرح کی باقی باتیں امی بابا کی تربیت کا حصہ نہیں تھیں مگر انسان اپنی تمام تر عادات و خصائل والدین ہی سے مستعار تھوڑی لیتا ہے۔ بعض اچھی یا بری عادتیں نہ چاہتے ہوئے بھی فضا میں موجود آکسیجن کی طرح بندہ معاشرے سے بھی تو وصول کرتا ہے۔ سو یہ عادت بھی گردوپیش کی عطا کردہ تھی۔

"کل ندی کہاں گئی ہوئی تھی؟"

وہ ابھی ابھی جاگنگ کر کے لوٹا تھا اور لاؤنج میں بیٹھا جاگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔ جب عائشہ کچن سے چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر وہیں چلی آئی اور دونوں پاؤں صوفے پر رکھ کر بیٹھنے کے بعد سامنے رکھا اخبار اٹھا لیا جو ابھی چند لمحے پہلے ہی ملازم رکھ کر گیا تھا۔

"کون کہاں گئی ہوئی تھی؟"

اخبار سے نظریں ہٹا کر چونکتے ہوئے سوال پوچھا گیا، مگر اکمل نے ندی کے لیے اپنا سابقہ طرزِ تخاطب "ندرت جی" استعمال کرنے کے بجائے اسی سوال کو پھر سے دوہرایا تو عائشہ نے اخبار تہ کر کے اپنی بائیں طرف صوفے پر ہی رکھا اور میز پر رکھا کپ دوبارہ سے اٹھا لیا۔

"جہاں آنا جانا تھا وہ آ چکی، اب وہ کیا منہ لے کر جائے گی دوسروں کے سامنے۔"

لہجے میں طنز چائے میں موجود پتی کی طرح تیز تھا مگر اب چونکنے کی باری اکمل کی تھی۔

"مگر میں کل آپ کے گھر گیا تھا۔"

"ہمارے گھر گئے تھے؟ مگر تمہیں پتا تو تھا کہ میں یہاں آئی ہوئی ہوں۔"

ہونٹوں تک جاتے جاتے کپ رک گیا تھا۔ بھنچے ابرو آن کی آن میں ملنے لگے تو آنکھیں بھی اپنے قدرتی حجم سے کچھ سکڑتی محسوس ہوئیں۔

"میں ندی سے ملنے گیا تھا۔"

اکمل کا لہجہ عائشہ کو گوند قطیرے کی مانند سرد محسوس ہوا تھا۔

"لیکن کیوں؟ کیا ضرورت ہے اس سے ملنے کی؟ اور وہ بھی اب جبکہ اس کے کرتوت روز کے اخبار کی طرح سب کے سامنے کھلے ہیں۔ ہونہہ نہ باپ کی عزت کا خیال کیا نہ بھائی کی غیرت کا۔ میں تو اول روز سے ناصر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں اتنا لاڈ نہ کرنے کا کہتی تھی مگر نہیں۔۔۔ بھلا میری کون سنتا۔"

اکمل نے رحم کھاتی نظروں سے بہن کو دیکھا جو اس وقت ایک اعلا گھرانے سے نسبت رکھنے کا دعوا کرتی تو شاید قابلِ یقین نہ لگتا۔

"اب جبکہ خود ان کی لاڈلی نے ہی عزت و کردار کے لات اور منات چوراہے پر لے جا کر توڑے تو میرے سامنے بات نہیں کر سکتے اب۔"

آج عائشہ ایک مڈل کلاس کم پڑھی لکھی لڑکی کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔

"میں اول روز سے آپ کو کہہ رہا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہے بات کو مت اچھالیں مگر آپ۔۔۔ سمجھ نہیں آتا کیا سے کیا ہو گئی ہیں آپ۔"

"یہ میرے گھر کا معاملہ ہے اور تم اتنی وکالتیں مت کرو اس کی پلیز۔"

آج وہ جا رہا تھا سو وہ خوامخواہ موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"دوسروں کے گناہ گنتے رہنے سے بندہ خود پارسا نہیں بن جاتا، اس لیے گناہ گار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ اللہ کو ہی کرنے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ یہی نا کہ میں اور ناصر بھی شادی سے پہلے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔"

اکمل بات کو کسی اور رخ کی طرف مڑتا دیکھ کر مسلسل نفی میں سر ہلا کر بولنے کی کوشش ہی کرتا رہا مگر کامیابی نہ ملی۔

"ہم اگر ملتے تھے تو گھر والوں کو پتا ہوتا تھا۔ ندی کی طرح یونیورسٹی کا کہہ کر آوارہ لڑکوں کے ساتھ ہوٹلوں، فلیٹوں میں وقت نہیں گزارتے تھے۔"

بولنے پر آئیں تو عائشہ نے اگلے پچھلے سب حساب بے باق کرنے کا سوچا اور اپنے بھائی کو ایسا جواب دینے کی ٹھانی کہ وہ آئندہ اس سے بات نہ کر سکے۔

اس کی آواز سن کر ممی بھی وہیں چلی آئیں۔

"کیا ہو گیا؟ خیر تو ہے صبح ہی صبح؟"

"پتا نہیں، ان سے ہی پوچھیں۔"

اکمل نے بے زاریت سے کندھے اچکائے تو ممی نے استفہامیہ نظروں سے عائشہ کو دیکھا جو اب انتہائی پرسکون انداز میں چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

"جسٹ لیو اٹ ممی، خوامخواہ اس نے صبح ہی صبح ندی کا ذکر کر کے بچی حلق تک کڑوا کر دیا ہے۔"

"میں تو بس یہی کہہ رہا تھا ممی کہ کل میں آپی کے گھر گیا تھا ندی سے ملنے کا کہا تو ناصر بھائی نے کہہ دیا وہ تو گھر پر ہی نہیں ہے، حالانکہ وہ تھی۔"

"تھی یا نہیں تھی، ناصر اس کا بھائی ہے جس سے چاہے اسے ملنے دے جس سے چاہے نہ ملنے دے۔"

ممی نے تو اتنی آسانی سے بات ختم کی جیسے دو جمع دو برابر چار والا سوال ہو۔

"اس بے چاری کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک نہیں ہے ممی۔۔۔ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ کن عادات و اطوار کی مالک ہے۔ پلیز آپ لوگ ناصر بھائی کا ذہن ندی کی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ وہ بے چاری چپ چاپ سوچ سوچ کر ہی خود کو تختہ دار کے حوالے کر دے گی۔"

اکمل پورے دل کی گہرائی اور خلوص سے ندی کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سنجیدہ لفظوں پر مسکراہٹ کا پیرہن چڑھانا چاہتا تھا۔ اسے ایک بار پھر زندگی جینے پر بخوشی آمادہ و رضامند دیکھنا چاہتا تھا اور اسی نیت سے وہ اس سے ملنے بھی گیا تھا۔ جہاں نہ صرف یہ کہ ناصر بھائی کی سرد مہری دیکھنے میں آئی بلکہ ندی سے بھی ملنے نہیں دیا گیا۔

"تمہیں اتنی دلچسپی کیوں ہے اسے زندگی کی طرف لوٹانے میں؟"

عائشہ نے اس کے چہرے پر بے چینی دیکھ کر خالی کپ رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میری بچپن کی سب سے اچھی دوست ہے وہ، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ساتھ یہ سب غلط ہو رہا ہے، ناانصافی ہے اس کے ساتھ اور میں ان حالات میں اسے معاشرے کے بھوکے شیروں کے سامنے نہتا نہیں چھوڑ سکتا۔"

اکمل کے لہجے، انداز اور الفاظ کو محسوس کرتے ہوئے ممی اور عائشہ نے کھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھا

"بچپن کی دوستی اس لیے یاد آ رہی ہے کیونکہ تم اس سے کافی عرصے بعد ملے ہو ورنہ جن دوستوں سے تمہارا اب تک رابطہ تھا ان کے لیے ظاہر ہے تمہاری فیلنگز اور ہوں گی۔" ممی نے سمجھانا چاہا۔

"اور اگر تم دوستی سے آگے کچھ سوچنا چاہو تو سوری، اب ایسا کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔ بس یہی سمجھو کہ جس طرح بعض اوقات ثابت سموسے، خوش رنگ سیب اندر سے گندا اور خراب نکلتا ہے اسی طرح ندی بھی اپنی ظاہری خوب صورتی سنبھال نہیں پائی اور اب اس کے اندر کا گند سب کے سامنے ہے۔" الفاظ چباتے ہوئے عائشہ نے اکمل کو اس کے آئندہ کے

ائحہ عمل کے حوالے سے تنبیہ کردی تھی۔ ممی کی گردن کا الف بے ہلتے رہنا مکمل طور پر اس کے لفظوں کی تائید کر رہا تھا۔ اکمل نے گہری سانس لیتے ہوئے باری باری دونوں کو دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"سوری، مگر میں اپنے فیصلوں اور مستقبل کے معاملے میں آزاد ہوں، وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا اینڈ پلیز نو آرگیومنٹ۔ (اور پلیز بحث نہیں)

بات کرکے وہ رکا نہیں اور فریش ہونے کے لیے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ممی اور خصوصاً عائشہ کا رویہ اس کے لیے بے حد حیران کن تھا کیونکہ وہ آج تک خود کو ایک مہذب اور سلجھے ہوئے خاندان کا فرد سمجھتا آیا تھا مگر۔۔۔

اکمل کے انداز سے اٹھتی بغاوت کی بو نے عائشہ کے دل میں ندی کے خلاف موجود حسد کو مزید ہوا دی تھی۔ غصے سے اس کے نتھنے نمونیا کے مریض کی طرح پھڑکنے لگے۔

ممی کے چہرے پر بھی کوئی کم تفکر نہ تھا۔ ذہن میں "لوگ کیا کہیں گے" کی سوچ ہمالیہ پہاڑ سے بھی مضبوط اور بڑی تھی۔

مگر پہاڑ بھی تو سر کیے جاتے ہیں نا۔

سو وہ بھی اسی تگ و دو میں دلیل کے مضبوط جوتوں اور سوچ کی لاٹھیوں کا سہارا ڈھونڈنے لگیں۔ باوجود اس کے کہ "اگر" کا خوف پہاڑ کی عین چوٹی پر سر اٹھائے کھڑا تھا۔

☆☆☆

میرا چشمہ نخلستان سائیں میرا بادل سبز شجر
تو بخت میرا تو تخت میرا تو محل میرا تو گھر
میں پیچھی ایک دعا مانگوں تو کر منظور اگر
یا پنجرہ پنجرہ شام نہ دے یا کاٹ لے میرے پر

مہربانو، ملکانی سائیں، میران اور شاہ سائیں کے ساتھ حویلی کے ڈرائنگ روم میں موجود تھی اور ایسا موقع بہت ہی کم ملتا جب وہ چاروں اکٹھے ہوں۔ جبھی مہربانو کا دل چاہ رہا تھا کہ بس وہ اس منظر کو قید کرلے اور جب دل چاہے نکال کر یہی خوشی محسوس کرے جو وہ ابھی کر رہی ہے باوجود اس کے کہ ساتھ بیٹھا ہونے کے باوجود بھی درمیان میں بہت فاصلے تھے مگر اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ سب ایک ساتھ بیٹھے ہیں اور یہ ایسا لمحہ تھا جس کا ذکر واپس ہاسٹل جا کر وہ بھی بڑے فخر سے کرسکتی تھی۔

حسرت بھری نظروں سے باری باری اس نے سب کو دیکھا۔

ملکانی سائیں حسب معمول سونی کو گود میں لیے اس کے گلے میں موجود میوزیکل بیل کا سیل تبدیل کر رہی تھیں۔ اس بیل کا فائدہ یہ تھا کہ اس میں ننھا سا آن اور آف کا بٹن بھی موجود تھا سو جب وہ چل پھر رہی ہوتی تو بٹن آن ہونے کی وجہ سے ملکانی سائیں اور دیگر کو خبر رہتی کہ وہ کس جگہ پر ہے البتہ گود میں لیتے، سوتے وقت یا پھر مزاج کے مطابق میوزک بند کرنے کے لیے "آف" کا آپشن استعمال کیا جاتا۔

شاہ سائیں اب سے چند لمحوں پہلے آنے والی فون کال پر کسی سے بات میں مصروف تھے جبکہ میران ہاتھ میں جدید ماڈل کا موبائل لیے کیا کر رہا تھا اس بات سے وہ بے خبر تھی کیونکہ اسے اتنا اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اس سے یہ سوال کرپاتی۔

ہاں البتہ اس کے برعکس وہ خود یوں کھلے عام بیٹھ کر موبائل ہرگز استعمال نہیں کرسکتی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ ملکانی سائیں کو ہی گھبراہٹ ہونے لگتی بار بار آگے پیچھے سے غیر محسوس طریقے سے گزرتے ہوئے اس کے موبائل کو یوں دیکھتیں کہ خود اسے لگتا کہ وہ کوئی غلط کام کر رہی ہے۔ میران گھر میں ہوتا تو جب جی چاہتا مختلف سوال جواب کرنے لگتا۔ تبھی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ اتنی دور دوسرے شہر میں اور پھر ہاسٹل میں رہنے کی اجازت ملنا واقعی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

شاہ سائیں الیکشن میں نظر آتی صورت حال پر تبادلہ خیال کر رہے تھے سو مہربانو وقت گزاری کے لیے بس یونہی جوتے سے نہ نظر آنے والی گرد کو فرش پر ملتی رہی۔

ابھی چند سال پہلے ہی شاہ سائیں نے پوری حویلی میں اطالوی سنگ مرمر لگوا کر گویا فرش سے ٹکراتی نظروں کو خیرہ کر ڈالنے کا مکمل انتظام کیا تھا۔

اسی اطالوی سنگ مرمر سے ڈھکے فرش پر جا بجا ایرانی، پاکستانی اور چینی قالین کے خوب صورت سے ٹکڑے بڑے آرٹسٹک انداز میں رکھے گئے تھے۔ اس پر کافرستان سے خصوصی طور پر منگوائے گئے دروازے۔۔۔ پہلی دفعہ آنے والا مبہوت ہوئے بنا نہ رہ پاتا۔ رہی سہی کسر شاہ سائیں کے شکار کردہ شیر، چیتے اور ہڑیال پوری کر دیتے جو حنوط شدہ شکل میں دیواروں پر اس طرح موجود تھے گویا ابھی زندہ ہو جائیں گے۔

"میں نے سنا ہے کہ تمہاری یونیورسٹی میں آج کل کچھ پرابلمز چل رہی ہیں۔۔۔"

مہربانو اچانک شاہ سائیں کی آواز پر چونکی جو فون بند کرنے کے بعد اب میران سے مخاطب تھے۔

"یہ کیا چل رہا ہے آج کل اخباروں میں؟"

ملکانی سائیں کے چہرے پر لمحہ بھر میں پریشانیوں کے بادل اتر رہے تھے۔ سونی کو سہلاتی انگلیاں ایک دم تھمیں تو وہ آہستگی سے نیچے اتر گئی۔

ماحول میں سونی کی بیل کا خوب صورت سا میوزک بکھرنے لگا۔

"میکوں (مجھے) وی تے کچھ بتاؤ نا پتر" پریشانی سے انہوں نے پہلے مہربانو اور پھر میران کی طرف دیکھا۔

یہاں حویلی میں تو مہربانو تک اخبار پہنچتا نہیں تھا اس لیے اس نے چہرے کے تاثرات سے لاعلمی ظاہر کی تو ملکانی سائیں نے پہلے میران اور پھر آخری امید کے طور پر شاہ سائیں کو دیکھا جو خود میران کے جواب کے منتظر تھے۔

میران کے معاملے میں ملکانی سائیں ہر وقت اسی طرح خدشات کا شکار رہتیں جیسے عام طور پر بڑی بوڑھیاں نومولود کے لیے سوا ماہ تک رہا کرتیں۔

"کچھ خاص نہیں بابا سائیں بس وہ۔۔۔ کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔"

"ہائے میریا ربا۔" ملکانی سائیں نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا جبکہ مہربانو اپنے سابقہ انداز میں بیٹھی رہی کہ لڑائی جھگڑا کرنا تو میران کے لیے اسی طرح تھا جیسے قصائی کے لیے گوشت کاٹنا۔

"بہت دن تک خبر آتی رہی مختلف اخباروں میں۔" شاہ سائیں کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں مگر ملکانی سائیں کے پریشان ہو جانے کی وجہ سے ایک دم ساری بات کرنے سے گریزاں ہیں۔

"جی، لیکن اب تو سارا معاملہ سیٹل ہو گیا ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہے اب۔"

بالوں کی ننھی سی پونی کو انگلی کے گرد لپیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے خود کو اس سارے معاملے کی کوئی پروا نہ کرتا دکھایا تھا۔

"یعنی پھر سے ایڈمیشن ہو گیا ہے تمہارا؟"

دائیں ٹانگ ہلاتے میران کے ساتھ ساتھ ان کی بات پر مہربانو اور ملکانی سائیں بھی چونکیں۔ مہربانو چاہ کر بھی کچھ بول نہیں سکتی تھی کہ اس طرح میران کے عتاب کا نشانہ بننا پڑتا سو چپ چاپ اس کے جواب کی منتظر رہی، البتہ ملکانی سائیں اس ڈر سے مستثنیٰ تھیں۔

"تا کیوں میرے پتر کا ڈمیشن (ایڈمیشن) کینسل ہوا ہے؟" شاہ سائیں نے خاموشی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے میران ہی کو جواب دینے کا موقع فراہم کیا۔

"او ہو اماں سائیں! اگر ایڈمیشن کینسل ہو بھی گیا ہے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے، پھر ہو جائے گا۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارا نام اخباروں میں اچھلنا ہمارے لیے کس قدر نقصان دہ ہے۔"

سگریٹ کا ابتدائی کش لیتے ہوئے وہ بولے۔

"اور آج کل تو پھر الیکشن ہونے والے ہیں، مخالفین ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوتے ہیں، کہاں قدم پھسلے اور وہ تماشا بنائیں۔"

"جی بابا سائیں!"

''کل یونیورسٹی جاؤ اور سارا معاملہ کلیئر کر کے آؤ۔''

''جی میں کل ہی جاتا ہوں۔''

شاہ سائیں کو بھی حالیہ الیکشن کی فکر تھی ورنہ وہ میران کی تعلیم میں دلچسپی سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ پڑھائی لکھائی میں نام کمانا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اسی لیے اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے وہ مہربانو سے امید لگائے ہوئے تھے اور ملکانی سائیں اور میران کی ہزار مخالفت کے باوجود اسے ڈاکٹر بننے کی اجازت دے کر اسے ہر معاملے میں سپورٹ بھی کیا کرتے۔

مگر اس بات سے وہ بھی بے خبر تھے کہ مہربانو اب صرف روپے پیسے کی سپورٹ سے بڑھ کر ان کے پیار کی متلاشی رہتی ہے۔ وہ بھی ان سے اسی طرح لاڈ کرنا چاہتی ہے جیسے میری اور کنول اپنے والد کے ساتھ کیا کرتیں...

وہ بھی گھر میں بیٹھ کر ساری باتیں پوچھنے کالج اور ہاسٹل سے لے کر ملکی حالات اور کرکٹ میچز تک سب کچھ ڈسکس کرنا چاہتی ہے مگر فاصلے تھے کہ جھنڈ میں لگے پوپلر کے سیدھے اور چکنے پتوں والے درختوں کی طرح ختم ہی نہ ہوتے۔

یا کبھی کبھار اسے لگتا کہ شاید وہ اس حویلی کی سب سے غیر مطلوب شے ہے۔ مکڑی کے اُس جالے کی طرح جو وہ عام طور پر دیواروں کے اور چھت کے کونوں میں بنا لیا کرتی ہے۔ مگر جس سے کسی کو کوئی غرض نہیں ہوتی وہ تنہا ہی دن رات اس جالے کو بنانے میں لگی رہتی ہے جسے کوئی بھی نظر پڑتے مٹا سکتا ہے۔ جس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔

اپنی سوچوں پر دل ہی دل میں خود ہی رائے دیتے ہوئے اس نے میران اور ملکانی سائیں کے سامنے شاہ سائیں سے واپس ہاسٹل جانے کی اجازت چاہی اور اٹھ کر کمرے میں جانے کی خواہش دل میں دبائے وہیں بیٹھی شاہ سائیں کی ہدایات سنتی رہی جو وہ اسے کل یونیورسٹی جانے کے بارے میں دے رہے تھے۔

شاہ سائیں کے اٹھنے سے پہلے یہاں سے اٹھ کر جانے کا نہ تو اسے اختیار تھا نہ اجازت اور شاید ہی ہمت۔

☆☆☆

بھاگتی ٹرین کے مناظر کی طرح کئی خوب صورت رشتے، لمحات اور مقامات پیچھے چھوڑتے ہوئے زندگی ایک بار پھر نئے انداز اور مزاج کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر چکی تھی۔

نیا گھر، اجنبی ماحول اور ناواقف لوگ۔۔۔

اماں نے گھر میں برکت کی نیت سے قرآن خوانی کا اہتمام کر رکھا تھا اور اسی مقصد کے لیے اس کالونی کے تمام گھروں میں سے خواتین کو آنے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔

ڈرائنگ روم کشادہ تو ضرور تھا مگر اس قدر وسیع ہرگز نہیں تھا کہ فرنیچر کی موجودگی میں خواتین کے بیٹھنے کا انتظام ہو پاتا۔ سو اسی غرض سے ڈرائنگ روم میں رکھا چیدہ چیدہ فرنیچر ایک روز کے لیے وہاں سے ہٹا کر سارے فرش پر سفید چاندنیاں بچھانے کے بعد دیواروں کے ساتھ مختلف کشن اور درمیان میں مناسب اونچائی کا حامل میز نما چوکھٹا رکھ کر اس پر مکمل طور پر گلاب کی پتیاں بچھانے کے بعد اوپر علیحدہ علیحدہ سیپاروں کے ساتھ چند سورہ یاسین اور تسبیحات بھی رکھی گئی تھیں۔

کھانا بنانے میں تو ثمینہ ویسے ہی تاک تھی سو اس معاملے میں اسے شاہ زین کی کوئی مدد درکار نہ تھی مگر ہاں ڈرائنگ روم کی سیٹنگ میں زیادہ کام اسی نے کیا تھا کہ ثمینہ چونکہ اگلے روز کے لیے سویٹ ڈش بنا رہی تھی تاکہ رات کو فریج میں رکھ دے، سو شاہ زین نے بڑی نیت سے پورے ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اماں نے لاکھ اٹھ کر کام کروانا چاہا مگر اس نے انہیں صرف اپنے سامنے موجود رہنے کا کہہ کر ایک کشن تک اٹھا کر نہ رکھنے دیا۔

یوں بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اماں شوگر کی مریضہ ہیں اور جسمانی تھکن سے ان کی صحت پر بھی اثر پڑ سکتا ہے، لہٰذا بڑے پیار سے انہیں منع کر کے بس اپنے سامنے بٹھا لیا تو وہ اپنے ہیرے موتیوں جیسے بیٹے کے جذبات سے کھیلنے والی لڑکی کو دل میں بھی برا بھلا تو نہ کہہ سکیں مگر ایک آہ اُن کے ہونٹوں سے ضرور نکلی تھی۔

رات دیر سے سونے کے باوجود بھی وہ ہمیشہ کی طرح پورے وقت پر آفس پہنچا تھا۔ یوں بھی اپنے فرسٹ ورکنگ ڈے میں ہی ساتھ کام کرنے والوں پر اپنی شخصیت اور کام کرنے کے انداز سے اُس نے جو تاثر قائم کیا تھا وہ اسے برقرار بھی رکھنا چاہتا تھا۔ نہ صرف سینئرز کے ساتھ عزت سے پیش آنے بلکہ ورکرز اور لوئر اسٹاف کے ساتھ بھی خوش اخلاقی سے بات چیت کرنے کے باعث اس کا تاثر ایک دوستانہ مزاج انسان کے طور پر ابھرا تھا۔

مگر مسئلہ پیدا ہوا تو تب جب اسے کچھ دستاویزات کی ضرورت پڑی۔ یوں بھی اس کی ڈگری تو ابھی مکمل بھی نہیں تھی کہ تمام تعلیمی اسناد اس کے پاس ہوتیں تو پروفیسر خورشید کی recommandation پر اسے جاب کے لیے ٹرائی کیا گیا تھا مگر پھر اس کے طریقہ کار اور لگن کو سراہتے ہوئے فائنلی اپوائنٹمنٹ لیٹر دے دیا گیا اور اب فیکٹری کے چند قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے اسے کچھ دستاویزات کی ضرورت تھی۔ جن کے لیے اسے یونیورسٹی جانا پڑتا۔

مگر یونیورسٹی جانے سے گریز کرتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ زبیر کو فون کر کے اسے ڈاکومنٹس لانے کا کہہ دے مگر ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ گھر بدلنے کے ساتھ ہی اس نے اپنی وہ سم بھی بدل ڈالی تھی جس میں زبیر وغیرہ کے نمبرز تھے اور جونڈی اور اس کے درمیان اکثر پُل کا کام کیا کرتی اس لیے شاید یونیورسٹی خود ہی جانا ناگزیر ٹھہرا۔

☆☆☆

اٹھانا خود ہی پڑتا ہے تھکا ٹوٹا بدن اپنا

کہ جب تک سانس چلتی ہے کوئی کندھا نہیں دیتا

ثروت آپا آج پھر میکے آئی ہوئی تھیں مگر حسب سابق ندی سے ہمدردی کے دو بول بولنا انہوں نے مناسب خیال نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر پہلے لاؤنج سے آتی آوازوں سے ندی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے سسرال والوں کے طعنوں سے دل ہی دل میں دن رات کڑھتی رہتی ہیں۔ اسی لیے ذرا دل ہلکا کرنے میکے چلی آئی ہیں۔ جواب میں کچھ دیر عائشہ بھابھی کی کھسر پھسر بھی جاری رہی اور پھر آوازیں آنا بند ہوگئیں۔

مگر آج کا دن ندی کے لیے فیصلہ کن دن کے طور پر طلوع ہوا تھا۔ زندگی اس طرح نہیں گزر سکتی اور اس کے لیے اب امی کے علاوہ گھر میں فکر کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ بات حالات گزرتے دنوں کے ساتھ اسے بخوبی سمجھا گئے تھے اور اب اسے زندگی اپنے زورِ بازو پر جینی تھی۔ اسی بارے میں امی سے بات کرنے کا سوچتے ہوئے اسے چق کی اوٹ میں کھڑا شاہ زین نظر آنے لگا۔

لمبا چوڑا، بدن اور پرکشش چہرے والا شاہ زین شلوار قمیص میں بھی اتنا ہی پرجمال اور وجیہہ لگ رہا تھا جتنا عام طور پر یونیورسٹی آتے ہوئے پینٹ شرٹ میں لگا کرتا۔

"دیکھو ندی! اگر کبھی ایسا ہو کہ ایک ہی زمین پر رہتے ہوئے ہمارے درمیان کوسوں یا میلوں کی بھی دوری ہو جائے تو یاد رکھنا کہ فاصلے صرف انہی لوگوں کے لیے وسوسوں اور خدشات کا باعث بنتے ہیں جن کے دل میں محبت کمزور ہو ورنہ جتنی بھی اور جیسی بھی دوری ہو اس سے محبت دوآتشہ ہو جایا کرتی ہے۔ مزید قریب لے آتی ہے۔

"جانتی ہوں شاہو! اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم چاہے مجھ سے ملو نہ ملو، ہماری بات ہوئے چاہے ہفتوں سے مہینے گزر جائیں تب بھی تم جہاں بھی ہو اس ایک آسمان کے نیچے کسی بھی مشکل گھڑی میں میرے لیے ایک بھرپور دلاسا اور کبھی نہ ٹوٹنے والا ناقابلِ شکست اعتماد ہو مگر ہاں تم بھی یاد رکھنا کہ میرے دل کی دہلیز پر صرف اور صرف تمہارے قدم لکھے ہیں اور اس چوکھٹ کے پار جانے کی اجازت نہ اب ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہوگی۔"

آن کی آن میں چق کے اُس پار کا منظر کسی روح کی موجودگی کا انکار کرتا محسوس ہوا تو وہ یاد کے کیچڑ میں جکڑ کر کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

خالق کو اپنی خلق سے الفت تھی اس لیے
جنت اتار ڈالی ہے ماؤں کے روپ میں

امی کے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی گویا وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔

ثروت آپا، عائشہ بھابھی اور ناصر بھائی کے سامنے امی بیڈ پر سفید دھاگے کی ہلکی سی کڑھائی والا سفید دوپٹہ لیے بیٹھی تھیں۔ دایاں ہاتھ اپنے پاؤں پر پھیرنے کے ساتھ جیسے ہی اسے اندر آتا دیکھا تو لہجے میں تازگی سموتے ہوئے اسے اندر آجانے کا کہا تو ضرور مگر لہجہ غریب کی گلک کی طرح خالی ہی رہا۔ اُن سب کے درمیان بیٹھی امی کس قدر نحیف اور کمزور لگ رہی تھیں یہ دیکھتے ہی ندی کا دل گویا خون کے آنسو رو دیا تھا۔ بابا کے ہوتے ہوئے اس نے کبھی بھی امی کو یوں ناصر بھائی کے سامنے کندھے جھکائے بیٹھے نہیں دیکھا تھا۔ جبھی یہ نظارہ اسے زنگ آلود چاقو سے قتل کرنے کے مترادف معلوم ہو رہا تھا۔

یوں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات عورت اپنی زندگی میں دو مرتبہ یتیم ہوتی ہے ایک بار تب جب اس کا باپ اس دنیا سے چلا جائے اور دوسری مرتبہ تب جب اس کے بچوں کا باپ اس دنیا میں نہ رہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو یہ دوسری یتیمی کہیں زیادہ اذیت ناک کٹھن اور دشوار ہوتی ہے۔ سو امی بھی اب اپنی زندگی کے اس کرب ناک سفر پر تھیں جہاں خود ان کی زندگی کا بہاؤ دنیاوی طور پر ان کی اولاد اور خصوصاً بیٹے کے ہاتھ میں موجود پتوار کا مرہونِ منت تھا۔

"آؤ بیٹا ادھر آؤ میرے پاس۔"

اسے یوں کمرے میں آتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے دیکھا تو انہوں نے پاس بلا لیا۔

"عائشہ! اسے کہو کسی کام سے آئی ہے تو ٹھیک ورنہ جائے اپنے کمرے میں واپس۔"

اسے اندر آتا دیکھ کر ناصر بھائی نے منہ پھیرا اور اس کے لیے پیغام عائشہ بھابھی کے توسط سے ارسال کیا۔

یوں بھی ناصر بھائی نے اس شام کے بعد سے ندی کو مخاطب نہیں کیا تھا نہ اس روز اس کے سر پر ہاتھ رکھا جب وہ بابا کے جنازے سے لپٹ کر بار بار بے ہوش ہو رہی تھی اور نہ ہی دنیاداری کے تقاضے نبھاتے ہوئے اس کے ساتھ تسلی کے دو بول بولے جب وہ بابا کی اپنے آخری سفر پر روانگی کے وقت ان کے پیچھے دیوانہ وار لپکتے ہوئے چکرا کر میت کو دائیں طرف سے اٹھائے ناصر بھائی ہی کے قدموں میں گر کر دنیا و مافیہا سے بےخبر ہوگئی تھی۔

قریبی رشتہ دار اور آس پاس کی خواتین میں سے کوئی گلوکوز پانی میں ڈال کر لانے کو دوڑی تو کوئی فوراً ہی منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی، پیاز سنگھایا گیا، آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی کی گئی مگر سب بےسود، آخر کسی بڑی بوڑھی کے کہنے پر بڑے جتن سے اوپر اور نیچے کے دانتوں میں ذرا سا خلا پیدا کر کے گلوکوز ملا پانی چمچ سے منہ میں ڈالا گیا تو حلق تک پہنچا ورنہ منہ میں ڈالا گیا گھونٹ بھر پانی دہانے کے دونوں اطراف سے ہوتا ہوا محض گردن ہی بھگوتا رہا۔

اس سارے عمل میں ناصر بھائی تو گو کہ جنازے کے ساتھ روانہ ہو چکے تھے مگر عائشہ بھابھی تو ایک طرف ندی کی سگی بہن ثروت آپا کا دل بھی نہ پسیجا اور اسے بابا کی موت پر موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے دور بیٹھی ہی بین کرتی رہیں۔

آخر باپ کا سایہ تو ثروت آپا کے سر سے بھی اٹھ گیا تھا مگر انہیں اس سانحے کے ساتھ سسرال میں ہونے والی سبکی کا احساس دل کو مزید کچوکے لگا رہا تھا۔ سسرالیوں کی ناک میں نتھ ڈالنے والی ثروت آپا کو ندی کی وجہ سے خود گھونگھٹ نکالنا پڑ رہا تھا اس لیے انہوں نے ندی کو لائق ہمدردی نہ سمجھا۔

"امی۔۔۔۔وہ۔۔۔۔ایک ب۔۔۔۔بات کرنا تھی آپ سے۔"

انتہائی بااعتماد ہونے کے باوجود ندی کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا مگر پھر بھی وہ رکی نہیں اور چلتی ہوئی بیڈ پر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

ہمیشہ ہر بات دھڑلے سے منوانے والی اُن کی لاڈلی بیٹی کا لہجہ آج التجائیہ تھا۔

اُس کے بیٹھتے ہی امی نے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے خود سے قریب کیا اور اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا جبکہ دوسرے ہاتھ میں تسبیح کے دانوں کی حرکت جاری تھی۔ ندی نے اُن کے ہاتھ پر نظریں جما کر اپنے سامنے بیٹھے "رشتے داروں" سے لاتعلق ہونا چاہا مگر اُن کے ہاتھوں پر موجود انگلیوں سے بھی نمایاں ہوتی موٹی موٹی نسوں پر مزید دل گرفتہ ہوگئی تو انہوں نے اس کے بازو پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر اسے مضبوط کرنا چاہا کہ بلاشبہ اس عمل سے وہ ندی کو مضبوط کرنا چاہتی تھیں۔

عائشہ بھابھی نے اُن کے اس انداز پر طنزاً ناصر بھائی کی طرف دیکھا۔

ثروت آپا کا چہرہ البتہ حسب سابق سپاٹ اور بےتاثر ہی رہا۔

وہ الفاظ جن سے خاموشی ٹوٹتی، یقینی طور پر قحط کا شکار تھے۔ سو یہ وقفہ کچھ طول پکڑنے لگا تو خود امی نے ہی ابتدا کی۔

"بولو بیٹا! کیا بات ہے؟"

(باقی آئندہ)

ناولٹ

فاخرہ گل

میرے ہمنوا کو خبر کرو

چوتھی قسط

"میں کل سے یونیورسٹی جوائن کررہی ہوں۔"
لہجے کی مضبوطی پر کنٹرول قائم رکھتے ہوئے ندی نے شاید اُن کے سروں پر انتہائی غیر متوقع طور پر گویا بم پھوڑا تھا۔

استفہامیہ نظریں عصر کے ڈھلتے سائے بنی پھیل گئی تھیں اور امی کے علاوہ کمرے میں موجود باقی تینوں نفوس چونک گئے۔

البتہ یہ سچ تھا کہ چہرے پر سکوت طاری کیے امی اُن سب کے تاثرات کا بغور مشاہدہ کررہی تھیں مگر تسبیح کو حرکت دیتی اُن کی اپنی انگلیاں تھم گئی تھیں۔

اوجھل ہی سہی آنکھ سے ڈوبا نہیں ہوں میں
اے رات خبردار کہ ہارا نہیں ہوں میں
مجھ کو فرشتہ ہونے کا دعوا نہیں مگر
جتنا برا سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں میں

"کیوں؟ کوئی نیا گل کھلانا باقی رہ گیا ہے کیا جس کے لیے یہ دوبارہ جانا چاہتی ہے یا پھر ابھی بدنامی میں کوئی کسر باقی ہے۔"

اسے مخاطب کیے بغیر ناصر بھائی نے فوری ردِعمل ظاہر کیا تھا۔

"میں کہتا ہوں کہ مجھے جینے کے قابل چھوڑے گی یا منہ چھپا کر بیٹھ جاؤں۔"

اب اُن کی مخاطب امی تھیں جو ان سب کے درمیان بیٹھی بھی تنہا معلوم ہورہی تھیں۔

"ندی! اب تم ایک بار پھر وہی کچھ کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو جس کی وجہ سے تم نے بابا کی جان لے لی۔۔۔ مجھے سسرال میں سر جھکا کر اُن کے طعنے سننے پر مجبور کیا اور اب۔۔۔"

ثروت آپا کی بات پر ندی کے دل میں موسم سرما راج کرنے لگا تھا۔ ہاتھوں پیروں میں بھی اسی موسم نے اثر دکھایا تو ان کا درجہ حرارت بھی گرنے لگا۔

اس کے برعکس شاید امی نے خود کو یا تو بہت جلدی کمپوز کرلیا تھا یا پھر انہیں اسی طرح کی باتوں کی توقع تھی۔ جبھی تسبیح کے دانے ریت بنے سرکنے لگے۔

"اب کیا یونیورسٹی جا کر امی کی جان لوگی؟"
سانس گننے کے لیے لحہ بھر رکنے کے فوراً بعد انہوں نے جملہ مکمل کیا۔

ان کے زہرخند لہجے میں تلخ ترین الفاظ استعمال کرنے پر ندی ششدر رہ گئی تھی۔ اُسی لمحے امی نے اس کے گرد موجود اپنے بازو کا حلقہ مزید تنگ کرتے ہوئے اسے سیکورٹی کا احساس دلایا۔ وہ بھی اس لمحے جب وہ خود اپنے آپ کو اولاد کے سامنے غیر محفوظ تصور کررہی تھیں۔

"ثروت! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

"غلط تو کچھ بھی نہیں کہا گیا امی!" ثروت کے بجائے ناصر بھائی نے جواب میں بلا کا سرد لہجہ استعمال کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تم لوگ ندی کے ساتھ۔۔۔ اپنی چھوٹی اور لاڈلی بہن کے ساتھ ایسا سلوک کروگے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

امی کی ذات کی بے قدری کا دکھ ندی کے تن بدن کو سرد آندھیوں کی زد میں لیے ہوئے تھا۔

"یہ سب کیا ہورہا ہے اور ابھی مزید کتنا کچھ ہونا

باقی ہے۔

پھٹی آنکھوں اور سائیں سائیں کرتے کانوں کے ساتھ سرد پڑتے جسم کو لیے ان سب کے درمیان بیٹھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ کتنی ہی دفعہ اس نے خود کو کسی کی بھی باتوں پر پریشان نہ ہونے کے بارے میں تاکید کی تھی مگر اس تاکید کو یاد رکھ کر اس پر عمل کرنا ہمیشہ ہی بھول جاتی۔ وہ اتنی کمزور تو کبھی بھی نہیں تھی مگر اب یقینی طور پر اس کا دل بہت کمزور پڑ چکا تھا۔ اپنی وجہ سے عزیز از جان ماں کی توہین اور کم مائیگی کا احساس اس کے دل کو مزید کچوکے لگا رہا تھا۔

''کچھ بھی غلط نہیں کر رہے ہم لوگ، یہ سب خود ندی کا کیا دھرا ہے، ہم تو بس بھگت رہے ہیں، شرم آتی ہے اب تو اس کی باتیں لوگوں کے منہ سے سنتے ہوئے بھی۔'' عائشہ بھابھی خاموش رہ کر ناصر بھائی اور ثروت آپا کو بولنے کا بھرپور موقع فراہم کیے ہوئے تھیں۔ امی جو کچھ دیر پہلے تک خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے ندی کو اپنے بازو سے احساس تحفظ فراہم کر رہی تھیں اب اپنے ہی بازو پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

''ان حالات میں جب ساری دنیا اس پر انگلیاں اٹھا رہی ہے اس کے کردار کے کیچڑ کو اپنی باتوں اور قہقہوں سے مزید نمایاں کر رہی ہے تو آپ خود سوچیں، ایسے حالات میں اسے یونیورسٹی جانا چاہیے یا نہیں؟ کم از کم میں نہیں سمجھتی کہ یہ جائے۔''

لفظوں کی تیر اندازی میں عائشہ بھابھی اب تک خاموش تھیں مگر اس ہنر سے ناواقف ہرگز بھی نہیں تھیں سو اپنا فن دکھانے کے لیے آخرکار زہر میں بجھے لفظوں کے تیر زبان کی کسی کمان کے ساتھ لیے اب ان کے لیے پیچھے رہنا ناممکن تھا۔

لہٰذا پورے جوش سے اپنا جوہر دکھانے میدان میں آن موجود ہوئیں۔

اماں کے بے جان اور زرد چہرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ثروت آپا نے بھی تائید کرتے ہوئے گردن ہلا کر ان کی بات کے حق میں ووٹ دیا۔

مگر ندی اپنی قسمت کا فیصلہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتی تھی جواب اس کے ساتھ بال برابر بھی مخلص معلوم نہ ہوتے۔

جن کی انا کا پودا کچھ ہی عرصے میں تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

''میں کل ہر قیمت پر یونیورسٹی جاؤں گی اور بس۔''

آخرکار جب ضبط کے غبارے میں حجم کم پڑنے لگا تو وہ پھٹ ہی تو پڑی، مگر اس کی بات پر لمحہ بھر رکے بغیر ناصر بھائی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''امی یہ یونیورسٹی جانا چاہتی ہے نا تو ضرور جائے، شوق سے جائے۔''

امی نے گردن اوپر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''لیکن یہ بھی سوچ لے کہ پھر اپنی آئندہ زندگی کہاں گزارے گی، کیونکہ واپسی کے سب دروازے اس کے گھر سے نکلتے ہی بند کر دیے جائیں گے۔''

اتنی سنگ دلی، اس قدر کٹھور پن۔۔۔

کوئی اپنی ماں جائی کے ساتھ اس طرح بھی کرتا ہے بھلا!

ناصر بھائی کی آواز میں اس قدر سختی تھی گویا شیشہ کٹ رہا ہو، پتے کے آخری سرے پر ٹکی بوند کی مانند انہیں اپنا آپ اب گرا کہ تب کے مصداق بے اماں محسوس ہوا تھا۔

ایسے میں چق کے پیچھے ایک مضطرب سی ہلچل محسوس ہوئی اور آن کی آن میں بابا دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر مگر بے نور آنکھوں سے خالی پن لیے اُن کے پاس آ بیٹھے۔

''آزمائش۔۔۔!! آزمائش ہے تمہاری، حوصلہ مت ہار دینا، جانتی ہو نا جو خدا کا زیادہ محبوب ہوتا ہے آزمائش بھی اسی کی ہوتی ہے۔ ہر ایک کی قسمت میں رب کی یہ اپنائیت کہاں۔''

''رب کی اپنائیت؟ آزمائش؟ آپ کو کیسے پتا کہ یہ آزمائش ہی ہے؟''

گرمیوں کی سنسان دوپہر میں کوئی کوئل کی کوک سے الفاظ امی کے خالی دل میں بازگشت پیدا کرنے لگے تھے۔

''ہر وہ دکھ، تکلیف یا پریشانی جو خدا سے نزدیک کر دے ہمارے لیے آزمائش، اور اگر اسی دکھ تکلیف یا پریشانی کے نتیجے میں مایوس ہو کر ہم خدا سے دور ہونے لگیں تو وہ ہمارے لیے سزا کی صورت نازل ہوتی ہے۔''

بابا نے چند لمحے امی کا چہرہ بغور دیکھا جہاں کی ویرانی پتھریلے پہاڑوں کو مات دیے ہوئی تھی۔

''یہ سارے حالات جس نے پیدا کیے ہیں اُس کے حوالے سب کچھ کر کے بے فکر ہو جاؤ، سب بہتر ہو جائے گا۔''

چق کے اوپر خزاں رسیدہ پتے ہوا کی مدھم رفتار سے گرنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ بابا سے امی اپنی الجھن بانٹتیں جیسے کچھ یاد آنے پر ایک دم بولے۔

''جانتا ہوں کہ ناصر کی وجہ سے تمہارا دل بہت دکھا ہوا ہے مگر دیکھو اُسے بد دعا نہ دینا، لفظوں کی ایسی گٹھڑی اس کے نصیب کے حوالے نہ کرنا جس کا بار اٹھانے کی طاقت اس میں نہ ہو۔''

امی نے ایک دم سر جھکا لیا تھا۔

چق کے اُس پار ایک دفعہ پھر شہر خموشاں سا سکون تھا۔

''امی!''

ثروت آپا نے اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے پکارا اور ان کے کندھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو امی نے دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

کمرے میں اس وقت ندی، ثروت آپا اور ان کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

ناصر بھائی بات کرنے کے بعد رکے نہیں تھے اور عائشہ بھابھی نے بھی ان کی تقلید کی تھی۔

☆☆☆

شاہ سائیں جان بوجھ کر ان دنوں حویلی میں اپنا قیام طویل کرنا چاہتے تھے۔ شہر میں جس طرح آج کل الیکشن کا میلہ سجائے جانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور ہر ممبر اپنی مارکیٹ ویلیو چیک کرنے کی غرض سے مختلف سیاسی جماعتوں سے اپنی قیمتیں لگوا رہے تھے ایسے میں شاہ سائیں کا منظر سے غائب ہو جانا یقینی طور پر ایک حیران کن امر تھا۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ بلاشبہ وہ ایک زیرک سیاست دان ہیں اور وقت کی چلتی نبض پر ہاتھ رکھ کر سیاست کی بچھی بساط پر مہرے تبدیل کیا کرتے ہیں۔

ان دنوں جب سیاست دانوں کی گاڑیوں کے پہیے اور فون کے کنکشن ہمہ وقت مصروف رہتے وہ بڑے آرام سے ہاتھ میں سگار لیے، کلف لگے شلوار قمیص میں اپنے جدید ٹی وی کی اسکرین پر نیوز چینلز کو آئینے کی طرح دیکھا کرتے۔ سیاسی جماعتوں کی بنتی بگڑتی صورت حال، کل کے وزیر آج کے اسیر اور اس پر خود کو پائے کا دانشور خیال کرتے مائیک کے سامنے بیٹھے صحافی۔

جو کسی بھی ڈگری کو کہیں بھی چیک کروانے کے نہ تو عادی تھے نہ پابند۔

مائیک ہاتھ میں آتے ہی جو کسی کو بھی فرش سے عرش تک بھی لے جا سکتے تھے اور عرش سے فرش تک پٹخنے میں بھی انہیں محض ایک ہی گھنٹہ درکار ہوتا۔

ایسے میں آج انہوں نے اپنے حلقے کے ہونے والے آئندہ الیکشنز سے پہلے اخباروں کے ذریعے عوام تک اپنا اچھا تاثر پہنچانے ہی کی غرض سے چند چیدہ چیدہ صحافیوں اور اعلیٰ عہدیداران کا ڈنر حویلی میں ارینج کیا تھا۔

بہترین ولذیذ کھانے بھی کھائے گئے، ''باہمی تعاون'' پر بھی اشاروں کناروں میں غور کیا گیا۔ جس پر بھی نے شاہ سائیں کو اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے انہیں بے فکر ہو کر الیکشن مہم کا آغاز کرنے کا مشورہ دیا اور محفل کی ''برکات'' سمیٹتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

برآمدے میں کھڑے شاہ سائیں اور میران چونکے تو تب جاتے ہوئے اللہ حافظ کہتے کہتے ایک صحافی نے اپنی طرف سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے خود کو میران کا مخلص دکھانا چاہا۔

''اُس لڑکی کی طرف سے پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا نا۔''

شاہ سائیں نے چونک کر پہلے صحافی کو اور پھر

میران کو دیکھا جو اس کی بات پر گڑبڑا سا گیا تھا۔

”نہیں نہیں، اب تو سب کچھ سیٹ ہو گیا ہے۔“

”سیٹ تو سائیں ہونا ہی تھا نا، خبر ہی ایسی لگائی تھی۔“

میران نے تو اپنے تئیں بات ختم کر کے جان چھڑانا چاہی تھی مگر ایسا ہو نہ سکا کیونکہ وہ یقیناً تفصیلی بات کرنے کے موڈ میں تھا جبھی شاہ سائیں کی طرف متوجہ ہوا۔

”اور صرف میں نے ہی نہیں، اپنے دوسرے صحافی دوستوں کو بھی میں نے بتایا کہ یہ خبر ضرور لگنی چاہیے اور لگے بھی ایسی جگہ پر کہ ہر ایک کی نظر سے ایک دفعہ تو ضرور ہی گزرے۔۔۔ اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔“

”ہاں بالکل، مگر اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”بس سائیں! اگر کبھی کوئی مسئلہ ہو بھی تو صرف ایک فون کال آپ کی، اور باقی سارا کام میرا۔“

”بہت مہربانی، شکریہ۔“

نا چاہتے ہوئے میران نے خوش اخلاقی نبھائی۔

”شرمندہ نہ کریں جی، ہمارا اخبار سمجھیں آپ کا ہی اخبار ہے، چاہیں تو روز لکھی جانے والی ڈائری کی طرح استعمال کریں۔“

”بہت شکریہ۔“

میران کو منظر سے جلد از جلد ہٹنے کی جلدی تھی مگر وہ تھا کہ جیسے رات کے اس پہر فراغت کے لمحات گزار رہا تھا۔ اس پر شاہ سائیں کے چہرے پر بنتے بگڑتے ناگواری کے تاثرات۔

”میں ان شاءاللہ پھر ملتا ہوں آپ سے۔“

شاہ سائیں نے خود ہی اشارتاً اب اُسے چلے جانے کا کہتے ہوئے مصافحہ کی غرض سے ہاتھ بڑھایا تو اسے جاتے ہی بنی مگر اس کے جاتے ہی میران بھی شاہ سائیں کی باتیں سننے کے لیے رکا نہیں اور فوراً حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

مصروفیت کے موڑ پر یادوں کی شاہراہ
لمحوں سے پوچھتی ہے مسافر کدھر گئے

نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ زین کو آج یونیورسٹی آنا ہی پڑا تھا مگر بڑے سے آہنی گیٹ کے اُس پار یونیورسٹی کے اندر ندی کی یادیں جو درزی کی کترنوں کی طرح جا بجا بکھری ہوئی تھیں اُن سے وہ کیسے اور کیونکر مل پائے گا، اس معاملے میں وہ خود کو تمام رستے سمجھاتا آیا تھا کہ ندی سے اس کا پیار صرف یک طرفہ تھا۔ اس کے جذبات سے محض وقتی طور پر اپنی انا کی تسکین کے لیے کھیلا گیا اور بس۔

لیکن یہ الگ بات تھی کہ اس نے اپنے دل و ذہن میں محبت اور تجارت میں بہت فرق رکھا تھا اگر وہ محبت میں تجارت کے اصول و ضوابط کی آمیزش کرتا تو یقیناً اب تک ندی کو اپنے دل سے نکال چکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں تھا، بلکہ اسے اب بھی ندی سے محبت تھی، فرق جو تھا سو دل کے کسی ایک کونے میں جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا ضرور تھا۔

اور اتنا سوشل تو وہ کبھی بھی نہیں رہا تھا کہ اسے دیکھتے ہی اسٹوڈنٹس کی ٹولیاں اس کی طرف لپکی آتیں جبھی بڑے سنجیدہ اور پروقار انداز میں چلتا ہوا ڈیپارٹمنٹ کی راہداری تک پہنچا کہ اسی راہداری کے آخر میں بائیں طرف موجود آفس میں وقار صاحب سے اُسے اپنے کچھ کاغذات کے سلسلے میں ملنا تھا۔

”شاہو!“ اسے لگا جیسے ہمیشہ کی طرح اس کے دائیں سمت چلتی ندی نے اسے پکارا ہو۔ ڈارک بلیو جینز پر وائٹ بے داغ کاٹن کا ٹاپ اور گلے میں چھوٹے سے پنک مفلر کی گرہ لگائے اس کی طرف چہرا کر کے چلتی ندی نے اسے پکارا تھا مگر شاہو نے اس کی بات سننے کے بجائے خود ہی اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”ویسے، میرے ساتھ تمہیں ایک فائدہ تو ہے۔“

”وہ کون سا؟“ وہ وہیں پر رک جاتی۔

”تم ہمیشہ میرے سامنے سر اٹھا کر بات کیا کرو گی۔“ وہ زیرِ لب مسکراتا تو ندی ہنس دیتی۔

”پتا ہے میں ہمیشہ تمہاری رائٹ سائیڈ پر چلتی ہوں، تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ میں تمہارا رائٹ ہینڈ ہوں اور اگر کبھی تم نے مجھے چھوڑ دیا نا تو نکمے ہو جاؤ گے ایک نمبر کے۔“ بات میں جب تک شوخی کی جھلک نظر نہ آتی اسے اپنی بات نامکمل سی لگا کرتی تھی، جبھی مسکراتے ہوئے اسے دھمکی دے ڈالی۔

”ہاں بالکل کیونکہ دو نمبری تو ویسے بھی تمہارے پاس ہے۔“

وہ محض بات برائے بات کرتا مگر نتیجتاً ندی کا دھموکا سہنا پڑتا۔

یہاں اسی راہداری کے ایک ایک ستون کے پاس بعض اوقات وہ چاروں صرف بات کرتے گزرتے رکتے اور کبھی کبھار اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ اگلے پیریڈ کا ٹائم بھی اسٹارٹ ہو جاتا۔ مگر اب ان سب یادوں پر وقت کی تیز ہوا دھول اڑا رہی تھی۔

کچھ کلاس فیلوز نے دیکھا تو ہیلو ہائے کرنے کی غرض سے آگے بھی بڑھے۔ انہی سے پتا چلا کہ آج زبیر اور صبا کی منگنی کی تقریب ہے اس لیے وہ دونوں یونیورسٹی نہیں آئے۔ حیرت انگیز طور پر کسی نے بھی ندی کے متعلق کوئی بات کی نہ پوچھی۔ حالانکہ لاشعوری طور پر شاہ زین کی سماعتیں منتظر ہی رہیں مگر چونکہ وہ کسی کے پاس بھی زیادہ دیر نہیں رکا تھا اور باوجود ان کے کینٹین چل کر چائے پینے کی آفر پر اس نے معذرت کرتے ہوئے اُن سے اجازت چاہی۔ اس لیے ندی کے بارے میں کوئی بات ڈسکس نہیں ہوئی تھی۔

ہوا میں موجود نرم اور پُر کیف احساس کی طرح یادوں کو ساتھ لیے نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتا اس سے پہلے کہ وہ مطلوبہ آفس تک پہنچتا، سامنے سے میران اپنے چیلوں کے ساتھ حسبِ معمول بازو دو فٹ دور کر کے اکڑتے ہوئے چلتا نظر آیا، شاہ زین کو دیکھا تو نہ صرف چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی بلکہ دایاں ہاتھ مونچھوں کو تاؤ بھی دینے لگا۔

بغیر بات کے چیلوں نے قہقہہ لگایا تو میران نے شاہ زین کی طرف رخ کر کے انہیں مخاطب کیا۔

”یار! شہر میں جتنی بھی کوشش کر لو پر یہ آوارہ، دم ہلاتے کتے ختم نہیں ہوتے۔“

”سائیں ندرت بھابھی کو تو کتے ویسے بھی بہت پسند ہیں۔“

ایک دوست نے کچھ زیادہ ہی نمبر بنانے کے لیے ندی کو بھابھی تک کہہ ڈالا جس پر پہلے تو میران چونکا پھر اسے تھپکی دیتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہاں تیری ندرت بھابھی کو منہ دکھائی میں بھی کوئی کتا ہی نہ دے دوں۔“

اور بس یہی وہ لمحہ تھا جب میران کی بات پر امڈ آنے والے قہقہوں کی مکروہ آواز سے وہ اپنی برداشت کھو بیٹھا اور پاس سے گزرتے میران کو پیچھے سے کالر پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ لمبے چوڑے شاہ زین کے سامنے میران جیسے بالکل ہی بچہ معلوم ہو رہا تھا۔ ساتھ موجود اس کے دوستوں نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات بھی پیش کرنی چاہیں مگر میران نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

راہداری میں موجود نوٹس بورڈ کے پاس کھڑے اسٹوڈنٹس ایک لمحہ میں وہاں سے غائب ہو گئے تھے اور اب وہاں ان کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

یوں بھی ہر نرم دل انسان کی بھی برداشت کی آخر کو ایک حد ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک خالی گلاس میں پانی ہم اس وقت تک ہی ڈال سکتے ہیں جب تک اس میں گنجائش ہو، دوسری صورت میں ڈالا گیا پانی ہر حال میں باہر گرے گا۔

سو اب بھی وہی ہوا تھا۔ شاہ زین کی سرخ ہوتی آنکھیں میران کے چہرے پر تھیں۔

”آج کے بعد اگر اُس کا نام بھی تمہاری زبان پر اس انداز میں آیا تو دوسرا لفظ کہنے کے قابل نہیں رہو گے۔“

ایک جھٹکے سے شاہان نے اُس کا گریبان چھوڑا تو وہ ایک بار پھر مسکرانے لگا۔ وہی جلانے والی طنزیہ مسکراہٹ۔

”کیوں تمہارے نام لکھی گئی ہے کیا؟“

”میں کہتا ہوں بکواس بند کرو اپنی ورنہ۔۔۔“

شاہ زین ایک بار پھر اس کی طرف لپکا مگر اس دفعہ میران کے دوستوں نے اسے آگے بڑھنے سے

روک دیا، یوں بھی وہ لوگ پانچ چھ تھے اور شاہ زین تن تنہا اور پھر یہ حقیقی زندگی تھی فلم ہوتی تو یقیناً پانچ چھ کے بجائے درجن بھر غنڈوں سے نبٹا جاسکتا تھا مگر حقیقت میں اب میران کے دوستوں نے اس کے گرد حصار بن کر شاہ زین کو میران تک پہنچنے سے روک تو دیا تھا مگر میران کے اشارے پر اس پر جھپٹنے سے گریز کیا تھا۔

''ورنہ کیا؟ کیا کرلو گے تم؟''

میران نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے مونچھوں کو ''سنوارتے'' ہوئے اسے چیلنج دیا تھا مگر اس سے پہلے کہ شاہ زین بھی جواب میں کچھ کہتا اتفاقاً سامنے اپنے آفس سے نکل کر آتے پروفیسر وقار کو دیکھ کر جہاں میران اور اس کے دوستوں کو وہاں سے کھسکنا پڑا وہیں شاہ زین بھی غصے میں محض پیچ و تاب کھاتا رہ گیا، باوجود اس کے کہ وہ ایک نہایت مضبوط اعصاب اور تحمل مزاج کا انسان تھا مگر پھر بھی میران کے ندی کے بارے کہے گئے الفاظ اور اس کے دوستوں کے گھٹیا ریمارکس نے اسے اس طرح کا ردِ عمل دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے لیے جس کے لیے شاہ زین کی محبت کا وجود شاید روزانہ کے اخبار سے بڑھ کر کبھی بھی نہیں رہا تھا اور حالات و واقعات یہی بتا رہے تھے کہ وہ اس کے جذبات کی سچائی سے سدا لاعلم ہی رہی تھی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جس کو ہم سفر جانیں
جسے پانے کی خواہش میں
ہزاروں درد انجانے
یونہی ہم کو دلیتے ہیں
زمانے کے گلے شکوے
کبھی اغیار کی باتیں
کبھی جاگتی ہوئی راتیں
ہمیں تحفے میں ملتی ہیں
تمنا جس کو پانے کی
زبان پرور دکی صورت
ہمیشہ جاری رہتی ہے
وہ جس کا نام سن کر
دل دھڑکنا بھول جاتا ہے
ہم اس خوش بخت کی خاطر
جاں پر کھیل جاتے ہیں
مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جس کو ہم سفر جانیں
ہمارے دل کی باتوں سے
وہی لاعلم رہتا ہے۔۔۔!!

☆☆☆

زندہ دلوں کا شہر لاہور اکمل کے لیے پہلی پوسٹنگ کے حوالے سے اب ہمیشہ کے لیے یادگار بن گیا تھا کہ اس شہر کی رونقوں پر وہ شروع سے فدا تھا، کراچی میں پلے بڑھے لوگ عموماً کراچی پر کسی بھی شہر کو ترجیح دینے سے گریز کرتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ شروع ہی سے لاہور کی فضا میں رچی بسی اپنائیت کا دلدادہ تھا۔ اسی لیے اب وہ لاہور آ کر خوش بھی تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ گھر سے آنے سے اب تک وہ اُن حالات و واقعات کو ہرگز نہیں بھولا تھا جن میں آج کل ندی زندگی گزار رہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ چاہنے کے باوجود آتے ہوئے اُس سے مل نہیں پایا تھا، یہ احساس یقیناً اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا خود ندی کے لیے۔ یوں بھی یہ اچھے دوستوں کی ایک نشانی ہے کہ وہ دوست پر بیتی تکلیف کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ مگر دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اپنے دل میں موجود ندی کے لیے اس احساس کو اس کے سامنے بیان نہیں کر پایا تھا۔ دنیا والے، شاہ زین، عائشہ سب اپنی جگہ مگر وہ اسے ایک مضبوط تحفظ کا احساس دلا کر خود کو اکیلا نہ سمجھنے کا کہنا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کی ڈھارس بندھاتا اور اس کے دل میں موجود تمام طوفان کو اپنے سامنے بہہ نکلنے کا موقع دیتا مگر۔۔۔

وقت کا پہیہ شاید اسے یہ مہلت دینے پر راضی معلوم نہ ہوتا تھا۔

جبھی طے شدہ وقت پر عین اس وقت ناصر بھائی نے اسے ندی سے ملنا تو دور بات تک کرنے کی اجازت نہ دی جب اس کے پاس مزید کوئی دن نہ تھا اور اگلے ہی دن اسے لاہور میں اپنی تعیناتی رپورٹ کر کے حاضری دینا تھی۔

''یار! ریس کورس جا رہا ہوں۔۔۔ موڈ ہے تو چلو۔''

اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے باہر موجود خوب صورت ہریالی اور رنگ برنگے ترتیب وار لگے پھولوں کو دیکھتے اکمل کی محویت دروازہ کھول کر محض سر اندر داخل کرتے نبیل کی آواز سے ٹوٹی۔

''او بندے نے بات کرنی ہو تو انسانوں کی طرح اندر آ کر کرنی چاہیے۔ تمہیں دیکھ کر تو لگ رہا ہے گھوڑے نے اصطبل سے منہ نکالا ہوا ہے۔''

نبیل کی آمد اکمل کے ذہن پر خوش گوار تاثر بن کر یوں ابھری کہ چند لمحوں پہلے ندی کے لیے سوچ کر پریشان ہوتے اکمل نے جان بوجھ کر مذاق کرتے ہوئے دل کو ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔

''واقعی؟'' نبیل کی طرف سے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا گیا۔

''میں تو سمجھا تھا صرف تم پر ہی کھڑکی سے چپٹے بندر کا گمان ہو رہا ہے۔''

اندر داخل ہوتے نبیل کی بات پر اکمل نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''ادھار نہ رکھنا کبھی تم۔۔۔''

''نا جی نا، کیونکہ ادھار محبت کی قینچی ہے یارا! ایویں خوامخواہ کٹ گئی تو کیا کریں گے دونوں۔''

''ویسے باتیں تو شام کے اخبار کی طرح بڑی کراری ہوتی ہیں تمہاری۔'' اکمل نے مسکراتے ہوئے جاگرز کے تسمے باندھے، ٹراؤزر کی جیب میں والٹ اور چابی ڈال کر ہاتھ میں موبائل لیا اور اس کے کندھے پر تھپکی مارتے ہوئے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

وہی آہٹیں در و بام پر وہی رتجگوں کے عذاب ہیں
وہی ادھ بجھی مری نیند ہے وہی ادھ جلے میرے خواب ہیں
یہ نہ پوچھ کیسے بسر کیے، شب و روز کتنے پہر جیے
کسے رات دن کی تمیز تھی، کسے یاد اتنے حساب ہیں

پچھلی دفعہ کی طرح اس بار بھی مہربانو وہی امید وہی خواہش اور وہی ادھوری تمنا دل ہی میں لیے اپنے ہاسٹل آن پہنچی تھی۔ وہ دعا جو وہ رستہ بھر مانگتی رہی تھی اس بار بھی قبولیت کے درجے کو چھوتے چھوتے رہ گئی تھی۔

ملکانی سائیں کے ساتھ میری اور کنول کی طرح دوستانہ انداز میں بات چیت، میران کے ساتھ چھوٹی موٹی شرارتیں اور چھیڑ چھاڑ اور شاہ سائیں کے ساتھ لاڈ بھرا انداز۔۔۔ بس یہی کچھ تو وہ مانگتی آ رہی تھی تب سے جب سے وہ حویلی کے بلند و بالا آہنی گیٹ سے نکل کر پہلی دفعہ اس ہاسٹل میں آئی تھی۔

زندگی کا اصل رنگ و روپ تو اب تک خود کو مہربانو کی نظر سے کسی دیہاتی دوشیزہ کی طرح چھپائے ہوئے تھا اور حقیقی معنوں میں یہ حسن اس پر کنول اور میری کے ساتھ ہاسٹل میں روم شیئر کرنے کے پہلے روز ہی آشکار ہو گیا تھا۔ جب اس کی توقع کے برعکس نہ تو اسے اُن دونوں سے کوئی خاص قسم کا پروٹوکول ملا اور نہ ہی ایف ایس سی کی کلاس فیلوز کی طرح اسے کوئی بہت توپ چیز خیال کیا گیا۔

پہلے دن اُن دونوں کی باتوں سے محظوظ ہو کر لگایا گیا قہقہہ خود اسے اجنبی لگا تھا مگر یوں کھلکھلا کر ہنسنے کے بعد اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ جوان دونوں اور اپنے ذہن کے درمیان کافی فاصلہ محسوس کر رہی تھی تو اس کا یہ احساس قطعاً غلط تھا اور یوں ہنسی مذاق میں وہ تینوں شروع کے چند ہی روز میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ پہلے اُس کا خیال تھا کہ اُسے ایسا کمرہ مل جائے جس میں اکیلی رہ سکے۔ مگر اب وہ اپنی ہی سوچ کے پورا نہ ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتی۔

تینوں مختلف بیک گراؤنڈ ہونے کے باوجود ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئیں — اور

اب اتنے دن ایک دوسرے سے دور رہنے کی وجہ سے باتوں کے ڈھیر تھے جو تینوں میں برابر تقسیم ہونا تھے۔

''مہرو، یار بہت مس کیا تمہیں چھٹیوں میں۔''

اٹیچی سے کپڑے نکال کر کپ بورڈ میں رکھتی کنول نے کتابیں سیٹ کرتی مہربانو کو مخاطب کیا تو ساتھ ہی بیگ میں منہ گھسا کر کچھ ڈھونڈتی میری بھی اپنا منہ ''برآمد'' کرنے پر مجبور ہوگئی۔

''اور کیا، میں اور کنول تو دور ہو کر بھی موبائل پر بات تو کم از کم کر لیتے تھے مگر تمہارا نمبر تو ہم سمجھے چھٹیوں میں کسی سرکاری دفتر نے ادھار ___ لے لیا ہے۔''

''سرکاری دفتر؟''

مہربانو اس کی بات میں چھپے مقصد کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ جبھی ہمیشہ کی طرح نئی خریدی گئی کتاب کے پہلے صفحے کے کونے پر نام لکھتے لکھتے اُس کا پین رک گیا تھا۔

''تو اور کیا یار، موبائل پکڑے پکڑے ہاتھ میں پسینہ آجاتا تھا، کان سے لگائے لگائے اتنی بیلز کانوں میں جاتیں کہ بعد میں بھی کانوں میں گونجتی رہتیں لیکن مجال ہے جو کبھی فون اٹھالو یا خود کرلو۔''

میری نے ہلکے پھلکے انداز میں شکوہ کیا، پین کے تسلسل میں آئے گئے توقف کے بعد اپنا ادھورا نام مکمل کیا اور پین بند کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں جتنے دن بھی حویلی میں رہی ہوں میں نے تو ایک بار بھی کبھی بیل کی آواز نہیں سنی۔''

''نہیں سنی؟'' دونوں نے یک زبان ہو کر چیختے ہوئے کہا۔ حیرت کا اظہار کرنے میں آواز کے ساتھ ساتھ ان کی پھیلتی آنکھوں نے بھی کافی مدد کی تھی۔

''ہاں۔۔۔ قسم لے لو، میں نے تو ایک دفعہ بھی اپنے موبائل کی بیل نہیں سنی۔''

''کہو تو موبائل کا call log دکھا دوں؟'' میری نے بڑے پرسکون انداز میں مسکراتی مہربانو کو یقین دلانا چاہا تھا۔

''مگر میں نے کب کہا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو، مجھے پتا ہے تم دونوں نے کال کی تھی۔''

''کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟ صحیح طرح بتاؤ۔'' کنول اس کی بات سے الجھ گئی تھی۔

''بیل کی آواز بھی نہیں سنی اور پتا بھی ہے کہ کال کی تھی؟'' میری نے پولیس والوں کا انداز اپناتے ہوئے تفتیشی رخ سے اس کے جملے پر غور کرنا چاہا مگر وہ خود ہی بول پڑی۔

''اس لیے کہ میرا موبائل وائبریشن پر تھا۔''

مہربانو نے یونہی خوامخواہ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''وائبریشن پر تھا؟'' کنول اور میری نے الجھ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''پوری چھٹیوں میں وائبریشن پر ہی رہا؟ لیکن کیوں یار؟''

قمیص ہینگر میں ڈالتے ڈالتے وہیں رکھ کر کنول اس کے پاس ہی آبیٹھی۔

میری بھی اس کی بات پر مکمل توجہ دینے کی غرض سے بیگ پر سے دھیان ہٹا بیٹھی تھی۔

مہربانو نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا جن کے چہرے پر اس کے لیے پریشانی تھی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''دراصل موبائل ان تمام دنوں میں میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ہی پڑا رہا۔ یہاں سے جاتے ہی میں نے اس کی ساؤنڈ آف کر کے وائبریشن پر جو لگایا تو اب آتے ہوئے ساؤنڈز آن کی ہیں۔''

''لیکن کیوں؟ یہی تو بات مجھے سمجھ نہیں آرہی۔''

''دراصل مجھے معلوم ہے کہ اماں سائیں یوں میرے موبائل پر بات کرنے سے شاید کچھ اور سوچنے لگیں۔ بس اسی لیے میں نے خود بھی کال نہیں کی کہ کہیں کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے کوئی سن نہ لے۔''

مہربانو بہت کم اُن کے سامنے اپنا آپ، حویلی یا

اس کے مکینوں کو ڈسکس کرتی تھی مگر آج اُن کے چہرے پر اپنے لیے اتنی پریشانی اور محبت دیکھ کر وہ بول ہی پڑی تھی۔ اپنی فیملی کے بارے میں بات چیت سے گریز کو خود کنول اور میری نے بھی محسوس کیا تھا اسی لیے کبھی اس سے اس بارے میں زیادہ پوچھ گچھ نہ کی جاتی۔

''ہاؤ فنی، گھر والوں نے انٹرنیٹ کے کنکشن سمیت جدید موبائل تو تم کو لے دیا۔ پڑھنے کے لیے گاؤں سے اتنی دور لاہور میں اور وہ بھی ایک ہاسٹل میں رہنے کے لیے تو بھیج دیا پھر بھی موبائل پر بات کرنے میں اتنی پرابلم۔۔۔؟'' حیرت کا اظہار اس تمام صورت حال میں بجا تھا۔

''تمہاری حیرت بالکل ٹھیک ہے مگر ایسا ہی ہے۔ مجھے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اتنی دور بھیجنا واقعی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب میرا اپنا بھائی میران علی شاہ مخالفت میں سب سے آگے ہو۔''

''ہوں۔'' دونوں نے گہری سانس لی تھی۔

''بھائی کیا کرتا ہے تمہارا؟''

''پتا نہیں آج کل کیا کر رہا ہے۔ میری زیادہ بات نہیں ہو پائی اُس سے۔''

مہربانو کے چہرے پر اداسی لحہ بہ لحہ بڑھنے لگی تھی۔ جسے ان دونوں نے بھی بخوبی محسوس کیا۔

''اچھا سنو، سارے کام چھوڑو میرا خیال ہے پہلے میس سے کھانا لے آتے ہیں۔''

کنول نے بات بدل کر اٹھتے ہوئے اُن دونوں کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے، ویسے بھی میس والے انکل کو بھی ذرا سمجھانا پڑے گا، مستقبل کی ڈاکٹرز کو پلیٹ میں مریضوں جتنا سالن ڈال دیتے ہیں۔ اب بندہ اگر بار بار مانگے بھی تو کس منہ سے۔''

میری نے پاؤں میں جوتے پہن کر ہاتھ میں پکڑی بیگ کی چابی بیگ ہی کی جیب میں ڈالی۔

''کس منہ سے؟ ارے اسی فٹے منہ سے ہی مانگو گی اور کیا۔۔۔''

کنول نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس کے گھورنے پر مسکرا کر دیکھا تو مزید کسی بھی حملے سے بچ گئی۔ مہربانو نے بھی کتابیں سائیڈ پر کرنے کے بعد موبائل ہاتھ میں لے لیا کہ گاؤں سے آئی کسی بھی کال کو فوراً اٹینڈ کرنا نہ صرف اس کی اولین ترجیح تھی بلکہ یہاں آنے کے بعد سے بنیادی فرض بھی۔

☆☆☆

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
متعین وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے، قضا بھی چھوٹ جاتی ہے

نئے تیار شدہ ملبوسات کی کوڈنگ چیک کرتے ہوئے پنک کلر کے ٹراوزر شرٹ پر یک دم شاہ زین کی نظر رُک سی گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کی آنکھوں کے سامنے ندی کا گلابی چہرہ آرکا تھا۔ یہ رنگ اس کے اپنے رنگ کے سامنے ہمیشہ سے سبقت لے جانے کی کوشش میں نظر آتا اور پھر وہی رنگ اکثر اوقات چلتے ہوئے سرخ کے قریب ترین جا پہنچتا اور وہ بھی اس لیے کہ ندی کی چال میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ ہمیشہ تیز رفتاری سے چلا کرتی مگر ہاں ہوا کو مات دیتی ہرگز معلوم نہیں ہوتی تھی۔

''ابھی تو پیریڈ شروع ہونے میں بہت ٹائم ہے پھر اتنا تیز کیوں چل رہی ہو؟''

گلابی رنگ پر نظریں ٹکائیں وہ اپنی محبت کے گلابی دنوں میں جا پہنچا تھا جہاں ابھی ان چاروں کی دوستی کے اوائل روز چل رہے تھے۔

شاہ زین کی بات ختم ہونے تک وہ ان تینوں کے نزدیک پہنچ کر رک چکی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتی زبیر نے اس کی طرف سے شاہ زین کو مخاطب کیا۔

''بس دیکھ لو، خوامخواہ ہی لوگ یورپ کی لڑکیوں کو تیز رفتار قرار دیتے ہیں، میں تو کہتا ہوں کوئی اپنی ندی کو دیکھ لے نا تو۔۔۔''

"یا تو یورپ کی لڑکیوں کو بھول جائیں گے یا اسے بھی وہیں لے جائیں گے۔"

صبا نے زبیر کے منہ سے بات اچکی تھی۔

"جناب۔۔۔!"

ندی نے بیگ سے چیونگم نکال کر تینوں کی طرف بڑھائی اور پھر اپنے منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے بولی۔

"نہ تو مجھے یورپ جانا ہے اور نہ ہی مجھے لڑکیوں کی اکثریت کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلنا پسند ہے۔"

"ٹھمک ٹھمک کر۔۔۔؟" صبا اور زبیر نے مشترکہ قہقہہ لگایا البتہ شاہ زین نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"تو اور کیا۔" ندی نے بے نیازی سے گلے میں جھولتے اسکارف کو ٹائی کی شکل میں گرہ لگائی۔

"دور کیوں جائیں، اپنی یونیورسٹی میں ہی دیکھ لینا، سلائی مشین جسم کے اوپر رکھ کر کپڑے سلوانے کے بعد ایسے ایسے جان لیوا ٹھمکے مارتی ہیں چلتے ہوئے کہ دیکھنے والوں کو شرم آجائے۔"

"ویسے ندی کی بات تو سچ ہے۔"

شاہ زین نے بھی اس دفعہ ندی کی تائید کی تھی جبکہ لفظ "جان لیوا" پر ہنسے بنا وہ بھی نہیں رہ پایا تھا۔

"بلکہ خاص طور پر لڑکیوں کو تو چلتے ہوئے اپنا انداز اتنا باوقار اور پر اعتماد رکھنا چاہیے کہ لڑکوں کے ہجوم میں سے بھی گزر کر آنا پڑے تو کسی کو جملہ کسنے کی بھی ہمت نہ ہو۔" شاہ زین نے دل ہی دل میں اسے سراہا تھا۔

اور وہ خود بھی تو ایسی ہی تھی، پر اعتمادسی۔

"تم پر جملہ کس کر کسی نے اپنے دانت تڑوانے ہیں۔"

"صرف دانت؟ ارے کسی کی ایسی حرکت پر میں پورا منہ بوتھا میں توڑ دوں گی یار۔" زبیر کی بات کے جواب میں ندی کی بات پر وہ تینوں ہل کر ہنسنے لگے تھے۔ خود شاہ زین کے ہونٹوں پر اب تک مسکراہٹ تیر رہی تھی اور شاید پنک لباس پر نظریں جمائے وہ یونہی دیر تک خیالوں میں ہی مسکراتا رہتا اگر اسی وقت باؤ کمرے میں داخل نہ ہوتا۔

"السلام علیکم شاہ زین صاحب!"

"وعلیکم السلام۔"

باؤ کی آواز پر شاہ زین نے چونکتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر ان تمام باتوں کے محض خیال ہونے پر ایک بار پھر افسردہ سا ہونے لگا۔

باؤ نہ صرف اس دفتر میں چپڑاسی کا کام کرتا تھا بلکہ رہتا بھی نزدیکی گاؤں میں تھا۔ شادی کو آٹھ سال گزر جانے کے باوجود چونکہ ابھی تک اولاد سے محروم تھا سو اس کی بیوی اکثر اوقات فیکٹری کے نزدیک تعمیر کیے گئے رہائشی علاقے میں مختلف گھروں میں بوقتِ ضرورت بلانے پر اُن کے کام کرنے چلی آتی۔

شاہ زین کے گھر منعقدہ میلاد میں اتفاقیہ آمد کے بعد تو ثمینہ اور اماں کے اخلاق نے اس کے دل میں ایسا گھر کیا کہ اُس دن بھی تمام کام ختم کروا کر گئی اور اس کے بعد بھی اکثر اوقات بن بلائے ان کے گھر آنے لگی۔

اسی وجہ سے باؤ بھی دوسروں کی نسبت شاہ زین کے ساتھ اس کی پوسٹ ذہن میں رکھتے ہوئے تھوڑا بہت ایزی ہو کر بات کیا کرتا۔

"شاہ زین صاحب! خیر تو ہے؟ کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہیں؟"

"ارے نہیں نہیں، بتاؤ کیا بات ہے؟"

"وہ دراصل یہ پیپر پر سائن کروانا ہے۔"

باؤ نے آگے بڑھ کر ایک پیپر ٹیبل پر اس کے سامنے رکھا جس میں فیکٹری کے ایم ڈی کے ساتھ کل ہونے والی پہلی میٹنگ کا ٹائم وغیرہ درج تھا۔

شاہ زین نے کل کا ٹائم سامنے رکھی اپنی ڈائری میں نوٹ کرنے کے بعد اُس پر سائن کیا اور باؤ کی طرف واپس بڑھا دیا۔

"سر آپ پہلے کبھی ملے ہیں اُن سے؟ یا آپ کی پہلی میٹنگ ہوگی؟"

"نہیں پہلے تو آج تک ایسا اتفاق نہیں ہوا، کل فرسٹ ہی ملاقات ہوگی۔"

شاہ زین نے پین بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں، میں تو بس ویسے ہی۔۔۔"

شاہ زین نے خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مزید کوئی بھی سوال کرنے سے گریز کیا۔

وہ ضرور کچھ کہنا چاہتا ہے، اتنا تو شاہ زین کو اندازا ہو گیا تھا لیکن وہ کسی بھی قسم کا اصرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

باؤ نے شاہ زین سے پیپر لے کر اسے درمیان سے تہہ کیا اور لے کر مڑتے ہوئے پہلے تو دروازے تک گیا مگر کچھ سوچ کر پھر لوٹ آیا۔

"ہمارے گاؤں کے وڈیرے ہیں، اور یوں سمجھیں کہ ہم سب اُن کی رعایا۔"

شاہ زین نے مکمل توجہ اُس پر مرکوز کرتے ہوئے اسے بولنے کا موقع دیا۔

"ہیں تو بہت اچھے اور خدا ترس۔۔۔ فیکٹری میں بھی دیکھیں سارے ورکرز انہی کے گاؤں کے ہیں مگر۔۔۔"

باؤ کے چند لمحے رکنے پر اُس نے استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

"کیا اخبار میں آج کل شاہ سائیں کے متعلق کچھ خبریں آرہی ہیں؟"

"میری نظر سے تو کوئی ایسی خبر نہیں گزری، کیوں خبر آنا تھی کیا؟"

باؤ کے سوال پر آخر شاہ زین نے پوچھ لیا۔

"الیکشن ہونے والے ہیں نا سر! تو آج کل تو شاہ سائیں گاؤں میں ہیں، لیکن سنا ہے کہ شہر میں اُن کی زندگی کا انداز کچھ اور ہی ہے۔ میرا مطلب آپ سمجھ رہے ہیں نا۔"

"باؤ۔۔۔!"

شاہ زین کے انداز میں واضح تنبیہی اشارہ تھا۔

"آج کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ تم میرے سامنے اس قسم کی کوئی بھی بات کسی کے لیے بھی نہیں کرو گے، سمجھے نا۔"

"جی سر!" متوقع پذیرائی نہ ملنے پر باؤ جزبز سا نظر آنے لگا تھا۔

"اُن کی یا کسی کی بھی ذاتی زندگی میں گھسنے یا ٹوہ لگانے سے پہلے ہمیں اتنا ضرور سوچ لینا چاہیے کہ دوسروں کے گناہ گنتے رہنے سے کسی کو فرق پڑے نہ پڑے ہمارا دل ضرور مُردہ ہو جاتا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں سر! میں تو بس ویسے ہی۔"

"اٹس اوکے، جاؤ اب مجھے بھی کام کرنے دو۔"

"جی سر!"

شاہ زین باؤ کے خیال کے بالکل برعکس طبیعت کا مالک نکلا تھا اور یہ بات باؤ کو خوش کر گئی تھی۔ ورنہ باقی سارے لوگ اس کی ایک ایک بات کو دھیان سے سنتے اور خود اس سے اکثر معلومات لیتے بھی۔

شاہ زین کے اس ردِ عمل نے نہ صرف باؤ کے دل میں بہت سی جگہ بنا لی تھی بلکہ باؤ نے اسے حقیقتاً اپنا باس بھی مان لیا تھا۔

• اچھا اور سچا والا۔۔۔!

☆☆☆

بھنور کے ساتھ الجھتی ہوئی صدا کو سنا
پھر اس کے بعد ساعت ہی ساتھ چھوڑ گئی
تم ایک شخص کے جانے کے غم میں بیٹھے ہو
یہاں تو پوری جماعت ہی ساتھ چھوڑ گئی

ناصر بھائی کے اس قدر سخت اور دوٹوک رویہ اپنانے پر ندی نے وقتی طور پر یونیورسٹی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان کے غصے یا گھر واپس نہ آنے دینے کی دھمکی سے ڈر گئی تھی بلکہ صرف اس لیے کہ اس کے ساتھ اس کی ماں کی زندگی بھی مزید مشکلات میں گھر سکتی تھی اور یہ اسے کسی بھی طور گوارا نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر وہ انہیں اپنی ذات سے کوئی خوشی نہیں دے سکتی تو مزید کوئی دُکھ

دینے کا باعث بنے۔

ورنہ ناصر بھائی کی نیچر سے تو وہ بخوبی واقف تھی ہی۔ جانتی بھی کہ کسی شخص کے لیے اگر ان کے دل میں ایک بار غلط فہمی جگہ لے لے تو وہ دور ہونا پھر مشکل ہی نہیں بعض اوقات ناممکن بھی ہوتا ہے۔

لیکن زندگی اس طرح دو رویہ ٹریفک کی طرح گزارنا بھی تو بھلا کب ممکن تھا۔

دن رات عجیب جھنجلاہٹ میں گزر رہے تھے۔

شاہ زین تو ایک طرف صبا اور زبیر تک کے نمبرز اسے زبانی یاد نہیں تھے ورنہ اب تک وہ ان سے تو ہر حال میں رابطہ کر چکی ہوتی۔

عائشہ دوپہر کا کھانا اب اپنے کمرے میں کھانے لگی تھی اور اگر باہر کھاتی بھی تو کیا فرق پڑتا کہ امی نے تو خود کو محض بیڈروم تک ہی محدود کر لیا تھا۔

کچھ دنوں سے ندی چونکہ امی کے لیے خود روٹی بنانے لگی تھی سو آج بھی فریج سے آٹا نکال کر ماربل کی سلیب پر رکھتے ہی پرانے مگر سنہری دن چق کی اوٹ سے جھانکنے لگے۔

''ارے امی، اب روٹی کی سائیڈ چینج کر بھی لیں نا، ورنہ جل جائے گی۔''

عائشہ کے میکے جانے پر امی آج اس کے اور بابا کے لیے روٹی بنا رہی تھیں جبکہ وہ ان کے ساتھ ہی دھنیا کاٹ رہی تھی۔

امی اس کی بات پر مسکرائیں ضرور مگر روٹی کی سائیڈ تبدیل کرنے کے بجائے دوسری روٹی کے لیے پیڑا بنانے لگیں۔

''امی جل جائے گی۔۔۔ اسے دیکھیں نا۔''

ایک بار پھر اس کے توجہ دلانے پر انہوں نے ایک نظر توے پر موجود روٹی کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا کہہ کر روٹی بیلی اور چند لمحوں بعد توے پر سے روٹی کی سائیڈ بدل کر ہلکا سا صافی کی مدد سے دبایا اور نرم گرم روٹی توے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں منتقل کر دی۔

ندی خاموشی سے اُن کا یہ عمل دیکھے جا رہی تھی۔

اس امر سے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ تبھی پہلے سے بیلی گئی روٹی توے پر ڈالتے ہوئے بولیں۔

''اگر تمہارے کہنے پر میں روٹی کی سائیڈ پلٹتی تو اسے پکانے کے لیے مجھے صافی سے زیادہ دبانا پڑتا نتیجتاً روٹی سخت ہو جاتی اور اگر نہ دباتی تو جل جاتی جگہ جگہ سے کچی رہتی۔۔۔'' انہوں نے ایک نظر توے پر پڑی روٹی کو دیکھتے ہوئے مزید آٹا ہتھیلی پر لیا اور مسکرائیں۔

''میری جان! مجھ پر بھروسہ رکھو، میں تمہیں کبھی کچی، سخت یا جلی ہوئی روٹی نہیں کھلاؤں گی۔''

ان کی بات سمجھ کر اُس نے بھی مسکراتے ہوئے سَر ہلایا اور تازہ دھنیا ہنڈیا میں ڈالنے کے بعد چولہا بند کر دیا۔

شاید وہ یونہی سلیب پر ہاتھ رکھے جانے کب تک ماضی کے خوش گوار مناظر میں جھانکتی رہتی کہ لاؤنج میں رکھے فون کی بیل سے حال میں لوٹ آئی۔

آٹا وہیں رکھ کر سب سے پہلے گلاس میں پانی ڈالا اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئی۔ بجائے اس کے کہ پانی پیتی لاشعوری طور پر اس روٹی سے اپنی ذات کا موازنہ کرنے لگی۔

یقیناً کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بھی دل ہی دل میں بعض اوقات اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتی کہ اس کی قسمت کی سائیڈ بھی اب چینج ہونی چاہیے کہ حالات کی تپش کے باعث اس کے دل و دماغ پر بھی کرب و اذیت کے کئی پھول نما نشان بن چکے ہیں اور اگر اب بھی اس کی قسمت کی سائیڈ تبدیل نہ کی گئی تو اس کی روح بھی جل جائے گی۔ جھلس جائے گی اور شاید کسی کو خبر تک نہیں ہو گی۔۔۔

لیکن اس دن کی طرح آج بھی وہ شاید اپنی قسمت کی ظاہری سائیڈ ہی دیکھ رہی تھی توے کے ساتھ لگی روٹی کی پوشیدہ حالت سے نہ وہ تب واقف تھی نہ اپنی قسمت کے پوشیدہ اسرار سے آج!

جانتا ہے تو صرف اللہ، کہ وہ ہی عقلِ کُل اور بہترین جاننے والا ہے۔

کیونکہ یہ سب تو محض ندی کا انداز تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ ایسا ہے جب کہ اوپر والے کے پاس لامحدود علم ہے اور مکمل اختیار بھی۔ اگر وہ ہمارے کہنے پر ہماری قسمتوں کی سائیڈز بدلتا رہے تو کون جانتا ہے وہی بات بعد میں ہمارے لیے تکلیف کا باعث بن جائے اس لیے ہمیں ہمیشہ اس ذاتِ احد پر مکمل بھروسہ کرنا اور توکل رکھنا چاہیے کہ وہ نرم گرم روئی کی طرح ہمارے لیے سدا بہترین ہی منتخب کرے گا۔

اپنی ذات کی بھول بھلیوں سے وہ جلد از جلد باہر نکلنا چاہتی تھی مگر اس کے لیے سب سے پہلے اسے امی کو اعتماد میں لینا تھا۔ تبھی اس نے آج رات امی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

مجھے تم سے ہے نفرت اس وجہ سے
اسے تم سے محبت کیوں ہوئی ہے
نظر انداز کرنا پھر بھلانا
قیامت پر قیامت کیوں ہوئی ہے

اس دن ندی کی بات پر شاہ زین کا ردِ عمل میران کو بھلائے نہیں بھول رہا تھا ور بھلا بھولتا بھی کیسے جب ذہن بھلانے پر آمادہ ہی نہ ہو۔

دن رات اس کے ذہن میں اگر کوئی بات تھی تو وہ یہ کہ شاہ زین کو کسی طرح نیچا دکھایا جائے جو ہمیشہ اس کی ذات پر نئے زخم لگانے کا موجب بنتا ہے ایسے زخم جو آنکھوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے نہ تو دھیان کسی اور طرف ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی رسنا چھوڑتے ہیں۔

یوں بھی جو بھی شخص انتقام لینے کے طریقوں یا بدلا لینے پر غور کرتا ہے اس کے زخم کبھی نہیں بھرتے اور حقیقتاً میران کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں موجود شاہ زین ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اور کچھ نہ سوجھا تو گہرے میرون رنگ کی چھت کو چھوتی الماری سے اپنی کلاشنکوف نکال کر اسے مختلف زاویوں سے جانچنے اور پرکھنے لگا۔ انداز بالکل وہی تھا جو کسی نئے جانور کو خریدتے ہوئے ہوتا ہے۔

ہر جگہ، ہر رستے، ہر موڑ پر شاہ زین کا یوں اس کا راستہ کاٹنا میران کے ذہن میں جیسے کوئی الارم بجا بجا رہا تھا۔

حالانکہ اتنا تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کسی امیر کبیر گھرانے کا چشم و چراغ نہیں ہے اور شاید زیادہ غصہ بھی اسی بات پر تھا اسے کہ وہ میران جسے دیکھ کر گاؤں میں لوگوں کی گردنیں جھک جایا کرتی ہیں کھیتوں اور فصلوں میں کام کرنے والے لوگ اسے دیکھتے ہی اپنا کام چھوڑ کر ”سلام سائیں“ کہنے کو دوڑے چلے آتے ہیں اور پھر ایسا صرف گاؤں میں ہی نہیں تھا۔ شاہ سائیں کے سیاسی و سماجی اثر و رسوخ کے باعث گاؤں کے باہر بھی اُسے اسی انداز میں پروٹوکول ملتا۔

یوں بھی جب دائیں بائیں اسلحہ بردار باڈی گارڈز صرف حفاظت اور اپنا Status ظاہر کرنے کی غرض سے تعینات کیے گئے ہوں تو پروٹوکول خود بہ خود ملنے لگتا ہے سو اس تمام پسِ منظر میں شاہ زین کا اس کے سامنے گردن اٹھا کر بات کرنا تو ظاہر ہے میران کے لیے کسی بھی طور قابلِ قبول نہ تھا اور نہ صرف یہ بلکہ ندی کا بھی اس کو لفٹ نہ کرواتے ہوئے شاہ زین کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی خاطر میران کی بے عزتی کرنا، یہ سب میران کے اندر ایک ناسور کی صورت پل رہا تھا۔

اخبارات میں اچھلنے والا سارا قصہ اُس دن شاہ زین کو یونیورسٹی میں دوبارہ دیکھ کر اسے بے حد بے معنی اور معمولی محسوس ہونے لگا تھا کہ رسی جلنے کے باوجود بل کا ابھی تک اسی طرح برقرار رہنا اب اس کے لیے برداشت سے باہر تھا۔

”میران پتر!“

ملکانی سائیں نے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف دیکھ کر حیرت سے بلایا۔

”جی اماں سائیں! آپ یہاں؟“

پیشانی پر ابھرتی ناگواری کی سلوٹیں تو نظر آ ہی رہی تھیں مگر میران نے لہجے میں موجود روکھے پن کو بھی چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

”ہاں پُتر! شام کا وقت ہو گیا ہے پر تو باہر ہی نہیں نکلا، میکوں فکر ہو گئی تھی فر۔“

اس کے لہجے کی تلخی محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے وہ آگے بڑھیں۔ اسی لمحے معمولی سے کھلے دروازے سے خراماں خراماں چلتی سونی بھی اندر داخل ہوئی اور عین ملکانی سائیں کے قدموں کے ساتھ کھڑی ہو کر گہری سبز آنکھوں کو مکمل طور پر کھولنے کے ساتھ پوری توجہ میران کی انگلیوں کی جنبش پر مرکوز کر دی جو کلاشنکوف کے مختلف حصوں کو کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھا۔

”بس میرا دل نہیں کر رہا تھا اماں سائیں!“

اکتاہٹ جون کے سورج کی طرح عروج پر تھی مگر اس اکتاہٹ بھرے انداز پر بجائے اس کے کہ ملکانی سائیں کسی طرح کی خفگی کا اظہار کرتیں، بے چینی سے وہ تو تڑپ ہی اٹھیں۔

”ہائے او میریا ربا، کی ہویا، میکوں تے گش بتانا۔“

ملکانی سائیں نے دہل کر انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سینے پر رکھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

سونی کا ارتکاز البتہ ابھی تک قائم و دائم تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں اماں سائیں! کوئی خاص بات نہیں۔“

”خاص ہے یا نئیں، جو گش وی ہے تُو مجھے بتا۔“

میران کے معاملے میں وہ ایسی ہی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ اپنی پریشانی انہیں بتا نہیں دے گا وہ نہ صرف اسی طرح پریشان رہیں گی بلکہ بار بار اس سے پوچھتی بھی رہیں گی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔

کچھ دیر یونہی ظاہری طور پر کلاشنکوف میں مصروف رہنے مگر حقیقتاً لفظوں کو مناسب لبادہ پہناتے ہوئے آخر وہ بولا۔

”اماں سائیں! سادہ لفظوں میں سمجھاؤں تو یہ کہ ایرانی نسل کا ایک انتہائی خوب صورت گھوڑا خریدنا چاہتا ہوں مگر وہ اتنا اڑیل ہے کہ خریدنا تو دور اپنے جسم پر ہاتھ تک پھیرنے نہیں دیتا۔“

صاف اور سچ بات کرنے سے ملکانی سائیں شاید اسے نذین کی خواہ مخواہ مخالفت پر روکنے کی کوشش کرتیں، اسی خیال کے تحت اس نے لفظوں کو مثال کا پیرہن بنا کر ان کے گوش گزار کیا تھا۔

اور اس کی توقع کے عین مطابق اس کی بات سنتے ہی وہ ایک دم ریلیکس محسوس کرنے لگی تھیں۔

”او پتر وہ نہیں تے کوئی اور سہی، گھوڑا تے فیر گھوڑا ہوتا ہے نا۔“

”نہیں اماں سائیں! ہر گھوڑا اُس جیسا نہیں ہو سکتا۔“ از راہ تفنن اس نے کلاشنکوف سے سونی کا نشانہ لیا۔

جس پر کتنی ہی دیر سے ایک انداز میں میران کو دیکھتی سونی کمزور سی آواز میں میاؤں کرتے ہوئے ملکانی سائیں کے دونوں پیروں کے درمیان جا بیٹھی۔

”اور اُسے تو میں خرید کر ہی رہوں گا۔“

ملکانی سائیں نے کلاشنکوف پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا اور اس کے لہجے کی مضبوطی دیکھ کر بولیں۔

”اگر پتر ایسا ہے تو فیر اس کا اک طریقہ ہے۔“

”کون سا طریقہ اماں سائیں؟“

”پُتر یہ جو جانور ہوتے ہیں نا، دیکھنے اچ سب اِک جیسے لگتے ہیں پر ان کے وی خاندان ہوتے ہیں، جیسے میں تیرے بغیر نئیں ناں رہ سکدی، ایسی طرح ایہہ جانور وی اپنی ماں یا ماں اپنے بچے سے دور نئیں رہتی وپار (بیوپار) کرنے والے وکھرا وکھرا (الگ الگ) بیچ تو دیتے ہیں پر جو جانور ذرا اڑی (ضد) کرتا ہے نا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی بچہ ہے فیر اسے ماں کے ساتھ خریدنا پڑتا ہے۔“

ملکانی سائیں نے اسے جو مشورہ دیا تھا وہ تو یقینی طور پر جانوروں کی نفسیات کے حوالے سے تھا مگر میران کے دل کو لگا تھا۔

خود ہم انسان بھی تو خاندان کی اکائی کی خاطر کتنے ہی ایسے کام کر جاتے ہیں جو اگر تنہا ہوتے تو شاید کبھی نہ کرتے۔

واقعی شاید ان رشتوں میں اتنی کشش ہوتی ہے جو انسان کو کچھ بھی کرواسکتی ہیں۔ خود سے جڑے ان رشتوں کے چہرے پر ایک آسودہ اور بھرپور مسکراہٹ کی خاطر جب انسان انتہائی قدم بھی اٹھانے پر مجبور ہوجاتا ہے تو پھر ایسے میں یقیناً یہ گر کاری گر ہوسکتا تھا۔

''بالکل اماں سائیں! آپ نے سچ کہا کہ جو جانور اڑیل ہو، اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی بچہ ہے۔۔۔ اور پھر اسے ماں کے ساتھ خریدنا پڑتا ہے۔''

ملکانی کے قدموں میں بیٹھی سونی کو میران نے جھک کر اٹھایا، کلاشنکوف بیڈ پر رکھی اور اس کے نرم بالوں بھرے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''میں بھی اس گھوڑے کو اب ماں کے ساتھ ہی خریدوں گا۔''

سگریٹ سے سیاہ پڑتے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ رینگی تھی۔

ملکانی سائیں نے بھی سکھ کا سانس لیتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو سونی جس کے لیے میران کا لمس کوئی بہت زیادہ مانوس نہ تھا، امداد طلب نظروں سے ملکانی سائیں کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

یہ بار فلک ہم نے زمیں پر نہیں رکھا
تھک کر کسی کاندھے پہ کبھی سر نہیں رکھا
کیوں ٹھوکریں لگتی ہیں کہ جب ہم نے کبھی بھی
رستے میں کسی کے کوئی پتھر نہیں رکھا

دن بھر کی تھکا دینے والی روٹین کے بعد نبیل کے ساتھ چہل قدمی کے دوران گپ شپ کرنے کے بعد اب وہ اپنے کمرے میں تھا اور ایک دوست کا نمبر ڈھونڈنے کے لیے بیڈ سے ٹیک لگا کر اپنا سیل فون ہاتھ میں لیے کونٹیکٹ لسٹ کھنگال رہا تھا جب اچانک ندی کا نمبر سامنے آنے پر موبائل کی اسکرین کو اوپر کی طرف پر مس کرتی انگلی وہیں تھم کے رہ گئی۔

ندی کا یہ نمبر اس دفعہ ہی لے کر اس نے save کیا تھا اور نہ اس سے پہلے اس کے پاس نہ تو اس کا کوئی نمبر تھا اور نہ ہی کبھی خیال آیا تھا۔

اب جو اس کا نام اور نمبر سامنے دیکھا تو بے اختیار اس کا تروتازہ سرخ و سفید چہرہ ذہن میں ابھرا تو ضرور۔۔۔ مگر صرف لمحہ بھر کے لیے، کیونکہ فوراً ہی ذہن کے پردے پر اس کا وہ روپ اتر آیا جو یقینی طور پر اس سے متضاد تھا۔ کانچ سی شفاف آنکھوں میں ڈیرے ڈال کر بیٹھی ویرانی، آنکھوں تلے سیاہ رنگ کے حلقے جو چہرے کی رنگت سے سرخی غائب ہوجانے کے باعث محض بے رونق سفیدی پر مزید نمایاں لگتے اور سفیدی بھی ایسی جس میں ندی کے بات کرنے کے دوران اکثر زردی کی آمیزش کا بھی شک گزرنے لگتا۔

وہ ندی جس کی خوش لباسی پر لڑکیاں رشک کیا کرتی تھیں اب تین تین دن کپڑے بدلنے کا بھی خیال نہ آتا۔

ننھی سی ستواں ناک میں موجود زرقون کی لونگ پن ہی وہ واحد چیز تھی جو اس کے چہرے پر اب تک اپنی چمک برقرار رکھے ہوئے تھی ورنہ جہاں چہرے کی چمک پھیکی پڑ چکی تھی وہیں آنکھوں کی پراعتماد روشنی بھی اب ماند تھی۔

اور اسی بات کا اکمل کو دلی دکھ تھا کیونکہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ ندی اس جرم کی سزا کاٹ رہی ہے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ قسمت کی ستم ظریفی تھی یا حالات کی سازش کہ جس کے باعث اسے قرض ہمعہ سود کے ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا گیا تھا جو اس نے کبھی لیا ہی نہیں تھا اور یہی بات وہ مکمل تفصیل کے ساتھ عائشہ کو بھی سمجھا چکا تھا مگر وہ اکمل کی کسی بھی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ ہوئی۔

آتے ہوئے بھی وہ ندی سے ملاقات نہیں کرپایا تھا سو اب نمبر سامنے آنے پر فون پر بنے گہرے سبز

نشان پر انگوٹھے کا ہلکا سا وزن بڑھاتے ہوئے اس سے بات کرنا چاہی۔ ایک، دو، تین۔۔۔ اور پھر کئی بیلز جانے کے بعد بھی فون ریسیو نہیں ہوا تھا جو کہ یقیناً اس کے لیے ایک تشویش ناک بات تھی جبھی اس نے کونٹیکٹ لسٹ میں سے عائشہ کا لینڈ لائن نمبر نکال کر ایک بار پھر فون ملا دیا جسے ناصر بھائی کے لیے چائے بنانے کے لیے کچن میں جاتی عائشہ نے دوسری ہی بیل پر اٹھالیا۔

''ہیلو۔۔''

کانوں کو مکمل طور پر چوکنا اور جسم کے ہر حصے کو کان بننے کا حکم دیتے ہوئے عائشہ نے آواز پہچاننے کی غرض سے ریسیور کان کے ساتھ دباتے جواب کا انتظار کیا مگر اس وقت مایوسی ہوئی جب ایئر پیس سے ابھرنے والی آواز اپنے ہی بھائی کی معلوم ہوئی۔

''السلام علیکم۔''

''اوہ۔۔۔ وعلیکم السلام۔۔۔ اکمل تم؟''

اکمل کی اس وقت کال چونکہ غیر متوقع تھی اس لیے لمحہ بھر میں یہ فیصلہ کرنا دماغ کے لیے ذرا مشکل تھا کہ جواب میں خوشی کا اظہار ہو یا کہ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آواز میں موجود بےزاریت کا عنصر فطری تھا۔

''کیا کسی اور کی کال کا انتظار تھا آپ کو؟''

''ارے نہیں نہیں۔۔۔ بس ویسے ہی، تم سناؤ کیا حال چال ہے؟''

''بس سب ٹھیک ٹھاک۔''

''دراصل ابھی کل ہی تو تم سے بات ہوئی تھی نا، اس لیے آج پھر تمہارا فون سن کر ذرا حیرت ہوئی۔''

انہیں اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اکمل تک اس وقت آواز کی بیزاریت پہنچ چکی ہے جبھی خوامخواہ صفائی دینے لگیں۔

''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھے ضرور گیپ دے کر بات کرنی چاہیے ورنہ تو شاید آپ میرا فون بھی ریسیو نہ کریں روز روز۔''

''اچھا زیادہ فضول باتیں نہ کرو، سمجھے۔''

''جی جی بالکل سمجھ گیا اور آپ سنائیں گھر میں سب کیسے ہیں؟''

''ویسے ہی ہیں اور ویسے ہی رہیں گے۔'' لاپروائی سے کریڈل پر سے انگلیوں کی مدد سے ہلکی ہلکی گرد صاف کرتے ہوئے وہ بولیں۔

''اور ندی۔۔۔؟''

''اُسے کیا ہونا ہے؟ ہونہہ، جو ہونا تھا اس سے جڑے سب رشتوں کو ہونا ہے، بس عجیب منحوس لڑکی ہے۔۔۔ میں تو کہتی ہوں۔۔۔''

''میں نے خاص طور پر ندی سے بات کرنے کے لیے ہی ابھی فون کیا تھا۔''

اکمل نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے ناپسندیدگی ظاہر کی، مگر اس کا جواب سنتے ہی عائشہ کی پیشانی کے بل ایک دم بڑھ گئے تھے۔

''وجہ پوچھ سکتی ہوں، خاص طور پر بات کرنے کی۔''

عائشہ کے لہجے میں لفظوں سے کہیں زیادہ طنز اور کڑواہٹ موجود تھی۔

''موبائل سے تو وہ فون ریسیو نہیں کررہی تھی، سوچا اسی نمبر سے شاید بات ہوجائے۔''

''اوہ۔۔۔ تو تم پہلے موبائل پر کرتے رہے ہو کوشش، لیکن آخر بات کیا کرنی ہے پتا تو چلے۔''

''میں آپ کو کوئی بھی بات بتانے کا پابند نہیں ہوں آپی!''

''ہوں، تو پھر میں بھی تمہاری بات کروانے کی پابند نہیں ہوں چھوٹے بھائی۔''

عائشہ کا مسکراتا لہجہ اکمل کو گیلی لکڑی کی طرح سلگا گیا تھا ان سے اس قسم کے رویے کی امید اسے ہرگز نہیں تھی۔

''آپی۔۔۔! آپ یہ سب ٹھیک نہیں کررہی ہیں۔''

''اور تم جو یہاں پر ''ماں کی سوکن کی بیٹی کی سہیلی'' والا معاملہ کررہے ہو وہ تو بالکل ٹھیک ہے، ہے نا!''

''آپ نے پہلے ندی کے بارے میں میری کی گئی کسی بات پر یقین ہی کب کیا ہے جو آپ سے کچھ

کہوں، مجھے لگتا ہے اب آپ میری بہن تو رہی نہیں ہیں صرف ندی کی بھابھی ہی بن کر رہ گئی ہیں آپ تو۔۔۔"

"دیکھو اکمل! اگر تو تمہارا اس سے بات کرنے کا مقصد محض ہمدردی ہے تو ٹھیک ہے، مجھے تمہاری بات کروانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن یاد رکھنا کہ اب تم دونوں کے درمیان کا تعلق رشتہ داری سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"عجیب نفسیاتی پرابلم ہے آپی کے ساتھ بھی۔" زیرلب کہتے ہوئے اس نے بغیر اللہ حافظ کہے رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج کل کے جدید دور میں بھی وہ ندی سے بات کرنے کی صرف حسرت ہی کر سکتا ہے۔ موبائل فون جو کچھ دیر پہلے تک تو کالز ریسیو کرنے بیل کی صورت میں ایک یہ احساس تو کم از کم دلا رہا تھا کہ اگر ابھی نہیں تو کیا ہوا جب بھی ندی فون دیکھے گی اتنا تو ضرور جان لے گی کہ وہ اسے فون کرتا رہا ہے۔ مگر اب دوبارہ موبائل نمبر ملانے پر پاور آف کا پیغام سننے کو ملا۔

یعنی اس نے اکمل کی طرف سے رابطہ کرنے کی کوشش کو مس کالز کی صورت میں موبائل پر دیکھا تو ضرور مگر کال بیک نہیں کی۔

کیا وہ اس حد تک فرسٹریٹڈ ہے کہ اپنا دکھ بھی شیئر کرنا نہیں چاہا؟

اکمل نے ندی سے بات کرنے کے ہر ذریعے پر غور کرنے کے بعد ناکامی ہونے پر موبائل بیڈ پر پٹخ دیا۔

☆☆☆

یوں بکھرنے سے بچا لے میرے مالک مجھ کو
ہاتھ جو پھر سے سمیٹیں گے اب کمزور ہوئے

گرمیوں کی تمازت بھری دوپہریں تو بالآخر رخصت ہو چکی تھیں اور اب ہلکی پھلکی ٹھنڈک کسی نازک اندام حسینہ کی طرح دبے پاؤں چلتے ہوئے موسم کی چک پھیری میں بس داخل ہونا ہی چاہتی تھی۔

رات کا کھانا امی کے ساتھ کھانے کے بعد ندی کچن میں برتن وغیرہ رکھ کے لوٹی تو وہ اپنے روزمرہ کے وظائف کی ادائیگی کے لیے عشا کی نماز ادا کرنا شروع کر چکی تھیں۔ جب تک بابا حیات تھے وہ وقت پر سے نماز عشا ادا کرنے کی عادی تھیں مگر اب چونکہ ان کے وظائف کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی اس لیے کھانے کے بعد اوائل میسر وقت میں وہ اللہ کے حضور حاضر ہو جایا کرتیں۔ اس دوران ندی بھی تو اُن کے ساتھ ہی نماز پڑھتی مگر کبھی لان میں یونہی بے مقصد گھومتے ہوئے اپنی زندگی میں آنے والے نشیب کے بارے میں سوچا کرتی۔

اس لان سے اس کی اور بابا سمیت تمام گھر والوں کی بے تحاشا یادیں وابستہ تھیں۔ اکثر یونیورسٹی سے واپسی پر اُسے امی، بابا اور عائشہ یہیں بیٹھے ملا کرتے اور اس کے گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی عائشہ فوراً اس کے لیے فریج سے جوس لانے کو اندر کی طرف رخ کرتی۔

مگر اب تو وہ قہقہے، وہ مسکراہٹیں حتیٰ کہ مل بیٹھنا بھی اک خواب سا محسوس ہوتا۔ ندی نے ایک نظر جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ رب تعالیٰ کے حضور جھکی ماں کو دیکھا اور پھر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولنے کے بعد ڈوری کی مدد سے باریک جالی کو نیچے کر کے مچھروں کے اندر نہ آنے کی یقین دہانی کرتے ہوئے امی کی نماز ختم ہونے کے انتظار میں عین کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر کا مشاہدہ کرنے لگی۔ جہاں اندھیری رات سیاہ چادر اوڑھے پُرسہ دیتی معلوم ہو رہی تھی۔ پہلی مرتبہ نہ جانے کیوں اسے لان کا منظر انتہائی پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

آسٹریلین توتوں کا پنجرہ کیونکہ اب شام ہوتے ہی وہ اپنے کمرے میں لے آتی تھی اس لیے ان کی جگہ بھی خالی معلوم ہوئی۔ اتنے پھول پودوں کے ایک ساتھ ہونے کے باوجود اسے ایک ایک چیز تنہا لگ رہی تھی۔

چپ چاپ، خاموش اور افسردہ!

وہ جانتی تھی ان پھول، پودوں سے بابا کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ خود امی صبح سویرے موتیا اور چنبیلی کے پھولوں کو لان سے اکٹھا کر کے اپنے کمرے اور ڈرائنگ روم میں موجود انتہائی نفیس گلاس پاٹ میں رکھا کرتیں۔

شفاف پانی میں تیرتے پھولوں والے اس گلاس پاٹ کی بدولت آج تک انہیں روم فریشنر کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

رخ موڑ کر اس نے کمرے کے داخلی دروازے کے بالکل ساتھ رکھی شوکیس بورڈ کے اوپر موجود گلاس پاٹ کو خالی دیکھا تو جیسے دل پھر سے جکڑ گیا۔ اسی دل گرفتگی کے عالم میں گلاس پاٹ سے نظر ہٹا کر امی کو دیکھا جو کتنی ہی دیر سے سجدے میں تھیں۔

یوں بھی بیٹیاں جوان ہو جائیں تو ماں باپ کے سجدوں کی طوالت روز بروز بڑھنے لگتی ہے۔ ماں کی دعا کے بنا روک ٹوک کے اول آسمان تک رسائی ہونے کے یقین کے باوجود اٹھتے بیٹھتے وہی دعا مانگنا فرائض کے قریب تر لگنے لگتا ہے۔

بیٹیوں کے نصیب کا خوف اکثر اوقات والدین کو وقت سے پہلے بوڑھا کرنے لگتا ہے اور یہاں تو پھر معاملہ ہی مختلف تھا۔

ندی کو اچانک محسوس ہوا جیسے امی سجدہ کرنے کے دوران شاید لرزہ کی کیفیت میں ہیں۔ بجلی کی سی رفتار کے ساتھ وہ ان کی جانب کو ندی اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنا ان کے قریب ہونا ظاہر کیا تو لرزہ آہستہ آہستہ ہچکیوں میں بدل کر آخر کار سانس کے متوازن عمل کا حصہ بدلنے لگا۔

ندی کا یوں بھاگ کر ان کے قریب آنا ایک فطری مگر بے ساختہ عمل تھا، ورنہ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھی کہ اس وقت وہ جس اعلا ہستی سے مخاطب تھیں وہاں لفظوں سے کہیں زیادہ لپٹے آنسوؤں کی وقعت خیال کی جاتی ہے۔ جہاں کسی کے سچے دل سے نکلا صرف ایک آنسو نصیب کی اول و آخر کی تمام سیاہی مٹا دینے پر اسی طرح قادر ہوتا ہے جس طرح سیپ کے منہ میں جانے والا محض ایک قطرہ، جو پل بھر میں سیپ کو گہر کی حفاظت سونپ کر اسے انمول بنا دیا کرتا ہے۔

سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے سرخ آنکھوں سے ندی کو دیکھتے ہوئے فوراً اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس کا نصیب اچھا ہونے کی دعا دی تھی۔

اندھیری رات میں دور سے جھینگروں کے چلانے کے یا نہیں شاید رونے کی بڑی بے درد آوازیں آ رہی تھیں۔ ٹکر ٹکر اندھیرا کھلی کھڑکی سے اندر جھانکتا ماں بیٹی کو یوں زمین پر بچھے کارپٹ کے اوپر جائے نماز پر بیٹھا دیکھ کر ست روی سے پلکیں جھپکتا معلوم ہو رہا تھا۔ ان کے لان کے عین سامنے موجود لان میں لگا بڑ کا درخت دور سے ایک عمر رسیدہ جن کی طرح قد آور معلوم ہو رہا تھا۔ جس کا جسم تو ندی کے اپنے لان میں موجود درختوں کی وجہ سے مخفی تھا مگر اوپری حصہ قدرے فربہ مگر پراسرار لگ رہا تھا اور امکان غالب تھا کہ اگر ندی کے گھر کے تمام شیشوں والے دروازے اور کھڑکیاں بند نہ ہوتے تو وہ اندر بھی چلا آتا۔

"تم نے نماز پڑھ لی؟"

امی جائے نماز سے اٹھیں تو ندی کو جائے نماز تہہ کرتے دیکھ کر استفسار کیا۔

"نہیں۔۔۔" ندی نے ایک گہری سانس لے کر جائے نماز بک ریک کے سب سے نیچے والے خانے میں رکھی اور ست روی سے چلتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

امی کی سوالیہ نظریں البتہ ابھی تک اس کے مکمل جواب کے تعاقب میں تھیں۔

"پڑھ لوں گی تھوڑی دیر میں۔" نظریں چراتے ہوئے ندی نے جواب دیا تو امی گہری سانس لے کر سبز رنگ کے موتی دانوں سے بھرا چھوٹا سا باؤل لے کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

یہ موتی دانے ایک ایسے پودے سے حاصل کیے

گئے تھے جو اپنی ذات میں آپ ایک معجزہ تھا۔ دراصل یہ موتی اُس پودے پر پھولوں کی طرح اُگا کرتے تھے اور جب یہ موتی پودے پر اپنا جوبن دکھا لیتے تو انہیں ایک رات کے لیے کھلے آسمان میں شبنم تلے رکھا جاتا۔ رات کے اوقات میں پڑنے والی اوس یا علی الصبح پڑنے والی شبنم سے یہ موتی مختلف رنگ اپنا لیتے۔ سرخ تو کوئی نیلا، سبز تو کوئی سفید۔

یہی نہیں بلکہ یہ موتی عام طور پر آرٹیفیشل زیورات میں استعمال ہوتے موتیوں ہی کی ساخت کے ہوتے جن کے دونوں اطراف حیرت انگیز طور پر سوراخ بھی ہوتا۔ جس میں دھاگہ ڈالنے کے بعد ننانوے، ننانوے موتیوں کی تسبیح بنا کر امی اب تک بے شمار لوگوں کو تحفتاً بھی دے چکی تھیں۔ انہی موتیوں کی نسبت سے اس پودے کا نام ''تسبیح دانہ'' مشہور تھا اور یہ پودا ناصر بھائی کے ایک دوست نے انہیں خصوصاً سیالکوٹ سے اس لیے منگوا کر دیا تھا کہ وہ اس پودے کی ان تمام خصوصیات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔

''پتا ہے نا امی! بابا کو تسبیح دانے سے کتنا پیار تھا۔'' ہتھیلی پر تسبیح دانے سے حاصل کیے گئے موتیوں کو یہاں سے وہاں لڑھکاتے ہوئے ندی نے کہا تو سوئی کے ذریعے ریشم کی تار میں ان موتیوں کو پروتی امی کے ہاتھ رک گئے۔ انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے ناک سے سلپ ہوتی عینک کو ٹھیک کیا اور بولیں۔

''ہاں۔۔۔ وہ کہتے تھے ساری رات یہ موتی کسی ظاہری پردے کے بغیر آسمان تلے پڑے اس پیدا کرنے والے کا نام اس خلوص سے لیتے ہیں کہ صبح تک ان کے اپنے رنگ پر ذکر کا رنگ غالب آجاتا ہے۔'' بابا کی بات کرتے کرتے امی کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے زندگی سے بھرپور لگنے لگی تھیں۔ مگر۔۔۔ لمحہ گزرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

ایک بار پھر آنکھوں سے ہٹتی عینک کی ڈنڈی پکڑ کر انہوں نے درست کیا۔

یوں بھی امی اب کمزور ہو چکی تھیں۔ اس لیے جتنے بھی فریم تھے وہ بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

''آپ بھی تو پیدا کرنے والے کا نام اسی خلوص سے لیتی ہیں امی! پھر آپ کی قسمت کے رنگ پر اس کے ذکر کا رنگ غالب کیوں نہیں آتا؟''

''اس لیے کہ میرے کیے ذکر میں خلوص نہیں ہے بیٹا! غرض چھپی ہے۔'' ندی نے اپنی بڑی بڑی کانچ سی آنکھیں پھیلا کر یوں دیکھا گویا ان کے منہ سے یہ بات اچانک ہی نکل گئی ہو۔ مگر ہاتھ میں سوئی پکڑے وہ ابھی تک اپنی کی گئی بات پر قائم تھیں۔

''یہ ذکر اذکار، یہ نوافل یہ سب تو میں اپنے مطلب کے لیے کر رہی ہوں نا، اپنی غرض پوری کرنے کے لیے، اپنی شہزادیوں سی بیٹی کا نصیب جگانے کے لیے۔۔۔'' لمحہ بھر رک کر انہوں نے دونوں ہونٹوں کو اوپر تلے دبا کر شاید خود کو کمپوز کرنا چاہا تھا۔

''خلوص ہوتا تو یہ ذکر اذکار، نوافل، عبادات تو تب کرنے چاہیے تھے نا جب گھر میں خوشیوں کا بسیرا تھا اور زندگی مکمل سے بھی بڑھ کر بھرپور اور آسودہ معلوم ہوتی تھی۔''

''لیکن امی۔۔۔! آپ تو تب بھی ہمیشہ پانچ وقت کی نمازی تھیں۔''

ندی کو لگا جیسے ان کے لفظوں میں پچھتاوے کی باس شامل ہونے کو ہے اسی لیے دفاع کے انداز میں انہیں یاد دلایا تو وہ اس کی بات پر مسکرا دیں۔

''پانچ وقت نماز تو ادا کرنی ہی ہے نا، کیونکہ پرچے کا پہلا اور لازمی سوال جو ٹھہرا اگر فرائض ادا کیے تو کیا احسان کیا۔ بات تو تب ہے جب مشکور ہو کر کچھ کیا جائے، ورنہ سچ کہوں تو بیٹا۔۔۔! زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ اب ہماری اکثر عبادات بھی ہماری مطلب پرستی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ لیکن چلو پھر بھی لوگ خوش قسمت ہیں کہ جنہیں پریشانی میں اللہ کو یاد کرنے اور اس سے مانگنے کی سدھ رہتی ہے ورنہ تو مصیبت کے ایام بھی لوگ ہائے اور کاش کے سہارے ہی وقت کاٹ کر پھر موردِ الزام قسمت کو ہی ٹھہراتے۔'' امی کی

بات پر ندی کو اپنا آپ شرمندگی کی عمیق گہرائیوں کی جانب کھنچتا محسوس ہوا تھا۔

''کیا آپ ان ڈائریکٹ لی مجھ سے مخاطب ہیں؟''

''ارے پاگل، وہ بیٹیاں ہی تو ہوتی ہیں جن سے مائیں ہر بات بالکل ڈائریکٹ کر لیتی ہیں۔'' دھیما سا مسکرانے کے بعد وہ موتی اور سوئی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ان کی مسکراہٹ پر ندی کا دل خود کو پلیٹ میں خربوزے کے چھلکوں کی طرح بے وقعت لگنے لگا تھا۔

سر جھکا کر موتی پرونے کے عمل میں بار بار نیچے کی جانب پھسلتی عینک اور پھر اُسے دوبارہ ناک پر جماتی امی۔۔۔ جو بابا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد فالتو سامان کی طرح گھر کے ایک کونے (جسے اُن کے بیڈروم کا نام دیا گیا ہے) میں پڑی تھیں۔ اسی ایک کونے میں انہیں وقتِ مقررہ پر کھانا بھی مل جاتا اور قیدیوں کی طرح ملاقات کے لیے اکثر ناصر بھائی بھی رات کے وقت اُن کے پاس آ کر رسمی کارروائی نبھا جاتے۔

ندی کا اس وقت بے ساختہ دل چاہا تھا کہ وہ امی کو لے کر اس گھر سے کہیں دور بہت دور ایسی جگہ چلی جائے جہاں کسی کو اُن کا دل دکھانے تو دور اُن کی کسی بات سے اختلاف بھی کرنے کی جرأت نہ ہو۔

لیکن کیلینڈر کی چپ چاپ دم سادھے مگر پر اسرار ہندسے گواہ ہیں کہ عورت ہمیشہ سے وہ سب کب کر پائی ہے جو اس کا دل چاہتا ہے۔ حالات سدا سے اس کے پاؤں میں رشتوں کی ایسی پائل پہنائے رکھتے ہیں جس کے اول و آخر جھوٹے گھنگھرو قدم اٹھاتے ہی دل کی مخالفت پر ایسا دیوانہ وار رقص کرتے ہیں کہ محض معمولی سی داد، رشتوں کی ذرا سی تحسین کی خاطر اسی رقص میں کب زندگی کی شام ہونے لگتی ہے، خیال ہی نہیں آتا۔

دل نے کب، کیا خواہش کی تھی، چیونٹی کی طرح بار بار حوض میں کب گرا تھا۔۔۔ یاد ہی نہ رہتا، اور بس۔۔۔ زندگی گزر جاتی۔

یہی رشتے ہی تو ندی کے پاؤں کی بھی زنجیر بن گئے تھے ورنہ اب تک تو جانے کیا کر چکی ہوتی اور پھر جب بات امی کی بے قدری کی ہو تو۔۔۔

ظاہری آنکھ سے دیکھا جاتا تو ندی اور امی ایک طرف اور باقی سب دوسری طرف ٹرین کی لائنوں کی طرح متوازی اور ایک ساتھ نظر تو ضرور آتے تھے مگر یہ بات بھی سب ہی جانتے تھے کہ اب افق پر جا کر بھی ٹرین کی ان دو لائنوں یا دریا کے دو کناروں میں کسی بھی قسم کے ملاپ کے امکانات نہ تھے۔

ندی کو ایک بار پھر اپنا دل بھیگی ہوئی روئی کی طرح بوجھل محسوس ہوا۔

اُسی پل امی نے سر اٹھا کر اس کے ستے ہوئے چہرے پر بے بسی عصر کی دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی پائی اور ان کے دیکھنے کی دیر تھی کہ ندی کے آنکھوں کے دیے کچھ اس انداز میں جگمگائے جیسے اُن میں تیل کے بجائے بارش کی پہلی بوندیں گر رہی ہوں اور انہی بوندوں سے پل بھر میں خود امی کا دل بھی بھیگنے لگا مگر جل تھل کا یہ سماں آنکھوں کے رستے ظاہر ہونے کے بجائے حلق ہی میں پھندے کی صورت رک گیا اور سوئی باؤل میں رکھ کر انہوں نے ندی کو جو گلے لگایا تو وہ جیسے ان سے لپٹ ہی گئی کہ اس وقت وہ خود ان کے گلے لگنا چاہتی تھی۔

''ندی بیٹا! ایک بات پوچھوں؟''

چند لمحے اس کے ریشمی بالوں کو اپنی بوڑھی انگلیوں سے سلجھانے کے بعد انہوں نے ندی کو مخاطب کیا جو ان سے یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے ذرا سی گرفت ڈھیلی ہونے پر وہ اُس سے کہیں دور چلی جائیں گی۔

''دیکھو بیٹا۔۔۔!''

اُس کے اثبات میں سر ہلانے کے بعد انہوں نے اپنی بات شروع کی۔

''اگر تو یہ تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں تو پھر پریشان ہونے کی کیا ضرورت؟ اور اگر مسائل جوں کے توں ہی رہیں گے تو پھر پریشان ہونے کا کیا

فائدہ؟"

"امی کیا اب زندگی اسی طرح گزرے گی؟"

اب کی بار وہ ان سے الگ ہوئی تھی۔

"ہرگز نہیں میری جان! اللہ سے بہتری کی امید رکھو وہ ہمیشہ انسان کو آنے والے کل کی صورت میں زندگی بہتر سے بہترین بنانے کے لیے موقع ضرور دیتا ہے۔"

"لیکن مجھے بتائیں گھر سے باہر میں نہیں جاسکتی، موبائل میرے پاس نہیں ہے، لیپ ٹاپ سے انٹرنیٹ کا کنکشن تک ہٹا دیا گیا ہے، اتنی شدید نفرت اور اتنے انتہائی اقدام۔۔۔ آخر میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟ اپنے ہی گھر میں قیدی بنا دیا ہے ناصر بھائی نے۔"

"انسان قیدی اس وقت نہیں بنتا جب اسے چار دیواری میں بند کر دیا جائے بلکہ اپنے اندر موجود بے اعتمادی کا وہ لمحہ اسے قیدی بناتا ہے جب وہ یہ سوچ لے کہ بس اب شاید زندگی اسی چار دیواری میں کٹے گی۔ جب اسے اپنے رب کی تدبیر پر اعتماد نہیں رہتا نا، اسی لمحے وہ قیدی بن جاتا ہے۔۔۔ تا حیات قیدی!"

"اگر میں کل سے پھر اُسی اعتماد کے ساتھ یونیورسٹی جاؤں تو۔۔۔؟"

"میری حمایت ہر صورت اور ہر وقت تمہارے ساتھ رہے گی، لیکن اگر تم مجھے ایک موقع دو تو۔۔۔"

"آپ کو موقع؟ مگر کس چیز کا؟"

"میں ایک بار ناصر سے بات کرنا چاہتی ہوں اگر وہ تمہارا یونیورسٹی جانا قبول کرتا ہے تو اس سے اچھی بھلا اور کیا بات ہوگی۔"

"اور اگر جو انہوں نے انکار کیا تو؟"

"مجھے امید ہے کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

یہ ان کی زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ جس نے انہیں ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جس کے دونوں طرف ان کی اپنی اولاد تھی اور وہ اس وقت سے حتی الامکان بچنا چاہتی تھیں جب انہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے۔

☆☆☆

اَسی کمی ویکھے تختاں تے
اَسی رلدے ویکھے شاہ
ساڈے زخماں اساں نال ضدی کیتی
ساڈی کمن نہ دیندے جاہ
کئی وار اندھیریاں رل مل کے
ساڈے گل وچ پایا پھاہ
اَسی رستے بن گئے جنگلاں دے
ساڈے سینے جم گئے گھاہ

ہالا کے محنتی کاریگروں کے ہنر مند ہاتھوں سے تیار کردہ شاہکار بیڈ پر ملکانی سائیں ٹانگوں پر کمبل ڈالے لیٹی چھت پر نقش و نگار کو خالی الذہن دیکھے جا رہی تھیں۔ اے سی کی رفتار موسم بدلنے کے باعث کم ضرور کی گئی تھی مگر ابھی تک مکمل بند نہیں کیے گئے تھے۔ شاہ سائیں آج شہر جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے اس لیے اُن کا میک اپ بھی قدرے ہلکا تھا۔ ورنہ تو وہ شاہ سائیں کی موجودگی میں ہاٹ ہاؤس کے اُس سفید گلاب کی مانند لگا کرتیں جو ہر قسم کے گرم و سرد سے بے نیاز صرف آرائش، سجاوٹ یا دکھاوے ہی کے لیے بنا تھا۔

حسب توقع شاہ سائیں الیکشن جیت چکے تھے مگر اس کے باوجود ملکانی سائیں کی زندگی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روپے پیسے اور زمین جائیداد کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر کا دکھ، بے یقینی اور آنے والے کل کا خوف کہیں تیزی سے اپنے حالیہ حجم سے آگے بڑھ رہے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ یہ دکھ محض ان کی ذات سے جڑا تھا۔ بلکہ شاہ سائیں کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا مگر یا تو وہ اس کو رب کی رضا سمجھ کر قبول کرنے کے بعد اب مطمئن تھے اور یا پھر ملکانی سائیں کے مزید پریشان ہونے کا سوچ کر ان سے اس موضوع پر بات کرنے سے گریز برتا کرتے جو کچھ بھی تھا مگر ملکانی سائیں چاہتی تھیں کہ ان کے اندر پکنے والے دکھوں کا یہ لاوا اب کسی طور باہر نکلے۔ لیکن بدقسمتی یہ بھی تھی کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے حلقہ احباب میں خاصی مشہور تھیں مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ انہی لوگوں سے ملا جلا کرتیں تھیں جن سے کئی برسوں کی میل ملاقات کے بعد بھی وہ اپنے دل کی بات تو ایک طرف گھر کی بات بھی شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

اور صرف وہی نہیں اکثر بڑے لوگوں کا یہی المیہ ہے کہ وہ لوگ ایسے سوشل سرکل میں رہتے ہیں جہاں لوگ روز روز ایک دوجے سے ملتے ہیں مگر کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ یہی سب سوچتے ہوئے ایک دم مہربانو کا خیال آیا تو اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کمبل کو ٹانگوں سے پرے ہٹایا اور سنگھار میز پر رکھے موبائل فون کی طرف بڑھ گئیں۔ عین سامنے لگی گھڑی کے مطابق وہ مہربانو سے صرف پانچ سات منٹ ہی بات کر سکتی تھیں کہ اس کے بعد سونی کو نہلانے کا ٹائم ہو گیا تھا جو پچھلے آدھے گھنٹے سے کنیزاں سے اپنا مخصوص آئل پوری باڈی پر لگوا کر مزے سے یہاں وہاں گھوم رہی تھی۔

☆☆☆

میری قسمت تیرا احسان نہیں بھولوں گی
دوست بخشے ہیں مجھے ماں کی دعاؤں جیسے

میری اور کنول پچھلے ایک گھنٹے کی محنت کے بعد ہاسٹل کے کچن سے کڑھی چاول بنا کر لوٹیں تو مہربانو کو دائیں بازو پر سر رکھے کروٹ کے بل لیٹا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"اے لڑکی! کھانسی کا سیرپ پی کر لیٹی ہو کیا جو نشہ نہیں اتر رہا؟"

میری نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کی نچلی سائیڈ کو گرما گرم کڑھی کے ڈونگے سے مس کیا تو ہڑبڑا کر پاؤں کو پیچھے کرنا اور آنکھوں کا کھلنا فطری تھا۔

"شاوا نے مہرو! ہم اتنی دیر کچن میں کھپتے رہیں اور تم اٹھ کر برتن بھی نہیں پکڑ رہیں۔"

کنول نے چاولوں کی دیگچی رکھتے ہوئے شکوہ کیا تو مہربانو واقعی شرمندہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"رئیلی سوری یار! بس ایسے ہی ذرا۔۔۔"

کمر کے پیچھے تکیہ رکھ کر اس سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے کمر تک چھوتے بالوں کو ہاتھ کے ارد گرد لپیٹ کر سر پر باندھ دیے اور آخر کار بیڈ سے اتر ہی آئی۔

"ویسے کیا تم پورے گھنٹے سے لیٹی ہوئی تھیں یا ابھی ابھی آئی ہو باہر سے۔"

میری نے کارپٹ پر دستر خوان بچھانے کے بعد اوپر ڈسپوزیبل پلیٹس، چمچ اور گلاس رکھے اور آلتی پالتی مار کر اس کی طرف متوجہ ہوئی جو تاول سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بھی اب تک سستی کا شکار لگ رہی تھی۔

"سچ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟ اتنی اداس کیوں ہو رہی ہو؟"

"آج اتنے دنوں بعد کچھ فراغت تھی تو سوچا کوئی ڈائجسٹ ہی دیکھ لوں مگر۔۔۔"

کنول اور میری دونوں کے اب تیور بدل رہے تھے۔

"مگر اتنا دردناک اینڈ ہوا ہے میری! کہ میرے تو آنسو ہی نکل آئے۔۔۔ تب سے دل پر بہت بوجھ ہو رہا ہے۔"

مہربانو کی بات پر میری تو بے ساختہ ہنسنے لگی تھی مگر کنول کا ردعمل مختلف تھا۔

"پہلی تو غلطی تمہاری ہے کہ میڈیکل کی اتنی ٹف روٹین سے اگر کچھ سکون میسر آیا ہی تھا تو اتنی "اندوہناک" کہانیاں پڑھنے کو کس ادیب نے کہا تھا اور دوسری غلطی اُن رائٹرز کی جو افسانوں، کہانیوں کا اینڈ ہر ممکن طور پر اداس دکھا کر تحریر کو امر کرنے کی غلط فہمی میں رہتی ہیں۔"

میری نے پلیٹ میں چاول اور چاولوں کے اوپر ہی کڑھی ڈال کر اسے پکڑائی مگر اس نے اپنی بات کے تسلسل کو ختم نہ ہونے دیا۔

"یار! اُن سے کوئی جا کر پوچھے کہ پہلے کیا دنیا

میں کم دکھ ہیں جو تم لوگ کرب ناک کہانیاں لکھ کر انہیں مزید بڑھاتے ہو اور پھر کہانیوں کا ایسا اختتام بعض اوقات دل پر نقش ہو کر کئی دن قاری کا حوصلہ پست رکھتا ہے، کچھ اور پڑھنے کو من نہیں مانتا۔"

کڑھی کی اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو نے اسے مزید بولنے سے روکا اور وہ چمچے کی مدد سے چاول اور کڑھی کو ایک دوجے کے رنگ میں رنگنے لگی۔

مہربانو بھی کنول کی بات سے پوری طرح متفق تھی۔

"اب تو خیر اتنا ٹائم ہی نہیں ہوتا ورنہ پہلے جب میں ڈائجسٹ پڑھتی تھی تا اینڈ پہلے سے دیکھ لیتی تھی۔"

میری نے اپنا تجربہ ہنستے ہوئے بیان کیا۔

"پتا ہے میرے ابا کہتے ہیں وہ تحریر جسے ہزاروں لوگوں نے پڑھنا ہو اس میں تو دکھوں کی اندھی گھپاؤں کو داخلے کی اجازت بھی نہیں ملنی چاہیے، خوش نما رنگوں کی باتیں ہوں، چاند کی کرنوں کے قصے ہوں اور مایوسی قریب بھی نہ پھٹکے۔"

"لیکن یہ سب بھی تو دنیا کے حقائق ہیں نا، ہوتا ہے سب اسی دنیا میں۔"

چاولوں میں ملانے کے بجائے صرف کڑھی کو چمچے سے کھاتے ہوئے مہربانو نے ذہن میں آئی بات زبان کے حوالے کی۔

"ہوتا ہے، میں مانتی ہوں، مگر اسی "ہونے" سے تو چند لمحے فرار حاصل کر کے بندہ ذہن کو ریلیکس کرنے کے لیے کچھ پڑھتا ہے نا۔"

کنول اپنی بات پر قائم تھی۔

"بات تو تم دونوں کی ٹھیک ہے لیکن حاصلِ بحث بات یہ ہے کہ تم دونوں کو صرف اینڈ سے مسئلہ ہے، بیچ میں جو مرضی ہو جائے مگر انت بھلا ہونا چاہیے۔"

میری نے بات اس طرح سمیٹی کہ دونوں ہی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں اور کھانا ختم ہونے تک شام کو باہر جا کر آئس کریم کھانے کا پروگرام ترتیب دے دیا گیا۔

☆☆☆

لے گئے وہ ساتھ ساری زندگی کی رونقیں
دل کا یہ عالم ہے ان کے دور ہو جانے کے بعد
جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکوتِ مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

شاہ زین آج جب گھر لوٹا تو عصر اور مغرب کے وقت میں معانقے کا عمل جاری تھا۔ پرندے جوق در جوق اپنے آشیانوں میں رات گزارنے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سبک ہوا کے ساتھ سرمئی کبود بدلیاں یہاں سے وہاں اٹھکیلیاں کرتی افق پر چہل قدمی میں مصروف تھیں۔ سورج کی پھیکی کرنیں گویا اقتدار نکل جانے کی وجہ سے بڑی اداس نظروں سے یہاں وہاں دیکھ کر موسم کے رنگ و روپ کو بے حد اداس کیے دے رہی تھیں۔ حسب معمول اماں اور ثمینہ داخلی دروازے کے نزدیک ہی پلاسٹک کی کرسیاں ڈالے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

شاہ زین نے داخل ہونے کے بعد انہیں سلام کیا اور ثمینہ کے سلام کا جواب دینے کے بعد وہیں بیٹھ گیا۔

اس کے لیے پہلے سے لا کر رکھے گئے سلیپرز پہن کر جوتے سائیڈ پر رکھے اور ثمینہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر پینے لگا۔

"بیٹا! کیسا گزرا آج کا دن۔"

یہ وہ سوال تھا جو اماں کی روزمرہ روٹین کا حصہ تھا۔ ثمینہ کالج سے آ کر ہاتھ منہ دھونے کے بعد ان کے پاس آ کر بیٹھتی تب بھی اور اگر شاہ زین باہر سے گھر آتا تب بھی۔

یوں بھی اماں بڑی قناعت پسند اور پرسکون رہنے والی خاتون تھیں۔ ان کے دل میں کن سوچوں کے شگوفے پھوٹ رہے ہیں اور کن سوچوں کے پتے زرد ہو کر بس گرنے کے قریب ہی ہیں، خبر ہی نہ ہوتی، بالکل اس شخص کی طرح جو چپ چاپ بنسی لگائے ندی کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کو بیٹھا ہو، مل گئی تو بھی خوش اور اگر نہ ملی تو بھی مطمئن۔

"بس اماں! الحمد للہ ٹھیک رہا۔"

آدھا جملہ بول کر وہ ثمینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور تمہارا کالج کیسا چل رہا ہے؟"

"بالکل فضول ہے۔" ثمینہ نے منہ بنا کر کہا تو شاہ زین سمیت امی بھی چونک گئیں۔

"جب سے میں نے جانا شروع کیا ہے مجال ہے جو ایک بھی قدم چلا ہو، بیچ جہاں تھا اب تک وہیں کھڑا ہے۔"

ثمینہ کی بات پر شاہ زین کے لبوں پر مخصوص انداز میں مسکراہٹ تیرنے لگی تھی۔ اماں نے بھی اس منظر کو مسکراتی آنکھوں سے دیکھا اور اس مسکراہٹ کے امر ہو جانے کی دعا بھی کر ڈالی۔

"ویسے بھائی! اک عجیب بات ہوئی آج۔"

مذاق کرتے کرتے وہ ایک دم کچھ یاد آنے پر سنجیدہ ہوئی تھی۔

"وہ کیا؟"

"کالج کے بعد جب گھر آنے کے لیے میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ بس کی طرف آ رہی تھی نا تو ایک لڑکی میرے پاس آئی۔"

"تمہاری کلاس فیلو؟"

ثمینہ کا انداز بتا رہا تھا کہ بات سیریس ہے جبھی شاہ زین مکمل توجہ اور دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"یہی بات تو حیرت انگیز ہے، کلاس تو کیا میں نے تو آج تک اسے اپنے کالج میں بھی نہیں دیکھا۔"

"اچھا پھر؟"

نا صرف شاہ زین بلکہ اماں بھی مکمل سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھیں۔ باوجود اس کے گھر آتے ہی ثمینہ مکمل تفصیل سے انہیں آگاہ کر چکی تھی۔

"پھر کیا بھائی! بڑے فرینڈلی انداز میں میرا نام لے کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنے بارے میں بتانے لگی، کہہ رہی تھی کہ وہ ابھی کالج میں نیو ہے اس لیے اسے میری ہیلپ کی ضرورت ہے۔"

"کس طرح کی ہیلپ؟ اور رہتی کہاں ہے وہ؟"

"ہیلپ کا تو کہہ رہی تھی گھر آ کر بتائے گی۔"

"لیکن اسے ہمارے گھر کا کیسے پتا؟"

ثمینہ نے بات کرنے سے پہلے جو سسپنس کری ایٹ کر دیا تھا۔ شاہ زین اُسی ڈائریکشن میں اس سے سوال کر رہا تھا ورنہ اپنی کالج لائف یا دوستوں کے متعلق وہ اکثر گھر میں باتیں تو کر رہی ہوتی مگر شاہ زین نے کبھی کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی۔

"وہ میرے ساتھ بس میں ہی آئی تھی اور ظاہر ہے کالونی کا گیٹ تو مین روڈ پر ہی ہے نا تو جب میں اتری اس نے دیکھ لیا مگر۔۔۔"

ثمینہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے کسی الجھن کا شکار معلوم ہو رہی تھی۔ شاہ زین نے خاموش رہ کر اسے بولنے کا موقع دیا۔

اماں بھی مکمل خاموش تھیں۔

"مگر مجھے وہ کچھ عجیب سی لگی کیونکہ ایک تو وہ عمر میں کالج گرل نہیں لگ رہی تھی اور دوسرا اس کے پاس کالج کی کوئی بک وغیرہ بھی نہیں تھی۔"

"ہوں۔"

شاہ زین نے کچھ سوچتے ہوئے اماں کی جانب دیکھا تو وہ بولیں۔

"میرا تو خیال ہے خوامخواہ یوں کسی پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ کل وہ کالج آئے گی تو اس کے بارے میں ساری معلومات لے لینا۔"

"نہیں اماں! اس کی والدہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ کہہ رہی تھی کہ شاید کچھ دن کے لیے وہ کالج نہ آ سکے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم ریلیکس ہو کر کالج جاؤ۔ ڈرنے یا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔" گہری سانس لے کر شاہ زین نے اس کی ہمت بندھائی اور اسی دوران ٹیلی فون کی ہونے والی بیل نے تینوں کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔

"ہیلو۔" شاہ زین نے ثمینہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہو کر خود فون اٹھایا۔

”ثمینہ ہے؟ آپ کون؟“
”اوکے پلیز ہولڈ۔“
ثمینہ کو فون دے کر وہ خود واش روم کی طرف بڑھ گیا اور جب واپس آیا تو ثمینہ بات کرنے کے بعد فون کال کا رابطہ منقطع کر چکی تھی۔
”بھائی! اُسی بس والی لڑکی کا فون تھا، کہہ رہی تھی مجھ سے ٹیوشن پڑھنا چاہتی ہے۔“
”تم سے ٹیوشن؟ مگر تم نے تو ابھی گریجویشن بھی کمپلیٹ نہیں کی۔“
شاہ زین کا حیران ہونا لازمی تھا۔
”وہ سب تو ٹھیک ہے مگر وہ مجھ سے جونیئر ہے نا، کہہ رہی تھی کہ جو کچھ وہ اب پڑھے گی وہ میرے مائنڈ میں تو ابھی فریش ہے نا اس لیے۔“
”ثمینہ تم خود اپنا پڑھ لو، یہی بڑی بات ہے، کسی دوسرے کی ذمہ داری ہرگز نہ لینا۔“
”امی! وہ اچھی خاصی فیس دے گی بدلے میں اور پھر کتنا اچھا ہوگا اگر میں بھی بھائی کے ساتھ مل کر گھر کے لیے کچھ کر سکوں، گھر میں ہی کرنا ہے' باہر تھوڑی جانا ہوگا۔“
فون کال ریسیو کرنے کے بعد سے اس کا جوش دیدنی تھا۔
بھائی کا بوجھ بٹانے اور اس کے ساتھ مل کر اپنے گھر کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اس کے اندر جیسے پارہ بھر چکا تھا۔
فون سننے کے بعد سے اسے اپنا آپ بڑا معتبر لگ رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف بھائی سے جیب خرچ بٹورنے کے ہی قابل نہیں بلکہ اب وہ اس قابل بھی ہوگئی ہے کہ معاشی طور پر خود زیادہ نہ سہی مگر کچھ تھوڑا بہت تو گھر کے لیے کر ہی سکتی تھی۔ something is better than nothing کا طبل بڑی زور سے بس بجے ہی چلا جا رہا تھا اور اسی کے طفیل ثمینہ کے دل میں سردائی کی سی ٹھنڈک پڑتی محسوس ہونے لگی۔
”تم اپنا سارا دھیان پڑھائی پر دو، جب تک میں ہوں تمہیں گھر کے خرچے کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“
”شاہ زین کی بات بالکل ٹھیک ہے بیٹا!“
اماں نے بھی ثمینہ کے مخالف جبکہ شاہ زین کی حمایت میں فیصلہ دیا۔
”اور پھر اللہ نے ضروریات سے بڑھ کر وسائل دیے ہیں بیٹا! تم بھلا پریشان کیوں ہوتی ہو۔“
”وہ سب تو ٹھیک اماں! لیکن آپ خود سوچیں ویسے بھی تو میں اکثر دوپہر میں سو ہی رہی ہوتی ہوں نا، جاگنے کے بعد بھی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی، ایسے میں اگر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کسی کو پڑھا دوں تو اس میں بھلا کیا حرج ہے۔“
اماں نے شاہ زین کی طرف دیکھا۔ جو فی الحال ثمینہ کے دلائل سے متفق نظر نہیں آ رہا تھا مگر ثمینہ بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھی جبھی آخری مگر جذباتی حربے کو استعمال کیا۔
”میں نے آج تک کسی کام کے لیے ضد نہیں کی، پہلی اور آخری دفعہ کسی چیز کے لیے اصرار کر رہی ہوں مگر پھر بھی۔۔۔“
ثمینہ نے منہ بسورا، مگر شاہ زین نے اسے لمحہ بھر ہونے والی بات چیت کا حوالہ دے کر کچھ یاد دلانا چاہا۔
”ذرا یاد کرو پیاری بہنا، اسی لڑکی کو ابھی کچھ دیر پہلے تم نہایت پراسرار بنا کر پیش کر رہی تھیں۔“
”ہاں کر تو رہی تھی۔۔۔“
ثمینہ نے خجالت سے سر کھجایا، مگر پھر سنبھل گئی۔
”مگر اب جب کہ وہ گھر آ رہی ہے اور روز آیا کرے گی تو ظاہر ہے ساری معلومات مل جائیں گی اس کے بارے میں اور وہ پراسرار بھی نہیں رہے گی۔“
”اچھا بھئی، ٹھیک ہے کر لو اپنا شوق پورا۔۔۔ لیکن اب کھانا بھی لے آؤ نا یا بھائی کا پیٹ بس باتوں سے ہی بھرو گی۔“
اماں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے تو بھلا شاہ زین کو کیا اعتراض ہوتا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا وہ بھی مسکرا دیا۔

☆☆☆

دوستوں کی پرکھ نہیں کرنا
مان ٹوٹے گا آزمانے میں

”کیا بات ہے لالے، یہ آج کل ہر وقت فون کے ساتھ تو ایسے مصروف رہتا ہے جیسے فون نہیں تیری نئی نویلی دلہن ہے۔“
بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ ہونے والی میٹنگ بھگتا کر کمرے میں آنے سے پہلے ہی کھلی کھڑکی سے اکمل کو موبائل پر نمبر پریس کرتے دیکھ کر کمرے میں داخل ہونے کے بعد نبیل نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔
جواباً بے ساختہ ہنستے ہوئے اکمل نے تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا۔
”او چل بک نا۔“
”چل تو بک لے، میں چپ کر جاتا ہوں۔“ تکیہ کیچ کر کے اس نے گھٹنوں پر رکھ لیا تھا۔
اکمل نے اسے سکون سے بیٹھتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کر موبائل چارج پر لگا دیا۔
”یار! میں نے کچھ پوچھا ہے تجھ سے۔۔۔“
”یار! جیسا تو سمجھ رہا ہے نا، ایسا کچھ نہیں ہے۔“
”چل جیسا بھی ہے بتا دے، میں سن لوں گا۔“
”اچھا چھوڑ یہ بتا۔۔۔“
”نا بابا، میں نے کوئی نہیں چھوڑنا، سیدھی طرح بتا دے، ناراض ہوگئی ہے نا ہماری ہونے والی بھابھی۔“
اکمل اس کی بات پر چونکا۔
”تیری ہونے والی بھابھی؟“ حیرت بجا تھی۔
”او نہیں، میری ہونے والی بھابھی۔“ نبیل نے چہرے پر معصومیت سجائی۔
”اوہ اچھا اچھا۔“
لمحہ بھر کے لیے اکمل نبیل کی معصومیت سے دھوکا ضرور کھا گیا تھا مگر اگلے ہی پل چونک گیا۔
”او بکواسی، میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا نا۔“
”چل یہ تو تُو مان گیا نا کہ تو بھابھی کو ہی فون ملا رہا تھا، مگر ظاہر ہے اگر ناراض ہیں تو پھر فون کیسے اٹھائیں گی۔“
”او بھینس کی دُم، تو سو فیصد غلط ڈائریکشن میں جا کر گھاس کھا رہا ہے۔“
”اچھا۔۔۔؟“ اپنا اندازہ غلط ہونے پر وہ مایوس ہوا تھا۔
”ویسے تیری بھابھی ہے تو سہی۔۔۔“
جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑنے کے بعد اکمل نے شرارتاً اسے دیکھا جس کے کان فوراً کھڑے ہو گئے تھے۔
”اسی دنیا میں۔ مگر نہ میں نے اسے اب تک دیکھا نہ کوئی نام پتے کا ہے اتا پتا۔“
”ڈینگی مچھر نہ بن انسان بن اور چھپ چھپ کر وار کرنا چھوڑ دے اب۔“
نبیل کا مزا کرکرا ہو گیا تھا ورنہ اس کا تو خیال تھا کہ اب اکمل کو دن رات تنگ کرنے اور چھیڑنے کے لیے اس کے ہاتھ ایک بات لگ گئی ہے مگر افسوس ایسا نہ ہوا۔
”اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ تیری ”وہ“ اب تک خبر سے بے دار ہو کر اسی دنیا میں ہے۔ تو مجھے اس فون کی حقیقت بتا ورنہ جان نہیں چھوڑوں گا، قسم ہے اپنے بیٹ مین کی۔“
اور اکمل کو پتا تھا کہ اب وہ واقعی جانے بغیر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ جبھی چند لمحے رک کر بولا۔
”لیکن یار یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔“
”واہ یار! اتنا ٹائم ٹریننگ میں اپنا آپ مار کر بھی کیا میں تجھے عمر شریف کا شاگرد لگ رہا ہوں؟“
اکمل نے تنبیہی انداز میں اُسے دیکھا تو اپنے سوال کا جواب اُس نے خود ہی دینا چاہا۔
”نہیں نا، تو پھر تو بول۔ سچ Now I am serious۔“
تھوڑی دیر وقفے کے دوران اکمل نے اس کا موڈ مکمل طور پر بدلتے دیکھا تو اپنے اور ندرت کے درمیان بچپن کی دوستی سے لے کر اس کے ساتھ

ہونے والی زندگی کی چھپن چھپائی تک سب کچھ بتا ڈالا۔ یہاں تک کہ عائشہ کا بدلا ہوا رویہ بھی اکمل نے اس سے نہیں چھپایا تھا۔

"ہوں۔۔۔" تمام باتیں گہری سنجیدگی سے سننے کے بعد نبیل نے گود میں لیا ہوا تکیہ دیوار کے ساتھ رکھ کر پیچھے کی طرف اس انداز میں ٹیک لگائی کہ جوتے ابھی تک زمین کو چھو رہے تھے۔

"تیرے گھر والوں کو یہ ڈر ہے کہ کہیں تُو ندی سے شادی نہ کر لے اور تیرا اپنا کیا خیال ہے؟"

"ندی میرے لیے دنیا کی سب سے اچھی دوست ہے مگر میں نے اُسے اِس نظر سے کبھی نہیں دیکھا لیکن I am afriad کہ عائشہ آپی کے اس بی ہیویر کی ضد میں آکر مجھے کوئی انتہائی قدم نہ اٹھانا پڑ جائے۔"

"ضد میں آکر کیے گئے اقدامات ہمیشہ نقصان ہی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا کہ بعد میں اپنے اس عمل سے تم خود انصاف نہ کر پاؤ۔"

"ندی کے ساتھ ہونے والے اس واقعہ سے پہلے گھر والوں اور خود عائشہ آپی کا بے حد ارادہ تھا کہ ندی ہمارے گھر میں بہو بن کر آئے اور میں نے خود کتنی ہی دفعہ اس سے اِس بارے میں بات کرنے کی کوشش کی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ میری کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہی مجھے اُس کی اور شاہ زین کی پسندیدگی کا علم ہو گیا بٹ آئی ایم ہپی یار۔۔۔!"

"رئیلی؟"

"آف کورس، کیونکہ وہ میرے لیے ایک دوست ہی کی طرح تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔۔۔ کچھ بھی۔"

نبیل نے اکمل کے چہرے پر بکھری سچائی کو دیکھا۔ وہ واقعی ندی کے لیے پریشان تھا یہ بتانے کے لیے وہ کوئی لفظ استعمال نہ بھی کرتا تو لہجہ خود بخود بتا رہا تھا۔

"I just wanna see her happy at any cost" (میں صرف اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں، ہر قیمت پر)

"چل بس، تو نہ فکر کر، کچھ سوچتے ہیں۔"

نبیل نے کہا تو اکمل ٹانگ ہلاتے ہوئے مسکرادیا محض اوپری دل سے۔۔۔!

☆☆☆

پرکھنا مت پرکھنے سے کوئی اپنا نہیں رہتا
کبھی بھی دیر تک آئینے میں چہرہ نہیں رہتا
بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا، دریا نہیں رہتا

شاہ سائیں آج پہلی مرتبہ اپنی فیکٹری کی نو برانچ سے ملنے آئے تھے۔ کانفرنس روم میں اُن کے داخل ہونے سے پہلے کھلے دروازے سے اُن کے استعمال کردہ پرفیوم کی خوشبو سب عہدیداران تک جا پہنچی تھی جسے کم و بیش سبھی نے گہری سانس لے کر پھیپھڑوں تک منتقل کرتے ہوئے اس کے شایانِ شان عزت درجے سے نوازا تھا۔ پل بھر کے بعد ہی شاہ سائیں برانچ کے آپریشنل ہیڈ کی سنگت میں کانفرنس روم میں داخل ہوئے تو شیشے کی مستطیل میز کے تینوں اطراف بیٹھے تمام افراد آن کی آن میں کھڑے ہو گئے۔

سفید کلف دار شلوار سوٹ، ڈائی شدہ بال، چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر سنہری رنگ کا مہنگا ترین نفیس سا چوکور فریم جس کے دونوں اطراف موجود اس کی کمپنی کا نام واضح طور پر درج تھا اور ہاتھ میں پکڑی سفید چمکدار دانوں کی ننھی سی مگر انتہائی خوب صورت تسبیح، میز کے ایک سرے پر موجود اپنے لیے خالی نشست پر بیٹھ کر انہوں نے لمحہ بھر میں تمام اسٹاف کو اپنی تجربہ کار نظروں سے دیکھا اور دائیں طرف کی پہلی ہی سیٹ پر بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ بیٹھے شاہ زین پر جاکر آخر کار اُن کی نظر رک گئی۔

"Would you like to introduce yourself" (کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند کریں گے؟)

"Sure, why not."

شاہ سائیں کے کہنے پر شاہ زین نے ذاتی تعارف کے طور پر محض اپنا نام بتا کر اس فیکٹری کے حوالے سے اپنا مکمل تعارف کروایا۔

اپنے دائرہ کار میں ہونے والے کام اور اپنی ان تمام ڈیوٹیز کے بارے میں آگاہ کیا جس کے لیے اسے اس فیکٹری میں تعینات کیا گیا تھا۔ فیکٹری کی اس برانچ میں اپنے انڈر ہونے والے کام کا فرسٹ ڈے سے لے کر اب تک کا مختصر جائزہ پیش کرنے کے بعد شکریہ کہہ کر اس نے اپنی سیٹ سنبھالی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے سبھی نے شاہ سائیں کو بریف کیا مگر جس طرح شاہ زین کا اندازِ بیاں اور چمکتی ہوئی سرمئی آنکھوں میں ذہانت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا کوئی اور نہ کر سکا۔

☆☆☆

جب ہم جواں ہوں گے
جانے کہاں ہوں گے
لیکن جہاں ہوں گے
وہاں تجھے یاد کریں گے
جب ہم جواں ہوں گے
اوں ہوں ہوں ہوں

پروگرام کے عین مطابق آئس کریم کھانے کے لیے باہر جاتے وقت اس وقت کنول بیڈ پر بیٹھی اپنے بیگ میں سے بریسلیٹ ڈھونڈتے ہوئے ساتھ ساتھ ایک پرانا سا گانا بڑی مگن ہو کر گنگنا رہی تھی جب شیشے کے سامنے کھڑی میری اسے گھورتے ہوئے عین اس کے سر پر آ پہنچی مگر اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ پتا چلا تو تب، جب میری کی طرف سے ایک چپت کنول نے اپنے سر پر وصول کی۔

"یعنی ابھی تک تمہارا جوان ہونا فعلِ مستقبل میں شامل ہوتا ہے؟"

"صرف فعلِ مستقبل نہیں یار مستقبل بعید میں۔"

کنول نے بھی اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے جواب دیا تو میری کانوں کو ہاتھ لگاتی ایک مرتبہ پھر شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسی دوران مہربانو کمرے میں داخل ہوئی۔ کنول کے ہونٹوں پر پھر سے وہی گنگناہٹ جاری تھی۔

"خیر تو ہے کنول! آج کون یاد آ رہا ہے تمہیں؟"

مہربانو نے مسکراتے ہوئے اپنے کھلے بالوں کو گردن کے عقب سے ایک جگہ پر جمع کر کے انہیں بینڈ لگایا تو جیسے اس کی کمر پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہونے لگا کہ لمبے بال تو بہت سی لڑکیوں کے ہوتے ہوں گے مگر اس کے بالوں کا خاصہ وہ سیاہ رنگ تھا جو دیکھنے والوں کو دیر تک دیکھنے پر مجبور کر دیتا۔

"بس ہے کوئی۔" کنول نے بریسلیٹ پہننے کے بعد جوتا پہنتے ہوئے اس کی اسٹرپ بند کرنے کے دوران مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"او۔۔۔" میری نے معنی خیز انداز میں ہونٹ سکیڑے۔

"یعنی یہ "بھی" کام سے گئی۔"

"'بھی' کا کیا مطلب ہے ویسے؟"

مہربانو نے اپنے شولڈر بیگ میں موبائل فون اور والٹ ڈالتے ہوئے اس کی بات پکڑی تھی۔

"اچھا تو چھپی رستم تم، ہاں۔" کنول نے بھی چھیڑا تو میری ہنسنے لگی۔

"ویسے آج ہم جا تو آئس کریم کھانے رہے ہیں مگر اندر کی بات بھی باہر آنی چاہیے۔" مہربانو نے چادر نما بڑا سا دوپٹا سر پر اچھی طرح جمانے کے بعد کمر پر پھیلاتے ہوئے بالوں کو ڈھکا۔

اس کی بات پر اُن دونوں نے متفق ہو کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اور اُسی دن یہ راز کھلا کہ کنول کی منگنی آج سے تین چار سال پہلے ہی اس کے کزن کے ساتھ ہو چکی ہے جبکہ میری ایک مسلمان لڑکے میں انٹرسٹڈ تو ہے مگر ابھی کیونکہ ہی سب جذبات پہلی منزل پر ہیں اس لیے وہ کوئی بہت زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ یوں بھی اُن دونوں کی شادی کوئی آسان بات نہیں تھی اس لیے وہ محض وقتی طور پر اس کے ساتھ دوستی رکھے ہوئے تھی۔

"اور تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ اگر منگنی وغیرہ نہیں ہوئی تو کیا آج تک کوئی بندہ اچھا بھی نہیں لگا تمہیں۔"

میری نے اسے کریدا تھا مگر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کے تمام تر سوالات کا جواب نفی میں دے دیا۔

"حیرت ہے یار! تم تو پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتی ہو۔"

کنول نے آئس کریم پارلر کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس حیرت کا اظہار کیا جو وہ پہلے بھی اکثر کیا کرتی تھی مگر جواب میں ہمیشہ کی طرح مہربانو مسکرا دی اور ارد گرد لوگوں کا رش دیکھ کر ایک مرتبہ سر سے ڈھلکتی چادر کو اچھی طرح سر پر جمایا۔

"ویسے ایک بات کہوں، مائنڈ نہیں کرنا۔"

میری کی اس تمہید پر مہربانو نے چونک کر اسے دیکھا۔

کنول اُن دونوں — کا "فیورٹ فلیور" بتانے کے بعد اُن کی طرف سے اوکے کروا کر آئس کریم لینے کے لیے آگے بڑھی تھی جبکہ وہ دونوں ذرا کونے میں کھڑی اس کے اشارے کی منتظر تھیں تاکہ ان کی مطلوبہ آئس کریم تیار ہو جانے پر وہاں سے لا سکیں۔

اور یہ سب بھی صرف اس لیے کہ مہربانو رش والی جگہ پر بہت جلد گھبرا جایا کرتی تھی اور نہ ہی وہ اتنے لوگوں میں ایک طرف اکیلے کھڑی ہونا پسند کرتی۔ اس لیے ہمیشہ اگر ایسی صورت حال ہوتی تو ان میں سے ایک مہربانو کے پاس رکتی اور دوسری جا کر باقی کام سنبھالتی۔

"بولو۔۔۔ میں بھلا کیوں مائنڈ کروں گی۔"

"یار! میرا اور کنول کا حلیہ دیکھو اور اپنا۔۔۔ کیا تم ایزی فیل کرتی ہو ایسے؟"

مہربانو نے ایک نظر اسے دیکھا۔

سیدھے سادے شلوار قمیص کے ساتھ گلے میں دوپٹا لیے وہ اس کے سامنے تھی تو ٹراؤزر کے ساتھ لانگ شرٹ اور سر پر برائے نام دوپٹا ٹکا کر اسے گلے کے گرد لپیٹے کنول قدرے فاصلے پر کھڑی آئس کریم کے مطلوبہ فلیورز منہ سے بتانے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کے اشارے سے بھی دکان دار کو سمجھا رہی تھی۔

"تم میری بات کا غلط مطلب نہ لینا۔ لیکن میں صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ خوب صورت اور اچھی لباس تو ٹھیک ہے مگر تمہارا دوپٹا لینے کا انداز تمہیں بہت دقیانوسی ظاہر کرتا ہے۔ آئی مین ہم دونوں سے بڑی لگتی ہو تم اس اسٹائل میں۔" میری کے یوں انتہا درجے کی فکری مندی ظاہر کرتے ہوئے کہنے پر مہربانو اس کی بات پر بے ساختہ ہنس دی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ مہربانو کچھ جواب دیتی کنول کے اشاروں نے میری کو اپنی طرف بلا لیا جو کہ دور سے یہ بتا رہی تھی کہ میری کا بتایا گیا فلیور نہیں ہے اس لیے خود آ کر دیکھ لو کہ اب کون سا لینا ہے۔

میری کے جانے کے بعد بھی مہربانو کے لب سابقہ انداز میں مسکراتے رہے۔

اسے معلوم تھا کہ میری یہ سب اس کے پیار میں کہہ رہی تھی اور میری کے پیار پر اسے بھی ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

مگر اس حقیقت سے بھی وہ بلا شبہ بے خبر تھی کہ اُسی لمحے آئس کریم پارلر کے باہر پارک کی گئی گاڑی میں بیٹھا اکمل پارلر کی شیشے کی دیوار میں سے اُسے دیکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتا — پھر باہر نکل آیا تھا۔

بڑی سی چادر میں لپٹی اس لڑکی میں جس قدر مشرقیت اسے نظر آئی تھی وہ شاید آج تک اس نے کبھی نہیں دیکھی۔

ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر اور دوسرا دائیں کندھے پر موجود شولڈر بیگ کے اسٹرپ پر رکھے وہ اکیلی ہی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

اور تب جانے اکمل کو کیا ہوا کہ میکانکی انداز میں گاڑی بند کرتے ہوئے سیدھا اس تک جا پہنچا۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اگر آج اس نے اُس سے بات نہ کی تو آئندہ کبھی اُس سے مل بھی نہیں پائے گا۔

نہیں۔

یوں بھی فوج کی تمام تر ٹریننگ میں وقت کی اہمیت ہر چیز سے زیادہ بتائی اور سمجھائی جاتی ہے۔ جبھی اس نے بھی دل کی گھنٹی پر لبیک کہتے ہوئے وقت "ضائع" نہ کرنے کا سوچا۔

اور عین مہربانو کے سامنے والی ٹیبل پر پہنچ کر بات کرنے کا موقع ڈھونڈنے لگا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی بہت لفنٹو ٹائپ انسان تھا مگر ہاں وہ مہربانو کے انداز سے اتنا ضرور سمجھ چکا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جس کا وہ انتظار کر رہی ہے اور وہ کسی کے بھی آنے سے پہلے صرف اُس کا نام وغیرہ پوچھنا چاہتا تھا اور بس۔

اس لیے اب وقت اور لفظوں کے درمیان جنگ سی چھڑی تھی۔

"آپ پلیز بیٹھیے نا۔"

کتنی ہی دیر سوچنے کے بعد جب کچھ سمجھ نہ آیا تو وہ ڈائریکٹ مخاطب کر بیٹھا۔

"جی؟"

مہربانو کے مسکراتے لبوں سے مسکراہٹ پل بھر میں پانی پر پھینکے پتھر کی طرح غائب ہو گئی تھی اور اب آنکھوں میں عجیب خوف تیرتا دکھائی دینے لگا تھا۔

"نو تھینکس۔"

کنول اور میری کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے مہربانو نے رکھائی کے اعلاترین درجے پر پہنچ کر جواب دے تو دیا مگر چہرہ اس کے لہجے کی مضبوطی کو اُن تاثرات کے ساتھ چیلنج کر رہا تھا جو اُس کے چہرے پر دل کی کھلی کتاب لیے موجود تھے۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں شاید۔۔۔" اکمل نے مسکراتے ہوئے اس امید کے ساتھ دیکھا کہ شاید ایک بار پھر وہ مسکراہٹ دیکھنے کو ملے جس نے ہرنی سی وحشت زدہ ان آنکھوں میں اس پل جگنو بکھیر دیے تھے۔

"دراصل میں یہاں بیٹھنے والا تھا، مگر آپ کھڑی رہیں اور میں بیٹھ جاؤں تو شاید اچھا نہ لگے۔" اکمل کے یوں دوستانہ انداز میں بات کرنے پر وہ کبھی حیرت سے اسے دیکھتی اور کبھی سہم کر۔ پھر بے بسی سے میری اور کنول کو دیکھتی جو میری کے فیورٹ فلیور کے لیے جانے کیا کر رہی تھیں اب تک۔

اور یک نہ شد دو شد ان کے پاس جانے کے رستے میں لگا لوگوں کا رش۔

"آگے کنواں پیچھے کھائی" کا محاورہ تو حقیقتاً اُسے آج ہی سمجھ آیا تھا۔

"دیکھیں آپ کو جو بھی کرنا ہے، جہاں بھی بیٹھنا ہے بیٹھیں مگر پلیز مجھ سے بات مت کریں۔"

مہربانو نے چاروں سمت نظریں دوڑا کر دیکھا۔ نہیں دیکھا تو بس اسے جو آج کل کے دور میں بھی اس کے یوں سہم جانے پر بڑی حیران مگر پُر شوق نظریں جمائے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"If you dont mind, may I know your name please." (اگر آپ برا نہ مانیں، تو کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔)

اس مزید پیش قدمی پر مہربانو بغیر کچھ بھی کہے اپنا شولڈر بیگ ٹیبل پر رکھ کر اس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔

دو بکس اور ایک ننھی سی ڈائری نکالنے کے بعد آخر کار موبائل ہاتھ آیا جس سے میری کو فون کر کے اپنی طرف متوجہ کرنے کے بعد جلدی آنے کا کہا تو وہ فوراً ہی ہاتھ میں اس کی بھی آئس کریم لیے آن موجود ہوئی۔

سامنے رکھی کتابوں سے ہی اکمل کو معلوم ہوا کہ اس کا نام مہربانو ہے اور وہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے۔ یا کم از کم لکھا تو یہ ہی تھا۔ اس خوش گوار معلومات کے حاصل ہونے پر دل نے لمبی سی سیٹی بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔

"سوری مہر! آج ان کے پاس اسٹرابری تو تھی مگر میرے لیے کیمن فلیور نہیں تھا۔ بس اسی میں دیر ہو گئی۔"

میری نے مہربانو کی طرف اسٹرابری فلیور بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے کچھ بھی جواب دینے کے بجائے جلدی سے باہر نکلنے پر اصرار کیا تو کنول اور میری کو بھی بادل ناخواستہ تقلید کرنی پڑی، مگر ابھی وہ تینوں آئس کریم پارلر کے اندرونی طرف سے دروازہ کھول کر باہر نکلنے ہی والی تھیں کہ اکمل کے "ایکسکیوزمی" کہنے پر پلٹ کر دیکھنا پڑا۔ مہربانو نے مڑ کر اسے دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے رکنے کے باوجود رخ نہیں موڑا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی آئس کریم بھی اپنی ناقدری پر اب آنسو بہاتے ہوئے پگھلنے کو تھی۔

"جی فرمایئے۔"

کنول نے یوں فلمی انداز میں کسی کے پکارنے پر پہلے میری اور پھر اکمل کو دیکھا۔

"دراصل یہ شاید آپ کی دوست کی بک ہے جو وہ ٹیبل پر ہی بھولے جارہی تھیں۔"

اکمل نے کنول کی طرف کتاب بڑھائی اور خود ایک سائیڈ سے ہو کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے پہلا کام اُن تینوں کو چھوٹے چھوٹے قدم لے کر چلتے ہوئے دیکھنے کا کیا تھا جو یقیناً مہربانو سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اُس گھر کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا
جس گھر کے مکینوں میں محبت نہیں ہوتی

امی نے آج عشاء کی نماز کی ادائیگی ذرا تاخیر سے کرنے کا سوچا تھا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ناصر بھائی سے ندی کے یونیورسٹی جانے کے لیے "اجازت" لینا چاہتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ ابھی تک ان کے انتظار میں بیٹھی جائے نماز پر تسبیح میں مصروف تھیں۔

ندی کو انہوں نے آج رات کمرے میں نہ آنے کا کہا تھا۔ مبادا اسے دیکھ کر ناصر بھائی کا پارہ نہ چڑھ جائے۔

اُن کی زندگی میں یہ عجیب مقام آیا تھا جب انہیں اپنے ہی بیٹے سے بات کرنے کے لیے پہلے لفظوں کو ترتیب دینا پڑ رہا تھا۔ جس بیٹے کو انہوں نے پہلا لفظ بولنا سکھایا تھا آج وہی بیٹا اُن کے سامنے فنِ خطابت کا وہ مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا کہ ان کے اپنے لفظ کہیں کھو سے جاتے۔

پھولوں کی طرح سینت سینت کر رکھنے والا بیٹا یقیناً ظاہری طور پر اُن سے کوئی بے ادبی نہ بھی کرتا مگر ندی کے ساتھ کیا گیا سلوک ہی امی کے لیے کسی نشتر سے کم نہ تھا۔ کبھی کبھار انہیں اپنا آپ اس رنگ برنگی تتلی کی طرح محسوس ہوتا جسے کسی نے دل بہلانے کے لیے بوتل میں بند کر دیا ہو اور اس بوتل میں ان کے زندہ رہنے کا سامان کرتے ہوئے ندی کی صورت میں ایک رنگین پھول بھی ان کے ہمراہ کر دیا ہو۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ تتلی اور پھول دونوں ہی اس طرح زندہ نہیں رہ پائیں گے۔

اسی دوران ہمیشہ کی طرح ناصر بھائی کمرے کا دروازہ بجانے کے بعد اندر چلے آئے۔

"السلام علیکم امی!"

"وعلیکم السلام بیٹا، جیتے رہو۔"

جائے نماز سے اٹھنے کی کوشش میں انہوں نے ایک ہاتھ گھٹنے پر اور دوسرا جائے نماز پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

آج ناصر بھائی کی آمد کچھ مختلف انداز میں ہوئی تھی۔

ورنہ عام طور پر تو وہ ہمیشہ رات کے وقت ان کے پاس اپنے چھوٹے سے بریف کیس اور ہاتھ میں ایک دو فائلیں لیے یوں آتے کہ گویا ماں کے پاس نہیں اپنے دفتر کے باس کے پاس جارہے ہوں۔

اس بریف کیس کے دو تین خانوں میں اُن کے مختلف کاغذات موجود ہوتے جنہیں فائلوں کو دیکھنے کے دوران انہیں اکثر اوقات نکالنا پڑتا۔ کافی دیر تک وہ انہی کاغذوں پر جھکے کبھی انہیں پڑھا کرتے اور کبھی بریف کیس کے ہی ایک خانے سے پین نکال کر کچھ

لکھنے لگتے۔ اس دوران امی اپنے بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھی بس خاموش نظروں سے انہیں دیکھا کرتیں۔ کئی مرتبہ اُن کا جی چاہتا کہ ناصر بھائی اُن کے پاس آ کر بیٹھیں، اس طرح نہیں جیسے اب بیٹھا کرتے ہیں بلکہ اس طرح جیسے پہلے وہ ان کے پاس آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیات، خاندان یا رشتہ داروں میں ہونے والے روابط، مستقبل کی باتیں۔۔۔ کتنا کچھ تھا جو وہ ان کے ساتھ شیئر کیا کرتے تھے۔

مگر ہمیشہ ویسا ہی کب ہوتا ہے جیسا انسان کا دل چاہتا ہے۔ جبھی اکثر امی اپنی ان ہی سوچوں سے گھبرا کر بند کھڑکی کے آگے سے پردہ ہٹا ہونے کے باعث شیشے کے اس پار لان میں اور اس کے آگے درختوں کی اوٹ سے تانبے کی طرح چمکتی پر لان سے ابھرتی روشنیوں کے ملاپ کو دیکھنے اور انہیں الگ کرنے میں خود کو مصروف رکھنے کی لاحاصل سعی کرتیں اور اسی دوران ناصر بھائی خاموشی سے اپنے تمام کاغذات سمیٹنے کے بعد بریف کیس بند کرتے فائل ہاتھ میں لیتے اور حسب سابق "اچھا امی! اللہ حافظ۔" کہہ کر کمرے سے نکل جاتے۔

اُن کے منہ سے ندی کے بارے میں کوئی مثبت بات، ندی کے ساتھ روا رکھے گئے رویے پر پچھتاوے کا کوئی ایک حرف یا اس کی آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی خوش گوار لائحہ عمل سننے کو وہ ترس گئی تھیں۔ روز اسی آس پر انہیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھتیں اور جاتے ہوئے پھر خاموشی سے اپنے بیڈ پر لیٹ جایا کرتیں۔

لیکن آج کا سورج ذرا مختلف انداز میں غروب ہوا تھا اور وہ یوں کہ ہمیشہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کو ہی نئی امید کی علامت قرار دیا جاتا ہے مگر آج بات کچھ مختلف تھی۔ آج سورج کے غروب ہونے کے بعد سے اب تک امی کے اندر ایک نئی توانائی جنم لے رہی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ "گڑگڑا" کر ناصر بھائی سے کچھ مانگیں گی تو وہ ہرگز بھی انکار نہیں کریں گے۔

اسی وجہ سے انہوں نے آج ندی کو اس وقت تک کمرے میں آنے سے منع کیا تھا جب تک ناصر بھائی اُن کے کمرے سے واپس نہ چلے جاتے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ندی سے اُن کا یہ فریاد کرتا لہجہ ہرگز برداشت نہیں ہو سکتا۔

مگر حیرت انہیں اس وقت ہوئی جب ناصر بھائی آج خالی ہاتھ ہی ان کے کمرے میں چلے آئے۔ نہ کوئی فائل اور نہ ہی بریف کیس۔۔۔ کچھ بھی تو آج ان کے پاس نہیں تھا۔

امی بیڈ پر بیٹھی ان کو بلاواسطہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

یقیناً وہ اُن سے کوئی بات کرنے آئے تھے مگر کیا۔۔۔

امی نے دل ہی دل میں اندازا لگایا۔

"پچھتاوے کا اظہار؟ شاید معافی؟

کیا واقعی آج ناصر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے؟ اسے اپنی بہن کی باتوں اور ماں کے آنسوؤں کے سچا ہونے کا اعتبار آ گیا ہے؟

صبح کا بھولا کیا واقعی شام کو گھر لوٹ آیا ہے؟"

اُن کے دل میں ناصر بھائی کے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر پل بھر میں جگہ بنا گیا تھا۔

بے شک یہی ماں کے رشتے کی لازوال سچائی ہے۔

بلاشبہ بہن بھائیوں کا رشتہ بھی اپنے اندر انوکھی کشش اور منفرد احساس رکھتا ہے مگر بہن بھائی آگے جا کر کئی نئے رشتوں میں بندھ جاتے ہیں، وہ محبت آپس میں برقرار نہیں رکھ پاتے جو ماں باپ کے ساتھ رہتے وقت ان کے دلوں میں ہوتی ہے۔ کبھی سسرال آڑے آتا ہے تو کبھی آگے جا کر اپنے ہی بچوں کی محبت بہن بھائیوں کے رشتے پر غالب آ جاتی ہے۔ بہن بھائی بعض اوقات ہمیشہ بہن بھائی ہی نہیں رہتے بلکہ نئے تعلقات اور رشتوں کے غلاف اوڑھ کر کبھی سمدھی تو کبھی جیٹھ جٹھانی۔۔۔

لیکن ماں باپ کا رشتہ دنیا کا واحد ایسا رشتہ ہے جو سو برس کی عمر ہو جانے پر بھی ہر اولاد کے لیے صرف ماں باپ ہی رہتا ہے۔

وہی لازوال پیار، بے لوث چاہت اور بے غرض

دعائیں۔
یہی وہ رشتہ ہے جو اٹھتے بیٹھتے بغیر کسی طمع ولالچ کے اپنی اولاد کے لیے دعائیں کرتے نہیں تھکتے۔
''امی۔۔۔!''
ناصر بھائی کے پکارنے پر امی خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئیں۔
''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔''
دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑنے کے بعد دائیں ہتھیلی پر ہلکی سی برائے نام خارش کرتے ہوئے انہوں نے مدعا بیان کیا۔
''بات تو مجھے بھی تم سے کرنا ہے، بہت ضروری۔''
''لیکن پہلے تم بات کرلو، میں سن رہی ہوں۔''
''ہوں۔'' چند لمحے سوچ کی نذر ہوئے اور بالآخر ناصر بھائی نے امی کے کہنے کے عین مطابق اپنی ہی بات شروع کرنے کا سوچا۔
''جو بات میں آپ سے کرنے جارہا ہوں، اسے بڑے تحمل اور حوصلے سے سنیے گا اور پھر جذباتی ہونے کے بجائے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنا ردِعمل ظاہر کیجیے گا۔''
ناصر بھائی کی تمہید نے امید کا پہلا کانچ توڑ پھینکا تھا۔
یعنی وہ جو معافی اور پچھتاوے کی خوش گمانی میں خوامخواہ انہیں معاف کر کے فوراً گلے لگا لینے کا ارادہ کیے بیٹھی تھیں ایسا کچھ نہیں تھا۔
ایک دبی دبی سی سسکی ان کے سینے میں اٹھی تھی۔
عرصے بعد بیٹے کو گلے لگا لینے کے منتظر بازو ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
باہر آسمان پر شام کی اداسی میں نیا چاند طلوع ہو چکا تھا اور وہ بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہونے لگیں کہ صرف تمہید ہی سے جیسے ان کے دل پر گرنے والے آنسوؤں کی شدت سے ہونے والی بارش کی بدولت اتنے مرغزار اُگ آئے تھے تو پھر جو بات وہ کرنے والے تھے اس کے حوالۂ سماعت ہونے کے بعد اس دل کا کیا بنے گا۔

''تم بے فکر ہو کر بات کرو۔۔۔ تحمل اور حوصلے کا تو اب تک تمہیں اندازا ہو ہی چکا ہوگا۔''
انہوں نے مضبوط لہجے میں بغیر کسی کپکپاہٹ یا کمزوری دکھائے جواب دیا۔
یوں بھی ایسے لوگوں کے سامنے خود کو کمزور ظاہر کرنے کا کیا فائدہ، جو ہمیں کسی بھی طور طاقت دینے پر قادر نہ ہوں، اس لیے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی ہوگی کہ اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے خود کو کمزور ظاہر مت کیجیے کیونکہ لوگوں کے سامنے ایک مرتبہ خود کو کمزور ظاہر کر دیا تو ساری زندگی اسی احساس کے ساتھ جینا ہوگی۔ اس کے برعکس اللہ کے سامنے خود کو کمزور ظاہر کیا تو وہ آپ کی عاجزی پسند کرتے ہوئے اس قدر طاقت بخشے گا کہ لوگ آپ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے میں خود کو محفوظ خیال کریں گے۔۔۔ اور یہی میرا ایمان ہے۔
''دراصل میں اور عائشہ کافی دنوں سے اس مسئلے پر سوچ رہے تھے اور آخر کار ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس طرح زندگی گزارنا نہ ندی کے لیے ممکن ہے اور نہ ہم سب کے لیے۔''
ندی کے بارے میں سوچنے کا اختیار اور فیصلہ کرنے کا حق انہوں نے بنا پوچھے اور بغیر بتائے عائشہ کے اور اپنے ہاتھ میں لے کر امی کی اہمیت کو بالکل صفر قرار دے دیا تھا۔
''اس لیے ہم بہت جلد۔۔۔ یعنی کچھ ہی دنوں میں ندی کی شادی کر رہے ہیں۔''
امی کے چہرے پر پھیلتی پیلاہٹ ناصر بھائی ناخن سے دوسرا ناخن کھرچنے کے دوران دیکھ نہیں پائے تھے۔
ایک بم تھا جو ان کی سماعت پر پھوڑا گیا تھا، بائیں کہنی پر بوجھ ڈال کر انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھانا چاہا مگر کپکپاتے ہاتھوں کی لرزش سے گلاس پانی سمیت کارپٹ پر جا گرا امی کے ہونٹوں سے ہلکی سی آہ نکلی۔
اسی وقت ناصر بھائی نے چونک کر انہیں دیکھا اور بجلی کی سی سرعت سے ان کی طرف لپکے۔
(باقی آئندہ)

فاخرہ گل

میرے ہمنوا کو خبر کرو

جو درد کے صحرا میں اکیلا بھی بہت ہے
اس کے لیے دیوار کا سایہ بھی بہت ہے
دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت ہے

رسم ورواج کی قیدی لڑکیوں کی مثال پنجرے میں بند ان رنگ برنگی چڑیوں کی سی ہوتی ہے جن کی چابی ہمیشہ ان کے بڑوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ وہ چاہیں تو پر کاٹ کر کچھ دیر باہر "آزادی" سے گھومنے پھرنے دیں اور اگر نہ چاہیں تو بس پنجرے میں ہی زندگی کی شام ہوجائے۔ ہاں البتہ چابی تھامنے والے ہاتھ تو ضرور تبدیل ہوجایا کرتے ہیں مگر نہ تو ذہن ہی بدلتا ہے اور نہ دل۔

مہربانو بھی انہی جیسی تو تھی جسے آزادی تو ضرور نصیب ہوئی تھی مگر پر کاٹ لیے جانے کے بعد۔

اپنے گھر، اپنے ماحول اور خصوصاً حویلی سے جڑی سوچ کا خوف ایک دیوہیکل جن کی طرح یوں اس کے ساتھ چمٹا رہتا کہ وہ چاہ کر بھی اس سے چھٹکارا نہ پاسکتی تھی۔

میران کے کبھی کبھار بن بتائے یونیورسٹی اس سے ملنے چلے آنے کی وجہ سے اس نے زیادہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہونا چھوڑ دیا تھا۔ کلاس سے باہر نکلتے ہی بس میران کے ایک دم کہیں نظر آجانے کا دھڑکا سا لگا رہتا کہ میران کے منہ سے نکلی ہوئی بات شاہ سائیں اور ماکانی سائیں کے لیے کس قدر سچی اور اہمیت کی حامل ہوتی ہے اس کا اندازا مہربانو کو بہت اچھی طرح تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میری اور کنول کے علاوہ وہ کسی کے ساتھ بھی فری ہوکر بات نہیں کرپاتی تھی۔ اس روز اکمل کے یوں ایک دم مخاطب کرلینے پر جو اس کا خون خشک ہوا تھا تو اس کا احساس کافی دیر تک ذہن پر رہا۔

اب بھی نماز پڑھنے کے بعد ذرا سا پیچھے کھسک کر سنگل بیڈ سے ٹیک لگا کر دعا مانگتے ہوئے یوں ہی اسے خیال آیا کہ اگر اس روز آئس کریم پارلر میں میران اس بندے کو اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا دیکھ لیتا تو یقیناً اب تک شاہ سائیں اور ماکانی سائیں تک واقعہ اس انداز میں پہنچ چکا ہوتا کہ مہربانو پڑھائی کے بہانے وہاں جاکر عیاشیاں کررہی ہے اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جاتا تو وہ بھلا اپنا یقین کیسے دلاتی؟ اور اس پر کوئی یقین کرتا ہی کیوں؟

شاہ سائیں بھی بعض اوقات حقیقت کو [illegible] پشت ڈال کر میران کی کہی گئی بات کو تسلیم کرنے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ مہربانو کی نیچر سے اچھی طرح واقف تھے مگر میران [illegible] میران تھا۔

ان کا جگر گوشہ، ان کا وارث اور ان کی نسل آگے بڑھانے کا وسیلہ۔

جبکہ اس کے لیے تو یہی معجزہ غنیمت تھا کہ اسے آگے پڑھنے لکھنے کی اجازت مل گئی۔ میران کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے۔

اور اسے پتا تھا کہ اسے کبھی بھی کسی بھی قسم کا کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے جس سے میران کی کی گئی مخالفت کو تقویت ملے۔

"کیوں بھئی، دعا ختم ہو گئی ہو تو کوئی بات کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟"

مہربانو نے "میری" کی آواز پر چونک کر آنکھیں کھولیں تو وہ دوزانو ہو کر اس کے سامنے ہی بیٹھی نظر آئی۔

"ارے تم کب سے بیٹھی ہو یہاں؟"

مہربانو حیران تھی کہ آخر اس کے آنے سے وہ لاعلم کیسے رہی یعنی یا تو وہ دبے پاؤں آئی ہو گی یا پھر وہ کچھ زیادہ ہی محو تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی، تمہیں دعا مانگتے دیکھا تو جوتے اتار دیے کہ خلل نہ پڑے۔"

"ہوں۔" مہربانو مسکرائی۔

"ویسے کیا مانگ رہی تھیں اتنی توجہ اور دھیان سے۔" میری نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے آلتی پالتی مار لی تھی۔

"ابھی تو کچھ مانگا ہی نہیں۔۔۔فی الحال تو بس رب سائیں سے باتیں کر رہی تھی۔"

"اتنی دیر تک صرف باتیں۔۔۔اور کچھ مانگا بھی نہیں۔" میری کو حیرت ہوئی تھی۔

مہربانو نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہمارے سامنے تو بہت کم بولتی ہو حالانکہ ہم تم سے کتنے ہی سوال جواب کرتے رہتے ہیں اور جہاں آگے سے صرف خاموشی ہی خاموشی میں جواب آتے ہوں وہاں کیسے باتیں کر لیتی ہو۔"

"ایسا نہیں ہے میری۔۔۔! بلکہ وہ تو میرے لیے ایک بہترین سامع ہے۔ جب دل چاہتا ہے اس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیتی ہوں اور یقین کرو اکثر میں روتی آنکھوں سے بات کا آغاز کرتی ہوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ ختم کرتی ہوں۔ He is the one, who understands me" اور ویسے بھی نہ تو اس سے کچھ چھپانا پڑتا ہے نہ ہی علی الاعلان بتانا۔۔۔وہ میرا اللہ دل میں بستا ہے، دل کی باتیں سنتا ہے اور دلوں کو سکون دیتا ہے۔"

اس لمحہ میری کو لگا جیسے وہ جذب کے عالم میں اس کے بجائے کسی اور سے گفتگو کر رہی ہے۔

"تمہیں کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہیں جواب مل رہے ہیں۔" میری کی حیرت بجا تھی کہ یہ موضوع آج ہی اتفاقاً ان کے درمیان آیا تھا۔

"پتا ہے میری۔۔۔! میرا دل بولنے لگتا ہے میرے اندر جیسے کوئی مکالمہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر کوئی تشنگی کوئی محرومی نہیں رہتی۔"

"یعنی تمہارے اندر تو بہت روحانیت ہے۔" میری بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے پر رقصاں جذب کو نوٹ کر رہی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے یار! یہ تو بس نارمل روٹین کی باتیں ہیں۔" مہربانو مسکرائی۔

"اچھا تم بتاؤ۔ مجھ سے کوئی کام تو نہیں تھا۔۔۔اور کنول کہاں ہے؟"

"کنول کچن میں ہے اور خیر سے آج بھنڈی کھلانے کا ارادہ رکھتی ہے اور کام تو نہیں تھا مگر۔۔۔" میری نے منہ بسورا۔

"مگر۔۔۔؟"

"یار۔۔۔! ممی کا فون آیا تھا، نصیحت کر رہی تھیں کہ کالج میں داخلہ ملے اتنا ٹائم ہو گیا ہے مگر ایک دفعہ بھی خدا کا تھینکس کرنے چرچ تک نہیں گئی۔"

"ہوں۔۔۔" میری فرش سے اٹھی تو مہربانو نے بھی اٹھ کر جائے نماز بند کی اور سامنے میز پر موجود کتابوں ہی کے اوپر رکھ دی۔

"اگر آنٹی کہہ ہی رہی تھیں تو تمہیں جانا چاہیے نا، زیادہ نہیں تو ایک بار چکر لگا لو۔"

"ہاں سوچ تو میں بھی کچھ یہی رہی ہوں۔" میری نے بیڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے تکیہ کا سہارا لیا۔

"کیوں نا آج ہی چکر لگا لیں۔۔۔تم چلو گی میرے ساتھ؟"

فوراً سے پیشتر میری نے پروگرام ترتیب دیا تھا۔

"کنول کچن میں ہے، ہمارے آنے تک کھانا تیار ہو گا۔ کھانا کھا کر اکٹھے اسٹڈی کر لیں گے۔"

"میں۔۔۔؟" مہربانو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم اور کون۔۔۔اور یقین کرو جلدی آ جائیں گے۔"

"یار! میرے گھر والوں کو میرا ہاسٹل سے یہاں وہاں جانا پسند نہیں ہے اور وہ بھی بغیر کسی کام کے۔" مہربانو نے جھوٹ کا سہارا لینے کے بجائے سچائی سے کام لیا۔

"اوہ لیکن تم کون سا سینما جا رہی ہو؟ جیسے تم لوگ مسجد جاتے ہو ویسے ہم چرچ۔ پاک جگہ ہے یہ بھی ہمارے لیے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

"شاید تم چرچ کی وجہ سے نہیں جانا چاہ رہیں۔" میری نے اپنے طور اندازا لگایا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے یار! لیکن یوں سمجھو کہ اماں سائیں نے یہاں بھیجنے سے پہلے میرے گرد ایک دائرے کا حصار بنا دیا تھا، اور کہا تھا کہ اس دائرے میں جو مرضی میں آئے کرو، مگر ہاں دھیان رہے کہ ایک قدم بھی اس دائرے سے باہر نہ نکلنے پائے ورنہ اس حصار کے ٹوٹنے کی ذمہ داری سراسر میری اپنی ہو گی۔"

"یہاں تمہیں گھر کا کوئی فرد نہیں دیکھ رہا، اور نہ ہی کسی کے ابھی آنے کا امکان ہے پھر بھی تم اتنی محتاط اور ہی ہو۔۔۔ڈرپوک کہیں کی۔" میری کی بات پر مہربانو کے چہرے پر بڑی بھرپور مسکراہٹ ابھری تھی۔

"پازیٹو سوچتیں تو فرماں بردار بھی کہہ سکتی تھیں۔"

"نہیں یار اتنی بھی کیا فرماں برداری۔۔۔" میری نے دہانہ سکوڑتے ہوئے کہا۔

"تم کوئی غلط کام کرنے یا کسی غلط جگہ پر تھوڑی جا رہی تھیں۔۔۔اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہی نہیں ہے۔ میرے ساتھ جانے پر شاید تم کترا رہی ہو۔"

"اچھا ایسا کرو تم اور کنول چلی جاؤ، بھنڈی میں بنا دیتی ہوں۔"

"مشورہ نہیں مانگا ہے تم سے۔۔۔شکریہ۔"

میری کے منہ کے زاویے جو بگڑے تو کلف لگے کپڑے کی طرح نرم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔

مہربانو جواب تک اس بات کو نارمل سمجھ رہی تھی، معاملے کی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی اب خود کو عجیب کشمکش میں مبتلا محسوس کر رہی تھی۔

"اپنی ذات کے اندر کوئی روزن، کوئی روشن دان ضرور بناؤ یار! ورنہ اس گھٹن اور حبس میں تو مر جاؤ گی تم۔"

"منظور ہے مجھے۔" مہربانو نے سنجیدگی سے کہا تو میری۔۔۔چونک سی گئی۔

"اس گھٹن اور حبس میں مرنا منظور ہے یار! مگر میں ایسا کوئی روزن یا روشن دان نہیں بنانا چاہتی جس سے آنے والی ہوا یا روشنی میرے والدین کے لیے ناپسندیدہ ہو۔"

"تمہارا کچھ نہیں بن سکتا یار You are just a mummy daddy child"

میری ہار مانتے ہوئے مسکرائی تو مہربانو نے بھی سکون کا سانس لیا۔

"ویسے حویلی کا نمبر کیا ہے؟"

"کیوں؟ خیر ہے؟ شکایت کرنی ہے کوئی؟"

"پھر بھی۔۔۔بتاؤ تو۔۔۔"

میری نے سامنے رکھا موبائل ہاتھ میں لے کر اس کی طرف دیکھا اور مہربانو کے نمبر بتانے پر اسی لمحے ملا بھی لیا۔

☆☆☆

شیشے اُتے دھوڑاں جمیاں، کنڈھاں جھاڑی جاندے
جلداں سانبھ کے رکھ محمد، ورکے پاڑی جاندے
فجری ویلے بول نی کوئلے، بول تماں دی بولی
نہ وس تیرے نہ وس میرے، بھیاپے بیا جھولی

ہمارے حصے میں آنے والے بعض دکھ کسی شعبدہ باز کی مانند ہوتے ہیں جو پتلی سی رسی پر چڑھا خود تو ہوا میں معلق ہوتا ہی ہے مگر ساتھ ساتھ دیکھنے والوں کا بھی خون اس وقت تک خشک کیے رکھتا ہے جب تک اس کا اور رسی کا ساتھ چھوٹ نہ جائے۔ بالکل اسی طرح وہ دکھ جو بن جاہے اور خلاف توقع ہماری جھولی میں آ گریں اور جن کے متعلق ہم اپنی ذات سے بھی ذکر

کرتے سے گریز کر رہے ہوں ایسے دکھ لمحہ بہ لمحہ انہیں اندر سے دیمک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ پتا چلتا ہے تو تب جب انسانی بت کھوکھلا ہو کر زمین پر آ گرے۔

پلنگ پر کسلمندی سے لیٹی ملکانی سائیں نے گہری سانس لیتے ہوئے کروٹ لی تو سونی نے بھرپور طریقے سے میاؤں کہہ کر انہیں اپنے ہونے کا یقین دلایا۔

حویلی میں اکثر اوقات وہ چونکہ اکیلی ہی ہوا کرتی تھیں سو جب دل بھیگی ہوئی روئی کی مانند بہت زیادہ بوجھل ہونے لگتا تو سونی سے ہی باتیں کر لیا کرتیں۔ وہ تھی بھی عقلمند۔ بات بے بات میاؤں کرنے کے بجائے کبھی کبھار ہی میاؤں کرتی۔ جس سے ملکانی سائیں کو گماں گزرتا کہ جیسے وہ سب سمجھ رہی ہو۔

چھوٹی سی گلابی ناک والی سونی جانے کیا سوچتے ہوئے اکثر اپنی گول مٹول گہری سبز آنکھوں سے ملکانی سائیں کو دیکھا کرتی۔ سچے دار انتہائی نرم جلد والی وہ سفید سی بلی ملکانی سائیں کے مزاج کے سب موسموں کی ساتھی تھی۔ کبھی جو انہیں مسکراتا دیکھتی تو اُس کا کھلنڈرا پن کود کر سامنے آ جاتا۔ پھر ان کے آگے پیچھے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کبھی اپنی دم سے کھیلا کرتی اور کبھی اپنی ہلکی سرخ زبان سے اپنے ہی پنجے چاٹنے لگتی۔

خدانا خواستہ اگر محسوس کرتی کہ جسم کے کسی عضو پر مٹی لگ گئی ہے تو پھر بھی اپنی زبان ہی سے گویا پورا جسم دھو ڈالتی۔ اس کے برعکس انہیں اداس یا معمول سے زیادہ خاموش دیکھتی تو خود بھی خاموشی سے دم سادھے Cattery میں پڑی رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انہیں اس قدر عزیز تھی۔

حویلی کی بڑی بڑی دیواریں انہیں پر اسرار روحوں کی طرح گھورتیں۔ یہاں سے وہاں پھیلی تنہائی میں بعض اوقات ملکانی سائیں کو اپنا وجود بے کار سا لگنے لگتا۔ میران، مہربانو اور شاہ سائیں سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں جن میں وہ مکمل طور پر ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہ نوکر چاکر اور بے شمار جاگیر

دوراثت کے ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا سمجھا کرتی تھیں۔ حویلی کی ملازماؤں سے وہ کام کے علاوہ اکثر اوقات چاہ کر بھی بات نہیں کر پاتی تھیں کیونکہ اب ان سے بات کرتے اور گھلنے ملنے کی خواہش کے در پردہ صرف اور صرف ان کی تنہائی چھپی تھی جبکہ اس تمام خواہش کے پیچھے ان کی زندگی کا وہ دور تھا جس میں انہیں بیٹھ ”اعلیٰ“ خیال کیا گیا تھا اور بس۔۔۔

انہیں کبھی کبھار اپنا آپ اس بت کی طرح محسوس ہوتا جس کے سامنے بیٹھ کر لوگ بڑے ادب سے اپنی خواہشوں اور حسرتوں کا اظہار تو کرتے ہیں۔ تکریم کی شیرینی میں بھیگے لفظوں سے ان کے قصیدے بھی پڑھتے ہیں مگر کوئی بھی ان کے ”منصب“ کی توہین اور بے حرمتی کے ڈر اور خوف کے باعث ان کے سامنے ہنسی مذاق کرنے، دوستانہ لہجے میں بات چیت کرنے سے کتراتا ہے۔ پہلے مہربانو اُن کے پاس تھی تو تنہائی یوں اس قدر محسوس نہیں ہوتی تھی مگر اب ان کے لیے دن گزارنا ایک مشکل اور انتہائی غیر دلچسپ امر بنا جا رہا تھا۔

تبھی ان کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال ابھرا تو وہ ماتھے پر سوچ کی لکھی سطروں کو نظر انداز کرتیں لمحہ بھر میں مسکرا دیں۔ کام مشکل تو ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا اور اس کام کو سر انجام دینے کے لیے انہیں سب سے پہلے شاہ سائیں کی مشاورت اور پھر ان کی تائید درکار تھی جبھی وہ فوراً پلنگ سے اتریں اور شاہ سائیں کو فون ملانے لگیں۔ صرف اس خیال کے آتے ہی ان کے خون میں جو حرارت اور سنسنی پیدا ہوئی تھی وہ اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ اگر یہ کام ہو جائے تو ان کی روکھی پھیکی اور بے رونق زندگی میں بھی زندہ رہنے کی لگن پیدا ہو سکتی ہے۔ یوں بھی ناممکنات کو ممکن بنانے یا ممکن بنا لینے کی خواہش میں جو لطف ہے وہ ان حسرتوں میں نہیں جو دو قدم کے حصول پر ہوں اور ملکانی سائیں نے اب کے یہ لطف اٹھانے کی ٹھان ہی لی تھی۔

☆☆☆

صحن میں دیوار کے ساتھ لگی کیاریوں کو پانی دیتی ثمینہ عملی اور ظاہری طور پر اس وقت مصروف ضرور تھی مگر ذہن کا پہیہ گھڑی کی سوئیوں میں اٹکا ہوا تھا۔

ب وقت ہوا اور وہ لڑکی جس نے اپنا نام زرمین بتایا اماں کے پاس پڑھنے کے لیے آئے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اسے گھر کے لیے کچھ کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ورنہ آج تک تو اس نے شاہ زین کو انتھک محنت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جس طرح وہ علی الصبح جاگنے کے بعد رات گئے تک محنت کرتا اور اس سے پہلے کالج کے زمانے میں بھی کالج شروع ہونے سے پہلے ہی دو ٹیوشنز پڑھا لیا کرتا تھا اور پھر اپنی کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد دوبارہ ٹیوشنز کا سلسلہ چلتا تو پھر رات گئے تک نہ رکتا۔

رزق اور محنت کے گرد طواف کرتے شاہ زین کو دیکھ کر اماں کا دل تو جو کڑھتا سو کڑھتا مگر خود ثمینہ کی بھی حالت ان سے مختلف نہ تھی کیونکہ جانتی تھی کہ گھر کے اخراجات اور کالج کی فیس وغیرہ ادا کرنا تو ایک طرف مگر شاہ زین کے ذہن میں ثمینہ کو رخصت کرنے کا بھی ایک واضح تصور موجود تھا۔ جسے حقیقت کا روپ دینے کے لیے وہ دن رات ایک کیے ہوئے تھا۔ ایسے میں ثمینہ کی شدت سے یہ خواہش ہوتی کہ کاش وہ بھی گھر کے لیے کچھ کر پاتی اور اپنے بھائی کا سہارا بن کر مکمل طور پر نہ سہی کسی حد تک اُن کا بوجھ اور فکریں کم کر پاتی۔

سو اب جب یہ وہ موقع اس کے ہاتھ آن لگا تھا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔ جلدی جلدی شام کے لیے کھانے کی تیاری بھی کر لی اور اماں کو چائے بھی بنا کر پلا دی۔ مگر ابھی تک زرمین کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ جبھی اٹھ کر پودوں کو پانی دیا۔ پیڈسٹل فین صحن میں رکھا اور اس سے پہلے فون کر کے اس کے بارے میں کچھ معلوم کرتی، ڈور بیل دینے کے ساتھ ہی نہ صرف زرمین اندر داخل ہوئی بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک نوجوان بھی یوں داخل ہوا گویا وہ دونوں پہلے بھی یہاں آتے رہے ہیں۔ انتہائی بے تکلفانہ انداز اور دوستانہ اطوار کے حامل یہ دونوں افراد اماں سمیت ثمینہ کو بھی چونکا گئے تھے۔

آج سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ان کے گھر کے اندر کوئی مرد داخل ہوا ہو یہاں تو پھر ابھی اتنا عرصہ نہیں گزرا تھا مگر سابقہ محلے میں بھی یہ دستور رائج تھا کہ اگر کسی کو کوئی بھی کام ہوتا تو باہر ہی نبٹا لیا جاتا کیونکہ اس امر سے بھی بخوبی واقف تھے کہ ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں اور شاہ زین اکثر ٹیوشنز کے سلسلے میں زیادہ تر وقت باہر ہی گزارتا۔ اسی لیے یہ پہلا اتفاق تھا کہ کوئی منہ اٹھا کر یوں ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اندر آ گیا ہو۔ ثمینہ کے لیے چونکہ یہ تمام صورت حال خلافِ توقع اور انوکھی تھی اسی لیے اس کی طرف سے کسی بھی قسم کا ردعمل آنے میں دیر لگی تب تک وہ اس کے اور اماں کے لیے گیٹ کے تھوڑا سا آگے رکھی کرسیوں پر ہی بیٹھ گئے۔

”السلام علیکم آنٹی!“

لاؤنج سے نکلتی اماں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں موجود حیرت کو یکسر کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے لڑکے نے خود ہی آگے بڑھ کر انہیں سلام بھی کیا اور ساتھ ہی ان کے سامنے سر جھکا دیا تو زرمین کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

”جیتے رہو، خوش رہو۔“

دعائیہ کلمات کے دوران ہی ثمینہ نے مزید دو کرسیاں وہیں لا رکھیں تو اماں بھی وہیں بیٹھ گئیں اور سوچا کہ اس لڑکے کو اپنے گھر کی اقدار بتائی جائیں مگر شاید وہ کچھ زیادہ ہی جلد باز تھا جبھی ان کے بولنے کا انتظار نہ کرتے ہوئے خود ہی بول پڑا۔

”آنٹی، میں دراصل آج صرف زرمین کو چھوڑنے آیا تھا اور نہ صرف اس کی بلکہ ہم سب کی ہی یہ خواہش ہے کہ یہ کسی طریقے سے بہترین نمبرز کے ساتھ کامیاب ہو جائے۔“

”ہاں، ہاں بیٹا! کیوں نہیں، محنت کرنے والوں کو تو اللہ بھی دوست رکھتا ہے اور مجھے امید ہے کہ زرمین! تم بہت اچھے نمبر لو گی اس دفعہ۔“ بات کرتے کرتے انہوں نے زرمین کو مخاطب کیا تھا۔

”جی آنٹی! کیوں نہیں۔“ جواباً زرمین مسکرائی۔

”اگر نیک نیتی سے پڑھانے والا استاد مل جائے

تو کوئی بھی امتحان مشکل معلوم نہیں ہوتا۔"

"صحیح کہا۔" اماں نے تائید کی۔

"ویسے ثمینہ آپ تو کافی ذہین ہیں۔" اماں سے دھیان ہٹاتے ہوئے اس نے ڈائریکٹ ثمینہ کو مخاطب کیا، تو وہ چونکی۔

"مگر آپ کو کیسے پتا؟"

"پتا تھا تو یہاں تک پہنچے ہیں نا۔" مسکراتے ہوئے بات کرنے کے دوران اس نے زمین کو دیکھا جو چاروں اطراف کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔

"ویسے آپ دونوں کیا اکیلی رہتی ہیں یہاں؟"

"نہیں بیٹا۔۔۔!" ثمینہ کے بجائے اماں نے جواب دیا۔

"ماشاء اللہ میرا بیٹا بھی ہے جو یہیں ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے لیکن دوپہر کو عموماً جاب کی وجہ سے گھر پر نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ تم پہلے لڑکے ہو جو گھر کے اندر تک آ کر یوں بیٹھے ہو ورنہ اس کی موجودگی میں بھی ایسا اتفاق کم ہی ہوتا ہے۔"

اماں نے تفصیلاً آگاہ کیا۔

"لیکن آنٹی یہ تو کچھ عجیب سی بات ہے کہ دوست آئیں اور باہر سے ہی بھگتا دیے جائیں۔" زمین نے یہاں وہاں نظر دوڑانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

"ہاں بیٹا! بات تو یقیناً عجیب سی ہی لگے گی اگر دوست آئیں تو۔۔۔"

اماں نے بات ادھوری چھوڑی تو دونوں کی استفہامیہ نظریں ان کے چہرے پر آرکیں۔ ثمینہ اسی دوران مشروب لے کر آئی اور خود سرو کرنے کے بجائے سامنے ٹیبل پر ٹرے رکھی، سب سے پہلے اماں کی طرف گلاس بڑھایا اور باقی دونوں نے رسمی طور پر کیے گئے اصرار کا انتظار نہ کرتے ہوئے خود ہی اپنے لیے گلاس تیار کیا اور ایک ایک گھونٹ کر کے پینے لگے۔

"کیا مطلب آنٹی؟"

"بیٹا میرا مطلب یہ ہے کہ شاہ زین نے اتنے دوست بنائے ہی نہیں ہیں کہ کوئی گھر تک آئے۔"

"ہوں۔۔۔"

ثمینہ نے معنی خیز انداز میں ان دونوں کی نظروں کا ٹکراؤ ہوتے دیکھا۔

"اس کا مطلب تو ظاہر ہے یہ ہے کہ آپ کو اس وقت میرا آنا اور یوں بیٹھنا ہرگز اچھا نہیں لگ رہا ہوگا۔"

"گھر آیا مہمان تو بیٹا سر آنکھوں پر، لیکن دراصل ہر گھر کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے نا، تو بس یوں سمجھو کہ ہمارے گھر کا ماحول ذرا مختلف ہے۔"

انتہائی نرم لفظوں اور مناسب لہجے میں اماں نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ ان کے گھر کے قاعدے قانون کیا ہیں۔

"اوکے جی، میں تو پھر چلتا ہوں۔ میں ویسے بھی آج اس کا پہلا دن ہونے کی وجہ سے ساتھ چلا آیا تھا ورنہ تو اتنا ٹائم ہی نہیں ملتا۔" گلاس رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اماں نے چند الوداعی اور دعائیہ کلمات کہے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر رخصت کیا اور اس کے جانے کے بعد وہ تینوں اٹھ کر لاؤنج میں آ گئیں۔

مگر ایک چیز جو انہیں حیران کیے دے رہی تھی وہ اس کا بے تکلفانہ انداز تھا کہ اندر آتے ہی سب سے پہلے اس نے ثمینہ سے اپنا گھر دکھانے کی درخواست کی اور اس کی ہامی بھرنے پر اپنا شولڈر بیگ وہیں صوفے پر رکھا اور ثمینہ کے ساتھ سارے گھر کا جائزہ لینے لگی۔ کچن میں داخل ہوئی تو وہی ٹرے جو ثمینہ ان کے لیے باہر لے کر گئی تھی اور اندر آتے ہوئے اس نے گلاسوں کو بغیر دھوئے ٹرے کو ویسے ہی سلیب پر رکھ چھوڑا تھا، زمین نے دیکھا تو ثمینہ کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود اس کے کسی حکم کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے گلاس اور ٹرے دھو کر اسپنج سے سنک کو خشک تک کر دیا اور پھر تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔

میں اور تم صرف ایک اسٹوڈنٹ اور ٹیچر کی طرح تو نہیں رہیں گے۔۔۔ ہم دوست بھی تو بن سکتی ہیں نا۔"

ثمینہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے مسکرائی۔

"ہاں کیوں نہیں، دوستی ہوگی تو پڑھائی کا مزا بھی آئے گا۔"

"بس تو پھر آج سے ہماری دوستی پکی۔"

زمین نے اس کے سامنے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا اور ثمینہ نے اسے تھامتے ہوئے دوستی کی ابتدا ہونے کا یقین بھی دلا دیا۔

☆☆☆

کچھ پنچھی جھنڈ میں اڑتے ہوں
اور رستہ بھی کچھ مشکل ہو
کچھ دور افق پر منزل ہو
اک پنچھی گھائل ہو جائے
اور بے دم ہو کر گر جائے
تو رشتے، ناتے، پیارے سب
کب اس کی خاطر رکتے ہیں
اس دنیا کی ہے ریت یہی
جو ساتھ چلو تو ساتھ بہت
جو رک جاؤ تو تنہا ہو

یوں بھی آج کل محبتوں سے گندھے ان خوب صورت رشتوں پر بدگمانیوں اور رنجشوں کی دھول پڑ چکی ہے اور اگر رشتوں پر بدگمانیوں کی گرد پڑنے لگے تو آنکھیں وہ بھی دیکھنے لگتی ہیں جو وقوع پذیر نہیں ہو رہا ہوتا، سماعتوں میں ان لفظوں کی چاپ بھی سنائی دینے لگتی ہے جو کبھی ادا ہوئے ہی نہ تھے، ایسے میں جب تک یہ گرد صاف نہ ہو، دل کچھ بھی اور سننے یا ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ دلوں میں پیدا ہونے والی بدگمانی کی باریک سی لکیر آخر کار نفرت کی ایک بڑی دراڑ کی جگہ لے لیتی ہے اور پھر وہ محبتیں جن کے بغیر جینا تو دور اس امر کے بارے میں سوچنا بھی محال لگتا ہو، قصہ پارینہ بن کر آہوں اور سسکیوں میں بکھری رہتی ہیں یہ سب ندی کے ساتھ ہو رہا تھا۔

امی بستر پر پڑی تھیں، ناصر بھائی اور عائشہ ڈاکٹر کے ساتھ کھڑے تھے جبکہ وہ خود امی کے بیڈ پر ہی بیٹھی ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے خالی خالی نظروں سے ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

گالوں کی جلد لٹک گئی تھی تو آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے آمد کے ساتھ ان کی آنکھوں کو بھی اندر دھنسا گئے تھے۔ ہاتھوں کی گہری سبز نسیں اس حد تک نمایاں تھیں کہ انگلیوں سے پہلے نظر اُن پر جا رکتی۔

"انہیں یقیناً بہت گہرا صدمہ ہوا ہے۔"

ڈاکٹر نے ناصر بھائی کو دوا کا پرچہ تھماتے ہوئے مخاطب کیا۔

"اسی وجہ سے اتنی لمبی بے ہوشی ان کے حواس پر طاری رہی مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ فی الحال یہ سو رہی ہیں۔ جب تک یہ خود نہ جاگیں، کسی قسم کے شور، آہٹ یا کھٹکے سے اچانک ان کی آنکھ نہ کھلے تو بہتر ہے۔"

"جی بہتر۔" ناصر بھائی نے دوا کے پرچے پر نظریں جمائے کہا۔

"اس وقت یہ اس ذہنی اسٹیج پر ہیں جہاں کوئی بھی انہونی، کوئی غیر متوقع عمل یا صدمہ ان کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔۔۔ اس لیے جس قدر خوش رکھ سکتے ہیں اتنا انہیں خوش رکھیے۔"

ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر اچانک ہی لاشعوری طور پر ندی اور ناصر بھائی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں ہی کو نظریں چرانی پڑیں۔

اور پھر اس دن باوجود اس کے کہ ندی بھی امی کے دائیں طرف بیٹھی بدستور ان کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ ناصر بھائی بھی دوسری طرف آ کر بیٹھ گئے۔ دھیرے سے ان کا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگے۔ نظروں کا مرکز البتہ امی کا چہرہ ہی تھا۔ جو گہری نیند میں ہونے کی وجہ سے بے حد پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

ناصر بھائی کی دیکھا دیکھی عائشہ بھابھی بھی کچھ دیر تو وہاں رکیں مگر پھر ناصر بھائی کے جلد نہ اٹھنے کے

ارادے کو بھانپتے ہوئے کب کی تو نظروں سے ندی کو دیکھتی آخر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

کتنے ہی عرصے کے بعد آج یوں ناصر بھائی اور ندی ایک ساتھ ایک جگہ پر موجود تھے۔ لمحہ بھر کو ندی کا دل تو ضرور چاہا کہ اٹھ کر اُن سے اپنے سابقہ انداز میں مخاطب ہو۔ ان کے لیے اپنے دل میں موجود سارا غصہ نکال کر ان کے کندھے پر سر رکھ کر اتنا روئے کہ شک، بدگمانی، غلط فہمی اور کدورتوں کے جتنے بادل ان کے سامنے تھے سب ایک ہی دفعہ میں کھل کر یوں برسیں کہ مطلع نکھر جائے۔

مگر ایسا نہ ہوسکا۔

کچھ اس کو بھی عزیز ہیں اپنے سبھی اصول
کچھ ہم بھی اتفاق سے ضد کے مریض ہیں

خود ناصر بھائی جتنی دیر وہاں موجود رہے۔ ذہن کے پردے پر صرف ندی ہی کا بچپن گھومتا رہا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک گھر کا ماحول کس قدر خوب صورت تھا۔ اور ندی ان کے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی اور پھر ندی نے جس طرح ان کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی ان تمام باتوں نے ان کے دل کو ایک بار پھر پارہ پارہ کر دیا تھا۔

ای کے کمزور اور نحیف چہرے سے ہوتی ہوئی ان کی نظر ندی کے زرد اور مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑی تو دل جیسے برف کا ٹکڑا ہوتا محسوس ہوا، آج کتنے ہی عرصے بعد انہوں نے ارادتاً ندی کو دیکھا تھا جس کے بغیر رات کا کھانا کھانا ایک ناقابل تصور عمل تھا۔ جسے دیکھے بنا انہیں رات کو نیند نہیں آتی تھی اور جس کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے اب اسے مخاطب بھی نہیں کرتے تھے۔ مسکراتی آنکھوں والی ندی اب وہ ندی تو لگ ہی نہیں رہی تھی جس کی آنکھوں کو عموماً لوگ کانچ سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ اب آنکھوں کے پپوٹے سرخ اور سوجے ہوئے تھے تو وہی کانچ بری طرح دھندلائے ہوئے تھے۔

لیکن دل کے بری طرح بھیج جانے کے بعد انہوں نے ندی ہی کو اس تمام صورت حال پر مورد الزام ٹھہراتے ہوئے بات کرنے کا خیال ترک کرتے ہوئے پھر سے امی پر نظریں مرکوز کر دی تھیں۔ جن کی طرف سے ہلکی سی حرکت محسوس ہونے پر جہاں ناصر بھائی کے دعا کرتے لب تیزی سے ہلنے لگے تھے وہیں ندی بھی اٹھ کر ان کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

چند لمحوں بعد انہوں نے آنکھیں کھولنے پر دونوں کو اپنے لیے متفکر اور سامنے موجود پایا تو ایک گہری سانس کے ساتھ آنسو خود بخود یہاں سے وہاں لڑھکنے لگے۔

☆☆☆

تعلق بعد میں تبدیل ہو کر جو بھی رہ جائے
محبت میں وہ پہلا مسکرانا یاد رہتا ہے
کسی کی لاکھ باتیں ایک پل میں بھول جاتی ہیں
کسی کا ایک ہی جملہ پرانا یاد رہتا ہے

میری نے اس دن ملکانی سائیں سے فون پر مہربانو کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت کیا کہہ کر لی اور کس طرح لی تھی یہ تو اسے معلوم نہیں تھا مگر ہاں اتنا ضرور تھا کہ میری موبائل ہاتھ میں لیے روم سے باہر نکلی تھی اور پھر چند ہی لمحوں بعد جب مسکراتے ہوئے اندر آ کر اس نے مہربانو کے کان سے فون لگایا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ موبائل میری کا اور آواز ملکانی سائیں کی۔

ناسمجھی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے میری کو دیکھا جو فرضی کالر جھاڑ رہی تھی۔

"میکوں فخر ہے مہربانو! کہ توں اتنی دور ہو کے بھی اساں کی مرضی اور پسند ناپسند دا کتنا خیال رکھتی ہے۔"

"اماں سائیں! یہ تو میں شروع ہی سے ایسا ہی کرتی ہوں۔"

"پتا ہے پتا ہے۔ اوپراب ساریاں باتوں کو چھوڑ کے اپنی دوست کے ساتھ چلی جائیں۔ اچھے دل کی لڑکی ہے۔ بڑیاں منتاں کر رہی تھیں بے چاری۔"

"ٹھیک ہے اماں سائیں! جیسے آپ کی مرضی۔"

اس کے فون بند کرنے کی دیر تھی کہ میری "یاہو" کا نعرہ لگاتی ہوئی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"پھر بتاؤ، مان گئیں نا مجھے؟"

"میں تو شروع سے ہی تمہارے ماننے والوں میں سے ہوں۔"

مہربانو ہلکا سا مسکرائی۔

"پتا ہے بعض اوقات ہم خوامخواہ ہی خود پر دوسروں سے دو قدم آگے بڑھ کر پابندیاں لگا لیتے ہیں۔ اپنے ہی ہاتھوں سے خود پر زندگی تنگ کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم یہ سب کسی اور کی خوشی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں حالانکہ ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسی دھن میں ہم انتہا کو چھو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ریس میں اول نمبر پر آنے والا امیدوار ونگ ربن کراس کر لینے کے باوجود بھی بھاگتا ہی چلے جائے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کا یہ بھاگنا اب کسی شمار میں نہیں۔"

"اوئے ہوئے، میری آج تو بڑا فلسفہ سوجھ رہا ہے۔"

کنول نے اندر داخل ہو کر دھلے ہوئے کپڑے ان دونوں اور اپنے سامنے الگ الگ کر کے رکھے اور اسی دوران حیرت سے میری کی بات چیت بھی غور سے سنی گئی۔

"بس میں چاہ رہی تھی کہ ہماری یہ پیاری سی دوست ابنارمل نہ رہے۔" میری نے ذومعنی انداز میں مہربانو کو دیکھا۔

"ابنارمل؟"

کنول کپڑوں کی تقسیم کے بعد اب اپنے کپڑے تہ کر رہی تھی۔

"تو اور کیا یار! چرچ جانے کا کہا تو منع کر دیا، اس دن آئس کریم پارلر میں اتنا ہینڈسم بندہ جان بوجھ کر ان کے پاس کھڑا رہا، پھر پیچھے کتاب دینے کے بہانے سے آیا بھی مگر یہ محترمہ تو جیسے وہاں موجود ہی نہیں تھیں۔"

میری کی بات پر کنول کھلکھلا کر ہنسی۔

اسی پل مہربانو کو بھی اس لمبے چوڑے نوجوان کا اپنے پاس کھڑا ہونا اور خوامخواہ بات کرنے کی کوشش کرنا یاد آیا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی اور اس کا یوں مسکرانا فوراً میری کی نظروں نے پکڑ لیا۔

"اب تو بڑا مسکرا رہی ہو، اس وقت تو یقین مانو ایسا لگ رہا تھا جیسے ہونٹوں پر پپڑی جم گئی ہو، گالوں پر زردیوں کے ڈیرے اور آنکھوں میں وحشت کے سائے۔۔۔ اف اف اف۔۔۔"

میری نے جان بوجھ کر کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی کر دی تھی۔

"اچھا تو تمہارا کیا خیال تھا کہ اسے پکڑ کر قاضی صاحب کے پاس لے جاتی۔" کنول نے میری سے رائے طلب کی۔

"قاضی تک نہ سہی مگر بات چیت تو سہولت سے کر ہی لیتی نا، کیا پتا اسی سے آگے جا کر بات بن جاتی۔"

میری کی بات پر مہربانو کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی اور یہ سچ تھا کہ وہ بندہ پہلی دفعہ میں ہی اس کے دل پر دستک دینے میں کامیاب بھی ہوگیا تھا مگر اس سے کہیں بڑا سچ یہ تھا کہ وہ اس دل کی چابی اپنے گھر والوں کے حوالے کر آئی تھی۔

"ویسے یار! یہ جو لڑکے ہوتے ہیں نا عجیب مخلوق ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے ایسی لڑکیوں کی کوئی ویلیو نہیں ہوتی جو آسانی سے ان کی دسترس میں آجائیں۔ یہ لوگ ہمیشہ دشوار گزار پہاڑیاں سر کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور پھر ان کی قدر بھی کرتے ہیں۔"

کنول نے اپنی دانست میں مہربانو کی طرف سے جواب دیا تھا۔

"شاباش، یعنی ایک نہ شد دو شد، میں خدانخواستہ تم لوگوں کو ہر ایرے غیرے کے ساتھ فری ہو جانے کو نہیں کہہ رہی، میں تو اسے صرف یہ سمجھا رہی تھی کہ لڑکا اچھا ہے۔ اب اگر کہیں ٹکراؤ ہو تو رسمی سلام دعا میں کوئی حرج نہیں۔۔۔ مگر مجال ہے جو اس نے مسکرانے کے علاوہ کوئی اور جواب دیا ہو۔"

میری کے منہ بسورنے پر اب مہربانو نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

''تم اچھا یہ سب باتیں چھوڑو، اور یہ بتاؤ چرچ کب جانا ہے؟ کنول کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

''ہاں شیور، کیوں نہیں۔''

مہربانو کے موضوع بدلنے پر میری نے بھی اپنا موڈ بدلا تھا۔

''چرچ جانا ہے؟ کیوں خیر تو ہے؟''

کنول کے یوں حیرت کا اظہار کرنے پر میری نے واضح طور پر برا منایا تھا۔

''تم لوگ مسجد جاتے ہو تو کوئی پوچھتا ہے کہ مسجد کیوں جا رہے ہو؟ خیر تو ہے؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل آج تک پہلے کبھی تم گئی نہیں نا تو بس اسی لیے پوچھ لیا کہ پہلے تو کبھی ذکر تک نہیں ہوا چرچ جانے کا اور اب ایک دم۔۔۔'' کنول نے وضاحت کی۔

''مگر پھر بھی اگر تمہیں برا لگا ہو تو آئی ایم ریئلی سوری۔''

''اٹس اوکے، مجھے پتا ہے تم نے کس سوچ سے کہا تھا۔''

''شکر ہے تم سمجھ گئیں، ورنہ میں تو سوچ رہی تھی ایسا نہ ہو مذہب کے نام پر اس کمرے میں بھی سرد جنگ کا آغاز ہو جائے۔'' مہربانو نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''ہاں، ایسا ضرور ہوتا، اگر ہمارے پیچھے بھی کوئی بیرونی ہاتھ ہوتا۔''

میری نے مسکراتے ہوئے بڑی گہری بات کی تھی۔

☆☆☆

امی نے لاکھ چاہا تھا کہ ابھی ندی کو ناصر بھائی کے ارادوں کی بھنک نہ پڑے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ناممکن تھا۔ ان کی طبیعت خرابی کا سن کر ثروت آپا سسرال سے آئی ہوئی تھیں اور ان کے کمرے میں ہی بیٹھی تھیں جب انہوں نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔

ورنہ اس سے پہلے تو ندی کے علم میں تھا ہی نہیں کہ امی کو آخر بیٹھے بٹھائے ہوا کیا۔ وہ تو اپنی طرف سے یہی فرض کیے بیٹھی تھی کہ مسلسل ٹینشن کی وجہ سے آخر کار ان کے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ مگر اب بھید کھلا تو حیرت کے مارے گنگ ہونا تو فطری تھا کہ وہ اس انتہائی قدم کی توقع ہرگز نہیں کر رہی تھی ان سے۔

''امی! ناصر بھائی نے مجھے بھی جلد از جلد ندی کی شادی کے لیے کوئی رشتہ لانے کا کہا ہے۔ لیکن اب ظاہر ہے میں بھی کیا کروں، ابھی تو بات تازی ہے ابھی ہے بھی لوگوں کے ذہن میں ندی کی تصویریں موجود ہیں اور پھر ادھیڑ عمر، دوسری شادی والے، رنڈوے غرض یہ کہ کتنے ہی لوگوں نے بھی خود مجھے انکار کر دیا ہے۔ صرف یہ کہہ کر اندھی، بہری یا لنگڑی کسی بھی طرح کی عورت سے شادی کرنا تو پھر بھی انہیں منظور ہے مگر ایک اخباری شہرت والی لڑکی کو اپنا ساتھ تو کیا اپنا نام بھی نہیں دے سکتے۔'' امی کے بے جان اور فق ہوتے چہرے کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے ثروت آپا خدا جانے کون سی بھڑاس تھی جو ان لفظوں کے ذریعے نکال باہر کرنے پر تلی تھیں۔

''آپا! آپ کہہ کیا رہی ہیں؟ پتا بھی ہے آپ کو؟''

ندی نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''وہی تو کہا ہے نا جو حقیقت ہے، اور پھر تم خود سوچو میں بھی سسرال میں ہوں۔ جن لوگوں کو تمہاری اس پھیلی ہوئی اسٹوری کا نہیں بھی پتا ہوتا میرے سسرال والے باتوں باتوں میں خود ہی کچھ ایسی بات کر جاتے ہیں کہ لوگ وہیں پر بات ختم کر کے آگے بڑھنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

انہوں نے ہاتھ مسلتے ہوئے اپنی مجبوری ظاہر کی تو ندی زچ ہو گئی۔

''اوہو مگر کیوں کر رہی ہیں آپ یہ سب، جب مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔''

نہیں کرنی تو پھر کیا کرنا ہے؟''

''مجھے یونیورسٹی جانا ہے آپا! بات سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔''

ایک سیدھی سادی بات سمجھانے میں اسے کس قدر پیچیدگی کا سامنا تھا۔ اس امر کا بخوبی اندازا اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب اس کے الفاظ کہیں اس کے حلق میں ہی پھنستے محسوس ہونے لگے تھے۔

امی اس دوران خاموشی اختیار کیے بس قدرت کے بدلے حالات کا مشاہدہ ہی کرتی رہیں۔

''یونیورسٹی جانے کا خیال تو میری بہن اب تم دل سے نکال ہی دو۔'' بات سمجھانے کے انداز میں انہوں نے نرم لہجہ اختیار کیا۔

''ناصر بھائی تمہاری جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے ہر ایک جاننے والے سے تمہارے رشتے کے لیے کہہ رکھا ہے۔''

''اس لیے اتنا لاڈلا رکھا تھا مجھے کہ اب آ کر ساری کسر نکال دیں گے۔'' ندی نے تڑپ کر کہا۔

''اب کہاں ہے آپ لوگوں کا پیار، اب بھی تو میں وہی ندی ہوں نا، پھر آپ لوگ سب میرے لیے کیوں بدل گئے ہیں، میرا اعتبار کیوں نہیں رہا آپ لوگوں کو، خدا کے لیے آپا! کم از کم آپ تو انہیں سمجھائیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔''

ندی بات کرتے کرتے ضبط کی آخری منزل پر تھی۔ باوجود اس کے کہ گلا رندھ گیا تھا مگر پھر بھی آنسو ابھی تک پلکوں پر ہی اٹکے ہوئے تھے۔

''کوئی بھی کیسے یہ بات مان سکتا ہے ندی کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ جب تمہاری اور اس لڑکے کی ہوٹلوں میں کھنچی گئی تصویریں، مختلف کیفے ٹیریاز میں اور پکنک پوائنٹس پر انتہائی کلوز ہوتی تصویریں ساری دنیا نے دیکھی ہیں اخباروں میں۔۔۔ تو پھر بتاؤ کوئی کیسے یقین کرے اور بندہ کس کس کو یقین دلائے۔۔۔ میرا تو اپنا سر جھک گیا ہے سسرال میں۔''

''میں آج کے بعد کسی کو بھی یقین نہیں دلاؤں گی۔ میرا انصاف اب خدا کرے گا اور بس ٹھیک ہے میں اس کے ساتھ بے حد بے تکلف تھی مگر صرف اتنی ہی جتنی مجھے معلوم تھا کہ ہمارے گھر میں برا نہیں سمجھا جائے گا۔ اس سے آگے میں نے نہ تو اپنی کوئی بھی حد پھلانگی اور نہ ہی کبھی ایسا سوچا تھا۔''

ثروت آپا نے سرسری انداز میں اسے دیکھا۔

''اگر آج میں اس تمام دور سے گزر رہی ہوں تو بھی آپا مجھ سے کہیں زیادہ ذمہ دار آپ سب ہیں، میں نہیں۔ بچے تو پانی کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کے بڑے انہیں جس برتن میں ڈال دیں وہ اسی Shape میں ڈھل جاتے ہیں۔ مجھے شروع ہی سے آپ لوگوں نے جس طرح پالا میں ویسی ہی بن گئی۔ اب۔۔۔ اب آ کر آپ کو وہ سب برا لگنے لگا ہے تو کیوں؟''

''اور امی۔۔۔!''

ثروت سے بات کرتے ہوئے اس نے ایک دم ہی امی کی طرف رخ موڑا اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے کٹورے، ہتھیلی کی پشت سے مسل ڈالنے کے بعد بولی۔

''آپ ہی تو کہتی تھیں نا کہ خصوصاً بیٹیوں کو پانی کی مانند ہونا چاہیے کہ جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لیں، برف کی طرح نہیں ہونا چاہیے انہیں۔

پھر بتائیں نا امی میری کیا غلطی؟ ناصر بھائی کو آج سے پہلے ان باتوں کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ اب مجھے کیوں سزا دی جا رہی ہے۔''

''ندی! ناصر بھائی جو کر رہے ہیں وہ صرف اور صرف تمہارے بھلے کے لیے کر رہے ہیں اور کچھ غلط بھی نہیں کر رہے۔'' ثروت آپا ابھی تک اپنے نقطے پر اڑی تھیں۔

''تم خود سوچو، ان کا تو سارا سارا دن لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، جانے کیسے کیسے سوالات کا سامنا کرتے ہوں گے اکثر۔۔۔ اور یہ تو امی بھی جانتی ہیں، تم بھی اور میں بھی کہ غیرت کی بات آنے پر تو لوگ قتل تک کر ڈالتے ہیں۔'' اتنے سفاک انداز پر امی نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"تم تو ثروت ایسا نہ کہو اور وہ بھی اپنی گڑیا شہزادیوں جیسی بہن کے لیے۔"

ثروت آپا کی بات پر حقیقی معنوں میں امی کو تکلیف پہنچی تھی۔ حالات کس طرح اور کس نہج پر جارہے تھے اور وقت ریت کی طرح کتنی تیزی سے ان کی مٹھی سے پھسلتا جارہا تھا۔ اس بات کا اندازا اب انہیں بہت اچھی طرح ہوچکا تھا۔

"یہ سب میں صرف اسے اور آپ کو سمجھانے کی نیت سے کہہ رہی ہوں۔ امی۔۔۔! آپ کو تو پتا ہے نا ناصر بھائی کا غصہ کتنا تیز ہے اور اس پر اتنا بڑا واقعہ۔"

"یہ واقعہ آپا اتنا بڑا نہیں تھا جتنا آپ سب نے مجھے تنہا کھڑا کرکے بڑا بنادیا ہے۔"

"اس لیے کہ ہماری آنکھوں میں ابھی کچھ شرم باقی ہے اور دنیا والوں کے سامنے جوابدہ ہیں ہم لوگ۔"

"لیکن ثروت! ایک بات تو بتاؤ۔"

امی کے مخاطب کرنے پر دونوں کی توجہ اب مکمل طور پر ان پر تھی۔

"کبھی دنیا سے سوال جواب کرتے اپنے ضمیر کا بھی کوئی سوال سنا تم نے؟ دیا ہے کوئی جواب اسے بھی؟"

امی کی آواز میں نقاہت بھی تھی اور بات کرتے ہوئے لہجے کی مضبوطی بھی مفقود تھی۔ ندی کا دل چاہا تھا اس لمحے وہ ثروت آپا کو ہاتھ سے پکڑ کر اس کمرے سے باہر نکال دے تاکہ وہ مزید ان کی دل گرفتگی کا باعث نہ بن سکیں اور پھر ان کے گلے لگ کر ڈھیر سارا روئے، اتنا کہ بس پھر حاجت نہ رہے۔

"میں تو اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہ رہی تھی امی! ورنہ نکاح تو اس کا دو دن میں ہو ہی جانا ہے۔۔۔ اور پھر آپ خود سوچیں۔۔۔" ایک بار کھڑی ہو کر وہ دوبارہ بیٹھ گئی تھیں۔

"اس میں ندی ہی کا بھلا ہے۔ ایک بار شادی ہوگئی تو کسی کی جرأت نہیں ہوگی اس پر انگلیاں اٹھانے کی اور فقرے کسنے کی۔۔۔ ایک مضبوط سائبان مل جائے گا اسے۔"

ثروت آپا ابھی ندی کی شادی کے مزید فوائد گنوانا چاہتی تھیں مگر امی نے اُن کی بات کاٹ دی۔

"اور اس سائبان کا کیا؟ جو سر پر ہوتے ہوئے بھی یوں بے دردی سے چھینا جارہا ہے۔ میری معصوم سی پھولوں جیسی بچی کو تم لوگ بے سائبان کررہے ہو تمہارا دل نہیں کانپتا؟"

امی کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔

"اور پھر تم خود یہ بات سمجھو ثروت اور ناصر کو بھی سمجھاؤ کہ کیا عزت ہوگی اس کی سسرال میں، جہاں تم لوگ اسے یوں چھپتے چھپاتے ایک مجبوری کے سودے کی طرح بھیج رہے ہو۔"

"واہ امی واہ۔۔۔ میں تو مان گئی آپ کو۔"

ان کے طنزیہ انداز پر ندی نے برہمی سے انہیں دیکھا تھا۔

"ندی جو ابھی سسرال کی دہلیز سے بھی شاید میلوں دور کھڑی ہے اس کی عزت کے لیے اتنی فکر اور میں جو بھرے سسرال میں صرف اس کی وجہ سے سر جھکائے رہتی ہوں میرا تو کوئی خیال نہیں آیا نا آپ کو۔"

اب کے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"سب کی ناک کٹوادی اور اب بھی آپ اسے اپنے سر پر تاج کی طرح سجائے رکھنا چاہتی ہیں تو معاف کیجیے گا مگر اب ایسا ممکن نہیں لگتا ہے۔"

اور تب ندی کو اس بات پر یقین آگیا تھا کہ رشتے خون کے نہیں احساس کے ہوتے ہیں۔ آج اسے اپنے ہی بہن بھائیوں کے سگے ہونے پر شک ہوا تھا۔ جن میں رشتوں کا احترام تو دور ایک سنی سنائی بات کو سچا یا جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کسی بھی اقدام تک کو ناگوار نہیں کہا گیا تھا۔

جو دیکھا اور جو سنا بس اس کو سچ مان لیا۔ بغیر کسی تحقیق کے بنا اس کا پس منظر جانے۔ کبھی تو اسے یوں لگتا کہ شاید یہ سب ہوا ہی اسی لیے تھا کہ ان سب کی محبت کے سچے اور وقتی ہونے کا پتا چل پائے۔ لیکن

کچھ بھی تھا حقیقت تمام تر تلخی اور سختی کے باوجود ایں کے سامنے حالات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی اور اب آخری حد تک جانا ہی ندی کے نزدیک تمام مسائل کا واحد حل تھا۔

☆☆☆

جدا ہوں، دور ہوں، انجان بن جائیں ہم کتنے ہی
ہوائیں دوست ہیں اپنی
ہماری رازداں بھی ہیں
تمہارے ہونٹوں پر کھلی کلی جیسی ہنسی آئے
تو میرے چاروں جانب جلترنگ سی بجنے لگتی ہے
ہوائیں رقص کرنے لگتی ہیں تو یونہی درختوں پر
فضا میں پنچھیوں کے منہ اچانک چوم لیتی ہیں
میں بھی جھوم جاتی ہوں
لب مسکانے لگتے ہیں
تب میں جان لیتی ہوں
ہوائیں رابطے میں ہیں
تمہاری آنکھ کا ساحل جو گیلا ہو
ہوا میں جانے کیوں اک دم نمی سی بڑھنے لگتی ہے
موسم درد بھرنے لگتے ہیں میری نگاہوں میں
ستارے چھپ سے جاتے ہیں بادل کی پناہوں میں
تب میں جان لیتی ہوں
ہوائیں رابطے میں ہیں
تمہاری آنکھ کے آنسو بھی
مجھ تک کھینچ لاتی ہیں
تم بھی جان لو جاناں
کہ ایسے وقت میں اکثر
اکیلے تم نہیں روتے
میری آنکھیں بھی روتی ہیں

شاہ زین آج صبح بھی جب جاگا تو طبیعت بوجھل سی تھی۔ حالانکہ کل رات تک ایسی کوئی پریشانی اس کے ذہن کا احاطہ کیے ہوئے نہیں تھی جس کے باعث وہ یوں بوجھل ذہن اور بھاری دل کے ساتھ جاگتا۔

دل چاہ رہا تھا کہ آج فیکٹری نہ جائے اور گھر سے نکل کر یونہی بلا ارادہ چلتے ہوئے کسی سرسبز شاداب جگہ پر جا پہنچے اور بس وہیں بیٹھا رہے۔ حالانکہ پہلے وہ جتنا بھی ڈپریس ہوا کبھی اس نے فیکٹری نہ جانے کا نہیں سوچا تھا اور یہی وجہ تھی کہ آج اس کے لیے اس کیفیت کا تدارک کرنا نہایت مشکل معلوم ہورہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جیسے تیسے فیکٹری گیا اور معمول کے مطابق تمام کام سرانجام دینے کی کوشش بھی کی مگر ہلکے انگوری رنگ کے خوب صورت لباس کو دیکھ کر جو ندی کی طرف دھیان گیا تو اسے لگا کہ شاید آج وہ ندی ہی کی وجہ سے پریشان ہے۔ یوں بھی اس نے ندی کے بارے میں سوچنے کے متعلق خود پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی سو جب چاہتا اسے دیر تک سوچا کرتا۔

مگر آج اس کے اندر ایک عجیب سا احساس تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا نقصان ہونے جارہا ہو، کوئی چیز چھن جانے کا ڈر، کچھ پرایا ہوجانے کا خوف۔۔۔ مگر یہ سب کیوں؟"

سارا دن تو جیسے تیسے گزارا ہی، گھر آیا تو ثمینہ زرمین کے متعلق اسے سب کچھ بتانے پر بے چین نظر آئی۔

"بھائی، مجھے تو لگ رہا تھا جیسے اسے پڑھنے سے کوئی غرض نہیں ہے اور نہ ہی وہ ہمارے گھر پڑھنے آئی ہے۔"

ٹیبل پر کھانا رکھتے ہوئے ثمینہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تو حقیقتاً چند لمحوں کے لیے شاہ زین کا ذہن دن بھر کی اداس کردینے والی کیفیت سے دور ہوتا محسوس ہوا۔

"تو پھر کس لیے آئی تھی؟"

"اللہ جانتا ہے، ہوسکتا ہے مجھ سے دوستی کرنے کی وجہ سے آئی ہو۔" ثمینہ نے مسکرا کر اماں کو دیکھا۔

"ہاں بیٹا! انداز تو کچھ عجیب سا ضرور تھا۔ اتنی بے تکلف اور اس قدر کھلا ڈلا انداز تھا کہ لگتا تھا وہ ہمارے گھر نہیں آئی بلکہ ہم دونوں اُس کے گھر میں آئے بیٹھے ہیں۔"

"ہوں۔" شاہ زین نے گہری سانس خارج کی

تھی۔

''رہتی کہاں ہے؟ کچھ اس کی فیملی کے متعلق بھی پوچھا تم نے؟''

''بھئی وہ اس قدر باتونی ہے کہ کسی اور کی سنتی ہی کہاں ہے، اماں تو اپنی نماز وغیرہ میں مصروف ہو گئی تھیں تا کہ میں اسے دھیان سے پڑھا سکوں مگر مجال ہے جو اس نے ایک لفظ بھی پڑھا ہو۔۔۔ کتاب تک نہیں کھولی اس نے۔''

بڑے دلچسپ انداز میں بار بار حیرت کا اظہار کرتی ثمینہ مزے لے لے کر اسے ساری باتیں بتا رہی تھی۔

''دو گھنٹے تک مجھے تو بس بولنے کی ہی آوازیں آتی رہیں۔''

ثمینہ کے انداز میں جھلکتی خوشی محسوس کرتے ہوئے اماں نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''ہاں تو اور کیا، وہ تو بس مجھ سے میرے اور آپ دونوں کے متعلق ہی پوچھتی رہی۔ کہہ رہی تھی اسکول کالج میں بھی تو پہلے دن صرف انٹروڈکشن چلتا ہے اور پھر پڑھائی اگلے روز سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے آج کا دن ہم بھی صرف باتیں ہی کریں گے اور پھر پڑھائی اگلے روز سے ہوگی، میں نے کہا ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔'' ثمینہ نے کندھے اچکائے اور سالن کا ڈونگا اماں کی طرف بڑھانے کے بعد خالی پلیٹ بھی ان کے سامنے رکھ دی۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر دھیان سے ہاں، آج کل کسی کا اعتبار نہیں ہے۔''

''ہاں میں نے بھی اسے یہی سمجھایا ہے۔''

اماں نے شاہ زین کی بات کی تائید کرتے ہوئے پلیٹ اس کے آگے رکھی۔

''ویسے اماں! ایک بات کہوں۔''

''ہاں بولو بیٹا! آج کچھ الجھے الجھے لگ رہے ہو۔''

''میں سوچ رہا تھا کیوں نا کل پرانے گھر کا ایک چکر لگا لیں۔''

''خیر تو ہے نا سب۔''

''ہاں سب خیر تو ہے۔ بس یونہی آج صبح سے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے اور پھر کل ابا کی برسی بھی ہے اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ وقت اسی جگہ جا کر گزاریں جہاں ہم نے بھی ان کے ساتھ بہت سارا وقت بتایا تھا۔''

''اماں بات تو ٹھیک ہے، اور اس طرح ہم ابا کی برسی کا اہتمام بھی اسی گھر میں کر لیں گے اور اس سے بہتر بات اور بھلا کیا ہوگی۔''

''آہ۔۔۔'' دونوں کی بات سننے کے بعد اماں نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

''اتنا سارا وقت ان کے بغیر کیسے گزر گیا۔ سوچنے بیٹھوں تو دل مانتا ہی نہیں۔'' اماں بھی افسردہ ہو گئیں اور ثمینہ کی آنکھیں بھی ضبط غم سے سرخ ہونے لگیں کہ اس نے تو ان کے ساتھ بہت کم وقت گزارا تھا اور ہر ہر موقع پر ان کی کمی کو محسوس کیا تھا۔

یوں بھی جن بچوں کی زندگی باپ کے سائے اور شفقت کے بغیر گزرتی ہے ان کی مثال سرد لوں کی چھاؤں میں سکھائے گئے کپڑوں کی سی ہوتی ہے۔ ہر لحاظ سے مکمل اور قابل ہو جانے کے باوجود ایک ادھورے ہونے اور زندگی میں موجود اس خلا اور کمی کا احساس ہمیشہ رہتا ہی ہے۔ ایسے میں اگر تو خوش قسمتی سے ان کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی ہمدرد کوئی اپنا ہو تو بات بن جاتی ہے بصورت دیگر یہ احساس محرومی خود رو جھاڑی کی طرح اندر کہیں خود بہ خود جنم لیتا اور پروان چڑھتا رہتا ہے۔

''چلیں پھر ایسا کرتے ہیں کہ صبح ان شاء اللہ تیار رہیے گا، جلدی نکلیں گے اور دیر تک وہیں رہیں گے، برسی وغیرہ کا اہتمام بھی کریں گے اور کچھ وقت وہاں گزاریں گے بھی۔''

''ٹھیک ہے بھائی ان شاء اللہ۔''

چند لمحے پہلے چہکتی ہوئی ثمینہ اب ایک دم چپ ہوئی تو ماحول کا بوجھل پن بڑھ گیا۔ خود وہ فیکٹری میں سیریس رہتا مگر گھر آ کر اماں کو مطمئن کرنے کی غرض

سے خوش رہنے کی جو اداکاری کرنی پڑتی اس میں بہت زیادہ تھک جاتا، مگر اب تو موضوع ہی ایسا چھڑ گیا تھا کہ سبھی اداس ہو گئے تھے۔

کھانے کی میز سے اٹھ کر وہ تینوں اماں کے کمرے میں آ گئے اور پھر دیر تک ابا کی یادیں اور باتیں ان کے ذہن کے پردے سے ہو کر لفظوں کی صورت فضا میں بکھرنے لگیں۔

☆☆☆

شاہ سائیں کوئی آج پہلی دفعہ تو حویلی نہیں آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا گھر ہے جب دل چاہتا آ جایا کرتے یا اگر زیادہ دن گزر جاتے تو ملکانی سائیں خود ہی ان کو فون کر کے بلا لیا کرتیں، لیکن ملکانی سائیں کے انداز میں اتنا جوش و خروش تو پہلے بھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ جس طرح وہ آج اتنی پرجوش نظر آ رہی تھیں اور یہی بات کنیزاں سمیت تمام ملازماؤں نے بھی محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کر کے ٹوہ لگانے کی کوشش تو کی مگر ناکام ہی رہیں۔

یوں بھی کنیزاں جو باقی تمام کی نسبت ملکانی سائیں کے زیادہ قریب ہوا کرتی تھی اس امر سے وہ خود لاعلم تھی تو بھلا دوسروں کو کیا بتاتی۔ اسے تو بس اتنا علم تھا کہ کوئی خاص بات آج حویلی کے در و دیوار کے بیچ موجود ضرور ہے مگر کیا اور کون سی، کس کے متعلق اور کیسے جیسی کوئی خبر اس کے پاس بھی نہیں تھی۔ کھانے میں بھی خصوصی اہتمام تو تھا ہی مگر اس دفعہ ملکانی نے خاص طور پر اپنے بیڈ روم کی نک سک بھی درست کروائی تھی۔

یہاں وہاں ان کے قدموں کی رفتار کو اپنا ساتھی سمجھے گھومتی رہنے والی سوتی البتہ خراماں خراماں یوں چل رہی تھی گویا ان کی ہم راز ہو اور سبھی کچھ جانتی ہو۔ منشی زمینوں کے لیے ٹھیکوں کا حساب دینے آیا تو وہ بھی ملکانی سائیں کی خوشی کو بھانپ گیا اور تبھی اس نے جہاندیدہ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے خود اپنی خواہش کا اظہار بھی کرنے کا مناسب وقت اسی دن کو تصور کرتے ہوئے کھاتوں کے وزن سے لدے رجسٹر بند کیے اور چند لمحے یہاں وہاں دیکھنے کے بعد آخر بولا۔

''ملکانی سائیں! اللہ آپ کو ہمیشہ ہمیشہ سکھی، تندرست اور یونہی خوش باش رکھا کرے، آپ کے دل کی تمام مرادیں پوری کرے، تو سائیں ایک عرض میری بھی ہے اگر۔۔۔ آپ اجازت دیں تو۔۔۔''

''ہاں ہاں، چاچا بول کیا بات ہے؟''

اپنی خوش طبعی برقرار رکھتے ہوئے ملکانی سائیں نے اسی نرم لہجے میں کہا تو منشی کے دل کو بھی سہارا ہوا اور چند لمحوں پہلے در آنے والی جھجک دفعہ ہونے لگی۔

''وہ ملکانی سائیں! اگر آپ کی اجازت ہو تو سائیں، مشرق کی طرف سبزی منڈی کے روڈ کی طرف جاتی زمین میں سے تھوڑی سی زمین کا ٹھیکہ اپنے بیٹے کو دے دوں۔۔۔''

''دے تو چلو تم دو، مگر وہ کیا کرے گا ان کا؟''

ملکانی سائیں کی نیم رضامندی نے منشی کو بے حد حوصلہ دیا۔ جبھی اب بولا تو پہلے سے کہیں زیادہ پرجوش اور بااعتماد تھا۔

''وہ ملکانی سائیں! دراصل اس میں لہسن کاشت کر کے منڈی میں بیچا کرے گا تو اپنے بیوی بچوں کا گزارا بہتر طریقے سے کر پائے گا نا۔''

''چاچا، شادی کب کی اُس کی؟''

''شادی کو تو کچھ برس گزر ہی گئے ہیں بلکہ اب تو اس کا چھوٹا بیٹا بھی اسکول جانے لگا ہے۔''

''اوہ اچھا اچھا، میکوں تے یاد ہی نہیں رہا۔''

مسکراتے ہوئے بات کر کے ملکانی سائیں نے منشی چاچا کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ ایک مخصوص فاصلہ ذہن میں رکھتے ہوئے یوں بات کیا کرتیں کہ سامنے والے کو ان کے ذہن میں موجود مخصوص فاصلہ ان کے لہجے، الفاظ اور رویوں میں بھی نظر آیا کرتا۔

مگر ظاہر ہے آج بات کچھ اور تھی۔ آج ان کے دل پر چھایا پانچویں موسم کا رنگ انہیں آنے والے وقت کے خوب صورت اور خوش کن خیال سے ہی

مدہوش کیے دے رہا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس یا اس جیسے کسی بھی غیر فطری قدم کو اٹھانے سے پہلے انہیں شاہ سائیں کی مکمل حمایت، تائید اور سپورٹ چاہیے تھی اور اسی وجہ سے وہ اس دفعہ یوں بے تابی سے شاہ سائیں کی منتظر تھیں۔ ان کا خیال تو اب یہ تھا کہ اس وقت وہ اپنا بہت ٹائم ضائع کر چکی تھیں اور یہ خیال انہیں آج سے پہلے کیوں نہیں آیا مگر بہر حال ہر کام کرنے کے لیے ایک درست وقت کا ہونا ضروری ہوا کرتا ہے اور اب انہیں یقین تھا کہ ان کے لیے درست وقت خوش خبری کا جھنڈا لیے وہ ساری رکاوٹیں توڑتا آن پہنچا ہے جو انہیں اس قسم کی خوشیوں سے روکے رکھتی تھیں۔

☆☆☆

اُس دن اکمل ابھی شام کو جاگنگ کرنے کے لیے پارک میں داخل ہوا ہی تھا کہ ٹراوزر کی جیب میں رکھے موبائل کی آواز پر متوجہ ہوا۔

دوسری طرف عائشہ تھیں، جس پر اس کا حیران بھی لازمی تھا کیونکہ عائشہ کا اس کو فون کرنا معمولات میں سے نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی کبھی کبھار انہیں فون کر کے خیریت معلوم کر لیا کرتا۔ ورنہ ممی سے بات ہوتی رہتی تھی ان کی زبانی پتا چلتا رہتا مگر حیران کے باوجود اس نے اپنی حیرت کو بڑی خوب صورتی سے چھپا کر ان سے بات چیت کا آغاز کیا۔

"واہ جی واہ، کیا بات ہے۔ آج تو خیر سے مجھے فون کیا جا رہا ہے۔۔۔ نمبر غلطی سے تو نہیں مل گیا نا۔"

"تمہیں پتا ہے میرے معاملات میں غلطیوں کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔" اکمل کے چھیڑنے پر عائشہ نے جواب دیا تو وہ مسکرا دیا۔

"یعنی اس وقت تو آپ سپر پاور بنی بیٹھی ہیں۔"

"چھوڑو فضول باتیں نہ کرو، یہ بتاؤ مصروف تو نہیں ہو ابھی۔"

"آپ سے باتیں کرنے میں مصروف ہوں بس۔"

"تم سے ایک بات کرنے کے لیے فون ملایا تھا آج۔"

"ہاں بولیں، اتنی تمہید کیوں باندھ رہی ہیں۔ ڈائریکٹ بات کریں، میں دراصل جاگنگ کے لیے آیا تھا اور بالکل فارغ ہوں۔"

ان کا انداز اب اکمل کو کچھ عجیب لگنے لگا تھا، جبھی دل بے چین سا ہونے لگا کہ جانے کون سی بات ایسی ہے جس کے لیے خاص طور پر انہیں فون کرنا پڑا۔

"ہم ندی کی شادی کر رہے ہیں۔"

بڑے آرام سے انہوں نے اکمل کی سماعتوں پر گویا بم پھوڑا تھا۔

"ندی کی شادی؟ مگر کس سے؟"

"ظاہر ہے کسی لڑکے سے ہی۔" اب کے وہ مسکرائی تھیں۔

"اوہو مگر کون ہے وہ، جس سے آپ اس کی شادی کرنے جا رہی ہیں۔ وہ راضی ہے؟ آپی! ندی کیا کہتی ہے؟"

پہلے کی بات اور تھی مگر اب کے وہ اپنی حیرت قطعی طور پر چھپا نہیں پایا تھا اور نہ ہی وہ ایسا کچھ کرنا چاہتا تھا جبھی جو الفاظ جس تاثر کے ساتھ منہ سے نکلے اس نے بغیر پروا کیے ادا کر دیے۔

"مگر تم اتنے ہونق کیوں ہو رہے ہو؟"

"آپی! دیکھیں اگر تو آپ نے مجھے فون کر ہی لیا ہے تو پلیز جس مقصد سے کیا ہے اسے واضح کریں اور اس طرح پہیلیاں بوجھوانے میں ٹائم ضائع نہ کریں۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے فارغ ہو، اب تمہارا ٹائم ضائع ہونے لگا ہے۔"

آج انہیں اکمل کو چھیڑنے میں مزا آ رہا تھا۔ جبھی بس یونہی تنگ کیے گئیں اور یہی بات محسوس کرتے ہوئے اکمل نے بھی اپنا انداز بدلا۔

"مرضی ہے آپ کی، نہیں بات کرنی تو ٹھیک ہے اس نیوز کو ہیڈ لائن میں ہی بنا رہنے دیں۔"

"اچھا بابا، بتاتی ہوں۔"

اب وہ باقاعدہ سنجیدہ ہوئی تھیں۔

"دراصل ہم آج کل ندی کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر فی الحال تو جہاں رشتے کی بات چلتی ہے لوگ یہ جاننے کے بعد کہ یہ وہی لڑکی ہے جو پچھلے دنوں اخباروں کی زینت بنی رہی، دوبارہ رابطہ ہی نہیں کرتے۔"

"کیوں۔۔۔" اکمل نے کچھ سوچتے ہوئے گہری سانس خارج کی تھی۔

"لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ شادی کر رہی ہیں اس کی، اور اب کہہ رہی ہیں کہ ابھی کوئی رشتہ ہی نہیں مل رہا۔"

"دونوں باتیں ہی سچی ہیں کیونکہ دو تین دن میں ہی اس کی رخصتی ہو جائے گی، یہ بات خود ناصر نے مجھ سے کہی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ثروت آپا کو بھی واپس سسرال جانے سے روک لیا ہے تاکہ وہ بھی اس وقت گھر میں موجود رہیں۔"

"آپ کی باتیں کم از کم میرے تو سر پر سے گزر رہی ہیں۔ رشتہ ملا نہیں اور تین دن میں رخصتی کر رہی ہیں۔"

ان کی باتوں سے اکمل اب بری طرح جھنجھلا چکا تھا۔

"رشتہ آج شام تک فائنل ہو جائے گا کیونکہ صبح ناصر بہت پر امید تھے اور کہہ رہے تھے کہ شام تک کام ہو جائے گا۔"

"آپی آپ کی اور ناصر بھائی کی منطق کم از کم میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ ایک چھوٹی سی غلطی کی سزا اتنی بڑی دے رہے ہیں کہ گھر کی بنیادیں تک ہلا دی ہیں آپ دونوں نے۔"

"تم خوامخواہ اس کی طرف داری کر رہے ہو اور خود مان بھی رہے ہو کہ اس سے غلطی ہوئی۔"

"یہ غلطی میں نے آپ کے مطابق کہا ہے۔ ورنہ میرے نزدیک وہ قطعاً قصور وار نہیں ہے اور آپی آپ یہ بات یاد رکھیں کہ کسی پر بے جا ظلم و زیادتی کا بدلہ بہت گھناؤنا ہوا کرتا ہے۔"

"میں نے تم سے کوئی لیکچر لینے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ تمہیں یہ خبر دینے کے لیے فون کیا تھا کہ پھر یہ نہ کہو کہ آپی مجھے بتانا تو تھا۔"

عائشہ اس کی تلخ بات کو برداشت نہیں کر پاتی تھیں جبھی لہجہ سخت ہو گیا۔

"اچھا آپی! اگر آپ یہ غصہ کرنے کا شوق دو منٹ کے لیے ختم کریں تو ایک بات کہوں؟"

"ہاں بولو۔"

اکمل کے کہنے پر وہ چند لمحوں میں کول ڈاؤن ہو گئیں ۔۔۔ کہ آخر کو ان کا بھائی تھا اور وہ بھی لاڈلا۔۔۔

"آپ خوامخواہ ندی کے لیے رشتہ ڈھونڈنے میں اتنی ہلکان ہو رہی ہیں اور پھر جس کسی کے ساتھ آپ اس بے چاری کی ان حالات میں شادی کریں گی، کیا خیال ہے کہ وہ اسے خوش رکھے گا؟ ہرگز نہیں آپی بلکہ وہ تو میرا خیال ہے کسی زرخرید غلام سے بھی بدتر سلوک کرے گا اس کے ساتھ۔"

"یہ سب تو اس کی اپنی قسمت ہے نا چھوٹے بھائی، تم پریشان نہ ہو۔"

اکمل کی اس قدر فکر محسوس کر کے انہوں نے سر جھٹکا۔

"اور ویسے بھی آگے جا کر اس کی زندگی کیسی ہوگی یہ تو اس کا اپنا نصیب ہے اور تم خود جانتے ہو کہ نصیب بدلا نہیں جا سکتا۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں مگر میرا تو ماننا یہ ہی ہے کہ اپنا نصیب اور قسمت ہم خود اپنے اعمال سے بناتے ہیں۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ جب کوئی اعلا اور بہترین قسمت کا حامل قرار پاتا ہے تو وہ اسے اپنی کامیابی اور انتھک محنت گردانتا ہے اور اگر کسی طور حالات کی گردش کی زد میں آ جائے تو پھر بُرے واقعے، اور اپنی ہر ناکامی کی ذمہ داری (نعوذ باللہ) خدا پر ڈال کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ اللہ نے تو ہماری قسمت ہی ایسی لکھی تھی اور ہمارا تو نصیب ہی خراب تھا۔"

جاگنگ ٹریک پر دھیرے دھیرے چلتا اکمل اب نصب کی گئی سنگی بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔

''اگر ایسا ہے تب بھی مان لو کہ اس نے اپنے ہی اعمال سے نہ صرف اپنی قسمت خراب کی ہے بلکہ دوسروں کے نصیب میں بھی کئی پریشانیاں اور رسوائیاں ڈال دی ہیں۔'' وہ بھی عائشہ تھیں بھلا کیسے ہار مان جاتیں۔

''اللہ کے خوف سے ڈریں آپی! جب اس کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آگئی تو۔۔۔ کبھی سوچا ہے آپ نے کہ اگر اس کے اذیت میں گزرے ہوئے ایک ایک پل کا آپ کو سود سمیت حساب لوٹانا پڑا تو کیا کریں گی؟''

''تم فوج میں بھرتی ہوئے ہو یا کسی مدرسے میں؟''

بات کو ختم کرنے کے انداز میں انہوں نے لہجے میں مسکراہٹ سموئی مگر وہ اکمل کا موڈ بحال نہ کر سکی۔

''آپی! مختصراً مجھے یہی کہنا ہے کہ وقت کا پہیہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ آج جو لوگ اس پہیے کے نیچے والی سائیڈ پر ہیں تا کل وہی اوپر ہوں گے۔ اس لیے آج جب آپ کو قدرت نے اوپر والی جگہ پر بٹھایا ہے تو نیچے والوں کا ہاتھ تھام لیں تاکہ کل جب پہیے کے گھومنے سے آپ ان کی جگہ پر ہوں تو آپ بھی ان سے کوئی اچھی امید رکھ سکیں۔''

''اچھا اچھا سن لیا۔ بہت ہو گیا تمہارا لیکچر۔ چلو اٹھ کر اب جاگنگ شروع کرو۔'' عائشہ کی بات کے جواب میں کچھ بھی کہے بغیر چند لمحے کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

''اکمل۔۔۔! کیا ہوا؟ کہاں ہو؟''

''آپی! آپ کو ندی کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

کچھ لمحے سوچنے کے بعد جب وہ بولا تو لہجے کی مضبوطی اس کے لفظوں کو مزید طاقت بخش رہی تھی اور اسی وجہ سے عائشہ کا چونکنا بھی لازم ٹھہرا تھا۔

''نہیں ہے کا کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ میں کروں گا ندی سے شادی۔''

''تم۔۔۔؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔''

اس دفعہ حالت متضاد تھی کہ عائشہ کی سماعتوں پر ضرب اکمل کے الفاظ سے لگی تھی اور ان کی حیرانی اکمل کی حیرت سے کئی گنا زیادہ بھی تھی۔

''بالکل بھی نہیں۔۔۔ میں جو بھی کہہ رہا ہوں مکمل طور پر ہوش و حواس میں رہتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔''

''اپنی جاب پر دھیان دو اکمل، اور فضول میں خدا ترسی کی عادت چھوڑ دو۔۔۔ اور پھر دیکھو وہ وقت اور تھا جب خود میں نے تم سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر اب حالات قدرے مختلف ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور تم سب کچھ جانتے بھی ہو اور۔۔۔ اور پھر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔۔۔'' حیرت کے مارے عائشہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

یہ سب اس انداز میں ہوتا تو ظاہر ہے انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تبھی ایک دم ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کن لفظوں کا سہارا لے کر اکمل کو روک لیں۔

''جی آپی! یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں ندی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور اس سلسلے میں آپ جس سے بھی کہیں میں بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ یہاں تک کہ ناصر بھائی سے بھی۔''

وہ جانتا تھا کہ اب عائشہ جذباتی ہو جائیں گی اسے یہاں وہاں کی باتیں کر کے سمجھائیں گی، مثالیں ـــــ مختلف حوالے دیں گی مگر اس نے جو سوچا تھا وہ اسے اب کرنا ہی تھا، اسی لیے اس نے بات کرتے ہی فون بھی بند کر دیا۔

☆☆☆

میران کی زندگی یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد سے ابھی تک باقاعدہ طور پر کسی ڈھب پر نہیں آ سکی تھی۔ کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے نکل جاتا تو کبھی شہر والے فلیٹ پر ہی سب دوستوں کو جمع کر کے وقت گزاری کا سامان کیا جاتا۔ یوں بھی یہ فلیٹ شاہ سائیں نے اسے یونیورسٹی میں داخلہ ہونے کے بعد ہی لے کر دیا تھا جس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اگر وہ دوستوں کے ساتھ مل کر پڑھائی کرنا چاہے تو گاؤں آنے کے بجائے سہولت سے سب کو یہیں مدعو کر سکے۔

اس کی غیر موجودگی میں وہاں ایک ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ جو نہ صرف صفائی ستھرائی اور باقی گھریلو امور کا خیال رکھتا بلکہ میران اور اس کے دوستوں کے آنے پر خانساماں کے فرائض بھی نبھاتا۔ اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلانا شاہ سائیں کا خواب تھا جو میران کی شکل میں پورا ہونے کا یقین تو انہیں اول روز سے نہیں تھا اسی لیے انہوں نے میران کی ہزار مخالفت اور ملکانی سائیں کے تمام خدشات کو رد کرتے ہوئے مہربانو کو اس منزل پر رواں دواں رکھا ہوا تھا۔

اور اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود پڑھے لکھے تو ضرور کہلائے جاتے تھے مگر پھر بھی ہائی کوالیفائیڈ نہ تھے۔ جس بات کا اظہار وہ بعض اوقات اپنے بچوں کے سامنے بھی کیا کرتے اور جب انہوں نے دیکھا کہ مہربانو کا رجحان تعلیم کی طرف ہے تو پھر اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ روایت، منصب اور ماضی کی تمام اقدار جو اس کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنیں گی وہ انہیں ہٹاتے جائیں گے۔

ایف ایس سی تک تو مہربانو پڑھتی رہی نہ کوئی شور ہوا نہ غوغا۔

لیکن جیسے ہی سب کو پتا چلا کہ شاہ سائیں نے اسے صرف پڑھائی کی غرض سے نہ صرف اتنی دور بلکہ ہاسٹل میں رہنے کی بھی اجازت دے ڈالی ہے تو جس نے سنا دانتوں تلے انگلیاں دباتے ہوئے انہیں اس فعل سے باز رہنے اور نتائج کے بعض اوقات امیدوں کے برعکس بھیانک ہونے کی طرف بھی توجہ دلائی مگر اس معاملے میں انہوں نے کسی کی بھی نہیں سنی تھی۔ سو جس نے کہا اسے ایک ہی جواب دیا۔

''تم لوگ مجھے جو مثالیں دیتے ہو وہ کسی اور کی ہوں گی مگر مہربانو میرا خون ہے، میری بیٹی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی میرا سر نیچا نہیں کرے گی۔''

سننے والے قدامت پسند ذہن کے حامل لوگوں نے شاہ سائیں کی تمام باتوں کو محض دیوانے کا خواب قرار دے کر لڑکی کی ذات پر اس قدر بھروسے اور اعتماد کو ان کی بڑی غلطی قرار دیا اور خاموش ہو گئے مگر درپردہ ہر وقت ان کی سماعتیں کسی ایسی بات سننے کی منتظر ضرور رہیں جس کے بعد وہ جا کر شاہ سائیں کو کہہ سکتے تھے کہ ''کاش تم نے ہماری بات مانی ہوتی۔''

میران کے متعلق البتہ کئی باتیں ایسی سننے میں آئیں مگر ان کے نزدیک یہی تو مرد کی اصل شان ہوتی ہے کہ وہ چادر لپیٹ کر گھر میں بیٹھا نہ رہے اور باہر نکل کر اپنی زندگی کو بہترین طریقے سے گزارے۔

مرد اور عورت کی تفریق ان کے چاروں اطراف بڑی شدت سے موجود تھی۔ ہر وہ بات جو مرد کے لیے قابل گرفت نہ تھی بعض اوقات اسی بات پر عورت کو اگر دیوار میں چنوانے کا اختیار ان کے پاس ہوتا تو شاید وہ لوگ کم نہ کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ میران کی ذات میں اپنے آپ کو دوسروں سے اعلا اور برتر خیال کرنے کے جراثیم اس قدر طاقت ور تھے کہ وہ یہ تصور نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کوئی اس بارے میں سوچے بھی۔

اس روز بھی وہ اپنی جیپ میں تیز آواز کے میوزک کے ساتھ اپنے علاقے کی حدود میں داخل ہوا ہی تھا کہ سامنے منشی چاچا کو زمینیں ناپتے دیکھ کر چونک گیا۔ شیشہ نیچے کر کے آواز لگائی تو منشی چاچا دونوں ہاتھ باندھے اس کے سامنے آن حاضر ہوئے۔

''سلام چھوٹے سائیں!''

''یہ کیا کر رہے ہو چاچا زمینوں میں؟''

''وہ سائیں! ملکانی سائیں کی اجازت سے اپنے بیٹے کو زمین کا ایک ٹکڑا دینے کے لیے ان کے بتائے گئے حجم کی پیمائش کر رہا تھا۔''

''زمین کا ایک ٹکڑا؟ تمہارے بیٹے کو؟ لیکن کس خوشی میں؟''

ناگواری سے پیشانی پہ جا بجا لکیریں ابھری تھیں۔ کالے شیشوں کی عینک کے پیچھے سکڑی

آنکھیں البتہ منشی چاچا سے اوجھل ضرور تھیں مگر وہ انہی کے سامنے پلا بڑھا تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان آنکھوں میں اس وقت کس قدر چبھن شروع ہو چکی ہوگی۔

''دراصل سائیں! زمین کا ٹکڑا اُس کے نام نہیں کرنا ہے سائیں بس وقتی طور پر کاشت کے لیے دینا ہے۔''

''وہ سب مجھے سمجھ آرہا ہے چاچا! لیکن کیوں دینا ہے؟ میں یہ پوچھ رہا ہوں۔''

''اس کا ذرا آج کل ہاتھ تنگ ہے سائیں! کہہ رہا تھا اگر تو تھوڑی سی زمین مل جائے تو اس میں سبزی وغیرہ لگا کر گزر بسر میں آسانی ہو جائے گی۔ اب تو سائیں اس کا بیٹا بھی اسکول جاتا ہے نا، تو ذرا فکر کرنے لگا ہے سائیں۔''

''ایسا کرو تم زمین کو چھوڑو اور یہ پیسے رکھو اپنے پاس۔ دے دینا اپنے بیٹے کو۔''

''لیکن سائیں۔۔۔ وہ۔۔۔''

''تم جیسے لوگوں کو زمین کی قدر نہیں ہوتی چاچا! اور تمہیں پتا ہے نا کہ زمین کی بے قدری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کل کلاں کو میں نے اسے کچھ کہہ دیا تو پھر روتا رہے گا۔ بہتر ہے کہ یہ روپے دے کر اس کی مدد کر دینا اور بس۔''

ہزار ہزار کے دو تین نوٹ نکال کر میران نے منشی چاچا کے حوالے کیے تو وہ بہت کچھ منہ میں آنے کے باوجود محض زبان کی نوک سے ہی واپس لے گئے۔

کیونکہ میران کے ساتھ کسی بھی معاملے میں بحث کرنے کا صاف مطلب اپنی ہی بدبختی کو دعوت دینا تھا۔

حالانکہ وہ جس جوش اور دلولے کے ساتھ زمین ناپ رہے تھے اس نے انہیں پھر سے نوجوان بنا ڈالا تھا۔ سوچ رہے تھے کہ اب ان کا بیٹا اس میں لہسن وغیرہ اگائے گا۔ جب شہر جا کر بیچا کرے گا تو خود کفیل ہو جائے گا اور زندگی کے دن بہترین انداز میں گزار پائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا اور میران کی نظر پڑ گئی۔ اور میران بھی وہ جسے حقیقی معنوں میں اپنی زمینوں کی مکمل تفصیل تک سے آگہی نہیں تھی۔ ایسے میں اگر آج وہ نہ دیکھتا تو کئی برسوں تک بھی اسے بھنک نہ پڑتی۔

مگر شاید اس زمین کی روزی منشی چاچا کے بیٹے کے رزق میں نہیں لکھی گئی تھی جبھی وہیں کھڑے کھڑے اپنے ساتھ آنے والے پٹواری کو اشارہ کر کے واپس چلنے کا کہا تو میران نے بھی دوبارہ شیشہ اوپر کر کے ''ہونہہ'' کے انداز میں سر جھٹکا اور ملکانی سائیں کی ''دریا دلی'' کا حساب لینے کو اپنی ترجیح قرار دیتے ہوئے حویلی کے اندر داخل ہوا تو شاہ سائیں کو بھی وہیں موجود پایا۔

''بابا سائیں! آپ کب آئے؟''

''دو تین گھنٹے ہوئے ہیں، مگر تم کہاں رہ گئے تھے؟ ابھی ابھی کھانا ختم کیا ہے۔ جلدی آجاتے تو اکٹھے کھانا کھا لیتے۔''

''آتو جاتا لیکن بابا سائیں! رستے میں منشی چاچا زمینوں کی پیمائش کرتے ہوئے نظر آئے تو وہیں رک گیا۔''

''زمینوں کی پیمائش؟''

شاہ سائیں نے ناسمجھی کے انداز میں سوال کیا۔

مگر میران نے انہیں براہِ راست جواب دینے کے بجائے سامنے بیٹھی ملکانی سائیں کو مخاطب کیا۔

''اماں سائیں! کیا ضرورت تھی انہیں زمین کے ٹکڑے پر کاشت کی اجازت دینے کی؟ اس طرح تو یہ لوگ خود ہمارے سامنے آکھڑے ہوں گے۔ بچہ تو خیر سے ابھی سے اسکول جاتا ہے۔ کل کو شہر والے اسکول میں داخل کروائے گا تو اس کی تو اپنی آنکھیں کھل جائیں گی۔''

''بیٹا پریشان تھا بے چارہ تے میکوں ترس آگیا۔''

''میں نے اسے زمین استعمال کرنے سے روک دیا ہے۔''

میران نے اطلاع دی تو ملکانی سائیں چونک گئیں۔

''پر میرا پتر! میں نے اسے زبان دی تھی۔''

''ارے اماں سائیں! پریشان نہ ہوں، عورتوں کی دی ہوئی زبان سبزی کے اتارے ہوئے چھلکوں کی طرح کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

شاہ سائیں چپ چاپ دونوں ماں بیٹے کی بات چیت سن رہے تھے۔

''آئندہ کسی پر ترس آئے تو روپے پیسے دے کر ان کی امداد کر دیا کریں کیونکہ جب تک یہ ہم سے امداد لیں گے ہمارے محکوم رہیں گے۔ خود کفیل ہوئے نا تو پھر ہمارے ہی سامنے کھڑے ہو کر ہمیں ہی آنکھیں دکھائیں گے۔''

میران نے خالصتاً کسی کاروباری شخص کی طرح نفع اور نقصان بیان کرتے ہوئے اُن کے سامنے سودے کے اصول واضح کیے تھے۔ جنہیں سننے کے بعد ملکانی سائیں کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب واقعی ایک سمجھ دار مرد کے روپ میں ڈھل چکا ہے۔

''میکوں پہلے ہی پتا تھا کہ میرا بیٹا اتنا عقلمند ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو آج شاہ سائیں کو خاص طور پر بلایا ہے۔''

ملکانی سائیں مسکرائیں مگر میران اُن کی بات پر توجہ دیے بغیر شاہ سائیں سے ملکی سیاست کے امور ڈسکس کرنے لگا۔ جس سے شاہ سائیں کو بھی لگا کہ وہ اب واقعی زندگی کو سنجیدگی سے سمجھنے لگا ہے اور یہ بات جہاں ان کے لیے تقویت کا باعث تھی وہیں ایک انجانا سا دھڑکا بھی تھا۔ جس کے تحت وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ زندگی کو سنجیدگی سے یوں سمجھنے لگے کہ پھر زندگی اس پر اپنا آپ عیاں کر دے۔ اُس دن اس لمحے سے اجتناب برتنا ان کی مجبوری ہی تو تھی۔

اس لیے وہ میران کو اس کی ایکٹیویٹیز میں مگن ہی رہنے دیتے۔ زندگی کی حقیقت میران کے لیے تلخ ہو سکتی ہے یہ بات اس کے علم میں بخوبی تھی مگر وہ بھی کبوتر کی طرح جب تک ممکن ہوتا اپنی آنکھیں بند رکھنا چاہتا تھا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جو ذہن اول روز سے جانتا ہو دل اسے قبول کرنے میں برسوں لگا دیتا ہے اور یہی کچھ میران کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

کٹھن ہے زندگی کتنی
سفر دشوار کتنا ہے
کبھی پاؤں نہیں چلتے
کبھی رستہ نہیں ملتا
ہمارا ساتھ دے پائے
کوئی ایسا نہیں ملتا
فقط ایسے گزاروں تو
یہ روز و شب نہیں کٹتے
ہماری جان نکلتی ہے
مجھے پھر بھی میرے مالک
کوئی شکوہ نہیں تجھ سے
میں جاں پہ کھیل سکتا ہوں
میں ہر دکھ جھیل سکتا ہوں
اگر تو آج ہی کر دے
محبت ہمسفر میری

امی کے مشورے کے بعد اس نے ثروت آپا کا موبائل لے کر شاہ زین سے بات کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اسی مقصد کے لیے وہ ان کو اکیلا دیکھ کر اس وقت کچن میں چلی آئی جب عائشہ بھابھی فون پر کسی سے بات چیت میں مصروف تھیں۔

ثروت آپا اپنے بیٹے کے لیے کسٹرڈ بنا رہی تھیں اور ان کا فون اوون کے اوپر رکھا تھا۔

''آپا۔۔۔!'' ندی نے پیچھے کھڑے ہو کر انہیں پکارا تو وہ بے طرح چونک گئیں کیونکہ اب ندی بہت کم یوں گھر میں اِدھر اُدھر نظر آتی۔ زیادہ تر وقت اس کا امی کے ساتھ ہی گزرا کرتا تھا۔

''تم۔۔۔؟ ہاں بولو ندی! کیا بات ہے؟''

''مجھے آپ کا موبائل چاہیے، اگر آپ دینا چاہیں تو۔۔۔''

ہزار نا چاہنے کے باوجود بھی آخر اُسے ثروت آپا سے درخواست کرنی ہی پڑی تھی کیونکہ اب اس کے سوا

کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔
''موبائل۔۔۔؟ لیکن کرنا کیا ہے تم نے؟''
چند لمحے سوچنے کے بعد سامنے رکھا موبائل اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا مگر ندی نے جواب دینا ضروری خیال نہ کرتے ہوئے تھینکس کہہ کر واپسی کی طرف قدم بڑھائے تو ایک مرتبہ پھر وہ بولیں۔
''تمہارے پاس محض دو تین دن ہیں ندی! میں تو کہتی ہوں ناصر بھائی کو راضی کرلو، کسی طرح اُن سے معافی مانگ لو، دراصل یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ بعض اوقات انسان سے غلطی پر غلطی ہوتی ہی چلی جاتی ہے جو کہ تم سے بھی ہوئی۔۔۔ اس لیے میری مانو تو اس گھر سے رخصت ہونے سے پہلے ہاتھ جوڑ کر بھی ناصر بھائی کو راضی کرنا پڑے نا تو کرلو۔''
اپنی دانست میں وہ بہت دانشمندانہ مشورہ دے رہی تھیں مگر شاید انہیں یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت یہ بات کرتے ہوئے مکمل طور پر جانبداری کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ویسے بھی تعلقات میں بگاڑ تبھی پیدا ہوتا ہے جب رشتوں میں توازن نہ رہے اور آج ثروت آپا کے الفاظ بھی اُن کے جانبدار ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔
ندی نے درزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھا جو اپنے تئیں اس سے ہمدردی جتا رہی تھیں جبکہ درحقیقت وہ اس فعل میں مکمل طور پر ناکام نظر آرہی تھیں۔
''ایک دو جگہ سے ناصر بھائی کو مثبت جواب ملا ہے، اُن میں سے کسی کو بھی کل فائنل کردینے کے بعد پرسوں نکاح کے لیے بلا لیا جائے گا۔''
شاید وہ ابھی مزید باتیں کرتی رہتیں مگر ندی کا اب نہ صرف ان کی باتوں بلکہ خود اُن سے بھی دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ جبھی بوجھل دل سے وہاں سے نکل کر دوبارہ کمرے کی طرف بڑھی تو ابھی تک عائشہ بھابھی کو فون پر ہی مصروف پایا۔
پورے گھر میں اگر کوئی اس کے لیے حقیقی معنوں میں متفکر تھا تو وہ صرف امی ہی تھیں اور وہ صرف ابا بابا ہی تھے جنہوں نے اس سے کچھ بھی پوچھے بغیر اس کی حمایت کرتے ہوئے ناصر بھائی، عائشہ بھابھی اور ثروت آپا کے سامنے اس کا دفاع کیا تھا۔
ابھی بھی وہ موبائل ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئی تو انہیں بڑی پریشانی میں ٹہلتے ہوئے پایا کیونکہ اُن کے سامنے ایک آپشن یہ بھی تھا کہ شاید وہ ندی کو فون دینے سے معذرت کرے، مگر ایسا نہ ہوا اس لیے کمرے میں آتی ندی کے ہاتھ میں فون دیکھ کر اُن کی جان میں جان آئی اور سکون کا سانس لیتے ہوئے وہیں بیڈ کی پائنتی پر ٹک گئیں۔
حالات کے پے در پے وار نے ان کی ٹانگوں سے وہ توانائی چھین لی تھی جو انہیں توانا رکھتی تھی۔
''میرے بیٹے میری جان میری شہزادی۔۔۔''
ندی ان کے قریب آکر بیٹھی تو فرطِ جذبات سے انہوں نے اسے لگالیا۔
''رات کو ناصر سے بات کرنے کے بعد مجھے اندازا ہوگیا ہے کہ وہ اب اس فیصلے سے کسی طور پیچھے نہیں ہٹے گا اور میں نہیں جانتی کہ وہ کیسے لوگوں میں تمہیں وداع کرے۔'' خود سے الگ کر کے انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔
''میں چاہتی ہوں کہ کسی بھی طریقے سے تم شاہ زین سے بات کرو، اسے ساری صورت حال بتاؤ۔ کیونکہ اس کے علاوہ اب اور کوئی راہ کم از کم مجھے تو سجھائی نہیں دے رہی۔'' امی کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ وہ اپنی شہزادی کو حالات کے جادوگر سے بچالینا چاہتی تھیں اور اس لیے اپنی طبیعت کی ناسازی کو پسِ پشت ڈال کر وہ کچھ بھی کرلینے کو تیار ہوگئی تھیں۔
پہلی کوشش کے طور پر رات کو ناصر بھائی سے التجائیہ انداز میں درخواست بھی کی مگر انہوں نے بغیر کوئی بدتمیزی کیے سرد لہجے میں ان کی ہر درخواست رد کردی۔ جواز تھا تو یہ کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں اور اب وہ ندی کو جو اس تمام پچھ

ہنسائی کا باعث بنی مزید اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتے اور اس کا واحد حل یہی ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے۔

ان کے صاف انکار کے بعد تمام رات امی نے آنکھوں میں گزاری تھی اور پھر بالآخر ثروت آپا سے موبائل لے کر شاہ زین سے ندی کو بات کرنے کو کہا کہ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل سکے۔

مگر مسئلہ تھا تو یہ کہ اس کا نمبر موبائل میں ایڈ تھا۔ آج سے چند سال پہلے تک جب لینڈ لائن فون ہی استعمال ہوا کرتے تھے تب ڈائریز میں نمبر لکھے جاتے اور مخصوص نمبرز خود بخود ذہن نشین بھی ہو جایا کرتے۔ مگر اب موبائل میں صرف نام پر کلک کرنے سے رابطہ ہو جانے کی وجہ سے شاذ ہی کسی کو نمبر یاد ہوتا بلکہ اکثر اوقات تو اپنا نمبر بھی لوگ موبائل سے دیکھ کر ہی بتایا کرتے۔ ایسے میں شاہ زین کا نمبر تو کیا کسی کا بھی نمبر اس کے ذہن میں نہیں تھا۔

مگر اس کا حل یہ نکالا گیا کہ یونیورسٹی لے جائی جانے والی کتابیں، نوٹس اور نوٹ بکس کے ایک ایک صفحے کو دیکھا گیا اور بالآخر پبلک ریلیشنز کے نوٹس کے کونے میں ایک نمبر کے ساتھ شاہ زین کا نام لکھا نظر آیا تو اسے محسوس ہوا جیسے صحرا میں تپتی دھوپ اور جھلستی ریت پر سفر کرنے والے مسافر کو پانی کے ٹھنڈے، میٹھے چشمے کا سراغ مل گیا ہو۔

ندی اور خود امی نے اپنے اندر ایک نئی توانائی اور خون میں ایک عجب حرارت محسوس کی تھی۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اب سفر کچھ لمحوں کا ہی باقی ہے اور منزل سامنے موجود ہے۔

"ندی! تمہارا کیا خیال ہے، ان حالات میں کیا وہ تم سے دو دن کے اندر اندر شادی کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔"

آس نراس کی عجیب سی کیفیت میں معلق امی کے سوال پر ندی کچھ بھی کہہ نہیں پائی تھی۔

"اچھا تم وقت ضائع نہ کرو، اس کا فون نمبر ملاؤ میں اس سے اور اس کی والدہ سے خود بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"امی۔۔۔!" ندی ایک بار پھر کسی ننھی بچی کی طرح اُن کے سینے سے جا لگی تھی مگر چاہنے کے باوجود رونے پر کمال کا ضبط قائم رکھا ورنہ دل تو اس وقت دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

امی نے اس کے نرم اور چمکیلے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے خود سے الگ کیا۔

"میری بچی یہ دو تین دن تمہاری زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔ ناصر کے ارادے مضبوط اور وہ اپنے فیصلے پر مکمل قائم ہے مگر۔۔۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہیں ناکردہ گناہوں کی سزا ملے۔"

"امی اگر آپ نہ ہوتیں تو شاید اب تک تو میں مر ہی جاتی۔"

آنسوؤں کو اپنے اندر اتارتے ہوئے ندی نے کہا تو چند آنسو بغاوت کر کے آنکھوں میں ڈھلکنے لگے۔

"ندی۔۔۔!"

امی نے ایک جھٹکے سے اس کے آنسو اپنی انگلیوں بھری ہتھیلی سے خشک کیے اور خود اپنے آنسوؤں کو بڑی سختی سے آنکھوں کی دہلیز پر جمائے رکھا۔

"یاد ہے نا تمہارے بابا کیا کہتے تھے؟"

انہوں نے اپنے ناتواں چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی تھی۔

"وہ کہتے تھے نا کہ تمہاری آنکھیں کانچ کی ہیں ایسی جیسے شیشہ اور شیشہ اگر دھندلا ہو تو کتنا برا لگتا ہے۔"

ندی نے بھی تائید میں گردن ہلاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کی یہ مسکراہٹ بلاشبہ امی کا دل چیر گئی تھی۔

"شیشے کی خوب صورتی اس کے چمکدار اور شفاف ہونے میں ہی ہوتی ہے، سمجھیں نا۔" اپنے دل کی کیفیت بہرحال اس وقت انہیں چھپانا تھی۔

"جی امی۔۔۔!"

سوچتی نظروں سے ندی نے اُن کی جانب دیکھا جو محض اس کا غم بانٹنے کے لیے اپنا کرب کس خوب صورتی سے چھپا رہی تھیں۔

"وقت بہت کم ہے بیٹا! تم جلدی سے نمبر ملاؤ۔"

انہوں نے خود ہی جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے اچھی طرح بند ہونے اور اُس سے پہلے وارڈ خالی ہونے کی تصدیق کی اور اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"کیا ہوا؟ فون بزی ہے؟"

ندی کے چہرے پر موجود پریشانی دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا تھا۔

"بند ہے۔" لب بھینچتے ہوئے ندی نے جواب دیا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

"بند ہے؟"

"جی امی۔۔۔!"

"پھر ملاؤ، ہو سکتا ہے نیٹ ورک یا سگنل میں کوئی مسئلہ ہو۔"

اور پھر ندی کے ہزار بار کوشش کرنے کے باوجود بھی نہ تو فون ملنا تھا اور نہ ہی ملا۔ دماغ اس قدر گنجلک ہو چلا تھا کہ اپنی بے بسی پر چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہا۔ زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آئے گا یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ امی کی موجودگی کے باعث اس نے خود کو رونے سے باز رکھا کہ جانتی تھی اس وقت خود وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔

وہ جو اکثر اوقات ابتدائی شب میں دوا لے کر سو جانے کی عادی تھیں اس کے لیے رات رات بھر جاگا کرتیں اور دن میں بھی دونوں ایک دوسرے کی دل جوئی کیا کرتیں۔

ایسے میں ایک انوکھا خیال ندی کے ذہن میں جو ابھرا تو کچھ دیر خود ہی اُس پر غور کرنے کے بعد آخر اُس نے امی سے کہہ دیا۔

"امی! کیا آپ میری ایک بات مانیں گی؟"

"یعنی اب تم بھی بات کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا کرو گی؟"

یونہی ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کو وہ مسکرائیں۔

"امی۔۔۔! وہ دراصل اگر آپ کی اجازت ہو تو میں شاہ زین سے خود ملنا چاہتی ہوں۔"

کسی پرانی حویلی کے سنسان اور بوسیدہ کمرے میں دی گئی آواز کی طرح ۔ اس کا لہجہ بے حد ہلکا اور کھوکھلا محسوس ہوا تھا۔

"یہ۔۔۔ تم کیا کہہ رہی ہو ندی! کیسے ممکن ہے یہ سب؟"

اُن کے کانپتے لہجے کی نمی نے خود ندی کے جسم پر کپکپاہٹ طاری کر دی تھی۔ آنے والے کل کا خوف کسی پھنکارتے ہوئے اژدھے کی طرح اُن کے سامنے اپنی تمام تر دہشت کے ساتھ لہرا رہا تھا۔

"یقین کیجیے امی! میں آپ کا اعتبار نہیں توڑوں گی۔"

اُن کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ندی نے انہیں یقین دلانا چاہا تھا۔

"اور اگر ان تینوں میں سے کسی کو پتا چل گیا تو۔۔۔"

وسوسے، واہمے، خدشات اور پھر یہ اگر مگر بھی امی کو شش و پنج میں ڈالے ہوئے مگر اس سے پہلے کہ وہ انہیں قائل کرتی وہ بولیں۔

"پہلے اُس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرو اور اگر ممکن نہ ہوا تو۔۔۔

ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں، اپنی ذات کے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کر لینا۔" اظہار تشکر سے ندی نے اُن کا ہاتھ چوم لیا تھا۔

"ناصر آج دوست سے ملنے کسی گاؤں گیا ہوا ہے تم اگر اپنی زندگی کے لیے کوئی رسک لینا چاہتی ہو تو میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔"

"جی امی! بس اب آر یا پار!"

ندی کے سامنے اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر وہ اسے ڈھارس تو دے رہی تھیں مگر اس کی اس تجویز کو سننے کے بعد سے اُن کا دل بھربھری ریت کی دیوار بنا بیٹھا جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

فاخرہ گل





چھٹی قسط

نفرت کرنے کے لیے دل کی سرزمین ہمیشہ سے زرخیز ہی پائی جاتی ہے۔ یہاں بیج ڈالا وہاں فصل تیار۔ کوئی بھی منفی جذبہ پنپنے کے لیے کسی چیز کی طلب نہیں کرتا، محنت نہیں مانگتا، سورج کے غروب ہونے کی طرح احساس بھی نہیں ہوتا اور ہم دل ہی دل میں کسی کے خلاف بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس محبت کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ محبت کرنی ہو تو سب سے پہلے اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ اپنا نفس جذبات کے ہاتھوں گروی رکھ کر بہت سی ایسی باتیں بھی نظر انداز کرنی پڑتی ہیں جو کہ محبت کے دور سے پہلے شاید ہمارے احتجاج کا باعث بنتیں۔ رانجھا رانجھا کرتے جب خود پر رانجھا ہونے کا گمان گزرنے لگے تب محبت کی سرزمین میں پہلا قدم رکھنے کا یقین ہوتا ہے۔

مگر جو لوگ یک طرفہ نفرت کے قلعوں میں قید ہوتے ہیں اُن کے دلوں کی فصیلوں میں محبت کے برمے لگا کر اگر کوئی سوراخ کرنا بھی چاہے تو اکثر اوقات سوراخ کے ہوجانے اور فصیلوں کے ٹوٹ جانے کی کوئی بھی خبر اُن قلعوں کے اندر تک نہیں جا پاتی۔

یہی حال عائشہ بھابھی کا بھی تھا۔ سفری بیگ پر لگی ایئر ٹریول کی مختلف پرچیوں کی طرح جانے اُن کے دل میں ندی کے خلاف کیا کچھ اور کب سے چسپاں تھا جو کہ اب موقع ملتے ہی ان کے رویے اور لفظوں سے عیاں ہونے لگا تھا اور اکمل سے بات ہونے کے بعد سے تو وہ جلے پیر کی بلی بنی یہاں سے وہاں گھوم رہی تھیں۔ ندی کے پاس اگر موبائل نہیں تھا تو کیا وہ لینڈ لائن نمبر پر فون کرسکتا تھا۔ ثروت آپا بھی گھر پر تھیں اگر اکمل کے فون کرنے پر وہ ریسیو کرتیں تو ظاہر ہے کہ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا اور وہ کیوں نا اس کی ندی سے بات کرواتیں۔ یہی بات اب انہیں بے چین کیے دے رہی تھی، کیونکہ اگر وہ اپنے دل میں اس کام کا مضبوط ارادہ کر لیتا تو بھلا ناصر سمیت کسی کو بھی کیا اعتراض ہوتا، بلکہ اوپر سے ظاہری طور پر چاہے غصہ ہی تھا، مگر پھر دل کے کسی کونے میں اطمینان بھی ضرور بیٹھا، مسکرانے لگتا کہ جیسا بھی اور جو کچھ بھی ہوا مگر بالآخر وہ ایک اچھے گھرانے کی بہو بن گئی ہے اور پھر جس طرح پہلے یہاں پر مشرق و مغرب میں ندی، ندی کی پکار رہا کرتی تھی وہاں بھی وہ تن تنہا ملکہ عالیہ بن کر عیش کیا کرتی اور یہ بات عائشہ بھابھی کو ہرگز گوارا نہیں تھی۔

مگر اب کریں تو کریں کیا، اگر اکمل کی طرف سے دیے گئے پرپوزل کو ندی سب کچھ بھلا کر قبول کرلے تو۔۔۔؟ اس "تو" کے آگے موجود سوالیہ نشان کے باعث عائشہ بری طرح جھنجلائی ہوئی تھیں اور یہ جانتی تھیں کہ اب یا تب اکمل فون کرنے ہی والا ہے، تبھی ناصر بھائی کے آنے تک انہوں نے اپنا وقت ثروت آپا کے ساتھ لاؤنج میں ہی گزارنے کا سوچا تاکہ اس کا احتمال نہ ہو۔

ثروت آپا بھی اپنے بیٹے کو سلا کر ابھی ابھی لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھی تھیں اور ہاتھ میں ریموٹ لیے چینلز چینج کر رہی تھیں، جب عائشہ بھابھی نے دوسرے صوفے کے کارنر پر فون سیٹ کے قریب جگہ سنبھالتے ہوئے چہرے پر افسردگی طاری کی۔

"ایک شخص کی غلطی کس طرح بھرے پرے گھر کو اجاڑ کر رکھ دیتی ہے نا۔" ثروت آپا نے ان کی بات پر بڑی افسردگی سے گہری سانس خارج کرتے ہوئے مزید چینلز چینج کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"عائشہ! گھر ہمیشہ بنتے بھی محبت سے ہیں اور اجڑتے بھی محبت کے ہاتھوں ہیں۔"

"کوئی بھلا محبت سے گھر کیوں اجاڑے گا؟" عائشہ بھابھی کو ثروت آپا کی بات کچھ عجیب سی لگی تھی۔

"محبت کی آڑ لیے تغیر کسی کا ہنستا بستا گھر اجاڑنا تو مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن بھی ہے۔" ثروت آپا اپنی کہی ہوئی بات پر مکمل طور پر قائم تھیں۔

"ایک مثال دیتی ہوں، لیکن دیکھو اسے صرف مثال کے طور پر ہی سننا، سچ سمجھ کر مائنڈ نہ کر جانا۔"

"ارے نہیں نہیں، آپ بات کریں۔"

"مثال کے طور پر اگر تم اپنے لفظوں میں شیرینی گھول کر ناصر بھائی کو گھر والوں کے خلاف بھڑکاؤ اور انہیں اس بات کا یقین دلاؤ کہ گھر میں انہیں کوئی عزت نہیں دیتا اور ان کی کوئی ویلیو نہیں ہے اور بس اسی بات پر تم دل گرفتہ رہتی ہو۔" ایسی عجیب سی اور سیدھی سیدھی مثال پر عائشہ کے ابرو ایک دوسرے کے قریب آتے محسوس ہوئے تھے مگر چونکہ اس کڑوی مثال کو محض مثال ہی سمجھنا تھا لہٰذا خاموش رہ کر ہاں میں ہاں ملانا بھی ان کی مجبوری تھی۔

"تو یقیناً وہ ان ہمدردی کے کمزور لمحوں میں خود ترسی کا شکار ہو کر دوسروں کے رویے میں چاہتے نہ چاہتے ہوئے اسی بات کی تصدیق کے عمل میں لگے رہیں گے کہ یقیناً اُن پر ظلم ہو رہا ہے، انہیں ان کے منصب یا حق کے مطابق عزت نہیں مل رہی۔ اس لیے انہیں بھی اپنے مثبت جذبات اُن سب کے بجائے تم پر ہی نچھاور کرنے چاہئیں چونکہ تم ہی اُن کی سب سے بڑی ہمدرد ہو۔"

آپا اپنے دل کی بات مثال کی آڑ میں کر رہی تھیں یا مثال کو آسان فہم بنانے کے لیے انہوں نے عائشہ کا نام استعمال کیا تھا۔ اس بات پر وہ آہستہ آہستہ اپنے دل کے اندر الجھتی جا رہی تھیں۔

"گھر کی پہلی اینٹ تو گرتی ہی تب ہے جو کوئی محبت کے لبادے میں لپٹا وجود ہمدردی کے شیرے میں ڈوبے الفاظ میں گھر کے اندر بڑے سکون سے آیا، لوگوں کو وہی سارا منظر ایک دوسرے انداز میں دکھاتا ہے۔ تب ہر ایک لفظ کا مطلب کہنے والے کی سوچ کے برعکس اُن ہمدردی میں ڈوبے لفظوں کے معیار پر سنا اور سمجھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شیطان نے اپنائیت کے لبادے میں ظاہر ہو کر حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا علیہ السلام کو دیس نکالے کا حکم سنوا دیا تھا۔ خود ہی سوچو اگر وہ شیطان ہی کے طور پر ظاہر ہوتا تو کیا اس کا کوئی بھی مشورہ قابل قبول ہوتا؟" بڑے آرام سکون اور مکمل واضح انداز میں کی گئی باتوں کا جواب عائشہ بھابھی نے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ مبادا چور کی داڑھی میں تنکے والی بات ہی نہ ہو جائے۔

"توڑنے والے تو گھر کی ایک ایک چوکھٹ اور دہلیز بڑی ہی عقیدت سے چوم چوم کر توڑتے ہیں۔ ایک ایک اینٹ اکھاڑنے سے پہلے بڑے آنسو بہاتے ہیں۔ بے پناہ اور بے تحاشا محبتیں جتاتے ہیں اور ایسی محبتیں گھر کی بنیادوں کو آہستہ آہستہ دیمک بن کر یوں چاٹ جاتی ہیں کہ پھر اس جگہ نیا مکان تو ضرور بنتا ہے مگر اس مکان کو گھر بنانا اور وہ بھی مہربانیوں کی دیمک کی موجودگی میں ناممکن ہی رہتا ہے۔"

ثروت آپا کی باتوں میں اپنی دلچسپی کا نہ ہونا ظاہر کرنے کے لیے تائید میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر ریموٹ لیا اور چینل بدلنے لگیں جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید باتیں سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ اس کے برعکس ثروت آپا کو تو جیسے بڑی مشکل سے یہ موقع ملا تھا سو چپ ہونے کا ارادہ ان کا بھی نہیں تھا۔

"ویسے بھی عائشہ، یہ بات تو تم بھی مانو گی نا کہ گھر کی بنیادوں میں زلزلہ برپا کرنے والے تو حقیقتاً گھر کے افراد کہلانے کے مستحق ہی نہیں ہوتے، کیونکہ گھر کے افراد کتنا ہی لڑ جھگڑ کیوں نہ لیں چند روز بعد سب کچھ بھلا کر وہ پھر سے ویسے ہی مخلص اور پیار کرنے والے نظر آتے ہیں جیسے پہلے۔"

"ہاں بات تو ظاہر ہے آپ کی سو فیصد ٹھیک ہے۔"

ٹی وی کو اپنی پہلی ترجیح قرار دیتے ہوئے عائشہ نے نظریں اسکرین پر ہی جمائے رکھنے کے دوران جواب دیا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

''بس دکھ تو اسی بات کا ہے نا کہ جب کوئی بھی باہر کا فرد مصنوعی چاہت کا ڈھاٹا باندھے نقب لگا کر اندر آتا ہے اور گھر کے یوں پرخچے اڑا کر رکھ دیتا ہے کہ برسوں ساتھ رہنے والے برسوں کے اجنبی قرار پاتے ہیں۔''

ثروت آپا کے ایک ایک لفظ اور چہرے کے تمام تاثرات سے ان کی دل گرفتگی ظاہر ہو رہی تھی اور یہی بات عائشہ کو کاٹ رہی تھی۔

''وہ کہتے ہیں نا کہ

دشمن سے یوں تو سب محتاط رہتے ہیں مگر
زندہ رہنا اک ہنر ہے دوستوں کے درمیاں

''ارے واہ آپا! آپ نے تو شاعری بھی شروع کر دی ہے۔'' اُن کے پڑھنے کے انداز پر عائشہ مسکرائے بنا نہ رہ پائی تھی۔

''نا بابا نا، میں کہاں، یہ تو جانے کہاں پڑھا تھا آج اپنے ہی حالات پر یاد آ گیا۔''

''آپ کو کن دوستوں سے فکر لاحق ہے ویسے؟''

عائشہ کا آج یہاں بیٹھنا مجبوری تھا سو بات تو کرنا ہی تھی۔ موضوع چاہے کوئی بھی ہوتا۔

''ارے نہیں، میں تو بس ویسے ہی۔۔۔'' انہوں نے بات ٹالی۔ مگر کچھ سوچتے ہوئے چند ہی لمحوں بعد دوبارہ بولیں۔

''ایک بات کہوں عائشہ! مان لو گی؟''

''ایسی کیا بات ہے آپا! آپ کہہ کر دیکھیں۔ اگر ماننے والی ہوئی تو پھر ظاہر ہے ضرور مانوں گی۔''

ثروت آپا کے وعدہ لینے کے انداز نے عائشہ بھابھی کو چونکا دیا تھا۔

''ندی جس عمر میں ہے، اس میں بعض اوقات غلطیاں بھی ہو ہی جاتی ہیں۔ ایسے میں ہمیں چاہیے تا کہ اس مسئلے کا خود کوئی حل نکالیں۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپا! میں سمجھی نہیں۔''

''دراصل میں سوچ رہی تھی کہ ندی کے لیے یہاں وہاں رشتہ دیکھنے کے بجائے اگر تم اپنا ہی یا اکمل سے بات کرو تو ہو سکتا ہے گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے۔'' ہچکچاتے ہوئے ہی سہی مگر ثروت آپا نے بالآخر اپنے دل کی بات کہہ ہی دی تھی اور ان کی اس بات کو سنتے ہی جیسے عائشہ بھابھی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یعنی وہ جس بات سے خوف زدہ تھیں ثروت آپا اسی بات کو مسئلے کے حل کے طور پر پیش کر رہی تھیں۔

''ویسے ایک بات تو خود میں بھی کہنا چاہ رہی تھی آپا! آج نہیں بلکہ پچھلے کئی دنوں سے۔''

عائشہ نے پینترا بدلا۔

''اکمل کا خیال تو آپ کو شاید آج ہی آیا ہو گا نا، مگر میں سوچ رہی تھی کہ ندی نے تو چلو جو بھی گل کھلائے سو کھلائے ہی، اب گھر کا کوڑا کسی اور پر پھینکنا بھی تو مناسب نہیں لگتا نا۔''

''تمہاری بات کا مطلب۔۔۔؟''

عائشہ بھابھی کے بل کھاتے لہجے نے ثروت آپا کو اپنے سوال کے جواب کے لیے تو مایوس ہی کیا تھا۔

''مطلب یہ کہ اپنے دیور سے ندی کی شادی کے لیے کوئی کوشش کیوں نہیں کرتیں آپ؟ اچھا ہے بلکہ آپ کے سامنے ہو گی، آپ کے ساتھ رہے گی تو کسی میں جرأت نہیں ہو گی اسے اُس کی نادانیوں کا طعنہ دینے کی۔'' ثروت آپا کو اس سے اتنے زہریلے وار کی توقع ہرگز نہیں تھی جبھی اس کی بات پر تلملا اٹھنا ایک فطری امر تھا۔

''اور اگر بالفرض کوئی اسے کچھ کہتا بھی ہے تو آپ دفاع کرنے کے لیے تو کم از کم موجود ہوں گی ہی نا اس کے پاس۔''

''تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم آخر کیا کہہ رہی ہو؟'' اپنے طیش کو حتی الامکان کنٹرول کرتے ہوئے ثروت آپا بولیں۔

''ہاں، بس یہی کہ اپنے سسرال میں ندی کی شادی کی بات چلائیں اور کیا۔۔۔'' کندھے اچکاتے ہوئے عائشہ بھابھی نے بات یوں لاپروائی اور بے

ے کر ڈالی تھی کہ جیسے ندی کی شادی اور اس کی
ری زندگی کا نہیں بلکہ یہ ذرا مارکیٹ تک جانے کی
ت ہو رہی ہو۔ کوئی ہمدردی، افسوس یا کسی قسم کا لگاؤ
کیے بغیر اُن کا یوں بات کرنا ثروت آپا کو گیلی
کڑی کی طرح سلگا گیا تھا۔

''عائشہ! شاید تم بھول رہی ہو کہ شادی شدہ
ندگی کے معاملے میں میرا نصیب اتفاق سے تم جیسا
ثابت نہیں ہوا ہے اور نہ ہی میں کسی سلجھے ہوئے
سسرال کی بہو بنی ہوں۔ اگر میں اُن کے درمیان ان
جیسی بن کر زندگی گزار رہی ہوں تو وہ میری ہمت
ے اور رشتے کی بات کرنا تو دور تم نے جس طرح
نند کے سامنے ندی کے ساتھ ہونے والا یہ واقعہ
یان کیا تھا صرف اُسی وجہ سے آج میں وہاں دب گئی
ہوں، سر اٹھا کر چل نہیں سکتی اب اُن کے
سامنے۔۔۔ اور وجہ ہو صرف تم۔''

''لیکن حقیقت سے ساری دنیا واقف تھی۔ اس
ت کا خیال آپ کو تب کیوں نہیں آیا جب بابا کی
جھ پر سب کے سامنے ندی کو موردِ الزام ٹھہرا دیا
تھا۔ تب تو آپ کو اپنی سسرال میں ہونے والی سبکی یاد
رہی تھی اور نہ ہی اپنے عزت۔۔۔''

''عائشہ! خدا کا واسطہ ہے چپ کر جاؤ۔'' ثروت
آپا نے حقیقتاً اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''پہلے سسرال والوں کی سنتے رہو اور اب یہاں
آ کر تمہاری۔۔۔ معاف کرنا، میرے دماغ میں اب
اتنی ہمت نہیں رہی ہے۔ حالات نے بہت کمزور کر دیا
ہے مجھے، میں اب وہ پہلی والی ثروت نہیں رہی
ہوں۔۔۔ پلیز چپ ہو جاؤ۔'' عائشہ نے چونک کر
ان کی پست آواز اور ارتعاش زدہ لہجے پر انہیں دیکھا تو
وہ اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔

''دیکھو عائشہ! تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش
کرو۔'' عائشہ بھابھی کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر
سامنے شیشے کے تکونے میز پر رکھتے ہوئے بولیں۔

''میری بات بہت ٹھنڈے دماغ اور پرسکون
ل کے ساتھ سنو۔ یہ اس کی پوری زندگی کا مسئلہ ہے

اور اس میں تو کوئی دو رائے نہیں ہے کہ اُس سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں، مگر تم خود سوچو نا اگر ہمارے جسم کا کوئی ایک حصہ کسی بیماری کے باعث خراب ہونے لگے تو بھلا ہم اسے کاٹ کر پھینک تھوڑی دیں گے۔ اس کا علاج کریں گے نا، کوئی تدبیر کریں گے تا کہ وہ پھر سے اُسی طرح بہتر حالت میں آ سکے۔'' بات کا متن تو بخوبی عائشہ بھابھی کی سمجھ میں آ گیا تھا مگر اس کے باوجود ہونٹ سکیڑے چپ بیٹھی سپاٹ چہرے اور بے تاثر آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہیں۔

''دیکھو، ندی اچھی ہے یا بری مگر ہے تو ہماری چھوٹی اور بہت لاڈلی بہن نا۔۔۔ اگر اس معاملے کو پرے رکھ دیا جائے تو اُس نے کبھی کسی کی دل آزاری نہ تو اپنے رویے سے کی تھی اور نہ ہی لفظوں سے۔۔۔ اور یاد ہے نا یونیورسٹی سے تھک کر آنے اور ناصر بھائی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود گھر آ کر تمہاری کتنی ہیلپ کرواتی تھی۔'' ذرا سا کھسک کر انہوں نے عائشہ بھابھی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔

''آج اُسے ہماری ہیلپ کی ضرورت ہے عائشہ! اپنے ہی جسم کے ایک حصے کو ہماری توجہ اور محبت شاید پھر سے اسی جسم کے ساتھ جوڑے رکھے اور یہ تمہاری مدد کے بغیر تو قطعاً ناممکن اس لیے بھی ہے کہ ناصر بھائی آج کل اور کسی کے منہ سے بھی ندی کی حمایت کے لیے کوئی بات بھی سننے کو تیار نہیں ہیں۔''

''آئی ایم رئیلی سوری ثروت آپا۔۔۔!'' بڑی نرمی اور سہولت سے عائشہ بھابھی نے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں سے علیحدہ کیے اور بالوں میں انگلیاں چلانے کے بعد بولیں۔

''جسم کا کوئی حصہ ناسور بن جائے تو جسم ہی کی بہتری کے لیے اسے کاٹ کر پھینک دینا ہی بہتر خیال کیا جاتا ہے۔'' ثروت آپا نے مایوسی سے ان کے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھا۔

''اور میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ اپنے ہاتھوں سے کسی بھی قسم کی بیماری اکمل کی زندگی میں داخل

کردوں۔'' دیر تک لاؤنج ہی میں بیٹھ کر اکمل کی متوقع فون کال کا انتظار کرنے والی عائشہ بھابھی کو وہاں سے اٹھنا ہی پڑا تھا کہ آج ثروت آپا پہ پڑنے والا ندی کی محبت کا یہ دورہ اب اُن سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سنو کیسا لگا اُس شخص سے ملنا بچھڑ جانا
ملا تو اجنبی تھا وہ بچھڑ کر آشنا ٹھہرا
پلٹ کر ہر طرف سے کیوں نظر پھر اُس پہ آ ٹھہری
وفا کے سلسلوں کی وہ مسلسل انتہا ٹھہرا

ابھی کچھ دیر پہلے جب مہربانو ہاتھ میں پیتھالوجی کی کتاب تھامے اپنے بلاک سے نکلی تھی تو اچھی خاصی دھوپ بھی مگر اب آناً فاناً آسمان گہرے بادلوں سے جو ڈھکا تو موسلا دھار بارش شروع ہونے میں بس چند ہی لمحات لگے اور وہ جو درخت تلے گھاس پر بیٹھ کر پڑھنے کا ارادہ کیے باہر نکلی تھی اسے بھی جلد ہی کوریڈور کے نیچے پناہ لینی پڑی۔

لڑکیاں اپنے کمروں سے نکل کر بارش سے بڑے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ گرلز ہاسٹل تھا اس لیے کسی کو بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ سب بڑے مطمئن انداز میں یہاں سے وہاں بارش کی بوندوں کے سنگ مستی کے موڈ میں تھیں۔ مہربانو خاموشی سے مسکراتے لبوں کے ساتھ بس انہیں دیکھے گئی۔

اسے یاد نہیں پڑتا کہ آج تک کبھی وہ بھی یوں بارش میں بھیگی ہو، اتنے بلند و بانگ قہقہے لگائے ہوں، اپنی کسی سہیلی کے ساتھ یوں بارش میں رس کودی ہو۔۔۔ اس کی زندگی میں ایسا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ کتنا کچھ تھا جو وہ اپنی زندگی میں مِس کر چکی تھی۔ تعلیم تو ایک طرف، اُسے صحیح معنوں میں زندگی کا مطلب ہی یہاں آ کر پتا چلا اور تب، جب وہ دوسری لڑکیوں کو یوں زندگی کے تمام رنگوں کے ساتھ جیتا دیکھتی تو یکبارگی دل میں ایک محرومی کا سا احساس جنم لیتا کہ وہ ظاہری طور پر سب کچھ ہونے کے باوجود کتنی تہی داماں ہے۔ اکیلے پن کا احساس بے طرح اس کے ذہن و دل پر ضربیں لگائے جاتا۔۔۔ کبھی اس کا بڑا دل چاہتا کہ وہ بھی اُن سب کی طرح ہنسے، کھلکھلائے اور خود کو اپنے زندہ ہونے کا احساس دلائے مگر وہ کوے کی طرح ہنس کی چال چلتے ہوئے خود اپنی بھی چال کو بھولنا نہیں چاہتی تھی اور تب اس کشمکش میں وہ اکثر نڈھال ہو جاتی۔ سامنے ایک دوسرے کو چھیڑتی لڑکیاں اور دل سے نکلنے والی گھٹی گھٹی سانسیں۔

ایک لمحے کو اُس نے سینے پر باندھے بازو کے درمیان موجود کتاب کو کسی اپنے، کسی ہمدرد کی طرح گلے لگایا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور خوش گوار ہوا کے ساتھ بارش کی پھوار جو اس پر پڑی تو سر پر لی گئی چادر اس تیز بوچھاڑ نما پھوار سے بھیگ کر رہ گئی۔ بڑے دل فریب احساس کے ساتھ وہ پیچھے کی طرف مڑی اور کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے جانے کہاں سے اُس دن آئس کریم پارلر پر ہونے والی اکمل سے ملاقات یاد آ گئی۔

مسکراتی آنکھوں والا اکمل کو کہ اس دن مہربانو کی حد درجہ گھبراہٹ کی وجہ سے اپنا تعارف نہیں کروا پایا تھا مگر اس کے باوجود کچھ ایسا ضرور تھا کہ آج برستی بوندوں کے ساتھ اس کا خیال مہربانو کے ذہن میں اُترا تھا۔ چند قدم پیچھے ہو کر ستون سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک ایک لمحہ دوبارہ سے فلم کی ریل کی طرح چلنے لگا تھا۔ اکمل کا اُسے بیٹھنے کے لیے کہنا اور پھر پیچھے آ کر کتاب پکڑانا، اتفاق سے اُس دن بھی یہی کتاب تھی جو وہ لوٹانے آیا تھا۔

وہ سب باتیں ذہن میں دوہراتے ہوئے اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ یونہی بس خوامخواہ مسکرانے لگی تھی۔ چونکی تو تب جب میری اور کنول بھی بھیگے کپڑوں کے ساتھ اس کے عین سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں کی قمیصوں کے دامن سے پانی یوں ٹپکتا جا رہا تھا گویا ابھی ابھی دھو کر بنا نچوڑے ہی کپڑے پہن لیے گئے ہوں۔

''اوئے ہوئے، بڑی اسمائلیں ہو رہی ہیں۔'' کنول نے خالصتاً لاہوری انداز میں کہا تو مسکراہٹ چھپانے کی کوشش میں مزید گہری ہوتی چلی گئی۔

''یعنی کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔'' میری بھی بھلا کیوں پیچھے رہتی۔

''کس کو سوچا جا رہا ہے اتنی خاموشی سے، اتنے رومینٹک ماحول میں؟'' دامن کو پکڑ کر نچوڑتے ہوئے کنول نے۔۔۔ ابرو اوپر نیچے کر کے مہربانو سے جواب مانگا۔

''ارے نہیں میں تو بس موسم انجوائے کر رہی تھی۔'' مہربانو نے دامن بچایا۔

''ہاں بالکل، یہ سر سے کمر تک لپٹی چادر کے ساتھ ہی بارش کا موسم انجوائے ہوتا ہے۔'' میری نے ایک بار پھر اس کی کلاس لینی چاہی۔

''ویسے تم ایک بات بتاؤ۔۔۔''

بارش جیسے یک دم شروع ہوئی تھی اسی طرح اب ختم بھی ہو گئی تھی۔ سرسبز پیڑ، پودے مزید نکھر کر ایک انوکھی ہی چھب دکھا رہے تھے مگر ہوا میں جو تازگی اور مہک تھی وہ ہر ذی روح کو شاد کیے دے رہی تھی۔ کوریڈور سے نکل کر وہ تینوں اب باہر آسمان تلے تھیں۔ جہاں اب کچھ دیر پہلے بھیگتی لڑکیاں کپڑے نچوڑتی وہیں پر سوکھ جانے کی بھی منتظر تھیں جبکہ کچھ لڑکیاں اب ہر بلاک کے مشترکہ غسل خانوں کے سامنے نہانے کے لیے اپنی باری کی منتظر تھیں۔

''ہاں بولو۔۔۔'' سر پر پہلے سے موجود چادر کو مہربانو نے ایک بار پھر سیٹ کیا کہ یہی اس کی عادت تھی۔ ہاسٹل کے اندر بھی سر سے چادر کا پلو نہ اترنے دیتی۔ ہاں البتہ اپنے کمرے میں ہوتی تو بات اور تھی۔

''سچ سچ بتانا، اس وقت کسے یاد کر رہی تھیں جب ہم نے تمہیں ڈسٹرب کیا؟''

''حکیم اللہ محسود کو۔۔۔'' مہربانو کے بولنے سے بھی پہلے کنول نے جل کر جواب دیا تھا۔

''میری! تم بھی نا، بالکل عقل سے پیدل ہو، اتنے اچھے موسم میں ظاہر ہے کسی ہیرو کو ہی سوچ رہی ہو گی۔''

''کیوں بھئی، یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ خوب صورت موسم میں بندہ صرف کسی ہیرو کو ہی سوچے، کوئی رومینٹک گانا سنتے ہوئے بھی اُسی کا خیال آئے، کوئی خوب صورت سی شاعری پڑھتے ہوئے بھی دل اسی کو سنانے کو چاہے، ہجوم میں بھی نظریں اسی ایک چہرے کو ڈھونڈیں، دل گرفتگی کے عالم میں بھی دل اسی کے کندھے پر سر رکھ کر رونا چاہے اور دل کی ہزار باتیں جو بندہ صرف اور صرف اسی سے مگر محض خود کلامی کے انداز میں کرتا ہو، کہاں لکھا ہے یہ قانون؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔''

''اُن سے کہنا کبھی چہرے بھی پڑھے ہیں تم نے
جو کتابوں کی کیا کرتے ہیں باتیں اکثر''

کنول نے مہربانو کو دیکھتے ہوئے میری کو مخاطب کیا اور شعر کا مفہوم سمجھنے پر میری بھی سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''تمہیں نہ ہوا ہو، ہمیں تو چہرے دیکھ کر پتا چل جاتا ہے کہ پیچھے سے کتاب دینے کے بہانے آنے والا بندہ دل میں کیا سوچ رہا ہے۔'' ذومعنی انداز میں میری نے کہا تو مہربانو کو یوں لگا گویا اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ مگر اس کے باوجود ''اقرارِ جرم'' نہ کرنے کا سوچتے ہوئے اُس نے اُن دونوں کی توجہ سامنے مختلف ٹولیوں میں موجود لڑکیوں کی طرف مبذول کروائی۔

آسمان ابھی تک ابر آلود تھا اور اسی موسم کے مزے کو کیش کروانے کا سوچ کر کینٹین میں گرما گرم بھاپ اڑاتے سموسے اور پکوڑے تیار کیے جانے لگے تھے۔ ایک کے بعد ایک کو خبر ملی تو سب اپنے اپنے والٹ تھامے جوق در جوق سموسوں، پکوڑوں کی طرف کھنچی چلی گئیں۔

''واہ یار! اللہ بھلا کرے کینٹین والے چاچا کا، بچی ایسے موسم میں آلو کے گرم سموسوں اور دہی پودینے کی چٹنی جیسی نعمت کا مقابلہ کوئی بھی چیز نہیں کر سکتی۔'' کنول نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پرشوق

انداز میں کہا تو مہربانو نے اس بات پر سکون کا سانس لیا کہ کم از کم وہ ان کی توجہ کسی دوسری جانب مبذول کروانے میں مکمل — کامیاب رہی ہے۔

☆☆☆

راہ دے وچ کھلونا اوکھا
اپنا آپ سکونا اوکھا
اینی وده گئی دنیا داری
کلیاں بے کے رونا اوکھا
دُکھاں اتے ہر کوئی ہسدا
کسے دا درد ونڈانا اوکھا
گلاں نال نئیں رجتے مل دے
جوگی بھیس وٹانا اوکھا
کوئی کسی دی گل نئیں سن دا
لوکاں نوں سمجھاناں اوکھا

ملکانی سائیں کی طرف سے کیے گئے میران شاہ کی شادی کے مطالبے نے جہاں شاہ سائیں کو حیران کر دیا تھا وہیں میران ان کی اس اچانک کایا پلٹ پر حیران تھا۔

''اماں سائیں! آپ کو پتا بھی ہے آپ آخر کہہ کیا رہی ہیں۔'' سب سے پہلا ردِعمل میران کی طرف سے انفرا ریڈ شعاعوں سے بھی کہیں زیادہ تیکھا اور چبھ جانے والے سوال کی صورت میں آیا۔

''آہو پتر! میں نے یہ بات بڑی سوچ وچار کے بعد کی ہے۔ کوئی ایویں ہی نئیں کہ اچھے دماغ میں کوئی گل آئی تے میں فٹو فٹ سب کو کہہ بھی دوں۔''

''کچھ فیصلے اگر ٹھنڈے دماغ سے اور سوچ سمجھ کر کیے جائیں تو محض ذہن میں آنے والے ان کے نتائج ہی بندے کو آئینہ دکھا دیتے ہیں۔'' شاہ سائیں نے میران شاہ کا جارحانہ ردِعمل دیکھ کر اس کی حمایت میں بات کا آغاز کیا تھا۔

''انسانی نفسیات کے زیرِ اثر ایسے مقامات بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جب وہ خود کو ہوا میں بھی اڑنے کے قابل سمجھنے لگتا ہے مگر دراصل ایسا ہوتا نہیں۔''

''ایسا ہی ہے شاہ سائیں۔۔۔! اور اب گیا پروہ، خود میران پتر کا بھی بڑا دل ہے۔ اس کے کمرے میں ایک سوہنی صورت والی لڑکی کی تصویریں خود میں نے بھی دیکھی ہیں اور اُسی دن میں نے تے سوچ لیا تھا کہ جو ہونا ہے تے ہوتا رہے پر میں اپنے پتر کی زندگی میں خوشی لاؤں گی۔''

''اماں سائیں! میں نے آپ کو ایک مرتبہ پہلے بھی کہا تھا نا کہ میرے کمرے کی کسی چیز کی تلاشی نہ لیا کریں جا کے۔'' کسی لڑکی کی تصویروں کی بات پر شاہ سائیں نے بھی میران کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ گو کہ یہ اس جگہ کوئی خاص ایشو نہیں تھا مگر اس کے باوجود میران کا ایک دم چونکنا اور اس کی بوکھلاہٹ اُن کے لیے حیران کن تھی۔

''ہاں تے پتر! میں نے کون سی تلاشی لی تھی کمرے کی، میں تے صفائی کروانے کے لیے کنیزاں کے ساتھ کمرے وچ گئی تے الماری کھلی پڑی تھی میں بند کرنے لگی تے کھلے ہوئے دراز وچ تصویریں نظر آ گئیں۔''

''مگر اماں سائیں! تصویریں ہونے اور شادی کے معاملے میں بڑا فرق ہے۔'' شاہ سائیں کی موجودگی کی وجہ سے لحاظ کا ایک پردہ اُن کے درمیان حائل تھا اور اسی وجہ سے وہ ان سے قدرے نرمی سے بات کر رہا تھا ورنہ اُن سے بات کرتے وقت وہ ہمیشہ ہی اُن کا ماں ہونا بھول جایا کرتا تھا اور اُن کے لاڈ پیار کی چادر تلے اکثر ہی اپنی زبان کا کھردرا پن چھپا دیا کرتا اور وہ پھر بھی ہمیشہ ممتا کی ماری اس کے آگے پیچھے پھرا کرتیں۔

''نا پتر! سچی سچی ایک بات تو بتا۔'' انگشتِ شہادت ٹھوڑی پر رکھ کر انہوں نے بات کی تمہید باندھی تو انگلی میں موجود ہیرے کی انگوٹھی نے سر کے عین اوپر لگے کرسٹل کے فانوس سے نکلتی دودھیا روشنی کو اپنے ہونے کا احساس خود سے نکلتی چمک دمک سے دلایا۔ مگر اس سفید دودھیا روشنی میں بھی میران شاہ کے چہرے کے پھیکے پن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''تیرا دل نہیں کرتا شادی کو؟'' ملکانی سائیں کے لہجے کی بے بسی واٹلن سے نکل کر بکھرتے ہیروں کی مانند بے قدموں پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔

شاہ سائیں اور میران کی نظریں ملکانی سائیں کی بات کو سننے کے بعد ایک دوسرے سے ٹکرائیں مگر میران زیادہ دیر تک انہیں دیکھ نہیں سکا تھا جبھی نظریں چرا لیں۔

''اب یہ نہ کہہ دیں کہ نہیں کرتا، کیونکہ میں نے نیر مانتا کوئی نہیں ہے۔'' دبیز قالین پر دبے پاؤں خراماں خراماں چلتی سونی صوفوں کے عقب سے ہوتی ہوئی ملکانی سائیں تک آ پہنچی تھی۔ انہوں نے بڑے لاڈ سے اسے اٹھایا تو وہ بھی کسی پیڑ کی لچکیلی ڈال کی طرح اُن کے بازوؤں میں ہی جھول گئی۔ ملکانی سائیں نے اسے گود میں بٹھایا اور اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے شاہ سائیں کی طرف دیکھنے لگیں جو کہ سگریٹ جلانے کے بعد اُس کا گہرا کش لے رہے تھے۔

''یہ بے چارہ کیا کہے گا اور کیا نہیں کہے گا، یہ تو اس عمر کی ایک فطری ضرورت اور خواہش ہے مگر۔۔۔'' شاہ سائیں تذبذب کا شکار معلوم ہوئے۔

''مگر تے اگر کچھ نئیں شاہ سائیں! میں نے اپنے پتر کو ست وانسی بچے کی طرح پالا ہے۔ یہ زمین، جائیداد، فیکٹریاں کچھ وی نئیں ہیں جے اگر ہمارا بچہ ہی خوش نہ رہے۔''

''تو کیا میں نے کبھی ایسا چاہا ہے کہ یہ خوش نہ رہے؟''

''نہیں شاہ سائیں! میرا تے ایہہ مطلب نہیں تھا۔''

''میران! تمہارا کیا خیال ہے؟ شادی کر دیں تمہاری؟'' میران نے جس نظر سے انہیں دیکھا ایسا لگا گویا زہر کی انی کسی نے اُن کے اندر گھونپ ڈالی ہو۔

''ایہہ کیا بتائے گا، میں ماں ہوں شاہ سائیں! جو اولاد کی سانس لینے کی رفتار سے جان لیتی ہے کہ اُن کا موڈ کیا ہے۔'' شاہ سائیں نے تائید طلب نظروں سے میران کو دیکھا، مگر اس کے چہرے پر جذبات کی کوئی بھی رمق نہیں تھی اس کے برعکس ملکانی سائیں کا چہرہ جوشِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

''شادی صرف گھر میں ایک لڑکی کو لے آنے کا نام نہیں ہے ملکانی اور پھر یہ بھی سوچ لو کہ ہمارے اپنے گھر میں بھی بیٹی ہے۔ کسی کی بیٹی کی زندگی خراب کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم پہلے اس مسئلے پر اچھی طرح سوچ لیں۔''

''نا تے زندگی کیا خراب ہونی ہے شاہ سائیں! ایسا کیا ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے اور پھر لڑکیوں کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔ روپیہ، پیسہ، آگے پیچھے پھرتے ملازم۔۔۔ اسی عیش و عشرت کو تو یہ شہری لڑکیاں مانتی ہیں۔''

''زندگی صرف عیش و عشرت ہی حاصل کرنے کا نام نہیں ہے اور بھی بہت سے تقاضے ہوتے ہیں۔ نبھالو گے میران؟'' ایک بار پھر انہوں نے گیند میران کے کورٹ میں ڈال کر ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی تو وہ کسی کشمکش کا شکار معلوم ہوا۔

''میں اپنی نُوہ (بہو) کو ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھوں گی، شاہ سائیں! بس آپ مان جائیں۔'' ملکانی سائیں تو جیسے پنجوں کے بل تیار بیٹھی تھیں۔ شاہ سائیں نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بولے۔

''جیسے تم دونوں ماں بیٹے کی مرضی اور میرے لیے بھلا اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کیا ہوگی کہ میرا بیٹا دولہا بنے اور ہم اس کی بارات لے کر جائیں۔'' وہ مسکرا دیے تھے۔

''مہربانی شاہ سائیں! اور پھر لوگوں کے منہ بند کرنے کا یہی سب نوں بہترین ذریعہ ہے۔ ایک ادھر سے پوچھتا ہے، شادی نئیں کرنی پتر کی، دوسرا اُدھر سے پوچھتا ہے، پتر کی شادی کا لگتا ہے کوئی خیال نہیں ہے۔۔۔ ہونہہ اب دیکھیں پتر، کیسے سب کے منہ بند ہوتے ہیں۔'' خوشی سے نہال ملکانی سائیں نے پیار سے سونی کو اپنی آغوش کا مزید احساس دلایا۔ وہ بھی اُن کا مزاج جان کر اپنے نرم نرم

نچے کبھی اُن کے ہاتھوں پر لگاتی اور کبھی منہ پر۔

''اور پھر شاہ سائیں! وہ لڑکی بھی لڑکیوں میں سے کوئی لڑکی ہے۔ اپنی خوب صورت ہے اپنی سوہنی ہے کہ بس میں تے کیا بتاؤں۔''

''ذات برادری کا بھی کچھ اتا پتا ہے یا صرف لڑکی ہی دیکھ کر خوش ہو رہی ہو؟''

''ہاں ایہہ تو میں نے وی نئیں پوچھا۔۔۔ کیوں میران؟''

''اماں سائیں! ہے تو وہ ہماری ہی برادری کی۔۔۔ میرا مطلب ہے سید گھرانے سے ہے۔ مگر۔۔۔'' شاہ سائیں کی موجودگی کی وجہ سے وہ کھل کر بات نہیں کر پا رہا تھا۔

''مگر۔۔۔؟''

''مگر یہ کہ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ اگر اسے میرے بارے میں پتا چل جائے تو کیا وہ پھر بھی شادی کے لیے تیار ہو جائے گی؟''

بات چونکہ شروع تو ہو ہی گئی تھی جبھی میران نے بھی مختصر لفظوں کا چناؤ کرتے ہوئے آپ بات کرنے کی ٹھان ہی لی۔

''تے پتر! تیرے بارے میں انہیں کش وی بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے بھلا۔۔۔ پڑھی لکھی تو میں اتنی نہیں، پر جاہل وی نہ سمجھ کر اپنی ماں کو۔۔۔ سب جانتی ہوں کس کے سامنے کون سی بات کرنی ہے اور کون سی چھپانی ہے۔'' انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے نوک دار مونچھوں کو مزید بل دیتے ہوئے سگریٹ سے سیاہی مائل ہوتے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

''تو دیکھیں ذرا۔۔۔ کیسے تیری ماں تجھے سامنے لائے بغیر تیری شادی کروائے گی۔'' ملکانی سائیں کے لہجے میں غرور در آیا تھا۔ بڑے فخر سے انہوں نے داد آمیز نظروں سے شاہ سائیں کو دیکھا جن کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

اکلوتے بیٹے کی شادی کی باتوں پر تو کم حیثیت (مالی اعتبار سے) لوگوں کی بھی باچھیں کھل جایا کرتی ہیں۔ چہرے پر خوشیاں رقص کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ بعض اوقات شادی کے موقع پر لیا گیا قرضہ اتارنے میں انہیں مدت لگتی ہے مگر ان تمام فکروں اور پریشانیوں سے آزاد ہو کر وہ بھی اپنے بچے کی شادی کی تیاریوں اور خوشی کے اس جشن کو ہر ممکن حد تک یادگار بنانے کی حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے زمین پر قدم ٹکاتے نظر نہیں آتے۔ مگر اس سب کے برعکس شاہ سائیں کا اس موقع پر تمام معاملے سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے سنجیدگی اختیار کرنا میران اور ملکانی دونوں کے اندر ہوتی اس انوکھی خوشی کی کھد بد کو کھل کر باہر آنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔

وجہ سے ملکانی سائیں بھی بخوبی واقف تھیں اور انجان تو میران شاہ بھی ہرگز نہ تھا۔ چند لمحے ایک دوسرے کے چہرے پڑھتے گزرے۔

''ایڈمیشن تو ویسے بھی تمہارا یونیورسٹی سے کینسل ہو گیا ہے۔ دوبارہ ایڈمیشن کروانے کی تم نے کوئی کوشش نہیں کی پھر کہاں ہوتے ہو آج کل؟ کیا مصروفیت ہے؟'' رواں موضوع کے بالکل برعکس بات کر کے شاہ سائیں جیسے ان پر کچھ جتانا چاہ رہے تھے یا پھر میران شاہ کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔

''بابا سائیں۔۔۔! وہ۔۔۔ کچھ خاص تو نہیں ہے بس یونہی۔۔۔'' غیر متوقع سوال پر میران کو کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔

''کتنے کتنے دن شہر میں گزارتے ہو، کبھی تو دن میں دو چکر بھی گاؤں سے شہر کے لگا لیتے ہو، کبھی مین روڈ پر بنی فیکٹری پر نظر نہیں پڑی تمہاری۔'' سگریٹ کو انہوں نے ایش ٹرے میں مسل دیا تھا۔

''جی بابا سائیں۔۔۔! دیکھی ہے میں نے۔ بہت بڑے رقبے کا احاطہ کیا ہے آپ نے فیکٹری کے لیے، اور اس پر قریب ہی موجود رہائشی کالونی بنانے سے نہ صرف ورکرز اپنا کام دھیان سے کرتے ہوں گے بلکہ آنے جانے کی فکر سے بھی آزاد ہوں گے۔''

''ہوں گے'' سے تمہارا کیا مطلب ہے، میں سمجھا

نہیں۔'' ملکانی سائیں جان چکی تھیں کہ ان کے اس طرح بات کرنے کے پیچھے کیا مقصد ہے۔ مگر جب شاہ سائیں بات کر رہے ہوتے تب انہیں بیچ میں بولنے کی اجازت نہیں تھی اور یہی حویلی کا دستور بھی تھا۔ سو خاموشی سے بیٹھی رہیں۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ یقیناً ایسا ہو گا۔''

''ہوں۔''

شاہ سائیں نے ہنکارا بھرا۔ ملکانی سائیں نے سونی کو گود سے اتارا تو وہ پھر بھی باہر جانے کے بجائے وہیں ان کے قدموں پر سر رکھ کے کارپٹ پر لیٹ گئی۔

''یہ جو اتنا کچھ بنا رکھا ہے نا یہ صرف تمہارے لیے ہے اور تمہیں چاہیے کہ اگر اب پڑھائی کو خیر باد ہی کہہ چکے ہو تو پھر بزنس کو وقت دو، وہاں شہر میں نہ سہی، اس فیکٹری کی باگ ڈور تو سنبھالو، تمہیں کم از کم کام کرنا نہیں تو کام کروانا تو آنا چاہیے کہ نہیں۔''

''جی بابا سائیں!'' میران کی نظریں نیچے تھیں۔

''شادی کرو، ضرور کرو، اگر تم سمجھتے ہو کہ تم کسی بھی طرح یہ رشتہ نبھا کر اپنی ہونے والی بیوی کو خوش رکھ سکتے ہو تو مجھے اعتراض آج ہے اور نہ کل ہو گا۔ مگر پھر بھی اب تم عمر کے جس دور میں ہو تمہارا یہ لاپروا انداز اور لاابالی پن اس سے مناسبت نہیں رکھتا۔''

''جی بالکل۔۔۔''

''اپنی ماں کے ساتھ مل کر شادی کی تمام تیاریاں کر لو، رشتہ کس طرح اور کب لے کر جانا ہے سب ڈسکس ہو جائے تب مہربانو کو بھی بلا لیں گے، ابھی سے اسے بلا کر یونہی خوامخواہ میں اس کی پڑھائی کا حرج نہیں چاہتا۔'' بات کرتے ہوئے انہوں نے ملکانی سائیں کو مخاطب قرار دے دیا تھا۔

''جی شاہ سائیں! بالکل ٹھیک ہے۔'' حسب معمول ملکانی سائیں نے ان کی ہر بات سے اتفاق کیا تھا۔

''لیکن ایک بات میں پھر بھی کہوں گا۔'' شاہ سائیں اٹھتے ہوئے بولے۔

''جب رشتہ لے کر جاؤ تو لڑکی والوں کو اس کے متعلق ہر بات سے آگاہ ضرور کر دو، پھر اس کے بعد اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ بھی خوش اور ہم بھی۔۔۔'' ملکانی سائیں نے ان کی بات پر میران کو دیکھا۔ جو تھا تو خاموش مگر شاہ سائیں کی باتوں سے اختلاف اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں۔ اسی لیے جیسے ہی شاہ سائیں اٹھ کر باہر گئے وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ملکانی سائیں کے پاس کھسک آیا تاکہ بیٹھ کر آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی کی جا سکے۔

☆☆☆

جو درد کے صحرا میں اکیلا بھی بہت ہے
اس کے لیے دیوار کا سایہ بھی بہت ہے
دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت ہے

شاہ زین، اماں اور ثمینہ کو ساتھ لے کر اپنے سابقہ گھر کے بجائے قبرستان کی طرف رخ کیے ہوئے تھا۔ آفس میں ایک دن کی رخصت کی درخواست وہ پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس لیے اب صبح کے وقت وہ آفس کی طرف سے دی گئی گاڑی میں اماں اور ثمینہ کو ساتھ لیے ابا کی آخری آرام گاہ کی طرف بوجھل دل کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ طے یہی پایا تھا کہ پہلے وہ قبرستان جا کر فاتحہ وغیرہ پڑھیں گے اور اس کے بعد گھر جائیں گے۔ سارا رستہ خموشی سے کٹا، اماں کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور ثمینہ بھی یقیناً کچھ پڑھ رہی تھی۔

سر پر والد کا سایہ نہ ہونے کی وجہ سے شاہ زین کے ساتھ زندگی جس بے گانگی سے پیش آئی تھی وہ تمام وقت شاہ زین کی آنکھوں کے آگے کسی فلم کی طرح گھوم رہا تھا۔ آج تک زندگی میں کہاں کہاں اور کس موقع پر اسے اپنے سر پر باپ کا سایہ نہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ سب لمحات اس کے ذہن میں پھر سے تازہ ہونے لگے اور یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ ابا سے ان تمام لمحات کی شکایات کر رہا ہو کہ دیکھیں آپ کے نہ ہونے سے ان سب نے کب کب اور کس طرح

مجھے ستایا ہے۔ ساتھ لائی یاسین شریف پڑھنے کے بعد اماں اور ثمینہ بھیگی آنکھوں سے قبر پر اُگی ننھی ننھی نیم نما پودوں کو ہٹا کر صفائی کرنے میں مصروف تھیں۔ اس کے بعد پانی کا چھڑکاؤ کیا، اگربتی مہکائی اور چپ چاپ بس قبر کو دیکھے ہی گئیں۔

"اماں! ایک بات تو بتائیں۔" خاموشی سے یک ٹک قبر کو دیکھ کر دل ہی دل میں ابا سے باتیں کرتی ثمینہ نے اماں کو پکارا تو ان کی تسبیح کو حرکت دیتی انگلیاں تھم گئیں۔

"مرنے کے بعد کیا واقعی بندہ اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ اپنے لیے نہ سہی اپنے پیاروں کے لیے بھی کچھ کر نہیں پاتا۔"

"تم کیا چاہتی ہو۔۔۔ تمہارے لیے کوئی دنیا سے چلے جانے کے بعد کیا کرے؟"

اماں اُس کے اس عجیب سوال پر حیران ہوئی تھیں۔

"میرا دل چاہتا ہے اماں کہ میں ابا کو کبھی دیکھوں، اُن سے باتیں کروں، دیکھوں کہ وہ کسی بات پر مسکراتے ہوئے کیسے لگتے ہوں گے۔ جب سنجیدہ ہوں تو کیسی متانت اور سنجیدگی ہوتی ہوگی نا اُن کے چہرے پر۔۔۔ پتا ہے اماں۔۔۔! جب مجھے ابا یاد آتے ہیں نا تو پھر بہت رونا آتا ہے، میرے دل کو سکون ہی نہیں ملتا پھر۔۔۔ دل چاہتا ہے بس زور زور سے روؤں اور کوئی مجھے چپ نہ کروائے۔" بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ رو دی تھی۔ اماں نے اسے گلے لگالیا۔

روتے ہوئے آواز دبانے کی کوشش میں اس کی سانسوں کی رفتار ایسی ہی تھی جیسے میراتھن ریس میں دوڑنے والوں کی ہوتی ہے۔ ثمینہ کی باتیں سن کر خود شاہ زین کو اپنا ضبط کھوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ سو وہ بھی وہیں بیٹھ گیا اور ثمینہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سہارا دینا چاہا۔

"میری جان! دلوں کا سکون تو صرف اور صرف اللہ کے ذکر میں ہے، لیکن ہاں جب بھی دل اس قدر اداس ہونے لگے تو اللہ سے ہم کلام ہو جایا کرو، اپنے دل کی کبھی شکایتیں خواہشیں، حسرتیں سب کچھ اسے کہا کرو اور تم دیکھنا بیٹا۔۔۔! تمہیں درحقیقت جواب موصول ہوں گے، تمہیں محسوس ہوگا جیسے حقیقتاً تم کسی سے محوِ گفتگو ہو۔۔۔" ثمینہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"آزما کر دیکھنا۔۔۔ چلتے پھرتے ہم میں سے اکثر لوگ دل ہی دل میں خود سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں، وہی باتیں اگر وہ خود سے کرنے کے بجائے اُن کا مخاطب اللہ کریم کو سمجھیں تو اس پاک ذات کا قرب حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں رہے گا اور اس کے قرب کا سکون تو قسمت والوں کو ہی ملتا ہے نا مگر کوشش کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔"

"جی اماں!" آنکھیں صاف کرتے ہوئے ثمینہ نے ایک نظر اس شہرِ خموشاں کی طرف دوڑائی جہاں نہ جانے کتنی داستانیں دم سادھے پڑی تھیں۔

"اور ہاں ایک اور بات۔۔۔"

اماں نے اٹھتے ہوئے ثمینہ اور شاہ زین کے ہاتھ کا سہارا لیا۔

"دنیا سے چلے جانے والے یقیناً اپنے لیے تو کچھ نہیں کر پاتے مگر وہ لوگ جو انہیں ایصالِ ثواب کریں یا اُن کی مغفرت کی دعا کریں اُن کے لیے جواباً دعا ضرور کرتے ہیں۔ اس لیے جتنا ہو سکے بس قرآن شریف پڑھ کر اپنے ابا اور تمام مسلمان ارواح کو ایصالِ ثواب کر دیا کرو۔" اماں نے الوداعی نظروں سے قبر کو دیکھا اور با آوازِ بلند سلام کرنے کے بعد وہ تینوں گاڑی میں بیٹھے تو تینوں ہی کے دل بوجھل تھے۔

حسبِ سابق رستہ تو خاموشی سے کٹا مگر اپنے محلے میں داخل ہوتے ہی جیسے من کھلنے سا لگا ہو۔ وہ جگہ جہاں ثمینہ اور شاہ زین پیدا ہوئے، جن گلیوں میں کھیلے کودے، جن رستوں سے ہو کر اسکول کالج گئے وہ رستے بھلا بھولنے کے لائق تھوڑا ہی تھے۔

ایک انجانی سی خوشی جیسے دل کا احاطہ کرنے لگی تھی۔

اس محلے کی ایک ایک چیز لگتا کہ ان کے گھر کی ہے۔ جس جس کو پتا چلتا کہ وہ آج خاص طور پر برسی کے سلسلے میں آئے ہیں تو سبھی آ کر ملتیں اور وضو کرنے کے ساتھ ہی کوئی سپارہ لے کر بیٹھ جاتیں تو کوئی نیاز اور ختم شریف کے اہتمام میں مصروف نظر آتیں۔ انہیں اسی بات کی حد درجہ خوشی تھی کہ وہ لوگ اس خاص موقع پر انہیں نہیں بھولے اور یہاں ان کے پاس آ کر ہی برسی کے موقع پر ختم قرآن وغیرہ کا اہتمام کیا۔

اپنا گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے، بندہ دنیا میں چاہے کسی بھی جگہ چلا جائے ذہن کو جو سکون اور تازگی اپنے گھر میں ملتی ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا اور پھر گھر بھی وہ جہاں انسان آنکھ کھولے، پہلا لفظ بولنا اور پہلا قدم چلنا سیکھے۔ اس گھر سے انسیت ہونا ایک فطری بات ہے اور یہی وجہ ہے کہ گھر کا تالا کھول کر اندر قدم رکھتے ہی ذہن میں اتری تازگی کو سب نے ہی محسوس کیا تھا۔ یوں بھی فیکٹری کی طرف سے چونکہ شاہ زین کو مکمل فرنشڈ گھر ہی ملا تھا اس لیے یہاں پر بھی تقریباً سب کچھ ویسا ہی تھا جیسے وہ لوگ چھوڑ کر گئے تھے اور پھر دوسرا سامان تو ایک طرف شاہ زین تو اپنی کتابیں بھی وہیں چھوڑ گیا تھا کہ ان کتابوں سے اب اسے وحشت ہونے لگی تھی۔

ہر کتاب کے ایک ایک چیپٹر سے ندی کی کوئی نہ کوئی یاد منسوب تھی۔

ختم شریف کے لیے آرڈر کیے گئے کھانے کو پہنچنے میں ابھی وقت تھا۔ سو یوں ہی محض وقت گزاری کے اس نے بلا ارادہ ہی بک ریک میں رکھی مارکیٹنگ کی کتاب اٹھائی تو اس میں ندی کی طرف سے دیا گیا گریٹنگ کارڈ عین اس کے قدموں کے سامنے جا گرا۔

یہ وہ کارڈ تھا جو ندی نے اس کی پہلی پریزنٹیشن کی بھرپور کامیابی پر اسے دیا تھا۔ جھک کر کارڈ اٹھاتے ہوئے شاہ زین کو اپنے کندھوں پر بلا کا بوجھ محسوس ہوا تھا۔ یوں بھی پیار صرف خوشی کے موقعوں پر گریٹنگ کارڈ یا ٹیڈی بیئر دینے کا نام نہیں ہوتا۔ پیار و محبت کے اس لطیف اور نرم و نازک جذبے کو پیار و محبت سے ڈیل نہ کیا جائے تو اس پر گرد جمنے لگتی ہے شکووں کی، بے توجہی کی۔ یکبارگی شاہ زین کو اپنے اندر بڑھتی گھٹن اور حبس کا احساس ہونے لگا تھا۔ سامنے ہی الماری کے دراز میں اس کی پرانی سم رکھی تھی۔ وہی سم جس کے ذریعے وہ اور ندی کتنی ہی دیر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی ڈسکس کرتے رہتے۔ حال کے خوب صورت حوالوں سے مستقبل کے سنہرے خواب سجاتے۔

وہ دن شاہ زین کی آنکھوں میں گھومنے لگے تو میکانکی انداز میں کارڈ وہیں تکیے پر رکھ کر اس نے دراز کھولی۔ کاغذ کے لفافے کے اندر ٹشو پیپر میں لپٹی سم نکالی اور اپنے موبائل میں ڈال کر ندی کے بھیجے گئے تمام میسجز پڑھنے لگا۔ زبیر کی طرف سے MMS کے ذریعے بھیجی گئی وہ تصویر جس میں شاہ زین ندی کے ہاتھ میں سیاہ بریسلیٹ پہنا رہا ہے۔ دیکھتے ہوئے جانے کیسے اس کا ضبط جواب دے گیا اور سرمئی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ ذہن کی سلیٹ اس وقت بالکل خالی تھی۔ یاد آ رہا تھا تو بس تصویر میں ندی کی ہتھیلی پر لکھا وہ شعر

ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی
زندگی چاہتا ہو جیسے!

ندی کے لیے اس کے جذبات اب بھی وہی تھے اور یوں بھی انسان تو اول روز سے ہی اپنے جذبات کا قیدی رہا ہے، کبھی نفرت کا قیدی اور کبھی محبت کا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ محبت کا قیدی بننا یا بنانا ایک نہایت مشکل امر اس لیے بھی ہے کہ کیونکہ محبت یا تو ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔ اس میں تیسری صورت کوئی نہیں ہے جبھی تو اس خوب صورت اور بے لوث جذبے کے تحت انسان اتنا سخت جان ہو جاتا ہے کہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے، بہت کچھ سہہ جاتا ہے۔ چاہے اس محبت کی ہری بھری شاخ کو وصل کی بارش میسر آئے یا نہ بھی آئے تب بھی سمجھوتے کے خشک پتے

اوران گنت مردہ پتیاں آخری دم تک اسی شاخ سے لگی رہتی ہیں اور خزائیں بھی بھی انہیں اڑا لے جانے کی ہمت نہیں کرتیں۔

سب کچھ ویسا ہی تھا مگر منظر بدل چکا تھا۔

وہ کمرا جہاں ابا نے اپنا آخری وقت گزارا تھا وہاں سے ثمینہ، اماں اور چند دوسری عورتوں کی تلاوت کی آواز آرہی تھی۔ اس نے سامنے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نظر ڈال کر ٹائم دیکھا۔ گھر واپس جانے میں ابھی بہت ٹائم تھا مگر اب اس کا دل لحہ بھر کے لیے بھی یہاں اس کمرے میں بیٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کہیں باہر نکلتا سم بدلنے کی غرض سے جیسے ہی اس نے فون بند کرنا چاہا آنے والی فون کال نے تو جیسے اسے چونکا کر رکھ دیا۔

''اس نمبر پر کون کال کر سکتا ہے؟'' حیران ہو کر اس نے ذہن دوڑایا۔

''ندی!''

فون پر ہوتی مسلسل بیلز کے درمیان ندی کا نام یونہی بے اختیاری طور پر اس کے منہ سے نکلا تھا اور ندی کا خیال آتے ہی اس نے غور سے نمبر دیکھا کہ اب تک اسے ندی کا نمبر ازبر تھا۔ مگر یہ دیکھ کر انتہائی مایوسی ہوئی کہ وہ کوئی اور انجان نمبر تھا۔ سو اس نے ریسیو کیے بغیر ہی کال کا رابطہ منقطع کر دیا۔

''شاہ زین بیٹا۔۔۔!''

برابر والے کمرے سے اماں کی آتی آواز کے ساتھ ہی موبائل ایک مرتبہ پھر بجنے لگا تھا۔

''کاش! کہ اس وقت ندی کا فون آجاتا۔'' شاہ زین نے بڑی حسرت سے سوچا اور آنے والی اس اجنبی فون کال کو ایک بار پھر منقطع کر کے موبائل کا والیم آف کیا اور اماں کی طرف چل دیا۔ یوں بھی اس کمرے تو کیا گھر میں بھی اس کے لیے رکنا محال تھا جہاں ندی کی موجودگی کے سپنے ساون بھادوں کے بادلوں کی طرح یہاں وہاں اڑتے پھر رہے تھے۔

☆☆☆

یہ کیسے ممکن تھا کہ ندی فون کرے اور شاہ زین اس کی کال نے بغیر ہی کاٹ دے اور یا پھر وہ فون کر کے ہلکان ہونے لگے مگر شاہ زین کی طرف سے مسلسل بیل جانے کے باوجود فون ریسیو نہ کیا جائے۔

یہ بات خود ندی کے لیے انتہائی حیرت اور اچنبھے کا باعث بن رہی تھی کہ پہلے تو اس کا فون مسلسل بند ملتا رہا اور اب اگر خوش قسمتی سے فون آن ہوا تو آگے سے ریسیو کرنے کے بجائے وہ یا تو فون بند کر دے اور یا اس سے بات نہ کرے۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا اور کیونکر ہو سکتا تھا۔

اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر امی بھی پریشان ہو گئی تھیں اور اس کا بار بار اپنی پلکوں کو جھپکانا انہیں ایسا لگا جیسے برسات کے بعد آدھی رات کو بارش کے قطرے پتوں سے پھسل پھسل کر نیچے زمین پر جا گرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اب کے تب اس کی خشک آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے یہ منجمد قطرے پگھل کر گرنے والے ہوں۔

''ندی! کیا ہوا بیٹا؟ فون بند ہے اب تک؟''

ندی نے خاموش نظروں سے یوں ان کی طرف دیکھا کہ جواب گہرے پانیوں میں چھید دار کشتیوں کی طرح بس ڈوبتا ہی چلا گیا۔ وہ اس کے بالکل قریب آکر بیٹھ گئیں تو ایک بار پھر ندی نے گہرا سانس لے کر انہیں مخاطب کیا۔

''حالات کی آندھیاں اس تیزی سے چل رہی ہیں کہ ٹھیک سے کسی بھی جگہ پر قدم جمنے ہی نہیں دے رہیں۔''

شاہ زین کا اس وقت اس کا فون نہ سننا، ندی کی ہمت کو ختم کیے دے رہا تھا۔ وہ جو اس کی آس دل میں لیے اب تک جیتی آئی تھی جو ہر دفعہ ہونے والے مختلف واقعات پر یہی سوچا کرتی کہ اگر شاہ زین سے اس کی بات ہو پائی تو وہ اسے بتائی کہ اس کے ساتھ زندگی کس طرح اجنبی کا سا برتاؤ کر رہی ہے اور اس کا ساتھ حاصل ہونے پر وہ خود کو کس قدر مضبوط تصور کیا کرتی۔

مگر اب صورت حال بہت مختلف ہو گئی تھی۔ ان چند منٹوں نے اس کے ذہن میں در آنے والے ہر خیال کے سامنے ایک بڑا سا ''اگر'' آویزاں کر دیا تھا۔

اگر ایسا ہوا کہ شاہ زین کہہ دے اب اسے میری کوئی ضرورت نہیں تو پھر۔۔۔؟

اگر اب تک وہ اپنی کوئی نئی دنیا بسا چکا ہو تو۔۔۔؟

اگر شاہ زین اس کی اور اپنی محبت کو محض وقتی جذبات قرار دے دے تو۔۔۔؟

اور اگر ایسا ہوا تو بھلا میرا کیا مقام رہ جائے گا۔۔؟

میں تو پھر چڑیا کے اس گھونسلے کی طرح ایک غیر ضروری اور بن چاہی اور نا مطلوب چیز کی مانند رہ جاؤں گی جس کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر میری زندگی میں باقی کیا رہ جائے گا؟ اس لمحے اس کا شدت سے یہ دل چاہا تھا کہ جس طرح ہم فزکس کے اصولوں کے تحت ہر عام مادے کے خواص معلوم کر لینے پر قادر ہیں اسی طرح زندگی میں بھی مستقبل بعید نہ سہی تو قریب کے ہی کچھ ہلکے سے خاکے معلوم ہو پاتے۔

''امی! فرض کریں کہ اگر شاہ زین کو اب میری ضرورت نہ رہی ہو، یا فرض کریں کہ وہ اب تک مجھے بھول کر اپنی دنیا میں مگن زندگی جی رہا ہو تو پھر ظاہر ہے کہ میں تو اس کے گھر جا کر بھی اس مہمان کی طرح ہونق دہلیز پر ہی کھڑی رہوں گی نا جو اتفاقاً پہنچ جائے اور گھر میں پارٹی ہو رہی ہو۔'' یوں گم سم لہجے میں اس کے بات کرنے پر امی نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں تھامے موبائل کو دیکھ کر بات کو مکمل طور پر سمجھنے کی کوشش کی اور پھر بولیں۔

''میری جان ایک بات یاد رکھنا کہ کبھی بھی اپنی آنکھوں اور ذہن کو ساون کے اندھے کی طرح بس ایک ہی سمت دیکھتے رہنے کی عادت نہ ڈالنا۔ ہر انسان کو اللہ نے اس دنیا میں کسی مقصد کے تحت بھیجا ہے۔ بظاہر زندگی کتنی ہی بے وقعت کیوں نہ لگنے لگے مگر ہر جان دار کی زندگی قیمتی بھی ہے اور کار آمد بھی۔

ندی نے ہونٹوں کو اوپر تلے دباتے ہوئے حسرت سے انہیں دیکھا۔ اتنی مثبت سوچ، اس قدر پختہ یقین۔۔۔ کاش اس کا بھی اعتقاد کا یہی عالم ہوتا۔

''ہو سکتا ہے تمہاری ذات کے اندر موجود موتیوں کی صفات کے لیے ہر وقت کوئی جوہری مہیا نہ ہو اور تمہیں لگنے لگے کہ شاید تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ مگر صرف وقت بدلنے کی دیر ہو گی اور خود تمہیں احساس ہو گا کہ ہاں واقعی جو ہوا یہ تو تمہاری سوچ سے بھی کہیں بہتر ہو گیا ہے، کیوں کہ میرا تو ایمان ہے بیٹا کہ اللہ ہم میں سے کسی کا بھی برا نہیں چاہتا، وہ ہم سب سے پیار کرتا ہے اور ہم میں سے کسی کے لیے بھی برا نہیں کرتا۔'' سرد پڑتے مگر دھڑکتے دل کے ساتھ ندی نے انہیں دیکھا۔

''میری جان! چاہے ساری دنیا کے رشتے تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں نا میں پھر بھی تمہارے ساتھ ہوں۔'' ندی نے بمشکل تھوک نگلا۔ خود اپنی ہی کیفیت اس کے لیے اجنبی تھی۔ دیوار پر لگی گھڑی پر وقت کا تعین کیا اور آخر تمام تر ہمت جمع کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے موجود امی کی کپ بورڈ سے سیاہ چادر نکالی، جس پر بڑی خوب صورتی مگر باریک بینی سے ننھے ننھے شیشے لگائے گئے تھے اور یہ چادر ناصر بھائی اپنے ہنی مون سے واپسی پر سوات سے خاص طور پر امی کے لیے لائے تھے۔

کپڑے بدلنے کا کوئی بھی تردد کیے بغیر چادر کو اچھی طرح پھیلا کر لیا تو اس کا صاف شفاف چہرہ سیاہ چادر کا ہالے میں کسی اداس چاند کی طرح لگنے لگا تھا۔ امی نے اٹھ کر اپنے کمزور وجود کی نقاہت کو ندی کے سامنے ظاہر کرنے سے گریز کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے دراز سے مختلف پنوں والی ایک ڈبیا نکالی اور اس کا نقاب اچھی طرح سیٹ کرنے کی غرض سے چادر پر چند جگہوں پر پنیں لگا کر نقاب کے نہ کھسکنے کا یقین کیا۔

اس دوران ندی بڑے غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی اس پر بے بسی کے بادبان لہرا رہے تھے۔ وہ تڑپ ہی تو گئی تھی اور شاید اس کی سوچ ان کے ذہن تک جا پہنچی تو انہوں نے ندی کو اپنے ساتھ بھینچ کر اسے حوصلہ دینے کی اپنے تئیں بڑی بھرپوری کوشش کی۔

"اللہ کے بھروسے گھر سے قدم نکالو اور یقین رکھو کہ جو ہوگا بہتر ہی ہوگا۔"

"جی امی!" فرطِ جذبات سے ان کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے بالآخر وہ باہر نکل آئی۔

یوں بھی ثروت آپا اور عائشہ بھابھی کے گھر کے اندر ہونے کا یقین تو امی پہلے ہی کر چکی تھیں اور ناصر بھائی تو ویسے بھی آج کہیں گئے ہوئے تھے۔ تیز قدموں سے نکلتے ہوئے ندی کا دل ساکت اور نبض گویا خاموش تھی۔ اپنے گزرے ہوئے کل اور بیتے جانے والے آج کا موازنہ کرتے ہوئے وہ اندر ہی اندر مر رہی تھی لیکن یہ انتہائی قدم اٹھانا اس کی مجبوری تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر ناصر بھائی کی کوئی بھی بات نہیں مان سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ آنے والے کل کے لیے کسی بھی قسم کا کوئی "کاش" بچا نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اپنی ہر طرف سے ہر ممکن تدبیر کر لینے کے بعد جو ہوگا اسے البتہ سوچنے کی ہمت ابھی اس میں نہیں تھی۔

اے محبت تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے
ہم سے دانا جو کمالات کیا کرتے تھے
خشک مٹی کو امارات کیا کرتے تھے
اے محبت یہ ترا بخت کہ بن مول ملے ہیں تجھ کو
ہم سے انمول جو ہیروں میں تلا کرتے تھے
ہم سے منہ زور جو بھونچال اٹھا رکھتے تھے
اے محبت میری، ہم تیرے خطاوار سہی
ہم جو لوگوں سے سوالات کیا کرتے تھے
ہم جو سو باتوں کی اک بات کیا کرتے تھے
تیری تحویل میں آنے سے ذرا پہلے تک
ہم بھی اس شہر میں عزت سے رہا کرتے تھے
ہم بگڑتے تو کوئی کام رکا کرتے تھے
اور اب تیری سخاوت کے گھنے سائے میں
خلقتِ شہر کو ہم زندہ تماشا ٹھہرے
جتنے الزام تھے مقسوم ہمارا ٹھہرے

ماضی اور حال میں گم سم کینچوے کی طرح کبھی آگے اور پیچھے سوچتی، اپنے آپ سے جھگڑتی ہوئی ندی کو رکشے یا ٹیکسی کے لیے بالکل بھی تگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی۔

☆☆☆

شہر کے نامساعد حالات کے باعث جہاں رینجرز، پولیس اور دوسری فورسز ہائی الرٹ تھیں وہیں آرمی کے جوان بھی ہر وقت اسٹینڈ بائی رہا کرتے تھے۔ ہیڈ کوارٹرز میں دی جانے والی بریفنگ بھی باقاعدگی سے جاری تھیں اور اوور آل تمام صورت حال کا بڑی باریک بینی سے جائزہ بھی لیا جا رہا تھا۔ یوں تو ہمیشہ کی طرح سبھی آفیسرز اور جوان بڑی مستعدی سے اپنے فرائض کے انجام دہی میں مصروف تھے مگر نئے تقرر شدہ جوانوں اور آفیسرز کا جذبہ واقعی قابلِ دید تھا۔

پنجوں کے بل کھڑے کوئی بھی آرڈر ملنے اور اسے پورا کرنے کو بے تاب۔۔۔۔

اکمل جب سے یہاں آیا تھا اپنی خوش طبعی کے باعث سب کے ساتھ بڑے دوستانہ انداز میں ملا کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ سب سے بہت اچھے طریقے سے سلام دعا ہوا کرتی اور اپنے روم میٹ نبیل کے ساتھ بھی وقت بڑے مزے میں گزرتا اور اکثر اوقات وہ اس کے ساتھ اپنی کئی باتیں شیئر کر لیا کرتا۔ آج کل ندی کے حوالے سے وہ جس پریشانی کا شکار تھا اس سے نبیل بھی اچھی طرح واقف تھا اور اس کا بھی مشورہ یہی تھا کہ اسے براہ راست ندی سے بات کرنا چاہیے۔

تبھی اکمل نے اب ندی کے لیے لینڈ لائن نمبر پر فون کر کے اس سے بات کرنے کا سوچا مگر فون ثروت آپا نے ریسیو کیا، جو اس کی آواز سنتے ہی کھل سی گئیں۔

"بڑی لمبی عمر ہے بھئی تمہاری، میں اس وقت بھی تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔" ٹی وی کی آواز بند کرتے ہوئے ان کی آواز میں بے حد اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔

"میرے بارے میں سوچ رہی تھیں؟" اکمل حیران ہوا۔

"کیوں آپا! خیر تو ہے نا، مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔"

"ارے نہیں، تم سے کہاں، غلطی تو ندی سے ہی ہونی تھی جو ہو گئی۔" چند لمحوں پہلے والی تازگی لہجے سے غائب تھی اور اس کی جگہ اب اداسی نے لے لی تھی۔ اکمل نے ان کی بات سن کر گہری سانس لی۔

"ہوں۔۔۔ آپ بھی یہی سمجھتی ہیں آپا؟"

"ارے اکمل! زبانِ خلق نقارۂ خدا، یونہی خوامخواہ تو نہیں کہلاتی نا۔ مگر سچ کہوں تو میں اپنی چھوٹی اور بہت پیاری بہن سے ناراض بھی بہت ہوں مگر اس کے مستقبل کے لیے پریشان بھی ہوں۔" اکمل کو سکون ہوا کہ کچھ دن پہلے تک ان کی زبانی نکلنے والا ندی کے خلاف جانے والا آتش فشاں اب یقیناً کچھ ٹھنڈا ہونے کو ہے۔

"میں نے عائشہ سے بھی کہا کہ جیسی بھی ہے اور اس نے جو کچھ بھی کیا ہے مگر ہمیں اس کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہیے، یقین مانو اکمل! اسے اور امی کو دیکھ کر میرا تو دل کٹتا ہے۔"

"آپ کس طرح اس کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتی ہیں؟"

"میں چاہتی ہوں کہ ٹھیک ہے، بے شک اسے یونیورسٹی نہ جانے دیا جائے مگر کم از کم اس کی شادی تو کسی بہتر جگہ پر کر دیں، مگر کیا کروں، ناصر تو آج کل عائشہ کے سوا کسی کی سنتا ہی نہیں، تو کون بات کرے اس سے۔"

"کوئی اچھا رشتہ دیکھا ہے آپ نے ندی کے لیے؟" ثروت آپا کے دل میں کم از کم ندی کی محبت ایک بار پھر جاگ رہی تھی اور یہ بات اکمل کے لیے بے حد سکون کا باعث تھی۔

"کوئی رشتہ دیکھا تو نہیں مگر۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے عائشہ بھابھی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور پھر آواز دباتے ہوئے بولیں۔

"مجھے لگا شاید تم اور ندی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔۔۔" اکمل اُن کی بات پر چونکا۔

"اگر ایسا ہے تو اس کے اپنانے میں ہرگز دیر نہ کرو۔"

"ثروت آپا! ایسا نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہاں پھر بھی اس سب کے باوجود وہ میری بہت اچھی اور مخلص دوست ہے اور میں اسے زندگی کی اتنی مشکل اسٹیج پر تنہا ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔" ثروت آپا کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ یہ بات جو وہ عائشہ کو کہنے کے لیے کتنی دقت محسوس کر رہی تھیں۔ اکمل سے کتنی سہولت کے ساتھ انہوں نے کہہ بھی دی اور اس نے سمجھ بھی لی۔

"یعنی تم۔۔۔؟" بدستور آواز کا دھیما پن قائم رکھتے ہوئے وہ اس کے منہ سے مکمل طور پر کوئی وعدہ سننا چاہتی تھیں۔

"آپ فکر نہ کریں آپا! میں کسی کو بھی اس کی زندگی خراب کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے، تم نے تو میرا دل جیت لیا ہے۔" ان کا روم روم اس وقت شکر گزاری کے عمل میں تھا، ورنہ ندی کے ہونے والے شوہر کے بارے میں ان کے ذہن میں جس جس طرح کے ہیولے ابھرتے، کیسے خیالات آتے، وہ یہ سب سوچ کر ہی لرز جاتیں۔

"آپا! آپ میری بات کروا سکتی ہیں ندی سے؟"

"ارے ہاں ہاں، کیوں نہیں۔۔۔" جوشِ جذبات سے وہ ریسیور لیے کھڑی ہو گئیں۔۔۔ مگر کھڑے ہوتے ہی انہیں یاد آیا کہ وہ لینڈ لائن سے بات کر رہی

ہیں اس لیے دوبارہ بیٹھنا پڑا۔

''وہ اکمل! دراصل میں ندی کے ہی پاس جاتی ہوں وہیں پر فون کر لینا الگ سے، وہ بھی ذرا ایزی ہو کر بات کر لے گی۔''

''لیکن کون سے نمبر پر؟''

''میرا نمبر ہے نا تمہارے پاس؟''

''جی بالکل، چلیں میں پانچ منٹ میں دوبارہ کرتا ہوں۔''

''ہاں یہ صحیح ہے، دراصل میرا فون کل سے ندی کے پاس ہے، یہاں لاؤنج میں بھلا وہ کیا بات کر پائے گی۔''

''جی جی، میں کرتا ہوں دوبارہ۔'' ثروت آپا کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اکمل کو کسی طرح خراج تحسین پیش کریں۔ جلدی جلدی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھا اور کشاں کشاں امی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں جہاں امی جائے نماز پر بیٹھی دونوں ہاتھوں کی کٹوری بنائے یقیناً ندی کے بہتر مستقبل کے لیے دعا گو تھیں۔

دروازے کے ایک دم یوں کھلنے پر چونکتے ہوئے بند آنکھوں کو کھولا تو ان میں ہزار سوال پنہاں تھے۔

''امی! ندی کہاں ہے؟'' کمرے کے اندر پہلا قدم رکھتے ہی ثروت آپا نے پوچھا تو امی کا دھڑکتا ہوا دل جیسے ان کے حلق میں آ کر اٹک گیا۔

''کیوں؟ خیر تو ہے نا؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' سرد ہوتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ خشک پڑتی زبان کو ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تو تمام وسوسے، واہمے اور خدشات، کینگرو مادہ کے پیٹ پر بنی تھیلی میں موجود بچوں کی طرح جھٹ سے سر نکال کر باہر جھانکنے لگے۔

کمرے میں موجود تمام تر آسودہ فضا کے باوجود چاروں اطراف عاشورہ کا سا سوگ پھیلتا محسوس ہوا۔ انہیں یوں لگا جیسے ثروت آپا، ندی کے گھر سے باہر جانے کے متعلق جان گئی ہیں اور اب آن کی آن میں ناصر بھائی اور عائشہ بھابھی بھی کمرے میں آتے ہی ہوں گے۔ دل کے رستے سارے جسم تک رسائی حاصل کرنے والا خون منجمد ہو کر اِدھر اُدھر رک سا گیا تھا اور تب انہیں محسوس ہوا گویا ابھی ابھی انہیں بحری جہاز کے عرشے سے پھسل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سمندر کی تہہ میں ڈوب جانا ہے اور تب ایک بار پھر کسی معجزے کی امید لیے اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے ندی کا خیال جو آیا تو وہ لرز کر رہ گئیں اور بے اختیار دل سے رب کے حضور مدد کی التجا کی۔

''سب خیر ہی ہے، وہ دراصل اکمل بات کرنا چاہتا ہے ندی سے۔'' آگے بڑھتے بڑھتے کچھ یاد آنے پر ایک دفعہ پھر وہ پیچھے مڑیں اور کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد بولیں۔

''میں نے اسے کہا کہ میرے موبائل پر فون کرے۔۔۔ کہاں ہے موبائل۔'' شکرانے کے احساس سے بھیگی ایک گہری سانس ان کے لبوں سے نکلی اور وہ ایک بار پھر سجدے میں گر گئیں۔ ٹپ ٹپ گرتے کئی آنسو لمحہ بھر میں مخملیں جائے نماز میں جذب ہو گئے۔

یعنی ایک مرحلہ تو طے ہو گیا تھا مگر اب ایک اور مشکل ان کے سامنے موجود تھی۔

اک اور دریا کا سامنا ۔ تھا منیر مجھ کو
میں اک دریا کے پار اترا تو میں نے جانا

ثروت آپا موبائل کی تلاش میں یہاں وہاں نظریں دوڑاتی اب بیڈ پر بیٹھ چکی تھیں۔ امی نے سجدے سے سر اٹھانے سے پہلے ایک بار پھر ندی کی خیریت سے واپس آنے کی دعا کی اور اسی رب کے بھروسے آنسو پونچھ کر بیٹھ گئیں۔ یہ ان کی زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔ جب وہ اپنی اولاد کے ہوتے ہوئے بھی خود کو بے آسرا، بے اماں اور تنہا سمجھا کرتی تھیں اور تب ان کے ذہن میں یہ سوال بڑی شدت سے اترتا کہ کیا شوہر کو مجازی خدا اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شادی کے بعد دنیا میں عورت کو اس کے علاوہ کہیں امان نہیں ملتی، پناہ نہیں ملتی کوئی اس کے دکھ درد کو سمجھنے

اور سہارا دینے والا نہیں ہوتا۔

تنہا ہوتیں تو اس بات کو کئی زاویوں سے دیکھتیں اور کئی دلیلوں پر پرکھتیں اور ہمیشہ ہی آخر میں نتیجہ یہی نکلتا کہ ہاں شوہر کو مجازی خدا نہ صرف کہنا بلکہ سمجھنا ہر بیوی پر فرض کی طرح اس لیے لازم ہے کہ اس کے بعد بھری دنیا میں بھی وہ اکیلی تصور کی جائے گی۔

''امی! موبائل کہاں رکھا ہے میرا؟ ایسا تو نہیں کہ سگنلز نہیں آ رہے ہوں اور ندی۔۔۔ وہ کہاں ہے؟'' ثروت آپا بے صبری ہوئی جا رہی تھیں۔ امی نے جائے نماز سے ذرا پیچھے کھسک کر بیٹھے بیٹھے ہی جائے نماز تہہ کی اور گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھ کر بولیں۔

''تمہارا موبائل وہ دیکھو سامنے کتابوں کے اوپر رکھا ہے۔'' امی مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو گئیں۔

یوں بھی وہ ندی کے علاوہ اور کسی سے اب کم ہی بات کیا کرتی تھیں کہ عائشہ کو تو چلو لاکھ ندی کے برابر سمجھا مگر پھر بھی وہ دوسرے خاندان سے ہی تھی اس لیے اس سے کوئی گلہ نہ تھا البتہ شکوہ تو اپنی سگی اولاد سے تھا جنہوں نے نہ تو ماں کا کوئی لحاظ کیا اور نہ ہی بہن کا کچھ خیال۔ اسی بات پر دکھے ہوئے دل کے ساتھ اُن سے خفا تھیں اور ناراضی کا اظہار کرنے کے لیے ان کے پاس بہترین طریقہ خاموش ہو جانے کا ہی تھا۔ ثروت آپا نے اٹھ کر موبائل ہاتھ میں لیا۔ سگنلز آنے کی یقین دہانی کی اور پھر آرام دہ کرسی پر تسبیح ہاتھ میں لے کر بیٹھی امی کے پاس آ گئیں۔

اپنی کرسی کا رخ انہوں نے لان میں کھلتی کھڑکی کی جانب کر رکھا تھا جہاں سے ندی گئی تھی اور واپس بھی وہیں سے آنا تھا۔

ثروت آپا ان کے قدموں کے پاس کارپٹ پر ہی بیٹھ گئیں۔ اپنے تئیں باتھ روم کا دروازہ کھولنے کے بعد انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ندی باتھ روم میں ہے اور کسی کے بھی ممکنہ سوالات کے تحت ہی اس نے باتھ روم کو لاک کر رکھا تھا تا کہ نہ وہ کسی کے سوال جواب کا سامنا کریں اور نہ ہی جھوٹ بولنے کی نوبت آئے۔

البتہ اس وقت انہیں ثروت آپا کا بھی اپنے کمرے میں موجود ہونا بری طرح چبھ رہا تھا جو ان کی مانگی جانے والی دعاؤں میں بھی خلل کا باعث بن رہی تھیں اور دل کو ندی کے آنے کا جو دھڑکا سا لگا تھا وہ تو سو تھا ہی۔

''امی! میں نے اکمل سے ندی کے بارے میں بات کی ہے۔ اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ناصر بھائی اس کی شادی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔'' امی ثروت آپا کی بات پر چونکیں۔

''کہہ رہا تھا کہ میں ندی کے ساتھ ایسا کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟ صاف بات کرو۔'' ایک نظر کھڑکی سے گیٹ تک ڈالنے کے بعد وہ ثروت آپا کی طرف پھر سے متوجہ ہوئیں تو انہوں نے عائشہ بھابھی سے ہونے والی بات چیت سے لے کر اکمل سے کی گئی تمام گفتگو بیان کر ڈالی۔

''میری چھوٹی بہن ہے ندی، میں اسے یوں کسی کے بھی ساتھ کیسے وداع کرنے کا حوصلہ کروں امی! اور میں تو کہتی ہوں کہ لوگ تو داغ لگے پھل کو نہیں لیتے یہ تو پھر اکمل کا ظرف ہے نا کہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ندی کو ہمسفر بنانے پر تیار ہے۔'' بات شروع ہوئی تو امی کو لگا جیسے ثروت آپا ایک بار پھر پہلے کی طرح ندی کے لیے اپنا دل صاف کر چکی ہیں مگر یہ اُن کا خام خیال تب ثابت ہوا جب انہوں نے اپنی بات مکمل کی، انہیں محسوس ہوا کہ شاید ثروت آپا دوہری کیفیت کا شکار ہیں۔ بہن سے محبت بھی ہے مگر اس محبت میں شاید غلط فہمیوں اور بدگمانی کا راج ہے۔ مگر وہ محبت بھلا کیا مقام رکھتی ہے جس میں بھروسہ اور اعتماد شامل نہ ہو۔

جس طرح کسی گھر کے لیے چار دیواری اہم ہوتی ہے بالکل اسی طرح محبت کے لیے بھروسہ اور اعتماد بھی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں محبت کے گھروندے کو گرتے کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔

ابھی شاید وہ مزید کچھ کہتیں مگر ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ہوتی بیل نے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ ثروت آپا کے پاس پہلے سے اکمل کا نمبر سیو تو نہیں تھا مگر یہ انجان نمبر یقینی طور پر اکمل کا تھا سو انہوں نے فوراً اٹھ کر باتھ روم کا دروازہ بجایا۔

''ندی۔۔۔! جلدی نکلو فون ہے۔'' امی کی سانسوں کی رفتار کے ساتھ ساتھ تسبیح کے دانے گرانے کے عمل میں بھی تیزی آگئی تھی۔

اگر اُن کے سانسوں کے ارتعاش کو کسی کمپیوٹر سے جانچا جاتا تو بڑا ہی پیچیدہ سا گراف بنتا جس کے اتار چڑھاؤ کی لکیروں میں بھی تمیز کرنا یقیناً ایک مشکل عمل ٹھہرتا، کون سا ایسا ورد تھا جو اس وقت ان کی زبان کو چھو نہیں پا رہا تھا۔ اُن کا بس چلتا تو وہ کہیں سے بھی بس ایک پھونک کے زور پر اس وقت ندی کو یہاں حاضر کردیتیں مگر ان کے بس میں ہی تو نہیں تھا کچھ۔

تسبیح کے دانے گراتی پوریں لحہ بھر میں دکھنے لگی تھیں اور چہرے پر پڑی سلوٹیں ایک دم نمایاں سی ہوگئیں تو انہوں نے دل ہی دل میں بڑی شدت سے اپنے رب کو پکارتے ہوئے ثروت آپا کو دیکھا جو دروازے کے پاس کھڑی اب آخر اکمل کا فون ریسیو کرچکی تھیں۔ یعنی اب کے تب ثروت آپا کو پتا چل ہی جاتا کہ ندی اس وقت گھر میں نہیں ہے۔

''ہاں اکمل! وہ دراصل ندی باتھ روم میں ہے بس۔۔۔'' اسی دوران ان کے بیٹے کے رونے کی آواز آئی جو یقیناً جاگ چکا تھا اور اب اسے فیڈر چاہیے تھا۔

''یہ تم ایک منٹ امی سے بات کرو، اتنے میں ندی نکل آئے گی پھر میں بھی آتی ہوں بس دو منٹ میں۔''

بیٹے کے رونے کی آواز سنتے ہی ثروت آپا نے ندی کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے فون امی کو پکڑایا اور خود تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئیں تو امی نے گہرا سانس لیتے ہوئے خدا کا بے پناہ شکر ادا کیا۔ سر پر دھرا منوں وزن جیسے اتر گیا ہو۔ اب فکر تھی تو یہ کہ کسی طرح ندی جلد از جلد خیر خیریت سے واپس گھر آجائے اور ادھر اکمل ندی سے بات کرنے کو بے چین ہوا جا رہا تھا۔

''آنٹی! اگر ندی اس وقت فارغ نہیں ہے تو میں تھوڑی دیر بعد کرلوں گا۔''

''نہیں بیٹا! وہ دراصل۔۔۔'' امی ایک بار پھر لاجواب ہوگئیں۔

''آنٹی! ایک بات کہوں۔۔۔؟''

''بولو بیٹا۔۔۔! کیا بات ہے؟''

''ندی اس وقت گھر پر نہیں ہے نا۔'' اکمل کے یوں وثوق سے کہنے پر ان کا ہاتھ لرز گیا تھا مگر وہ لہجہ شاید یقین اور اعتماد کے پنپنے کا تھا۔ اس لیے چند سیکنڈ کا توقف کرنے کے بعد آخر وہ بولیں۔

''بیٹا! وہ شاہ زین سے ملنے اور اسے اپنی یوں ہونے والی شادی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔'' اکمل ان کا دیکھا بھالا اور ان کے ہاتھوں کا پلا ہوا بچہ تھا۔ جانتی تھیں کہ وہ بے حد قابلِ اعتماد ہے اور ندی کے لیے ایک دوست کی حیثیت سے بھی بہت مخلص ہے۔ جبھی انہوں نے کسی بھی قسم کا جھوٹ بولنے اور ندی کے یوں وہاں جانے کے بارے میں بھی اسے بتا کر ندی کی مشکلات کم ہونے کی دعا کی۔

''اور ناصر بھائی۔۔۔؟''

''نہیں، میرے علاوہ اس کے باہر جانے کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، بس ابھی آنے ہی والی ہوگی۔'' تفکر ان کے کمزور لہجے میں لفظوں سے بڑھ کر بول رہا تھا۔ خود اکمل ان حالات میں اس کے گھر سے یوں نکلنے کا جان کر پریشان ہوگیا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا اور کیا ہونے جا رہا تھا۔ سبھی کچھ غیر متوقع تھا۔ حالات کس طرح اس موڑ تک پہنچ جائیں گے یہ تو کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر وقت بھلا سوچنے کی مہلت دیتا بھی کب ہے۔ جب گزر رہا ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ کچھ نیا نہیں ہو رہا اور دن اور رات معمول کے مطابق بس گزرتے جا رہے ہیں مگر چند لمحے رک کر مڑ کر دیکھیں تو بہت کچھ بدل چکا ہوتا ہے۔

''آپ فکر نہ کریں آنٹی! سب بہتر ہوجائے گا اور بس وہ بھی ابھی آتی ہی ہوگی۔'' اپنے تئیں اس نے دلاسا دیا تو ان کا دل بھر آیا۔

''کبھی بھی اور کسی بھی مقام پر آنٹی نہ آپ تنہا ہوں گی اور نہ ہی ندی۔۔۔ میرے لیے آپ بھی ماں کا درجہ رکھتی ہیں اور میرے ہوتے ہوئے ان شاء اللہ کوئی دکھ آپ کو مزید اپنے حصار میں لینے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔''

''جیتے رہو بیٹا! اللہ تم سے سدا خوش رہے اور تم کو سدا خوش رکھے۔'' گلوگیر لہجے میں انہوں نے صدقِ دل سے اکمل کو دعا دی۔

یوں لگتا ہے جیسے عصر اور مغرب کا وقت الوداعی گلے مل رہے ہوں، اتنی غم ناک اداسی، موت سا سکون اور دل دہلانے والی خاموشی۔۔ اپنے بیٹے کے ہوتے ہوئے کوئی اور انہیں دلاسا اور تسلی دے رہا تھا اور انہیں ان کے اپنے سگے بیٹے کے ممکنہ اقدامات سے ہونے والے مسائل سے نمٹنے کے لیے خود کو بطور سہارا پیش کر رہا تھا۔

ایک گہرا سانس انہوں نے خارج کیا۔

''میں ندی کو کسی بھی ایرے غیر کے حوالے اس کی اور آپ کی مرضی کے بغیر نہیں ہونے دوں گا، آپ اللہ کے بعد مجھ پر بھروسہ رکھیے اور پلیز پریشان نہ ہوں۔'' اکمل کی دل گرفتگی کا عالم ہی کچھ عجیب تھا۔ اول تو ندی کے حوالے سے حالات جو ملغوبے کی سی شکل اختیار کر گئے تھے وہ اور اب اس کا یوں گھر سے باہر نکلنا وہ بھی اس صورت میں کہ جب ناصر بھائی بھی گھر پر نہیں تھے۔

''اگر ناصر بھائی آج ایک بار پھر اسے کہیں باہر دیکھ لیتے تو۔۔۔'' اکمل نے اضطرابی کیفیت میں بالوں میں انگلیاں پھنسائیں مگر اس کے باوجود وہ امی کو حوصلہ دے رہا تھا اور ان کے سامنے اپنی پریشانی یا خدشات کا اظہار کر کے انہیں مزید کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اکمل کی طرف سے دی جانے والی تسلی، حوصلے اور سہارے کے پُراثر بول سن کر امی کے ہونٹوں سے نکلنے والی گھٹی گھٹی سسکیاں ان کے سارے بدن پر رینگنے لگی تھیں۔ انہیں لگا کہ ناصر جوان کا اپنا خون ہے اس کے سامنے اب ان کی حیثیت ایک کٹے ہوئے ناخن سے بڑھ کر ہرگز نہیں رہی ہے اور یہ بات ان کے دل پر پڑے بوجھ کو یوں بڑھانے لگی کہ منہ سے الفاظ کی ادائیگی مشکل سی ہوگئی۔

''اچھا بیٹا! میں اب فون بند کر رہی ہوں۔''

''آنٹی! یہ فون اپنے پاس ہی رکھیے گا، میں شام کو ندی سے بات کرنے کے لیے دوبارہ فون کروں گا۔'' اور دونوں اطراف سے فون بند ہونے پر وہ ندی کے خیالوں میں یوں ڈوبے جیسے کنویں میں اگنے والا ننھا پودا سدا نم ہی رہا کرتا ہے۔ دل سے نکلتی سچی اور بے لوث دعائیں کاش کہ جلد از جلد پوری ہوں۔ یہ امی کی خواہش بھی تھی اور اکمل کی حسرت بھی۔

☆☆☆

کہیں دن چڑھے، کہیں شب ڈھلے
کہیں قربتیں کہیں فاصلے
کبھی دور رہ کر جدا نہیں
کبھی ساتھ رہ کر ملے نہیں
کبھی ساتھ دل کے ہو اک جہاں
کبھی دھوپ میں ہیں سائباں
کہیں اک دھنک ہے چہار سو
کہیں لاپتا ہر رنگ و بو
کہیں دیپ ہو کہیں دل جلے
کوئی خالی ہاتھ کہیں سب ملے
کہیں صبح ہے کہیں شام ہے
زندگی اسی کا نام ہے

بارش کے بعد سے ہر منظر نکھرا نکھرا سا لگنے لگا تھا۔ پھول پتوں کے رنگوں میں کھلی تازگی نہ صرف آنکھوں پر اچھا اثر ڈال رہی تھی بلکہ ذہن و دل کو بھی فریش کیے دیتی۔ تمام نفوس کے چہروں پر جہاں بارش برسنے کی وجہ سے ایک رعنائی نظر آنے لگی تھی۔

فرسٹ ہاف کی کلاس ختم ہوئی تو میری، کنول اور

مہربانو ہاتھوں میں کتابیں لیے کلاسوں کے سامنے بنے کوریڈور سے گزرتی لڑکیوں کے رش کا ہی حصہ بن گئیں۔ اب انہیں ڈائی سیکشن کے لیے جانا تھا۔ سو دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں۔

''ویسے یار! اللہ کا بہت بڑا شکر ہے نا کہ ہم تینوں لڑکیاں ہیں۔'' اچانک یوں ہی بلاوجہ بغیر کسی سابقہ گفتگو کے تسلسل کے کنول نے جو اللہ کا شکر ادا کیا اور وہ بھی اس بات پر کہ وہ لڑکی ہے تو باقی دونوں کا حیران ہونا فطری تھا۔

''خیر تو ہے؟ کیا تمہیں ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ تم لڑکی ہو؟'' میری نے حیرت سے کنول کو دیکھتے ہوئے سوال داغا تو مہربانو مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''نہیں بتا تو امی نے بچپن میں ہی دیا تھا مگر اس بات پر شکر کرنے کا مجھے آج احساس ہوا ہے۔'' بغیر شرمندہ ہوئے اس نے اپنا موضوع برقرار رکھا تھا۔

''اب آگے بھی کچھ بات کرو گی یا کسی ٹرک کی طرح بس ٹریفک میں ہی پھنسی رہو گی۔'' مہربانو نے کہا تو کنول دانشورانہ انداز میں گویا ہوئی۔

''ترس آتا ہے مجھے لڑکوں پر، اب دیکھو ذرا تصور کرو کہ ڈائی سیکشن کرتے ہوئے ڈیڈ باڈیز، میل ٹیچرز، ان کے میل ہیلپرز اور پھر پڑھنے والے بھی اگر صرف میل ہی اسٹوڈنٹ ہوں تو کیا وہ پڑھائی کسی سزا سے کم ہے۔'' کنول کی بات پر میری بے اختیار ہنسنے لگی تھی۔ مہربانو بھی سر جھٹک کر مسکرائی اور بولی۔

''اسی لیے تو کہا جاتا ہے نا کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔''

''اور اسی لیے تو کو ایجوکیشن رکھا جاتا ہے نا تا کہ سب دل لگا کر پڑھیں۔''

''اور واقعی پہلے سب دل لگاتے ہیں اور بعد میں پڑھتے ہیں۔'' کنول نے دونوں کی بات کو جس زاویے سے سمیٹا تھا اس پر وہ دونوں ہی ہنسے بغیر نہیں رہ پائی تھیں۔

طے یہ پایا تھا کہ آج کالج سے ذرا جلدی نکلنے کے بعد وہ تینوں چرچ جائیں گی اور اس کے بعد عیاشی کرتے ہوئے شام کا کھانا کہیں باہر کھانے کے بعد ہاسٹل کے مقررہ وقت سے پہلے واپس پہنچ جائیں گی کہ اس کے بعد رات کو مہربانو نے ملکانی سائیں کو فون پر بات کرنے کا ٹائم بھی دے رکھا تھا۔ کیونکہ آج جس وقت ان کا فون آیا تب وہ اپنی کلاس میں تھی اور اس نے کلاس سے چند لمحے کے لیے باہر آ کر انہیں بتایا کہ اس وقت وہ بات نہیں کر سکتی کیونکہ وہ کلاس میں ہے۔

مگر ملکانی سائیں کے بات کرنے کے انداز سے لگتا تھا کہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے ورنہ وہ کبھی اس وقت فون نہیں کرتی تھیں۔ جبھی انہوں نے خصوصاً اسے تاکید کی تھی کہ رات کو نو بجے کے بعد وہ انہیں فون کرے تاکہ وہ اس سے چند اہم نوعیت کی باتیں ڈسکس کر سکیں۔ ان کے بات کرنے کے انداز اور شام کو فون کرنے کی اس قدر تاکید پر وہ ٹھٹک گئی تھی کہ ایسا کیا ہے جس کے بارے میں بات کرنے کو وہ اتنی بے چین ہیں مگر اُن کا کہنا تھا کہ یہ بات کیونکہ مہربانو کی آئندہ زندگی سے متعلق ہے اس لیے وہ یوں جلد بازی میں اس سے بات کر کے اس معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو گنوانا نہیں چاہتیں۔ جو بات ملکانی سائیں، مہربانو سے کرنا چاہتی تھیں وہ اس کی آئندہ زندگی سے متعلق تھی یہی ایک ایسا جملہ تھا جس پر وہ ٹھٹک گئی تھی۔

اس کی آئندہ زندگی میں تو دور دور تک میڈیکل کی تعلیم کے علاوہ ایسا کچھ پلان نہیں تھا پھر یہ اچانک بیٹھے بٹھائے ملکانی سائیں کو کیا سوجھ رہی ہے؟ وہ کیا سوچ رہی ہیں؟ حویلی کی آسمانوں کو چھوتی دیواروں کے پیچھے کیا آج کل اس کی زندگی کے فیصلے ہو رہے ہیں؟ کیا سابقہ رسم و رواج کے آئینے میں اس کی تقدیر بھی آرسی مصحف کی رسم ادا کی جا رہی ہے؟ وہ شدید الجھن کا شکار تھی۔ مگر اپنے دل کی پریشانی کا اظہار ان دونوں کے سامنے کرنے کے بجائے وہ ان کی بات چیت سننے کے دوران بڑے ماہرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ مکمل طور پر ان کی بات چیت سن رہی ہے مگر ہمیشہ وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے۔

☆☆☆

سیاہ چادر کا نقاب کیے وہ کانچ سی آنکھیں بڑی امید سے رکشے کے ٹائروں تلے روندے جانے والے رستوں کو دیکھے جا رہی تھیں۔ اسے امید تھی کہ شاہ زین سے ملتے ہی سب کچھ بس ٹھیک ہونے والا ہے اور زندگی کو اب ایک جینے کی مضبوط وجہ ملنے والی ہے لیکن شہر کی ٹریفک بھی ایسی کہ منہ کے دانتوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی گاڑیاں جو کسی طور ایک دوجے کو رستہ دینے پر راضی نہ تھیں، اس کی گھبراہٹ اور پریشانی میں بے طرح اضافہ کیے دے رہی تھیں۔

''چاچا۔۔۔! پلیز ذرا جلدی سے رکشہ چلائیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' دائیں بائیں چیونٹی کی رفتار سے رینگتی گاڑیوں کو دیکھنے کے باوجود اس نے رکشہ ڈرائیور سے التجا کی تو اس نے پہلی دفعہ رکشے کے بیک مرر سے اس کا چہرہ پڑھنا تو چاہا مگر کوشش میں کامیابی یوں نہ ہو سکی کہ بڑی سی چادر میں لپٹی ندی نے پورے چہرے کو نقاب کے ساتھ ڈھانپ رکھا تھا اور آنکھوں پر بھی سیاہ رنگ کا چشمہ لگائے وہ مکمل طور پر ظاہر ہونے کے باوجود بھی پوشیدہ تھی۔

یوں بھی رکشہ ٹیکسی کے ڈرائیور حضرات پولیس والوں کی طرح پہلی ہی نظر میں بندہ پہچان لیا کرتے ہیں۔ سارا دن مختلف قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کی وجہ سے ان کی مردم شناسی کی حس اکثر اوقات تیز ہوتی ہے اور اپنے اسی تجربے کی بنیاد پر رکشہ ڈرائیور نے اس کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد اس کی آواز کی لجاجت پر یقین کرتے ہوئے اپنا رکشہ ہر ممکن طریقے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

اپنائیت اور یگانگت کا حقیقی مفہوم کیا ہے یہ تو وہی لوگ جانتے ہیں جو کسی کو اپنا بناتے اور کسی کو اپنا سمجھتے ہیں۔ محلے میں موجود تمام لوگوں کی بے لوث محبت سے یوں تو وہ لوگ پہلے ہی واقف تھے مگر جس طرح آج ابا کی برسی کے موقع پر بغیر بلاوے کے سب آ کر ان کے ساتھ ایصالِ ثواب میں شریک ہوئے اور قرآن خوانی کی، اس محفل کو باقاعدہ طور پر اپنے گھر کی محفل جانا یہ بات خود ایاں کی بھی آنکھیں احساسِ تشکر سے بھگوئے جا رہی تھیں۔

خود بخود آ کر سب نے گھر بھر میں رونق ہی تو لگا دی تھی جبکہ اماں کا ارادہ گھر سے نکلتے وقت بس یہی تھا کہ وہاں جا کر چند سورتیں وغیرہ پڑھ کر ایصال کر دیا جائے گا مگر جس طرح ساری خواتین نے آ کر باقاعدہ قرآن خوانی کی تو شاہ زین نے اماں ہی کے کہنے پر فون پر ہی پکے پکائے کھانے کا آرڈر کر دیا اور یوں انتہائی خوش اسلوبی سے تمام کام سر انجام دینے کے بعد اب ان کے واپس جانے کا وقت آن پہنچا تھا۔

جب تک تمام خواتین اماں اور ثمینہ سے ملتی رہیں وہ ان کے فارغ ہونے کے انتظار میں اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ پرانی سم کو اسی طرح ٹشو پیپر میں لپیٹ کر وہ پہلے ہی دراز میں ڈال چکا تھا۔ اب تکیے سے ٹیک لگا کر پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکائے وہ ایک بار پھر ہر وہ خیال دوہرانے لگا جو اس نے ندی کے حوالے سے اس گھر میں دیکھا تھا۔

صبح کے اجالے میں ڈھونڈتا ہے تعبیریں
دل کو کون سمجھائے خواب خواب ہوتے ہیں

ہسپانوی لیموں جیسی صاف شفاف جلد، چمکتی روشن آنکھیں اور نرم و سیدھے کندھوں کو ڈھانپے رکھنے والے بال لیے ندی کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ہر قسم کے میک اپ سے بے نیاز اس کا چہرہ کیسا شگفتہ نظر آیا کرتا تھا۔

ندی جو خود لڑکی ہونے کے باوجود اس سے اظہارِ محبت میں پہل کر چکی تھی۔ اب خود ہی کئی قدم پیچھے بھی ہٹ گئی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ شاہ زین کا پیار اس کے لیے سچا ہے، بے لوث ہے مگر اب یقیناً وہ کسی اور کی یا تو ہو چکی ہے اور یا ہونے والی ہوگی۔ تکیے سے ٹیک

لگائے شاہ زین کی آنکھیں غیر محسوس طریقے سے نمی کے باعث چمکنے لگی تھیں۔ اپنی محرومی کے احساس سے اسے آنسو اندر ہی اندر کہیں گرتے ہوئے اپنا حلق نمکین لگنے لگا تھا۔ جنگل کا سناٹا اسے اپنے ہی ساتھ اس کمرے میں مقید ہوتا محسوس ہوا اور اپنا آپ کسی جنگلی قیدی کی مانند مجبور اور بدحال۔۔۔ کہ چاہنے کے باوجود نہ تو وہ فرار ہوسکتا تھا اور نہ ہی اس قید میں اس کے لیے زندگی کی کوئی رمق نظر آتی تھی۔

کیا واقعی ندی کو کسی اور سے محبت ہے؟ بالکل ایسی ہی محبت جیسی مجھے اس سے ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ اور اگر ہے تو ایسا ممکن کیوں ہوا؟ کہاں تھیں اس وقت اماں کی دعائیں ان کے ورد اور وظیفے۔۔۔ میری خوشیوں کے لیے رات رات بھر جاگ کر کی جانے والی مناجات کیوں عرش تک رسائی حاصل نہیں کرسکیں اور اگر نہیں کرسکیں تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ماں کی دعا سیدھی عرش پر جاتی ہے۔۔۔ میرے لیے اماں کی مانگی جانے والی دعائیں رستہ بھٹک کر کہاں گم ہوگئیں ہیں۔ کچھ لوگوں کی قسمت میری ہی طرح صفر کی مانند کیوں ہوتی ہے؟ وہ کسی کے بھی ساتھ جمع کیوں نہیں ہو پاتے؟ ان کی کوئی بھی اہمیت، حیثیت اور جگہ کیوں نہیں ہوتی دنیا میں؟ کیوں انہیں اپنا آپ ثابت کرنے کے لیے کسی کا سہارا لینا پڑتا ہے؟ وہ اکیلے اتنے بے وقعت کیوں ہوتے ہیں کہ ان کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ کسی کی زندگی سے منفی ہوجائیں تو بھی کوئی دلبرداشتہ ہونا تو دور کی بات چونکتا تک نہیں ہے اور اگر کسی کے ساتھ جمع ہوں تب بھی کسی کو احساس تک نہیں ہوتا اور ندی بھی اتنی سخت دل کی ہوگی۔۔۔ یہ بات اب تک میرا دل کیوں تسلیم نہیں کرتا۔ میں کیوں اب تک کسی کرشمے، کرامت یا کسی معجزے کے پیش آجانے کی حسرت میں ہوں۔۔۔

اپنے اندر کے شور سے گھبرا کر شاہ زین سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ جوتے زمین پر ٹکائے وہی تکیہ جس سے کچھ دیر پہلے ٹیک لگا رکھی تھی، گھٹنوں پر رکھ کر ان پر کہنیاں ٹکائیں اور سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ صحن سے اماں اور ثمینہ کی الوداعی کلمات کی آوازیں آرہی تھیں۔

یہ سچ تھا کہ واقعی اس نے ندی سے محبت کی تھی۔ اسی لیے تو اس کے معاملے میں سوچتے ہوئے شاہ زین کی انا کا ننھا سا پودا اس پر ابھی پھول پتے بھی نہ آئے تھے سر جھکا کر کھڑا رہتا۔ ویسے بھی جب انا سر اٹھانے لگے تو محبت باقی نہیں رہتی اور محبت کو ہمیشہ قائم و دائم رکھنے کے لیے انا کا خودرو پودا جب تک تراش خراش کے بعد اپنے اصل قد کو نہ پہنچے، عجب مثال بن جاتی ہے ورنہ دوسری صورت میں یہی خودرو پودا اپنی طاقت کا اعتراف کرتا ہوا باقی ہر جذبے پر حاوی ہوکر انسان کو تنہا کردیا کرتا ہے۔

''شاہ زین بیٹا! چلیں۔۔۔؟'' اماں نے کمرے میں داخل ہوئے بغیر اسے پکارا تو وہ تکیے کو پرے کر کے نہایت بوجھل قدموں سے گاڑی کی چابی مٹھی میں بھینچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

ہم کوئی جگ سے نرالے تو نہیں
ہم بھی دنیا کی طرح ہیں کہ جنہیں
دکھ چھپانا بھی ہے ہنسنا سر بازار بھی ہے
ہم پر بھی عہد جوانی کا عذاب اترا ہے
ہم نے بھی دور کسی شہر میں
ہنستے ہوئے، بستے ہوئے
اک شخص کو چاہا ہے بہت۔۔۔!

شاہ زین کے گھر کی گلی شروع ہوتے ہی ندی کے دل کی دھڑکنیں عجیب انداز میں اچھل پچھل ہونے لگیں ــــ رستہ تو جیسے تیسے ایک ایک لمحہ گنتے کٹا تھا مگر اب اس گلی سے گھر تک کو جاتا رستہ ندی کو کئی میلوں پر محیط ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ کون سا لمحہ ہوگا جب وہ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھے گی۔ اپنے سارے دکھ، سب مشکلات مسائل شاہ زین کے حوالے کرکے خود کو ہلکی پھلکی محسوس کرے گی اور اگر اس وقت شاہ زین گھر پر نہ ہوا تو وہ اس کی والدہ اور ثمینہ کو ایک ایک بات بتائے گی۔ یونیورسٹی میں ہونے والے تمام واقعات کے بعد گھر میں ہوئی بے وقتی تک۔۔۔ انہیں بتائے گی کہ بابا کے جانے کے بعد اب وہ اور امی خود کو کتنا تنہا محسوس کرتی ہیں اور یہ بھی کہ اب ناصر بھائی زیادہ سے زیادہ دو دن میں اسے جانے کس کے نکاح میں دے کر کہاں رخصت کریں۔ اور وہ جانتی تھی کہ شاہ زین تک تو شاید بات بعد میں پہنچتی مگر اماں ہی ایسا کچھ نہیں ہونے دیں گی۔ آج سے پہلے وہ اُن سے ملی تو نہیں تھی مگر ہاں شاہ زین کی زبانی ان کے متعلق سنا بہت کچھ تھا۔

سارا راستہ وہ اپنے نرم و گداز سفید ہاتھوں کو کبوتروں کی طرح گود میں ڈالے بیٹھی رہی تھی مگر اب بے چینی اور اضطراب کا یہ عالم تھا کہ کبھی وہ انگلیاں چٹخانے لگتی تو کبھی ہاتھوں کو مسلنے، اور انہیں لحات میں اس نے وہ کیا جو آج سے پہلے اس نے کبھی نہ کیا تھا۔ ایک دیگ غریبوں کو کھانا کھلانے کے لیے، چالیس نوافل اور روزے اور جانے کیا کیا۔۔۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے منتیں یوں مان رہی تھی جیسے اسٹاک ایکسچینج میں ہندسے تیز رفتاری سے بدلا کرتے ہیں۔ لگتا جیسے وہ خدا کے حضور کھڑی ہاتھ باندھے اپنی خواہش کی نیلامی کرتے ہوئے بولی لگانے میں مصروف ہو۔

رکشہ اب سیدھی گلی سے ہوتا ہوا بغلی گلی میں جا مڑا تھا، یہ گلی پچھلی گلی کی نسبت کم کشادہ تھی۔ اس پر سائیکل چلاتے بچے، گوگو کھیلتی ننھی بچیاں جو ایک طرف سے رکشہ اور سامنے سے آتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے اب اپنا کھیل ترک کرکے چند لمحوں کا وقفہ لے چکی تھیں۔

''چاچا! خدا کا واسطہ ہے جلدی کریں، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' ایک بار پھر خود پر قابو نہ رکھتے ہوئے وہ فریاد کر بیٹھی تھی۔ ناصر بھائی کا خوف اب تک اس کو پسینہ پسینہ کیے دے رہا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ آج ان کی واپسی شام کو ذرا دیر سے ہونے کا غالب امکان ہے۔ وہ خوامخواہ ''اگر'' کے ہاتھوں بلیک میل ہوئی جارہی تھی۔

یوں بھی ہم انسانوں کی نفسیات پر حاضر سے کہیں زیادہ غائب کا اثر ہوتا ہے۔ وہ چاہے واقعات ہوں یا واہمات اور اس کی سب سے بڑی مثال خود ہمارا مستقبل ہے جو غائب ہونے کے باوجود ہم پر اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ ہم اپنے نظر آنے والے اور گزارے جانے والے ''حال'' کو اُس نظر نہ آنے والے مستقبل کے خوف پر یوں قربان کردیتے ہیں کہ ''حال'' کی ہر گھڑی پر مستقبل کے چوکیدار کا کڑا پہرہ نظر آنے لگتا ہے اور یوں ہم وقت کے ساتھ ناانصافی کرجاتے ہیں۔ ''حال'' میں مستقبل کے اونچے اور پتھریلے ٹیلے پر چڑھنے کی کوشش میں ننگے پاؤں رہ جاتے ہیں اور وہ بھی بڑے ہی مخفی اور غیر محسوس طریقے سے۔

''بیٹا! پیچھے والی گلی کھلی تھی نا پر وہ نہیں تھی۔ اب یہاں آپ خود دیکھو گلی اتنی چوڑی نہیں ہے کہ دو گاڑیاں ایک ساتھ گزر سکیں۔''

''ہاں تو آپ اس گاڑی کے آنے سے پہلے اپنا رکشہ لے جائیں نا آگے۔'' ندی نے بچوں جیسی ضد کرتے ہوئے کہا تو وہ رکشہ والا خاموش ہوگیا۔

''چاچا! میری زندگی اور موت کا سوال ہے، آپ بھی بیٹیوں والے ہوں گے، میری مشکل کو سمجھیں اور کسی طریقے جلد از جلد رکشہ آگے لے جائیں۔۔۔ میں۔۔۔ میں آپ کو ڈبل کرایہ دوں گی، بس ذرا جلدی۔۔۔'' ندی کی بات پر رکشہ والا بھی جذباتی سا ہوگیا تھا، جانے وہ کون تھی، کیسی مجبوری میں جارہی تھی، اس پر کیا بیت چکی تھی۔ آخر رکشہ والے نے سوچا کہ ہر ممکن طریقے سے رکشہ جلد از جلد آگے بڑھایا جائے۔ مگر ذرا سا آگے جانے پر رفتار پھر مدھم پڑنے لگی تھی۔

''بیٹا گاڑی رکی ہوئی ہے اور اندر بیٹھی خاتون باہر کھڑی خاتون سے بات چیت کررہی ہیں اور پھر تجی بات تو بیٹا یہ ہے کہ گلی ہے ذرا تنگ، اور اگر ذرا سی بھی میرے رکشے سے ان کی گاڑی چھوگئی تو مجھے پیسے بھرنا پڑیں گے۔'' رکشے والے نے اپنی حقیقی مجبوری

بیان کی، باوجود اس کے کہ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کی جیب اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ گاڑی کا بھی ممکنہ خرچہ بھرے۔

"چاچا! میں دوں گی نا پیسے، آپ بس فکر نہ کریں اور رکشہ آگے لے جائیں میرے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے۔" اس کے لجاجت آمیز لہجے پر رکشے والے نے ایک گہری سانس لے کر آہستہ آہستہ رکشہ آگے بڑھانا شروع کیا۔

آس پاس سے گزرتے لوگ رکشہ آتے دیکھ کر گردن موڑ کر یا چند لمحے نظریں ٹھہرا کر رکشے کے اندر بیٹھے انسان کی شناخت ضرور کرنے کی کوشش کرتے۔ یوں بھی اس وقت اکثر عورتیں شاہ زین کے گھر سے انہیں اللہ حافظ کہہ کر نکلی تھیں اور اپنے اپنے گھروں کو جا رہی تھیں۔ اسی دوران آتے رکشے کو دیکھ کر محض ایکٹیویٹی کے طور پر گردن ذرا سی لمبی کر کے اندر ضرور دیکھتیں۔ یہی وجہ تھی کہ اب ندی بالکل ہی سر جھکائے بیٹھی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنے پرس میں سے کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ رکشہ آگے بڑھنا شروع ہوا تو گاڑی کے ساتھ ہی کھڑی خاتون پیچھے ہٹ گئیں اور گاڑی نے بھی رکشے کو جگہ دیتے ہوئے رستہ سمیٹنا شروع کیا مگر حسب توقع گلی کے تنگ ہونے کے باعث آخرکار رکشہ اور گاڑی ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

"شاہ زین بیٹا! تم گاڑی کو سائیڈ پر کر کے قریشی صاحب کے گھر کی طرف موڑ لو، ان کا گیٹ ذرا کھلا ہوا ہے گاڑی ذرا اندر ہو جائے گی تو رکشہ کو بھی جگہ مل جائے گی۔" اماں نے اُن کا کھلا ہوا گیٹ دیکھ کر موقع غنیمت جانا تھا۔ ہمیشہ جب اس گلی میں دو گاڑیاں آمنے سامنے آ جاتیں تو یہی حکمت عملی اپنائی جاتی۔

"معاف کرنا صاحب، دراصل ایک ایمرجنسی میں جا رہے ہیں، ذرا جلدی پہنچنا تھا نا اس لیے۔" رکشے والے نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ کوئی گاڑی رکشے کے لیے یوں جگہ خالی کر رہی ہے۔ جبھی تو شرمندگی محسوس کرتے ہوئے فوراً وضاحت کر ڈالی۔

مگر شاہ زین نے ہاتھ کے اشارے سے "اٹس اوکے" کہہ کر اسٹیئرنگ موڑتے ہوئے گاڑی کے اگلے دونوں ٹائر قریشی صاحب کے گھر کے اندر کیے جس سے آدھی گاڑی گلی میں اور آدھی ان کے گھر کے اندر جا منتقل ہوئی۔ رکشے والے نے مشکور نظروں سے گاڑی کو دیکھا اور فوراً رکشہ آگے بڑھا دیا۔ زیادہ دور نہیں بس اسی گلی کے آخر میں اگلی گلی کے شروع ہونے سے پہلا آخری گھر ان ہی کا تھا۔ ندی نے حسب وعدہ رکشے والے کو پہلے سے طے شدہ کرایے سے زیادہ روپے دیے تو وہ کشمکش وپیچ میں پڑ گیا۔

"نہیں چاچا! آپ کو میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں، آپ کی محنت کے پیسے ہیں۔"

"خوش رہو۔" رکشے والے نے سامنے رکھا چھوٹا سا تولیہ اٹھا کر اس کے نیچے پلاسٹک کی سیاہ تھیلی کھول کر ندی کے دیے ہوئے روپے اس میں ڈالے اور ندی کے نیچے اتر جانے پر ایک بار پھر رکشہ پیچھے موڑ لیا۔

اب جبکہ وہ اپنی منزلِ مقصود کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر بھی جانے کیوں وہ اپنے آپ میں وہ مضبوطی محسوس نہیں کر پا رہی تھی جو اس کا خاصہ تھی۔ حالات کے پے درپے وار اسے ذہنی طور پر بے حد کمزور کر چکے تھے۔ ایسے میں شاہ زین کا خیال اسے اندھیری رات میں روشنی کی کرن کی مانند زندگی کی نوید سنا جاتا اور اب بس چند ہی لمحوں میں یقیناً اس کی زندگی سے یہ وقتی کالے بادل چھٹنے ہی والے تھے۔ اسے سامنے دیکھ کر اماں اور ثمینہ کا ممکنہ ردِعمل سوچتے ہوئے جانے کہاں سے ایک عرصے بعد ہونٹوں پر مسکراہٹ آ کوندی تھی۔ اور اسی کیفیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے بیل پر انگشتِ شہادت کی مدد سے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ بجائے اس کے کہ اندر سے گیٹ کھلتا اسے اپنے کندھے پر کسی ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا تھا۔ اس نے ایک دم چونک کر دیکھا وہی خاتون جو گاڑی کے اندر کسی سے بات کرتے

ہوئے رکشہ آ جانے کی وجہ سے اپنے دروازے کے جانب آ کھڑی ہوئی تھیں، اب اس کے سامنے موجود تھیں۔

"بیٹا! کیا بات ہے؟ میں دیکھ رہی ہوں، کافی دیر سے گھر کے سامنے کھڑی ہو۔" اس کے لپٹے لپٹائے وجود کو جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

کیا کہتی کہ شاہ زین کے لیے آئی ہے۔ یا اماں سے ملنے آئی ہے۔ اس طرح کے سوال کی چونکہ اسے توقع نہیں تھی جبھی ذہن نے اس متعلق کچھ بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر کوئی اس سے کچھ پوچھے تو اس کا جواب کیا ہونا چاہیے۔ یوں بھی جس علاقے میں ان کا گھر تھا وہاں تو لوگ تہوار کے تہوار ہی ایک دوجے کو جانا کرتے۔ کس کے گھر کون آ رہا ہے؟ کیوں آ رہا ہے؟ کتنے بجے آ رہا ہے؟ اس طرح کی دردسری کے لیے نہ تو کسی کے پاس وقت تھا اور نہ ہی دلچسپی۔ جبھی تو ان کے یوں بے تکلفانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے اور ایک دم ہی کیے گئے سوال کے نتیجے میں وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔

"کس سے ملنے آئی ہو؟ گھر تو نہیں بھول گئیں کسی کا؟" وہ زبردستی حقوق العباد پورے کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ندی نے گلاسز کی اوٹ سے ایک نظر انہیں اور پھر دوبارہ اُس گھر کو دیکھا جو اس وقت دنیا میں اس کی امیدوں کے پورا ہونے کا واحد مرکز نظر آتا تھا۔

"میں دراصل ثمینہ سے ملنے آئی ہوں۔ یہی گھر ہے نا اُن کا۔"

"ثمینہ سے۔۔۔؟" اُن خاتون کو حیرت کس بات پر ہوئی تھی اس بات پر خود ندی کو بھی حیرت ہوئی۔

"جی ثمینہ سے، میں دوست ہوں اس کی۔" اب تک اندر سے اطلاعی گھنٹی کا کوئی بھی جواب نہ آنا ندی کو پریشان کیے دے رہا تھا۔ اس پر اُن خاتون کے سوال جواب۔۔۔

"لیکن وہ تو کب سے یہ گھر چھوڑ کر کہیں دور شفٹ ہو گئے ہیں۔" پرکھتی نظریں اب بھی اس کے چہرے کو دیکھ لینے کی خواہش میں نقاب کے اردگرد ہی گھوم رہی تھیں۔

"شفٹ ہو گئے ہیں؟ کہیں دور۔۔۔؟" اپنی سماعتوں پر ندی کو ہرگز یقین نہیں آیا تھا۔ مگر جو حقیقت تھی وہ تو تھی۔ فضا میں یکبارگی آکسیجن کے کم ہونے کا احساس ندی کو اپنے سانس کے گھٹنے سے ہوا۔ ایک تو زندگی میں پہلی بار یوں خود کو اتنی بڑی چادر میں لپیٹ کر نکلی تھی اس پر نقاب۔۔۔ اسے سانس لینا ناممکن لگنے لگا تو جی چاہا کہ چہرے پر کیا گیا نقاب نوچ ڈالے۔

ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی
زندگی چاہتا ہو جیسے

سماعتوں میں گھومتے پھرتے یہ الفاظ پل بھر میں ایسے الجھے کہ ریشم کے ان دھاگوں کو سلجھانا اسے ناممکن ہی تو لگا تھا۔

تفکرات، غم، انتشار، گمان، وسوسے، خدشات سب گونگے کیا ہوئے ایک بار پھر گہرے سیاہ اور بوسیدہ جبے میں ملبوس "اگر" بڑے پراسرار انداز میں لاٹھی ٹیکتا اس کے سامنے سوچ و بچار کی تمام راہیں مسدود کر کے وہ بھی بھید بھری باتیں جن کو وہ سوچنے سے بھی کترا رہی تھی الم نشرح بیان کرنے لگا۔

(باقی آئندہ)

فاخرہ گل

میرے ہمنوا کو خبر کرو

مکمل ناول

کوئی تم سے پوچھے کون ہوں میں
تم کہہ دینا کوئی خاص نہیں
اک دوست ہے کچا پکا سا
اک جھوٹ ہے آدھا سچا سا
جذبات کو ڈھانپے اک پردہ
بس ایک بہانہ اچھا سا
جیون کا ایسا ساتھی ہے
جو دور بھی ہے اور پاس بھی
کوئی تم سے پوچھے کون ہوں میں
تم کہہ دینا۔۔۔کوئی خاص نہیں

ندی کی امی سے بات کرنے کے بعد اکمل کی بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ ندی نے آج جو انتہائی قدم اٹھایا تھا اس کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا اور حالات اس کے حق میں پہلے سے بھی برے ثابت ہونے کا قوی امکان موجود تھا۔ ایسے میں اس کا یوں گھر سے باہر نکل کر شاہ زین سے ملنا کئی خطرات کو دعوت دینے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

معصوم چہرے اور شفاف آنکھوں والی ندی مسلسل اکمل کی نیک خواہشات کے حصار میں تھی۔ مگر ایک بات پر شرمندگی اکمل کو بھی ضرور تھی اور وہ یہ کہ اس کی اپنی سگی بہن حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اسے اس کی غلطی سے بھی کہیں بڑھ کر سزا دلوانے پر تلی ہوئی تھی حالانکہ وہ ہمارا رب جو چاہے تو ہماری ذرا سی نافرمانی پر ہم پر تکلیفوں کے پہاڑ توڑ دے مگر اس کی ذات کو تو یہ گوارا ہی نہیں کہ کوئی اپنے گناہ سے بڑھ کر سزا کاٹے بلکہ اس کی رحمت تو اکثر ہماری کتنی ہی خطاؤں کو نظر انداز کر کے انہیں اپنی عطاؤں سے ڈھانپ دیتی ہے۔ ہماری سزا کو جزا میں بدل ڈالتی ہے۔ پھر ہم انسان آخر خود کو اختیار کی کون سی منزل پر سمجھتے ہوئے اپنے ہی جیسے انسانوں کو ان کے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی آخری حد تک سزا دینے پر تل جاتے ہیں۔

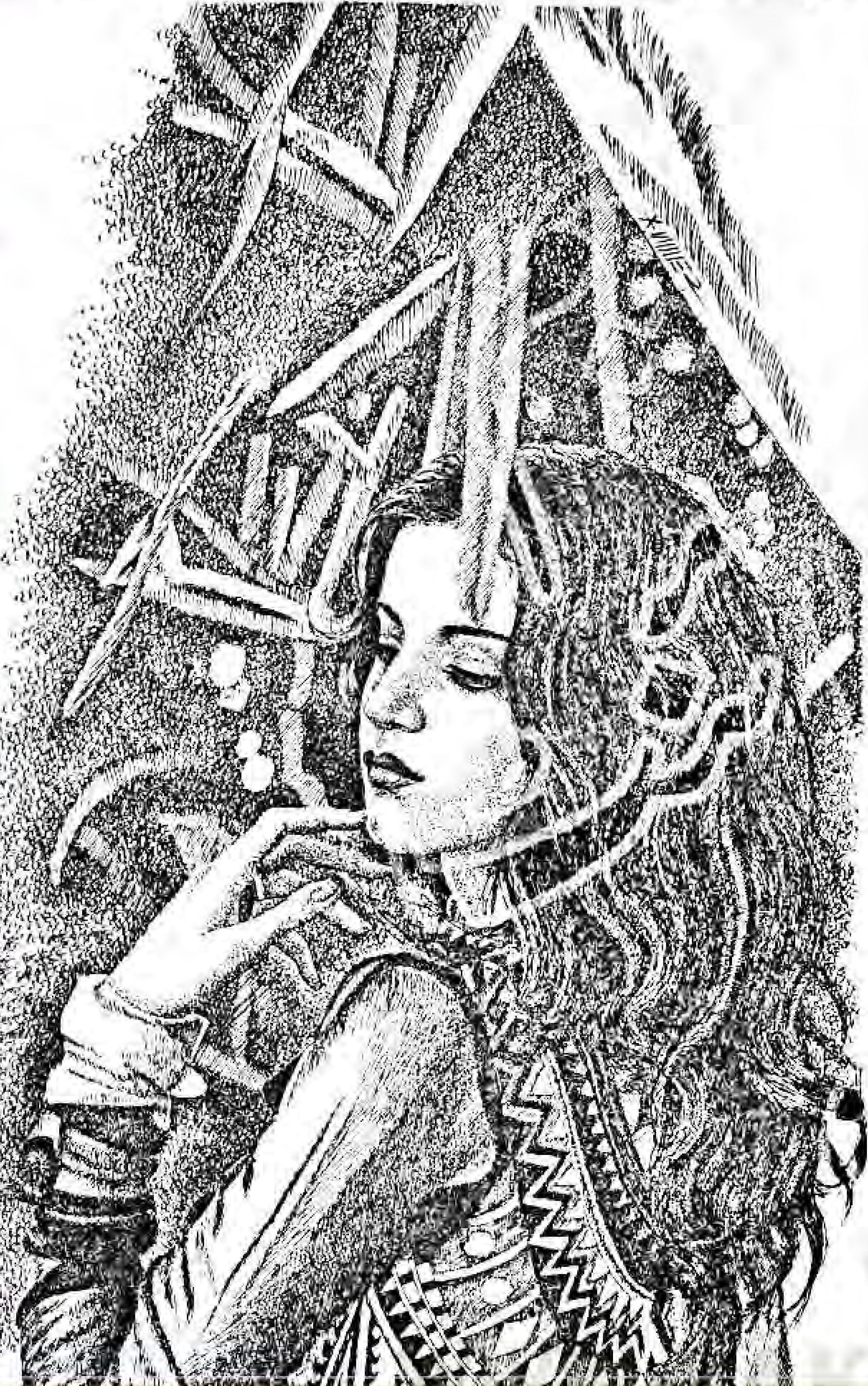
خود کو کل اختیار کا مالک سمجھتے ہوئے ہم رب کریم کو کیوں بھولنے لگتے ہیں؟

ہم اُس دن کا تصور ذہن میں کیوں نہیں لاتے جب ہم پروردگار کے سامنے اپنی سزاؤں کی معافی کے لیے گڑگڑا رہے ہوں، بلبلا رہے ہوں اور تب ہمیں یاد دلایا جائے کہ اسی طرح کبھی ہم سے بھی کسی نے معافی مانگی تھی، اسی رب کے پاک نام کا واسطہ دیا تھا، مگر اس وقت ہم طاقت اور اختیار کے نشے میں دھت بدمست ہاتھی کی طرح تمام جذبات اور سب درخواستوں کو روندتے چلے گئے تھے محض اپنی ذاتی انا کے برج کو اعلا سے اعلا تر کرنے کے لیے۔۔۔

اور معاف کر دینے کے بجائے بدلہ لینے کو ترجیح دی تھی اور بدلہ بھی کیسا، ماشہ کے بدلے پورا چھٹانک۔

باوجود اس کے کہ دوسری طرف اس کی بہن تھی مگر اس کی مکمل حمایت ندی کے ساتھ تھی۔ جبھی ایک بار پھر اس کا دل چاہا کہ فون کر کے ندی سے بات کرے جو یقیناً اب تک گھر پہنچ گئی ہوگی مگر یہ جان کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ندی اس وقت تک گھر نہیں لوٹی تھی اور امی کی پریشانی کے باعث حلق سے آواز کا نکلنا بھی ایک مشکل امر معلوم ہو رہا تھا۔ ان سے بات کرتے ہوئے اکمل کا دل چاہا کہ کاش وہ

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان کے پاس پہنچ پاتا۔ ندی اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگی یہ امر بھی اپنے نزدیک پریشان کن ضرور تھا مگر ان حالات میں امی کس طرح ایک ایک لمحے کو صدیوں پر محیط پا رہی ہوں گی، یہ بات بھی اکمل کو خاصا پریشان کر رہی تھی۔ امی اس وقت کس اعصاب شکن صورت حال



سے گزر رہی ہیں، یہ سوچ ہی اکمل کے لیے انتہائی دل گرفتگی کا باعث تھی۔ اچھا خاصا جوان بندہ بھی ایسی صورت حال میں شاید اپنے حواس پر قابو نہ رکھ پاتا اور امی جو تن تنہا اس ساری صورت حال کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

مٹھیاں بھینچتے ہوئے اور کچھ نہ سوجھا تو زوردار مکا تکیے پر ہی جڑ دیا۔ ڈرل وہ کر چکا تھا اور یہ ٹائم اس کی جاگنگ کا تھا مگر آج ٹریک سوٹ پہننے کا اہتمام کیے بغیر ہی محض چابی اٹھا کر باہر نکل آیا۔ برآمدے سے لانڈری کی طرف جاتے ہوئے بیٹ مین کو نبیل کے لیے پیغام دے کر اپنے جانے کے بارے میں بتایا اور اپنی واحد پناہ گاہ یعنی پارک کا رخ کیا۔

☆☆☆

عصر کی دھوپ دیواروں پر پڑی بے دلی سے اونگھ رہی تھی۔ کالونی میں لگے درخت اور پودے بھی خاموش کھڑے چپ چاپ یونہی بلا مقصد یہاں وہاں دیکھتے وقت گزارنے کے پابند تھے۔ ماحول میں ایک عجیب سا سکوت تھا۔ کالونی کے بچے عام طور پر شام کے اوقات میں اپنے اپنے اسکول کا ہوم ورک نبٹا لینے کے بعد اس وقت کھیلتے ہوئے نظر آ رہے ہوتے۔ ایک دوسرے کے گھر کی بیلز دی جاتیں، ٹیمیں سلیکٹ ہوتیں، کھیل منتخب کیے جاتے اور پھر کچھ دیر مل کر کھیلنے کے بعد انہیں ٹیموں میں دھڑے بازی ہوتی اور نئی ٹیمیں تشکیل پاتیں اور پھر یہی کھیل کو دیر تک چلتا رہتا۔

اختلاف رائے کے بعد جب نئی ٹیمز بنتیں تب بھی نہ تو کوئی شور و غوغا ہوتا اور نہ ہی لڑائی جھگڑا، یہی وجہ تھی کہ سب ہی مائیں اپنے اپنے گھروں میں بڑے ہی سکون اور بے فکری سے کاموں میں مصروف رہتیں۔

"اماں۔۔۔! آج باہر اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

کیاریوں کے پاس موڑھا رکھ کر نیل کٹر کی مدد سے ناخن تراشتے ہوئے ثمینہ نے اماں کے آنے کی آہٹ محسوس کی تو بولی۔

"روزانہ اس وقت اتنی ہی خاموشی ہوتی ہے بیٹا!"

یہ وقت ان کا پودوں کے ساتھ گزرتا تھا جب ہی عقبی حصے سے چھوٹی سی پیڑھی اور ہاتھ میں کھرپی لے کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"دراصل آج سے پہلے تم کبھی اس وقت یہاں آ کر بیٹھی ہی نہیں نا، تو بھلا تمہیں کیسے اندازہ ہوتا۔"

اُن کی بات پر ثمینہ نے سوچا کہ سچ ہی تو ہے کہ آج سے پہلے وہ کبھی اس پہر یہاں بیٹھی ہی نہیں تھی آج پتا نہیں کیا جی میں آئی کہ یہیں بیٹھ کر ناخن تراشنے لگی۔

"ویسے اماں! ہمارا گھر بھی تو کتنا سونا سونا لگتا ہے نا۔۔۔ خاموش خاموش سا۔۔۔" گردن کو بائیں کندھے کی طرف گھماتے ہوئے اس نے اماں کو دیکھا۔

"آپ کو نہیں لگتا ایسا؟"

"لگتا تو ہے۔۔۔" انہوں نے بھی تائید کرتے ہوئے کیاریوں میں گر جانے والے پتے اٹھائے اور کیاری کے ساتھ ساتھ لگی تکونی سرخ اینٹ کے ساتھ رکھ دیے۔

"اور اسی لیے اس مرتبہ میں نے شاہ زین کی شادی کی بات چھیڑ دی ہے۔"

"بھائی کی شادی۔۔۔؟"

وہ ایک دم موڑھے سے یوں اچھل کر نیچے اتری گویا سانپ دیکھ لیا ہو۔

"واؤ اماں واؤ۔۔۔! مگر کب؟ کس کے ساتھ؟ کہاں؟ اور بھائی کو پتا ہے اس بات کا؟"

ثمینہ خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی بڑی خبر اور اماں اسے یوں سرسری لہجے میں سنا رہی ہیں۔ فوراً اپنا موڑھا گھسیٹ کر ان کے قریب کیا اور دھپ سے اس پر ایک بار پھر جو بیٹھی تو ان کے ہونٹوں پر رینگتی مسکراہٹ دیکھ کر انہیں پکڑ کر جھنجھوڑ ہی توڈالا۔

"بتائیں نا اماں! ساری بات بتائیں پوری تفصیل کے ساتھ۔"

"ارے بیٹا! ابھی تو صرف پہلا قدم اٹھایا ہے اور تم اس طرح جوش دکھا رہی ہو۔۔۔"

"ہاں تو بتائیں نا وہی پہلا قدم کون سا ہے؟"

ثمینہ نے ان کی بات کاٹی۔ تجسس واقعی قابلِ دید تھا۔

اور اس وقت اس کے ذہن میں سوالات یوں ٹھنسے ہوئے تھے گویا پوست کے ڈوڈے میں پھٹنے کو خشخاش کے دانے۔

"تمہارے ابا کے ایصالِ ثواب کے بعد جب محلے کی خواتین یونہی بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی تھیں نا، تب میں نے اُن سے شاہ زین کے لیے رشتہ دیکھنے کا کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میں شاہ زین کی شادی جلد کرنا چاہتی ہوں، اس لیے اگر کسی کی بھی نظر میں کوئی رشتہ ہو تو مجھے ضرور بتائے۔"

موتیے کے ننھے سے ناتواں پودے کو اون کے دھاگے کے ساتھ باندھ کر دھاگے کی گرہ امرود کے نسبتاً مضبوط پودے کے ساتھ لگا کر انہوں نے ثمینہ کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اور بھائی۔۔۔؟ وہ جانتے ہیں یہ سب؟"

"نہیں۔۔۔ اور ظاہر ہے اگر اس سے بات کی ہوتی تو تمہیں بھی تو پتا چلتا نا۔"

"ہوں۔۔۔" مکمل توجہ اور دھیان ان کی بات پر دیتے ہوئے ثمینہ نے ہنکارا بھرا۔

"لیکن اماں۔۔۔! آپ کو کیا لگتا ہے کہ بھائی مان جائیں گے شادی پر؟"

"ان شاء اللہ ضرور مان جائے گا۔ مجھے بڑا اعتماد ہے اپنے بیٹے پر۔"

ان کے لہجے میں شاہ زین کے لیے محبت بھرا فخر پانی سے بھرے بادلوں کی طرح ڈول رہا تھا۔ پیڑھی کو ذرا سا پیچھے کھسکا کر انہوں نے براہِ راست ثمینہ کو دیکھا۔

"اور پھر تم خود بھی تو سوچو نا کہ ندی تو اپنا گھر بسا چکی ہے، اللہ اُسے آباد رکھے مگر کیا ہم شاہ زین کو یونہی کنوارا چھوڑ دیں؟"

لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہوئیں مگر ثمینہ نے گہری سانس لے کر محض اثبات میں سر ہلایا اور بدستور اُن کی طرف متوجہ رہی۔

"وہ میرے سامنے، میری خوشی کے لیے لاکھ اداکاری کیوں نہ کرے مگر ماں ہوں، جانتی ہوں کہ وہ یہ سب صرف مجھے خوش دیکھنے کے لیے کر رہا ہے ورنہ اس کا دل یقیناً بہت ناشاد ہے۔"

"ہاں اماں! اکثر مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بھائی محض اوپری دل سے ہنس بول رہے ہوں۔" ثمینہ نے تائید کی۔

"بس اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ اس کی زندگی میں کوئی خوش گوار تبدیلی آنی چاہیے جو اسے سب کچھ بھلا دے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔!"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے، بھائی کو بھی تو اپنی زندگی خوش باش طریقے سے گزارنے کا پورا حق ہونا چاہیے نا، یہ تھوڑی ہوگا کہ اب وہ ساری زندگی بس اسے ہی یاد کرتے رہیں گے۔" اماں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میں بھی دیکھوں گی اماں! ہو سکتا ہے ہمارے کالج میں ہی کوئی اچھی اور پیاری سی لڑکی مل جائے۔"

ثمینہ کے جذبات اب جوش کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اماں بھی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے خوش گوار ہونے کی امید لیے مسکراتے لبوں کے ساتھ گہری سانس لے کر بس اسے دیکھے گئیں۔

ثمینہ کا تو بس چلتا تو ابھی بیٹھے بٹھائے مہندی مایوں تک کے انتظامات ڈسکس کرنے لگتی ــــ کہ نرمین کے بیل دینے کے مخصوص انداز نے اس کے خیالات کو لمحہ بھر کے لیے بریک لگا دیا اور اپنی سوچوں کو تصوراتی آنکھ سے حال کا حصہ بنائے جب اس نے نرمین کے لیے دروازہ کھولا تو اسے پہلے کے برعکس ایک نئے زاویے سے دیکھا۔ گھنگھریالے بالوں اور سانولی رنگت والی نرمین، ثمینہ کو آج بے حد دلکش لگ رہی تھی اور اس کے انداز کو خود نرمین نے بھی محسوس کیا۔

"خیر تو ہے، آج تو لگتا ہے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو

مجھے۔"

"ہاں۔۔۔نہیں تو۔۔۔بس ویسے ہی۔"

چوری پکڑی جانے پر وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹی اور اسے اندر آنے کے لیے رستہ دیتے ہوئے غیر ارادی طور پر اماں کی طرف دیکھا تو وہ بھی رخ پلٹے اس ہی کی طرف متوجہ تھیں اور یقینی طور پر اس کا ذہن پڑھ چکی تھیں۔

زمین یوں بھی باتیں کرنے کی شوقین تھی۔ ثمینہ کو اکثر محسوس ہوتا کہ وہ اس کے پاس باتیں ہی کرنے آیا کرتی ہے کیونکہ پڑھائی کی طرف اس کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکثر اوقات خود ثمینہ اسے کہہ کہہ کر کتاب کھلواتی مگر آج معاملہ کچھ مختلف تھا۔ آج تو ثمینہ خود اس سے باتیں کرنے کے انتظار میں معلوم ہوتی تھی۔ سوصوفوں پر بیٹھتے ہی یونہی اِدھر اُدھر کی دو ایک باتیں کرنے کے بعد اُس کے اور اس کی فیملی کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش تو اپنے تئیں ضرور کی مگر وہ ہمیشہ ہر سوال کے جواب میں کنی کترا جاتی اور اس کے اسی رویے سے جب ثمینہ کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے یا اپنی فیملی کے متعلق کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتی اور آج جبکہ وہ باتیں کرنا چاہ رہی ہے تو خلاف معمول زمین خود کتاب کھول کر کچھ پڑھانے پر اصرار کرتے ہوئے پورے سال کی تعلیم ابھی ایک دو گھنٹوں میں حاصل کرنے پر مصر ہے تو لاشعوری طور پر ثمینہ کے ذہن میں زمین سے ملنے کے بعد اس کے گھر تک آنے اور پھر آج تک کے تمام مناظر چلتی ٹرین کے بھاگتے مناظر کی طرح ذہن میں نمودار ہوتے اور اوجھل ہو کر نئے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کرتے نظر آئے۔

اور تب جو ایک بات ثمینہ نے نوٹ کی وہ یہ کہ اول روز سے آج تک زمین نے صرف اور صرف اُس ہی کے بارے میں یا اس کے گھر اور گھر کے افراد کے بارے میں ہی بات کی ہے۔ وہ کون ہے؟ کتنے بہن بھائی ہیں؟ ابا کیا کام کرتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اس نے اپنے بارے میں کچھ بھی تو شیئر نہیں کیا تھا۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ یا کچھ اپنی فیملی کے متعلق ہی سہی، مگر وہ اسے کچھ بھی کیوں بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔ یہ بات ثمینہ کو زمین کے متعلق بری طرح الجھائے جارہی تھی۔

☆☆☆

اور کچھ دیر میں جب پھر میرے تنہا دل کو
فکر آلے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر! ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

سرد ہوتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ ندی کی سماعتوں پر یہ جملہ برف بن کر برس رہا تھا۔ "ہاں بھئی، جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ کسی لڑکی کا چکر تھا اور اپنا شاہ زین تو خود ہمارے ہاتھوں میں پلا بڑھا، انتہائی شریف بچہ ہے مگر وہ بدذات لڑکی شاید اس کے پیچھے پڑ کر زندگی تباہ کر گئی بے چاری کی، نیک نامی کو ایک داغ لگا اور گھر بھی چھوڑ گئے بے چارے۔۔۔ کسی بھلے مانس نے اس لڑکی کو سمجھایا تو اس بے چارے کو بھی یونیورسٹی سے نکلوا دیا اس بے غیرت نے۔"

ندی کے لیے ان کی باتیں سنتے ہوئے اپنے ہی پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ تھا اب اس کا معاشرے میں تاثر اور مقام۔

ایک اور خاتون بھی متجسس نظروں سے ان کے قریب آکر کھڑی ہوئی تھیں اور گفتگو میں اپنا حصہ ڈالنا انہوں نے بھی ضروری خیال کیا۔

"لڑکی کے بھائیوں کو پتا چلا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی آوارہ لڑکی کو کسی کھونٹے سے باندھتے، اس بے چارے کی جان کے دشمن ہو گئے، مانو اکلوتا بیٹا ہے یہ اپنی ماں کا، اور ہے بھی بہت نیک اور سلجھا ہوا، بس اسی کم بخت نے بدنام کر دیا تو محلہ ہی چھوڑنا پڑا۔"

"ہاں ورنہ دیکھو تو شادی کے بعد میاں کے ساتھ اسی گھر میں آئیں، دونوں بچے یہیں پیدا ہوئے، میاں کا کوئی رشتے دار بھی دیکھا نہ خود اُن کا، بس اسی محلے میں ہی سب کو اتنا پیار دیا کہ آج بھی ان کی یاد آئے تو ساتھ گزرے دنوں کی یاد کر کے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔"

دونوں خواتین ایک دوسرے کو مخاطب کر کے بات آگے بڑھا رہی تھیں۔

یوں بھی ندی آگے سے بھلا کیا سوال جواب کرتی اُس کا تو جسم سن اور زبان گنگ ہو چکی تھی۔ اسی دوران سامنے سے سبزی فروش ٹھیلے پر مختلف سبزیاں سجائے ایک ہاتھ سے اُن پر پانی کے چھینٹے مارتا اور دوسرے ہاتھ سے ٹھیلے کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے صدا لگاتا گلی میں داخل ہوا تو اس کی آواز سننے کے ساتھ ہی فوراً چند خواتین گھروں سے نکل کر یوں ٹھیلے کی طرف لپکیں گویا دروازے کے عقب میں ہی کھڑی تھیں بس اس کی آواز لگانے کی منتظر تھیں اور یوں فوراً باہر نکل آنے کا مقصد یقینی طور پر تازہ سبزی کا حصول تھا۔

بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد سبزی اپنی پلاسٹک کی ننھی سی ٹوکری میں ڈلوانے کے بعد ایک خاتون کی نظر غیر ارادی طور پر اُن پر پڑی تو سامنے کھیلتے بچے کے ہاتھ ٹوکری اپنے گھر کی طرف بھجوانے کے بعد اُن ہی کے پاس آگئیں۔

ندی کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے اور باقی دو خواتین کی گفتگو سنتے ہوئے وہ بھی بولے بنا نہ رہ پائیں۔

"ہاں بھئی۔۔۔ باپ کے مرنے کے بعد پھر جس طرح اس لڑکے نے کم عمری میں گھر کی ذمہ داریاں سنبھال کر اپنی شرافت سے نیک نامی کمائی تھی، اس لڑکی کی وجہ سے سب ملیامیٹ ہو گئی اور میرے حسنین کا دوست تو اسی یونیورسٹی میں ہے، کہہ رہا تھا وہ لڑکی تو ہے ہی ایسی۔"

خاتون نے اپنے بیٹے کے ذریعے ملنے والی معلومات شیئر کیں۔

ندی کا وجود اس وقت پتھر کا مجسمہ بنا سب کچھ سن رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا مگر افسوس کسی بھی قسم کی حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی کیفیت سے بے خبر اب وہ تینوں خواتین اسے ہر طرح کی معلومات دینے پر بضد نظر آتی تھیں۔

"ہاں یہ سب تو ہے مگر اب تو ویسے ہی شاہ زین کی شادی کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔۔۔" شاہ زین کی شادی۔۔۔؟ کچھ دنوں کی بات۔۔۔؟

اس سے آگے وہ خاتون کیا کہہ رہی تھیں اور بعد میں آنے والی خاتون کیا پوچھے جارہی تھیں، ندی کا دماغ تو جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ ذہن اور دل ایک عجیب خانہ جنگی کا شکار معلوم ہوتے تھے۔ اُن میں ایک دوسرے کے خلاف ہی شاید جنگ چھڑ چکی تھی۔

وہ سب کچھ جو ہم جانتے ہیں اور وہ سب جو ہم محسوس کرتے ہیں اگر ایک دوسرے سے متضاد ہونے لگیں تو ذہن و دل میں چھڑنے والی جنگ اکثر اعصاب کا امتحان بن جاتی ہے۔ ندی کی آنکھوں کے سامنے ابھرتے سیاہ اور نیلے ننھے منے دائرے دن کی روشنی چھپانے لگے تو اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی ان ہی خاتون نے اپنی گفتگو کے دوران چونک کر اسے سہارا دیا۔

"بیٹا معاف کرنا، اتنی دیر سے ہم نے تمہیں یہیں کھڑا رکھا ہوا ہے، ثمینہ چلی گئی تو کیا ہوا، آؤ ہمارے گھر چلو کوئی چائے ٹھنڈا وغیرہ۔۔۔"

اُن کی کی گئی پیش کش پر ندی نے ایک ہاتھ سے سر دباتے ہوئے خالی الذہنی سے ان سب کو دیکھا اور انہیں حیران و پُرتجسس چھوڑ کر بغیر کچھ کہے چپ چاپ انہی قدموں پر واپس مڑ گئی۔

من من کے قدم بڑھاتے ہوئے کیفیت وہی تھی جو کسی بھی جواری کی ہو سکتی ہے وہ بھی تب، جب وہ شرط میں اپنی زندگی ہی ہار جائے۔ مکڑی کی طرح جالے بنتی زندگی میں وہ ادھ مری مکھی کی طرح جالے کے اندر پھنس کر رہ گئی تھی۔ دماغ تھا کہ بالکل ماؤف۔۔۔ جس آخری اور واحد امید کے سہارے

اس نے انتہائی رسک لے کر گھر سے قدم نکالا تھا وہ امید تو پانی کے بلبلے کی طرح لمحہ بھر میں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اب زندگی اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔

اس بات کا خیال ذہن میں آتے ہی سوچ بس ایک دم رک کر رہ جاتی تھی۔ اس سے آگے تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

حالات نے جب جب اسے چلتے انگاروں کی بھٹی سے گزارا تھا تب تب ہی اسے خدا کے بعد صرف شاہ زین کا ہی خیال آتا۔ اسے یقین تھا کہ بس اس تک پہنچنے کی دیر ہے اور سب کچھ چٹکی بجاتے ہی گویا حل ہو جائے گا۔ مگر اب۔۔۔ اب جبکہ شاہ زین کی شادی ہونے والی ہے، وہ اس کی جگہ کسی اور کو دینے والا ہے تو اس کا کیا بنے گا جس نے شاہ زین کو ہمیشہ خود سے بڑھ کر چاہا۔۔۔

ندی کو خود اپنے آپ پر آج ترس آ رہا تھا۔ شاہ زین کی شادی کا خیال آتا تو لگتا دانتوں میں ریت کھس گئی ہو، آنسو تواتر سے چشمے کے عقب سے بہتے ہوئے سیاہ نقاب میں جذب ہونے لگتے۔ سبزی کے تھیلے والا دائیں ٹانگ پر بوجھل ڈالے بایاں پاؤں دائیں ٹانگ کے گھٹنے پر رکھے اسے دیکھتا ہوا کیا سوچ رہا ہے، سبزی لے کر گھروں کو لوٹتی عورتیں اُسے کس نظر سے دیکھ رہی تھیں، گلی میں صاف ستھری فراکیں پہن کر ننھی منی پونیاں سجائے بچیاں اسے منہ میں انگلیاں ڈالے دیکھتے ہوئے کیا سوچ رہی ہیں، ان باتوں کی نہ تو اسے کوئی فکر تھی نہ ہی خیال۔

اسے لگا تھا جیسے آج پھر ایک بار بابا اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوں، آج پھر اسے اپنا آپ کسی تنکے کی مانند ہلکا اور ناتواں لگنے لگا تھا جسے وقت کی ہوا جانے کہاں کہاں اڑا کر لے جائے، کس کے قدموں میں مسل جانا مقدر ٹھہرے، یا یونہی ویرانے میں پڑا رہنا اور یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سفر ہی اس کا نصیب بنے۔

ماضی قریب میں کیے گئے شاہ زین کے خوب صورت محبت بھرے جملے واکمن سے بکھرتے حسین سُروں کی بازگشت بن کر ذہن کی فصیلوں سے سر پٹخ رہے تھے۔ آنے والے کل کا خوف اور بیتے کل کا دکھ اس کی دھڑکنوں کے لیے عجیب سا امتزاج بن کر ابھر رہا تھا۔ واپسی کا رستہ دیکھنے والی ماں کا کمزور وجود گھر میں منتظر نہ ہوتا تو شاید وہ دوبارہ گھر کا رخ نہ کرتی، اس کی منزل کوئی اور ہوتی لیکن اب بہر حال اسے اپنی مجسم دعا بنی ماں کے لیے ہی سہی گھر کو لوٹنا تو تھا۔ جہاں کل کی بولڈ اور آج کی بے غیرت کہلائی جانے والی ندی کے بخیریت گھر کو لوٹنے کے لیے ماں کی ہتھیلیاں آنسوؤں سے تر ہونے کے باوجود ابھی تک ملی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”ہتھ جوڑا پکھیاں دا
نالے میرا پُت لگدا
نالے جانن اکھیاں دا“

آج صبح سے ملکانی سائیں کی زبان پر جو یہ فقرے ابھرے تو اب تک رواں تھے۔ جی بھر کے اپنے بیٹے، حویلی کے اکلوتے وارث اور اتنی بڑی جاگیر و جائیداد کے تنہا مالک میران پر پیار آ رہا تھا۔

اور بھلا پیار آتا بھی کیوں نا، آخر وہ اس کی شادی کی بات جو پکی کر چکی تھیں اور وہ بھی اس طرح کہ رشتہ لینے کے لیے بھی رسمی طور پر بھی لڑکی والوں کے گھر نہیں جانا پڑا تھا۔ سو مختلف ملازمین کو مختلف ہدایات جاری کرنے کے بعد اس وقت وہ ”رومن کولوسیم“ کی یاد دلاتے حویلی کے لمبے لمبے ستونوں کے درمیان کھڑی ظاہری طور پر تو حویلی کے وسیع و عریض باغ کے آگے گیٹ کے عین سامنے کھڑے توڑے دار بندوق والے چوکیدار کو دیکھ رہی تھیں جو اپنے لیے مخصوص کالی کرسی چھوڑے چوکس یوں کھڑا تھا گویا کسی طرف سے حملہ کیے جانے کی پیشگی اطلاع مل چکی ہو۔

اور ویسے بھی اب تو آہستہ آہستہ یہ خوش خبری پورے گاؤں میں پھیلتی جا رہی تھی کہ چھوٹے سائیں کے سر پر سہرا سجنے والا ہے اور گاؤں بھی کوئی چھوٹا سا نہیں تھا، پرچون کے کھوکھے، دودھ دہی کی دکانیں، پنساری، پتنگ والے، گنے کے رس کی ریڑھیاں، سائیکل کو پنکچر لگانے کی ”ورکشاپس“، درزی، نائی الغرض کہ بنیادی ضرورت کی کافی اشیاء گاؤں ہی سے دستیاب ہو جایا کرتیں۔ اسکول شاہ سائیں نے بنوا دیا تھا اور دوا بیماری کے لیے روزانہ شام کو ایک ڈسپنسر آ جایا کرتا جس سے گاؤں کی اکثریتی آبادی چھوٹی موٹی بیماری کی دوا لے لیا کرتی۔ دوسری صورت میں شہر کا رخ کیا جاتا، مگر گاؤں کے رہائشی علاقے سے شہر تک جانے والی سڑک سے بس میں بیٹھنے کے لیے پہلے گاؤں سے چلنے والے تانگے یا چنگ چی رکشے کا سہارا لینا پڑتا کہ آبادی سے سڑک تک آنے کا رستہ بھی چار پانچ کلومیٹر سے کم تو ہرگز نہیں تھا۔

حویلی میں آج سے ڈھولکی بھی رکھی جانی تھی جس کی مکمل ذمہ داری کنیزاں کے سر پر تھی۔ آرائشی قمقموں سے بھرا ٹرک بھی کچھ ہی دیر میں پہنچا ہی چاہتا تھا جس نے نہ صرف حویلی کی چھت اور بیرونی دیواروں پر لائٹنگ کرنی تھی بلکہ باغ کو بھی روشنیوں سے سجانا تھا۔ یوں بھی سارے انتظامات محض ایک فون کال ہی کے تو منتظر تھے۔ شاہ سائیں بھی حویلی ہی میں موجود تھے اور خوش تھے۔

حویلی کے رسم و رواج کے عین مطابق پورے گاؤں میں ”کچی روٹی“ کی رسم آج ہی دوپہر کو ادا کی گئی تھی۔ جس کے مطابق ہر گھر کو ایک کلو گوشت اور اسی کا ہم وزن گڑ، چاول اور گندم دی جاتی تھی۔ یہ رسم ہر کوئی ادا نہیں کرتا تھا بلکہ حویلی کے مالکان یا ان ہی کے ہم پلہ لوگ اپنے بیٹوں کی شادی کے موقع پر خوشی کے طور پر تمام گاؤں والوں کو تحفے کے طور پر یہ سب کچھ بھیجا کرتے اور ملکانی سائیں کا بس چلتا تو ہر چیز دس دس کلو کے حساب سے تقسیم کرتیں۔ ساری حویلی میں موجود ملازمائیں بھی ملکانی کو اس قدر مسکراتے دیکھ کر ان کے دانت بھی نظر آنے لگتے، حیرت کا اظہار کرتیں اور مسکراتی آنکھوں سے ایک دوسرے کو جو اشارے کرتیں تو خود بھی دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر ہنسنے لگتیں۔

جس جگہ رات کو ڈھولک رکھ کر گانے گائے جانے تھے اور گاؤں سے خواتین نے آکر بیٹھنا تھا وہاں خوب صورت نیلے رنگ کا ایرانی قالین ڈال کر تمام دیواروں کے ساتھ کشن بھی رکھے گئے تھے البتہ جو بیگمات دوسرے گاؤں سے آنے والی تھیں ان کے لیے خاص طور پر کوہائی دیوان اس بڑے سے ہال میں رکھوا کر اطراف میں اطالوی کشن سیٹ کیے گئے تھے۔ ہال کے چاروں کونوں میں خشک میووں سے بھرے تھال موجود تھے اور چھت پر دائیں سے بائیں ترچھے انداز میں پھولوں کی لڑیاں لگا کر چھت پر کی گئی نقش و نگاری پر اعتماد ظاہر نہ کرتے ہوئے اسے مزید خوب صورت بنانے کی تگ و دو جاری تھی۔ گانوں کی تقریب میں شامل ہونے والی خواتین اور گھر آئے مرد حضرات اور ملازمین میں بانٹی جانے والی مختلف انواع کی مٹھائیاں، جلیبیوں اور بتاشوں سمیت حویلی میں ہی تیار کی جا رہی تھیں۔

سب کچھ بڑی خوب صورتی اور منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا تھا۔ باوجود اس کے کہ شادی اچانک طے ہوئی تھی اس ”اچانک“ کا کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ شاہ سائیں بھی بڑے پرسکون انداز میں ڈرائنگ روم کے صوفوں پر عین دیوار پر ٹنگی چیتے کی کھال کے نیچے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ہاتھ میں جدید موبائل لیے ”کونٹیکٹ لسٹ“ میں سے مختلف نام دیکھ کر سامنے بیٹھے منشی چاچا کو لکھواتے جا رہے تھے۔

یہ وہ تمام نام تھے جنھیں شادی میں مدعو کرنے کے لیے دعوتی کارڈز ارسال کیے جانے تھے۔ برادری کے لوگوں کی لسٹ الگ تھی۔

اُدھر ملکانی سائیں بھی مطمئن انداز میں ہاتھ باندھے تمام کام ہوتے دیکھ رہی تھیں، کمی تھی تو صرف مہربانو کے آنے کی۔

جو ابھی حویلی میں ہونے والے اس جشن سے متعلق بے خبر تھی۔ ملکانی سائیں نے صبح اس سے بات

کرنے کی کوشش بھی کی جو اس کے کلاس میں ہونے کی وجہ سے ناکام رہی۔ اس لیے اب انہیں رات نو بجے کا شدت سے انتظار تھا کہ جب وہ اس سے بات کر پاتیں۔

سونی ہمیشہ کی طرح ان کے قدموں کے پاس ہی موجود تھی، جب میران کا فون آیا، وہ اپنی شادی کی خریداری کرنے گیا تھا کہ وہاں جا کر اسے مہربانو کا بھی خیال آ گیا۔ سو تاپ پوچھنے کے لیے فون کر ڈالا۔ اسے کچھ دیر بعد فون کرنے کا کہہ کر ملکانی سائیں مہربانو کے کمرے میں جانے کے لیے اندرونی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی ہی تھیں کہ شاہ سائیں نے اشارے سے منشی چاچا کو فی الحال باہر جانے کا اشارہ کیا اور ملکانی سائیں کو آنکھوں کے اشارے سے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔

"خیر تو ہے شاہ سائیں؟"

اُن کے اس انداز پر ملکانی سائیں اُلجھ گئیں۔ تبھی آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے ہی سوال کیا اور پھر چادر سنبھالتے ہوئے سونی کو گود میں لے کر بیٹھیں۔

"کیا واقعی جو کچھ تم سوچ رہی ہو وہ ہو جائے گا؟"

بے یقینی ان کے لہجے میں کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہی تھی۔

"ناں تے اس میں مسئلہ کیا ہے؟"

وہ ابھی تک ان کی پریشانی اور تذبذب کی اصل وجہ تک نہیں پہنچ پائی تھیں۔

"میران کی حد تک تو چلو ٹھیک ہے اور میں خود یہ ہی چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی آئے جو اس کی زندگی کو مثبت راہ پر لے آئے مگر مہربانو۔۔۔" وہ لحہ بھر کو رکے، اپنی سنہری باریک سے فریم والی انتہائی نفیس عینک اتار کر صوفے پر ہی دائیں طرف رکھی، انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی پوروں سے لحہ بھر کے لیے آنکھوں کو ہلکا سا دبایا اور پھر گہری سانس لے کر بولے۔

"مہربانو کی زندگی کے لیے تو میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ اسے اعلا تعلیم دلوا کر ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا میں۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر اب یوں اچانک اس کی شادی کا معاملہ چھیڑ کر تم نے تو خود میرے اندر جنگ چھیڑ دی ہے تو خود سوچو مہربانو کا کیا ردِ عمل ہوگا۔۔۔"

"کوئی ردِ عمل، شدِ عمل نہیں ہوگا شاہ سائیں! آخر کو وہ میری بھی تو بیٹی ہے نا، ناں کیا خیال ہے آپ کا، میں اودے لئی اچھا نہیں سوچ رہی۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں۔"

"آہو، پتا ہے مینوں، پر تسی اے بھی تو دیکھو نا کہ رحمٰن شاہ دے علاوہ اس کے جوڑ کا کوئی اور ہے بھی تو نہیں نا۔"

"رحمٰن شاہ اور اس میں تمہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"

شاہ سائیں، ملکانی کے اس انداز پر تڑپ ہی تو اٹھے تھے۔

"پورے اٹھارہ سال کا فرق ہے دونوں میں، اور اگر رحمٰن شاہ نے ابھی تک شادی نہیں کی تو اس کا کیا مطلب ہے کہ وہ دودھ پیتا بچہ یا کوئی کم عمر نوجوان ہے اب تک؟ ہماری مہربانو سے اٹھارہ سال بڑا ہے وہ۔۔۔ پورے اٹھارہ سال۔۔۔"

سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے شاہ سائیں نے آخری جملہ تقریباً چباتے ہوئے ادا کیا۔ مگر آج ملکانی سائیں پہلے کی طرح فرماں برداری کے موڈ میں قطعاً نہیں تھیں۔

"تے شاہ سائیں! ایہہ کوئی نویں بات تے نہیں ہے نا ہماری برادریوں میں، پہلے دن سے ایہوای ہوتا آ رہا ہے، جس کا جوڑ نہیں، اسے تے فیر انتظار کرنا ہی پڑتا ہے نا، چاہے اٹھارہ سال ہو یا وی (بیس) سال۔۔۔"

"کس کا اتنا جگرا ہے کہ گھر کی جائیداد باہر لوکاں میں جا کر دے آئے۔"

اضطراب کے عالم میں شاہ سائیں نے سگار سلگا یا تھا۔

"رحمٰن شاہ کو تو ساڈی جیداد (جائیداد) میں سے آنہ وی نہیں چاہیے، وہ تے کہتا ہے کہ صرف ویاہ کر دو میرا اور بس۔۔۔ میں تے ابھی تک مہربانو کے آنے اور آپ کی طرف سے ہاں کے انتظار میں ہوں ورنہ میران وی راضی ہے ایس رشتے پر، کہتا ہے اگر ابھی مہربانو کی شادی نا کی تے فیر سبطین کے جوان تک انتظار کرنا پڑے گا مہربانو کو۔۔۔ تے او وی کم از کم پندرہ نہیں تے بارہ سال ضرور۔"

ملکانی سائیں اپنے تئیں شاہ سائیں کو اس شادی کے نہ ہونے کی صورت میں تمام سائڈ ایفیکٹس سے آگاہ کر رہی تھیں مگر ان کے چہرے پر ابھی تک ملکانی سائیں کے دلائل کے حق میں تائیدی تاثرات نہیں ابھرے تھے۔

"پتا ہے نا، ہماری عمروں میں بھی کتنا فرق ہے؟"

ملکانی سائیں نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے اُن کی طرف توجہ مرکوز رکھی۔

"اور عمروں کے اس واضح فرق نے ہم سے اس ایک دفعہ ملنے والی زندگی کو ایک دفعہ بھی ڈھنگ سے جینے نہیں دیا۔ ان سب کے باوجود میں نے گو کہ تمہارے تمام حقوق پورے کیے، ہر ضرورت کا خیال رکھا مگر تمہارے اندر تحفظ کی کمی کا احساس جو پہلے دن سے تھا اسے ختم نہیں کر پایا۔"

ملکانی سائیں نے سر جھکا کر سونی کو خود سے مزید قریب کیا۔

"اور اس کی بڑی وجہ شادی کے ابتدائی سالوں میں میرا وہ رویہ تھا جس میں، میں تم سمیت سب کو اپنی خوشیوں کا قاتل سمجھا کرتا تھا کہ ساری عمر میں تمہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا آیا تھا اور اسی طرح جیسے آج تم میران کی شادی کے موقع پر مہربانو کی زندگی کا صفحہ بھی الٹنا چاہتی ہو نا، بالکل اسی طرح جب حیدر بھائی نے حویلی کی تمام روایات سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی پسند سے شادی کر لی اور ابا سائیں نے انہیں ان کی بیوی سمیت سب ملازموں کے سامنے بے عزت کر کے حویلی سے نکال دیا تو انہیں میری فکر نے آ لیا کہ کہیں میں بھی حیدر بھائی کی تقلید نہ کر بیٹھوں اور ہم دونوں کی شادی کر دی گئی، مگر۔۔۔ مگر تم خود سوچو کیا ہم نے اپنی زندگی خود گزاری ہے؟"

وہ ملکانی سائیں کے جواب کے انتظار میں لحہ بھر خاموش ہوئے مگر کوئی جواب نہ پا کر پھر سے بولے۔ سگار البتہ اُن کے لفظوں کی روانی کے باعث ابھی تک نظرانداز ہو رہا تھا۔

"صرف میری حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کے لیے تم نے ایک کل وقتی ملازم آج تک میرے تعاقب میں رکھا، صرف اس لیے کہ ہمارا رشتہ بے یقینی کا شکار تھا۔" ملکانی سائیں اس انکشاف پر بے اختیار چونکیں اور یہ حقیقت کھلنے پر کہ شاہ سائیں یہ سب جانے کب سے جانتے ہیں چور سی بن گئیں۔

"تمہیں خوف تھا کہ عمروں کے اس واضح فرق کے باعث ایسا نہ ہو کہ میں اپنی کسی ہم عمر کو اپنا لوں۔۔۔ اور اکثر اوقات میں جان بوجھ کر اسے تمہارے سامنے شکایتیں لگانے کا موقع بھی دے ڈالتا اور وہی بات پھر اخباروں تک کیسے پہنچتی، مجھے سب معلوم تھا۔"

مسکراتے ہوئے انہیں اب سگار کا خیال آیا تو اس کا کش لے کر گہری سنجیدگی سے بولے۔

"دیکھو، میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، ہمارے معاملے میں بات اور تھی اور اب جو کچھ تم کرنا چاہتی ہو اس میں رحمٰن شاہ ہماری بیٹی پر حاکم قرار پائے گا، جب تم عورت ہو کر مجھ پر شک کر سکتی ہو تو خود سوچا نا کہ رحمٰن شاہ کس طرح کا رویہ رکھے گا ہماری پھول سی مہربانو کے ساتھ۔"

شاہ سائیں کو لگا کہ شاید اُن کی باتوں نے ملکانی سائیں کے ذہن پر ٹیسو کے پھول کا سا رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے مگر اس کے باوجود ان کے چہرے کا

اضطراب شاہ سائیں کو چونکائے دے رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر ہمت نہیں کر پا رہیں، لفظوں کے جوڑ توڑ میں مصروف ملکانی سائیں کی طرف سے کچھ بھی کہنے کا تھوڑی دیر تو انہوں نے انتظار کیا پھر یہ خاموشی برداشت نہ ہو پائی تو یوں بول اٹھے۔

"کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں شاہ سائیں! مسئلہ تے کوئی نہیں او دراصل۔۔۔۔"

سگار کا کش گہرے سے گہرا ترین ہو گیا۔

"او دراصل بابا قربان شاہ نے رحمٰن شاہ کو زبان دے دی ہے، ہاں کر دی ہے انہوں نے ایس رشتے تے۔"

ملکانی سائیں نے تھوک نگلنا چاہا مگر خشک پڑتے حلق میں جیسے سارے غدود خاردار جھاڑیوں کی طرح یک لخت تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکائے ملکانی سائیں خود میں اتنی ہمت موجود نہیں پا رہی تھیں کہ شاہ سائیں کا سامنا کر سکتیں، جن کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ سگار کے دھویں میں بڑا کمزور اور نحیف سا تاثر دے رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم ہو ممکن ہو سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر نہ اک مہر نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن میرے دل! یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے۔

شاہ زین جس طرح خلوص اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا، ایسے میں کام کا روز بروز بڑھنا کوئی اچنبھے کی بات ہرگز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ذاتی طور پر وہ تمام ورکرز کے کام کو جس طرح سپروائز کرتا وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اُن پر تعینات یہ ہیڈ واقعی کام کروانا چاہتا ہے۔

یوں بھی کہیں بھی نظر دوڑائی جائے تو مزدور یا ورکرز یا کارکنان ہمیشہ جان توڑ اور خلوص دل سے محنت کرتے ہیں مگر بدنصیبی سے اگر اوپری سطح پر موجود لوگ ہی بے دیانت ہو جائیں تو اُن کا کیا گیا تمام کام رائیگاں جاتا ہے۔

اور شاہ زین کے معاملے میں تو دوہرا اصول کارفرما تھا کہ وہ محنتی اور ایمان دار بھی تھا اور پھر اسے پرانی یادوں کو بھلانے کے لیے بھی آخر کچھ درکار تھا۔ جبھی اپنے کام کرنے کے اوقات میں مکمل دل جمعی سے یوں مصروف رہتا کہ غالب گمان گزرتا کہ وہ یہاں ایک تنخواہ دار طبقے سے تعلق رکھنے کے بجائے مالک ہے اور یہی وجہ تھی کہ اب شاہ زین Casual Wear کے ساتھ ساتھ فارمل ڈریسز کے نصف شعبے کو بھی ہیڈ کر رہا تھا اور یہ اضافی ذمہ داری شاہ سائیں نے اس سے پہلی ملاقات اور اس کے متعلق رپورٹ پڑھنے کے بعد لگا کر تنخواہ میں بھی اضافہ کیا تھا۔

اس روز ابھی وہ پیکنگ ڈیپارٹمنٹ کا وزٹ کر کے لوٹا ہی تھا کہ انٹرکام کے ذریعے اسے اطلاع ملی کہ شاہ سائیں فیکٹری کا سرپرائز وزٹ کر رہے ہیں اور اُن ڈیپارٹمنٹس کی طرف آنے والے ہیں جن کی ذمہ داری شاہ زین کو سونپی گئی ہے۔ اطلاع ملتے ہی شاہ زین نے ایک نظر سامنے ترتیب وار رکھی فائلوں کو اور پھر انٹرکام کو دیکھا جس کے ہی ذریعے اسے یہ اطلاع خیر خواہی کے طور پر پہنچائی گئی تھی تاکہ وہ "چوکنا" رہے۔ مگر اس کے ذمہ لگائے گئے تمام کام بڑی خوش اسلوبی سے چل رہے تھے اس لیے بے فکر ہو کر معمول کے مطابق کاموں میں مصروف ہو گیا اور

بجائے اس کے کہ تسلسل رہتا سامنے رکھے میگزین میں موجود سیاہ رنگ کے دلکش اور دیدہ زیب ڈریس کو دیکھ کر ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے ندی کا سراپا گھوم گیا۔

یوں بھی عشق حقیقی ہو یا مجاز، اس کی حدود ہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں پر خود اپنی ذات پر سے اختیار کی حد ختم ہو جائے۔

اور ندی کے لیے شاہ زین کی محبت یقینی طور پر عشق کے درجے پر پہنچ چکی تھی جبھی تو چاہنے نہ چاہنے کے باوجود اور اکثر اوقات لاشعوری طور پر بھی اسے سوچا کرتا۔ شاید وہ چند لمحے اور اسی لباس کے ساتھ ندی کے تصور میں گم رہتا کہ ہلکی سی دستک کے ساتھ ہی کھل جانے والے دروازے کی آواز پر چونک گیا۔ سامنے شاہ سائیں موجود تھے، ہمیشہ کی طرح اکیلے، اُن کا ماننا تھا کہ چونکہ ہر بندے کی اپنی عزت نفس ہوتی ہے اس لیے اگر وہ کسی کو فرائض سے کوتاہی پر سرزنش بھی کرنا چاہتے تو کوشش کرتے کہ اکیلے میں کی جائے تاکہ سامنے والے کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور یہی وہ بنیادی وجہ تھی جس کے باعث وہ ہمیشہ سرپرائز وزٹ عہدیداران کے بغیر ہی کیا کرتے۔

شاہ زین انہیں دیکھتے ہی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ کیا گیا اور شاہ سائیں کے اشارے پر دونوں براجمان ہوئے۔ تنقیدی نظروں سے انہوں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر "ہوں" کرتے ہوئے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ شاہ زین کو آج شاہ سائیں کا سرپرائز وزٹ جانے کیوں خانہ پری لگ رہا تھا ورنہ اس سے پہلے تو وہ آ کر فائلز چیک کرتے، ڈیلی بیسز پر لکھی گئی رپورٹس دیکھتے، مختلف ورکرز کے بارے میں پوچھتے، مشینوں پر ڈسکشن ہوتی وغیرہ۔۔۔ مگر آج تو وہ بہت خاموش خاموش اور سرسری سا انداز اپنائے ہوئے تھے۔

"شاہ زین۔۔۔!"

"یس سر۔۔۔!"

اسے یوں لگا تھا جیسے شاہ سائیں نے اسے پکارا نہ ہو بس خود کلامی کی ہو، مگر ظاہر ہے کہ اسے تو جواب دینا ہی تھا اور اس کے جواب دینے پر ہی شاید شاہ سائیں کو لگا کہ جیسے وہ بے دھیانی میں اسے پکار بیٹھے ہیں۔

عجیب ادھورا اور غیر ضروری سا سوال کیا تھا انہوں نے جس کا جواب شاہ زین نے یوں دل چسپی سے دیا گویا وہ اسٹاک ایکسچینج کے شیئرز کی بات ہو۔

"جی سر بالکل، تمام لوگ بہت محنت اور خلوص کے ساتھ کام کرتے ہیں اور تقریباً سبھی ورکرز گھنٹوں کا کام منٹوں میں کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔"

"ہوں۔۔۔ ویٹس گڈ، تم خود بھی تو بہت محنتی ہو۔"

"شکریہ سر! مگر میں اکیلا بھلا کیا کر سکتا تھا اگر باقی سب میرا ساتھ نہ دیتے تو۔"

"کیوں؟ اکیلا انسان کچھ نہیں کر سکتا کیا؟"

"سر! علامہ اقبال بھی تو یہی کہہ گئے ہیں ناکہ
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
جب تک دوسرے ساتھ نہ دیں اکیلا چنا تو سر! بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا نا۔"

"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن مثبت انداز میں، اگر یہی بات دوسرے زاویے سے دیکھی جائے ملکی سطح پر یا گھریلو سطح پر، تو ایک منفی ذہن کا مالک انسان ہی سارا گھر وندہ گرانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔"

"یس سر! بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔" شاہ زین نے بھی تائید کی تھی۔

"ملکی اور گھریلو سطح پر بھی تباہی کے لیے ایک ہی شخص بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"تمہارا تجربہ ہے یہ سب یا پھر مشاہدہ؟"

اُن کے اس ذاتی سوال پر اس کے لبوں پر وہی دھیمی سی مسکراہٹ ابھری جو اس کا خاصہ تھی۔ شاہ سائیں آج کی ملاقات میں اسے نہایت ان فارمل لگ رہے تھے مگر شاہ زین بھلا کب کسی پہ کھلتا تھا سو بات کا زاویہ بدلنے کی کوشش کی۔

”سر! یہ سب تو ہماری دنیا میں بہت کامن ہے اور ہر بندہ ہی اس کا شکار بھی۔“

”ہوں۔۔۔“ شاہ سائیں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”تمہاری ڈگری تو ادھوری رہ گئی تھی نا شاید۔۔۔“ اٹھنے کا ارادہ کرتے کرتے وہ ایک بار پھر بیٹھ گئے تھے۔

”یس سر۔۔۔!“

”لیکن کیوں؟“

شاہ سائیں کے سوال پر شاہ زین کے لیے یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل ہو گیا تھا کہ آیا وہ تمام معاملے سے باخبر ہیں یا نہیں۔

”کیا فیس وغیرہ کے اخراجات کا مسئلہ تھا؟“

اُن کے سوال سے شاہ زین کو لگا جیسے وہ واقعی سارے قصے سے لاعلم ہیں۔

”نہیں سر! اخراجات کا تو ایسا مسئلہ نہیں تھا، بس ذرا یونیورسٹی میں ڈسپلن کا کچھ ایشو ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ذرا پرابلم ہوئی۔“

”دنیا میں تعلیم سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں ہے، کوشش کرو کہ اپنی ڈگری کو حاصل کر لو، اس سے تمہارا سیلری اسکیل بھی امپروو ہو سکتا ہے۔“

”یس سر۔۔۔!“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ پہلے اس جنون میں پڑھ رہے تھے کہ اچھی نوکری ملے گی اور اب چونکہ نوکری تو آل ریڈی مل چکی ہے اس لیے بس avoid کر دیا۔“

وہ مسکرائے، شاہ زین بھی ان کے سامنے ظاہری طور پر تو فارمل تھا مگر ذہنی طور پر اب بے حد ریلیکس اور دوستانہ انداز میں بڑی سہولت سے جواب دیے جا رہا تھا۔

”نہیں سر! ایسا تو ہرگز نہیں تھا، میری والدہ کی زندگی کی یہ بہت بڑی خواہش ہے کہ میں اعلا تعلیم حاصل کرتا۔“

”اولاد کا تعلیم یافتہ ہونا بھی تو نصیبوں کی بات ہے۔“

”جی سر۔۔۔! ورنہ وہ بھی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس دولت و آسائشوں کی فراوانی کے باوجود تعلیم نہیں ہوتی۔ بچوں کو اعلا تعلیم یافتہ دیکھنا ان کی خواہش سے حسرت میں بدل جاتا ہے، ہوتا ہے نا ایسا؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”اسی لیے تو کہا جاتا ہے نا کہ علم نصیب سے ملتا ہے روپے پیسوں اور اثر و رسوخ سے نہیں۔“

”ہاں سچ کہہ رہے ہو بلکہ بالکل سچ۔“

اس کی بات پر شاہ سائیں کے چہرے پر سے جیسے کوئی تاریک سایہ لرزتے ہوئے گزرا۔ مہربانو اور میران کو اعلا تعلیم دلوانا ان کی بہت بڑی خواہش تھی اور اسی لیے تمام لوگوں کی مخالفت مول لینے کے باوجود انہوں نے مہربانو کو پڑھنے کے لیے گھر سے اتنی دور بھیجا مگر اب پھر لگتا تھا کہ ان کی خوشیوں کا قتل ہونے جا رہا ہے۔ میران سے یوں بھی انہیں کوئی توقع نہیں تھی کہ وہ دوبارہ یونیورسٹی جاتا اور مہربانو کو ایک دفعہ کھلے آسمان میں پرواز کروانے کے بعد پھر سے پنجرے میں قید کرنے کا جو اندیشہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کی وجہ سے شاہ سائیں انتہائی متفکر تھے، جب ہی تو بس یونہی شاہ زین سے اتنی زیادہ باتیں کیے گئے اور وہ بھی یوں جیسے پہلے سے دونوں میں گپ شپ رہتی ہو۔ روشن روشن سرمئی آنکھوں والے شاہ زین سے بات چیت کے دوران انہیں لحہ بھر کے لیے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ وہ اس سے اسی انداز میں بات کر رہے تھے جیسے حویلی میں بیٹھے میران سے کر رہے ہوں۔

لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جس طرح شاہ زین نے ان کی بات کے رخ کو سمجھتے ہوئے جواب دیے تھے، میران کے جوابات ان سے قدرے مختلف ہوتے، اپنے ننھیال والوں کی طرح اس کے دماغ میں ”اعلا“ ہونے کا جو کیڑا ابل رہا تھا اس کے باعث ہی وہ کبھی بھی تعلیم کو اپنی اوائل ترجیحات میں نہیں رکھ پایا تھا اور اس کی اسی عادت پر شاہ سائیں کو اختلاف ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے ڈگری کے بغیر بھی معاشرے میں ایک اعلا مقام حاصل ہے۔ شاہ سائیں سے نسبت کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آتے جاتے لوگ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں اور بھلا اسے کیا چاہیے تھا۔ الیکشن میں بھی کھڑا ہوتا تو آبائی حلقے سے جیت جانے میں کوئی شک نہیں تھا اور بس اسی لیے وہ مطمئن تھا۔ راہ چلتے کسی بھی شخص کی بے عزتی کر دینا، خلاف پسند کسی بات پر طوفان کھڑا کر دینا، یاروں، دوستوں کا خوشامد کی لیس میں تھڑا ہجوم اپنے ساتھ رکھنا، یہی اس کی زندگی تھی اور اسی میں وہ بے حد خوش بھی تھا۔

”بہت اچھا لگا آج تم سے تھوڑی دیر بات کر کے۔“

”اٹس مائی پلیژر سر!“

بازوؤں پر زور ڈال کر کرسی سے اٹھتے ہوئے شاہ سائیں نے کہا تو شاہ زین اُن کے کمنٹ پر مسکرا دیا۔

”ہوپ ٹو سی یو سون اگین۔“

”ہوپ فلی۔۔۔“

الوداعی مصافحے کے بعد وہ رخصت ہوئے تو اب شاید سوچنے کی باری شاہ زین کی تھی۔ آج کا سرپرائز وزٹ اسے واقعی سرپرائز ہی تو دے کر گیا تھا۔ اُن کا ایک سخت گیر قسم کا جو تاثر سارے لوگوں کی طرح شاہ زین کے بھی ذہن میں قائم تھا آج تو وہ اس تمام تاثر کی نفی کر گئے تھے۔

اُن کی بول چال، مسکرا کر دیکھنے کا انداز اور کسی لمحے تفکر آمیز لہجہ۔۔۔

یہ سب کیا تھا؟ اس طرح تو بندہ صرف اپنوں کے سامنے ہی ظاہر ہوتا ہے دوسروں کے سامنے کوئی اپنے دکھ درد بھلا کہاں شیئر کرتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے آگے جس کی حیثیت ان کے نزدیک ایک تنخواہ دار ملازم سے زیادہ ہرگز نہ ہو، کوئی بھلا کیوں اپنا دل کھولے گا۔ وہ اپنی اولاد کی وجہ سے پریشان ہیں یہ تو شاہ زین نے اندازہ لگا لیا تھا مگر کیوں پریشان ہیں؟ اتنا مال و دولت اور معاشرے میں ایک نمایاں مقام رکھنے والے انسان کا لہجہ بات کرتے کرتے ڈھے کیوں جاتا تھا؟ اور کیا وہ کسی بھی طریقے اُن کے کام آسکتا تھا؟ یہ سب باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ ان کے آتے وقت مصافحہ کرنے کے انداز میں اور الوداعی مصافحہ کرنے میں بہت فرق تھا۔

یوں بھی اگر غور کیا جائے تو ہم کسی کے ملنے کے انداز سے ہی اس کے دل میں اپنی حیثیت کو بخوبی جانچ سکتے ہیں اور جاتے ہوئے جس طرح گرم جوشی سے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا وہ انداز اب تک شاہ زین کے دل میں ان کی محبت کو بڑھائے دے رہا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد سے اب تک اس کا دل یوں کبھی کسی کے لیے نہیں ہمکا تھا۔ مگر آج تو دل چاہ رہا تھا کہ جب انہوں نے ہاتھ ملایا تھا کاش ایک دفعہ گلے بھی لگا لیتے۔ مگر اپنی اس خواہش پر وہ گردن جھٹک کر خود ہی زیرِ لب مسکرا دیا۔

یہ دل بھی بعض اوقات کیسی کیسی خواہشات کرنے لگتا ہے، مٹھی میں پانی کو بند کر لینے کی خواہش اور جستجو میں چاہے انگلیوں کی پوریں اور ہتھیلی نرم ہو کر جھریوں میں بدل جائیں، جب تک دماغ کی طرف سے ڈانٹ ڈپٹ نہ ہو، منہ زور گھوڑے کی طرح رسی تڑائے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے بس سرپٹ بھاگتا ہی چلا جاتا ہے اسی لیے کامیاب کہلائے جاتے ہیں وہ لوگ جو ہمیشہ اپنے دل کی فیصلوں پر عقل کو حاکم قرار دے دیں۔

☆☆☆

کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیسا اختلاط
ہم کو نہ چھیڑو تم کہ اب وہ ہم نہیں رہے

ندی کی امی سے بات کرنے سے لے کر اب تک اکمل کا وقت گویا کانٹوں پر گزر رہا تھا۔ ندی اب تک واپس گھر پہنچ چکی ہے کہ نہیں؟ اس کی شاہ زین سے یا اُس کے گھر والوں سے ملاقات ہوئی کہ نہیں؟ اگر ملاقات ہو گئی ہے تو پھر نتیجہ کیا رہا؟ یہ تمام سوالات

اسے کسی طور چین لینے نہیں دے رہے تھے۔ وجہ اس کے اور ندی کے درمیان تعلق تھا جو بچپن سے چلا آرہا تھا اور جس کے باعث وہ ذہنی طور پر اتنے نزدیک تھے کہ جب درمیان میں کچھ عرصے کے وقفے کے بعد ملاقات ہوئی تب بھی ایسا ہی لگا گویا بیچ میں وہ عرصہ آیا ہی نہ ہو ندی اسی طرح شوخ وشنگ تھی اور اکمل اسی طرح زندہ دل۔۔۔

فرق تھا تو بس اتنا کہ اکمل باقی گھر والوں کے سامنے ذرا محتاط رویہ اپنانا چاہتا تھا مگر اس کے ارادے کو ندی کے برجستہ جملوں نے بھلا کہاں پورا ہونے دیا تھا، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس وقت اکمل کا دل سچا دوست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بے حد پریشان تھا اور یہی وجہ تھی کہ آج وہ خلاف توقع جاگنگ کرنے کے بجائے جاگنگ ٹریک کے اطراف میں بنی ایک سنگی بینچ پر بیٹھا تھا۔

کبھی دل چاہتا کہ فون کر کے ندی کے بخیریت واپس آنے کی یقین دہانی کی جائے، مگر وہ یوں بار بار فون کر کے امی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ بھی ایسی صورت میں کہ اگر وہ اب تک گھر نہ پہنچی ہو، عجیب کشمکش تھی۔

دانت بھینچتے ہوئے اس نے پوری قوت سے دائیں ہاتھ کا مُکا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال دامن گیر تھا کہ ندی کی وجہ سے وہ اس قدر پریشان ہے تو ان حالات میں خود ندی اور اس کی امی کی ذہنی حالت کس قدر مخدوش ہوگی۔

آتے جاتے لوگوں سے بے نیاز شاید وہ دیر تک ندی ہی کے بارے میں سوچتے ہوئے کسی بھی ممکنہ حل تک پہنچنے کی کوشش کرتا کہ جیب میں رکھے موبائل کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ سامنے ایک اجنبی نمبر موجود تھا۔ چند لمحے رک کر اکمل نے نمبر کو ذہن میں دوہرایا۔ مگر پھر بھی خیال میں کوئی شناسائی نہ ابھری اور بیلز مسلسل بجتی رہیں تو اکمل نے فون ریسیو کرنے کا فیصلہ کیا مگر دوسری طرف مکمل طور پر نامانوس آواز نے اسے حیرت سے دوچار کر دیا اور حیران ہونے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آواز نسوانی تھی اور اس سے واقف بھی۔

"معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"ہاں، وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن کیا تم اکمل ہی بات کررہے ہونا؟"

اکمل کے الجھن بھرے لہجے میں کیے گئے سوال کے جواب میں آگے سے انتہائی مطمئن انداز میں جواب آیا تھا۔

"جی ہاں محترمہ! میں اکمل ہی ہوں اور آپ کا تعارف؟"

ایک تو وہ پہلے ہی پریشان تھا اوپر سے یہ "آ بیل مجھے مار" "بوجھ پہیلی" جیسی فون کال اسے زچ کیے دے رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ اکتا کر فون بند کرتا، سماعتوں سے ٹکرائی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"اچھا اچھا، وہ دراصل ابھی تھوڑی دیر پہلے شاید تمہاری بہن آئی تھی نا ثمینہ سے ملنے۔۔۔"

"میری بہن؟ کب آئی تھیں؟ اور آپ کو یہ یقین بھلا کیسے کہ وہ میری بہن تھیں؟" عجیب کسوٹی نما فون کال تھی جو لمحہ بھر میں اکمل کے ذہن کو کئی سمتوں میں بیک وقت سوچنے پر مجبور کررہی تھی۔

"ارے ابھی آئی تھی تھوڑی دیر پہلے کالی شیشوں والی چادر میں نقاب کیے۔" اپنی بات سچ ہونے کا یقین دلاتے ہوئے حلیہ تک بیان کر دیا گیا۔ مگر یہ بات اکمل کے لیے انتہائی حیرت کا باعث تھی کہ عائشہ آپی اور وہ بھی چادر اور نہ صرف چادر بلکہ نقاب کر کے کسی ثمینہ سے ملنے گئیں اور یہ ثمینہ کون ہے؟ جس سے وہ یوں مشکوک انداز میں ملنے گئیں اور پھر اٹھارہ کروڑ عوام میں سے آخر یہ خاتون صرف اسے ہی کیوں اُس لڑکی کا بھائی بنانے پر تلی ہیں؟ جب یہ بھی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہونے لگیں تو اس نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"دیکھیں محترمہ! آپ جو کوئی بھی ہیں، صاف بات کریں یوں پہیلیاں نہ بجھوائیں؟" بات ختم کرتے ہی اس کے ذہن میں چھناکا سا ہوا، ہوسکتا ہے یہ ندی کی بات کررہی ہوں اور پھر تو اس نے مکمل توجہ فون سے آنے والی آواز کی طرف مبذول کر دی۔

"بھئی نام تو میں نے اس کا نہیں پوچھا مگر وہ ثمینہ سے ملنے آئی تھی اور جاتے ہوئے اس کا چھوٹا پرس (والٹ) یہیں گر گیا۔ بس اسی میں سے تمہارا نمبر دیکھا تھا ہم نے اور ساتھ ہی نام بھی۔"

"ثمینہ کون؟ وہ شاہ زین کی بہن نا؟"

اکمل نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو عین نشانے پر لگا۔

"ہاں، ہاں بیٹا! وہی، مگر وہ تو گھر چھوڑ گئے ہیں نا، اس لیے وہ جو چھوٹا پرس گرا تھا نا تمہاری بہن کا، وہ میں نے اپنے بیٹے کے ہاتھ تمہارے گھر بھیج دیا ہے۔" اکمل کی سماعتوں پر انہوں نے ایک ساتھ دو بم پھوڑے تھے۔ یعنی ندی کی شاہ زین یا اس کے کسی بھی فیملی ممبر سے ملاقات نہیں ہو پائی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ ان خاتون کا بیٹا ندی کا والٹ لے کر اُن کے گھر پہنچنے ہی والا ہے، اور اگر یہ والٹ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو۔۔۔ یقیناً اس کا گھر سے باہر نکلنا مخفی نہ رہ پاتا۔ انتہائی اضطراب کے عالم میں اکمل نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور موبائل کو دائیں کان سے پر منتقل کیا یہ بات سمجھ سے باہر تھی کہ وہ ان سے شاہ زین کی فیملی کے بارے میں کچھ بات کرے یا پھر ان کے بیٹے کے بارے میں، جو کہ مستقبل قریب میں ندی کے گھر بس پہنچنے ہی والا تھا۔

"آپ کا بیٹا کس ایڈریس پر گیا ہے؟"

"ارے بیٹا وہی۔۔۔"

انہوں نے ایڈریس دوہرایا۔

"اُسی پرس میں لکھا ملا تھا ہمیں یہ ایڈریس، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میرا بیٹا گھر پر تھا تو اسی وقت موٹر سائیکل پر بھیجا، مگر بیٹا اپنے روپے گن لینا، ہم تو ایک آنے کے بھی روادار نہیں ہیں، اللہ نصیب ہی نہ کرے کسی اور کے روپے پیسے۔۔۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے جارہی تھیں۔

"لیکن دیکھیں، وہ دراصل۔۔۔ آپ مہربانی کر کے اپنے بیٹے کو واپس بلالیں کیونکہ وہ ایڈریس ٹھیک نہیں ہے۔"

اُس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"ٹھیک نہیں ہے تو کیا مطلب؟ اب وہ بے چارا سارا شہر گھومے گا اُس پرس کو لے کر، حالات کا معلوم ہے نا کتنے خراب ہیں۔"

اُن کے لہجے سے ناگواری جھلکی۔

"میرا مطلب ہے آپ بس کسی طریقے سے اسے گھر بلالیں، پرس میں خود ایک دو روز میں آکر آپ سے لے لوں گا۔"

اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طریقے، التجا کر کے ہی سہی اُن کے بیٹے کو واپس موڑ دے اور وہ ندی کے گھر یا گھر والوں تک نہ پہنچ پائے۔

"لیکن اب تو شاید وہ پہنچ بھی گیا ہوگا اور جب اُسے پتا چلے گا کہ پتا غلط ہے تو پھر واپس بھی آجائے گا۔"

لاپروائی سے جواب آیا تو اکمل سلگ کر رہ گیا، اب وہ انہیں کس طرح سمجھاتا کہ اس پرس کے وہاں پہنچنے پر کیسا ہنگامہ کھڑا ہوسکتا ہے۔ اس لیے مجبور ہو کر ضدی بچوں کی طرح ایک مرتبہ پھر اپنی بات دوہرائی۔

"آپ کی بات تو بالکل ٹھیک ہے مگر خوامخواہ اسے جانے کی زحمت ہی ہوگی نا، تو میرا مطلب تھا کہ بے چارہ اتنی دور جائے گا پھر آئے گا، تو بہتر ہے کہ اسے ابھی فون کر کے رستے ہی سے واپس بلالیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں بیٹا! کسی کے کام آنا ہی زندگی ہے اور میں اُسے فون کر بھی دیتی مگر وہ غصے کا بڑا تیز ہے اس لیے میں ذرا احتیاط ہی کرتی ہوں۔"

انہوں نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

یوں بھی یہ بات حقیقت ہے کہ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ایک فرد ضرور ٹیڑھے مزاج کا ہوتا ہے جو باقی سب کو "نتھ" ڈال کر رکھتا ہے۔

"اچھا بیٹا! اگر وہ پرس واپس لے آیا نا تو میں امانت کے طور پر سنبھال کے رکھ دوں گی، تم کوشش کرنا

کہ ذرا جلدی آ کے لے جاؤ، پتا ہے نا امانت کا بڑا بوجھ ہوتا ہے دماغ پر۔"

"جی جی بالکل۔"

تھکے تھکے لہجے میں اُس نے انہیں اللہ حافظ کہا کیونکہ جانتا تھا کہ اب وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔

پہلے ندی گھر پہنچے گی یا اس کا والٹ؟ یہ بات اپنی جگہ خود ایک پہیلی تھی۔ عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ ندی سے بات بھی کرنا چاہتا تھا مگر کچھ دیر بعد، تاکہ وہ گھر میں آجائے اور اس سے سکون کے ساتھ ساری بات ہو۔ سست قدموں سے چلتا اب وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا، مگر ذہن اور دل ندی کا تصور ذہن میں لیے بڑے زور و شور کے ساتھ اس دعا میں مصروف تھے۔

میرے مالک! کرم کردے
رحم کردے
اس کی آنکھ میں آئے اگر آنسو
تھکاوٹ، کرب، کلفت یا پریشانی
کبھی احساسِ تنہائی
کوئی آفت، کوئی وحشت
وقوع ہونے کو ہو کچھ بھی برا
افتاد کی صورت
اسے تو روک دے مولا
تیری رحمت وسیع ہے
خلق سے تیرے پیار کی مانند
دعا میں مانگتی ہوں تو اسے مقبول کرلینا
اگر ہونے کو ہو ایسا
اسے جو مضطرب و مضمحل کردے
تو اپنے رحم کے صدقے
اسے تو روک دے مالک!
کبھی واپس نہ آنے کو۔

☆☆☆

"میری! تم کسی اور روز چرچ نہیں جا سکتیں کیا؟" کنول نے آج صبح آتے ہوئے کینٹین والے چاچا سے مینو کا کیا پوچھ لیا تھا اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ جلد از جلد وقت کی ڈوری لپیٹ کر واپس ہاسٹل جا پہنچے اور گرما گرم پائے کا سالن، سلاد اور نرم نرم سے نان کے ساتھ مزے لے کر کھائے۔

جب تک وہ آج دوپہر کے مینو سے بے خبر تھی بڑی پُرسکون تھی۔ تینوں کے باہم مشورے سے ہی پروگرام یہ طے پایا تھا کہ صبح کالج سے جلدی آف کرنے کے بعد وہ تینوں مل کر چرچ جائیں گی اور واپسی میں سپر اسٹور سے کچھ شاپنگ کرکے رات آٹھ بجے تک وہ لوگ دوبارہ ہاسٹل جا پہنچیں گی اور جب ہی نو بجے مہربانو نے ملکانی سائیں سے بات بھی کرنا تھی۔ لیکن اب تو ظاہر ہے معاملہ "پائے کے سالن" کا تھا اور وہ بھی کنول کے لیے، جو ان سب کے بلاک میں سب سے چٹوری تھی۔ اسی لیے اب اپنا دوپہر کا کھانا "قضا" ہو جانے کے خیال سے کچھ جز بز دکھائی دے رہی تھی۔

"تو باہر کھالیں گے نا یہی کھانا، اس میں اتنا مسئلہ کیا ہے؟"

میری اس کے بہانوں کی وجہ سے باخبر تھی جب ہی بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں کھانے کے لیے کہہ رہی ہوں؟"

"نہیں نہیں، مجھے پتا ہے تم تو ویسے ہی ہاسٹل کو مس کررہی ہو، ہے نا؟"

"اچھا زیادہ اوور اسمارٹ نہ بنو۔"

کنول اس کا مذاق سمجھ گئی تھی جب ہی چار و ناچار کتابیں اور نوٹس سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہربانو نے بھی پہلے سے سر پر موجود چادر کو ایک مرتبہ پھر سلیقے سے اوڑھا، شولڈر بیگ میں اپنی چیزیں ڈالیں اور تینوں ایک ساتھ کالج کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھنے لگیں۔

"ویسے میں ایک بات سوچ رہی ہوں مہربانو!" برآمدے سے گزرتے ہوئے لائبریری کے اندر موجود بیٹھے اسٹوڈنٹس کو کھلے دروازے سے ایک نظر

دیکھتے ہوئے کنول پرسوچ انداز میں بولی تو اس کی سنجیدگی پر میری بھی آتی جاتی مستقبل کی ڈاکٹرز کے نت نئے ماڈلز نما ڈریسز کو دیکھنا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

مہربانو نے بھی کنول کی طرف رخ موڑا۔

"ہاں بولو کنول کیا بات ہے؟"

"پتا نہیں تم لوگوں کا اس بات کو سننے کے بعد کیا ردِ عمل ہو، اچھی لگے یا بری اور اللہ جانے تم لوگ میری بات سے ایگری کرتی بھی ہو کہ نہیں۔"

چلنے کے دوران اپنے ہی جوتوں پر نظر جمائے کنول کا اس قدر سنجیدہ لہجہ مہربانو کے ساتھ ساتھ میری کو بھی تشویش میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔

"تم کہہ کر تو دیکھو، باقی باتیں تو بعد کی ہیں نا۔" میری بولی۔

"اور ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا کہ ہم تینوں کو ایک دوسرے سے کوئی بات کرنے کے لیے اس قدر تمہید باندھنی پڑے، اتنی سوچ بچار کرنی پڑے تو پھر آج ایسا کیوں؟" مہربانو نے بھی اسے اپنائیت کا احساس دلایا تو وہ ہاتھ سے چہرے پر آئے بال ہٹاتے ہوئے دونوں کو دیکھنے لگی۔

"کیا گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟"

"ارے نہیں، ایسا تو کچھ نہیں ہے، اچھا تم دونوں وعدہ کرو کہ میری بات کا برا نہیں مناؤ گی۔"

"اچھا بابا، وعدہ تو ہے مگر کچھ بتاؤ گی بھی کہ براہِ راست بچے کی جان لو گی؟" میری سے اب یہ سسپنس برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

"وہ مہربانو.....! دراصل میں سوچ رہی تھی کہ ظاہر ہے ہم تو اب سات آٹھ بجے سے پہلے ہاسٹل نہیں جاسکتے تو کیوں نا انوشے کو فون کردیں۔"

"اوہو، لیکن اسے فون کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟"

"وہ دراصل وہ چاچا سے ہم تینوں کا سالن لے کر فریج میں رکھ دے گی نا تو ہم شام کو اوون میں گرم کرلیں گے۔"

کمال معصومیت سے کنول نے پورا "منصوبہ" ان کے گوش گزار کیا تو اس کی پشت پر پڑنے والی پہلی کتاب میری ہی کی تھی۔ مہربانو البتہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔ وہ پائے کی اتنی بڑی "فین" تھی یہ بھلا کسی کو اندازہ ہی کب تھا۔

"اگر ان گائے بکروں کو پتا چل جائے کہ تم ان کے پائے کی کس قدر شیدائی ہو تو یقیناً ہر ذبح خانے میں تمہاری تصویر فریم کروا کر لگواتا ان کی پہلی اور آخری خواہش ہو۔" میری کی بات پر کنول کھسیا گئی مگر اپنی بات پر ابھی تک قائم تھی۔

"کیا ہوا تیرا وعدہ..... وہ قسم وہ ارادہ؟" مصنوعی آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتے ہوئے اس نے ان دونوں کو وعدہ یاد دلایا تو مہربانو اپنے بیگ سے موبائل نکالنے لگی۔

"بس بس تم یہ گانا تو رہنے ہی دو، یہ تو ہمارے ہر سیاست دان کے فون کی رنگ ٹون ہونا چاہیے۔"

میری کی بات پر وہ تینوں مسکرانے لگی تھیں۔

مہربانو نے بیگ سے فون نکالا اور اس سے پہلے کہ انوشے کا نمبر ڈائل ہوتا، اس کی چارجنگ نہ ہونے کے باعث فون بند پایا گیا سو دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔

"میری تم کردو اسے فون، بس ہمارے "پائے" کسی طریقے ہمارے ہی رہیں۔" اور کنول کی جب جان میں جان آئی جب انوشے نے بڑی خوش دلی سے یہ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ہامی بھرلی اور جب ہی وہ تینوں بس اسٹاپ پر بھی پہنچ چکی تھیں۔ بس میں بیٹھ کر کہیں بھی جانے کا مہربانو کا یہ بالکل پہلا تجربہ تھا۔ ورنہ آج سے پہلے تک وہ پارک، لائبریری یا سپر اسٹور وغیرہ کے علاوہ کہیں نہیں گئی تھی۔ شروع شروع میں تو جب اس نے کالج جوائن کیا تھا تو "فیس بک" کے اسٹیٹس کی طرح ہر وقت ملکانی سائیں کو اپ ٹو ڈیٹ رکھا کرتی۔ ابھی کالج گئی، ابھی ہاسٹل آگئی، ابھی لائبریری جارہی ہوں، ابھی کچھ لینے جارہی ہوں وغیرہ وغیرہ۔

مگر آہستہ آہستہ ملکانی سائیں بھی سمجھ گئی تھیں کہ

اس کی روزمرہ کی روٹین بس انہی چیزوں کے گرد گھومتی ہے جبھی ذرا سا خود بھی ریلیکس ہو گئیں اور اس کو بھی کر دیا، مگر اس نرمی کے باوجود وہ ہمیشہ بہت محتاط رہا کرتی، ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتی، کسی سے بھی زیادہ بات چیت کرنے سے کتراتی اور خصوصاً لڑکوں سے تو سلام دعا بھی ہو جاتی تو گھبرا کر یوں چاروں اطراف دیکھتی گویا اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو اور میران یہیں کہیں کسی درخت، پودے یا ستون کے پیچھے سے نکل کر ہاتھ میں ہتھکڑی لیے بس اس کی طرف بڑھنے ہی والا ہے۔

شروع ہی سے اس نے حویلی میں میران شاہ کو اس قدر dominent پایا تھا کہ وہ بے شک اس کے سامنے ظاہر نہ کرتی مگر دل ہی دل میں وہ ہمیشہ میران شاہ سے خوف زدہ ہی رہتی تھی۔ کبھی بھی کسی بھی بات پر اس کے دل میں شاہ سائیں اور ملکانی سائیں کا خیال تو بعد میں آتا سب سے پہلے میران کا تصور ذہن میں آن ابھرتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بھائی تو بہنوں کے لیے ماں باپ کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط ڈھال ہوتے ہیں۔ اس کے دماغ میں بھائی کا تصور بید کی چھڑی ہاتھ میں لیے غصیلی نظروں سے دیکھتے ایک شخص سے بڑھ کر بھی بنتا ہی نہیں تھا۔

اور یہی حال اب حویلی سے اس قدر فاصلے پر مقیم ہونے کے باوجود بھی تھا۔ اسے لگتا کہ میران کہیں کہیں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اور اگر دیکھا جائے تو صرف ایک مہربانو ہی کیا ہم میں سے کتنے ہی لوگ اکثر کوئی کام کرتے ہوئے پہلے یہ ضرور سوچتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اور اگر کام کچھ ایسا ہو جس سے خود ہمارے دل میں بھی کھٹکا پیدا ہو رہا ہو تو اول آنے والا خیال یہی ہوتا ہے کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

اس سب کے برعکس اگر ہم اپنی اس تمام سوچ کو اوپر والے کی طرف موڑ دیں اور کوئی بھی کام کرتے ہوئے یہ سوچ لیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو دنیا والوں کے اس دو دھاری تلوار جیسے پیمانے سے تو مشکل آپ گزرا جاسکتا ہے کیونکہ تلوار کتنی ہی تیز اور دو دھاری کیوں نہ ہو پانی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

خود مہربانو بھی حویلی کے اس ماحول سے فرار حاصل کرتے ہوئے رفتہ رفتہ خود کو اس پاک ذات کے قریب محسوس کرنے لگی تھی اور اب تک جو وہ سنتی آئی تھی کہ رب ہمارے دل میں رہتا ہے، ذہن اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچتا، اسے یوں لگتا جیسے اب تو اس کی شخصیت میں کوئی کمی باقی ہی نہیں رہی، اپنا آپ اسے مکمل سا لگنے لگا تھا اور یہی بات جب وہ ایک روز جائے نماز پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے بند آنکھوں سے دعا مانگ رہی تھی تو اس نے کنول سے بھی کہی تھی۔

”مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کنول! کہ رب تو میری آنکھوں میں رہتا ہے، بند کروں تو اس کا تصور اتنا قریب لگنے لگتا ہے کہ اپنے ہونے کا اپنی ذات کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور آنکھیں کھولوں تو ہر طرف بس وہ ہی وہ ان آنکھوں کے پردے پر نقش محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب جب میری خشک آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں وہ میرے قریب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ میری دل جوئی کرنے اور مجھے سہارا دینے کی خاطر۔“

اور تب اسے اپنے رب پر ٹوٹ کر پیار آتا۔

دنیا کے رشتے، ان کی بے اعتنائیاں اسے ہرگز برے نہ لگتے کہ یہ سب تو رب کی طرف سے عطا کردہ تھے اور بے شک وہ کسی کو بھی کچھ برا عطا نہیں کرتا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ رب نے دنیا میں آنے والے ہر انسان کو جو بھی کچھ دیا، بلاشبہ بہترین تھا مگر اس عطا کو ڈھانپنے والے اعمال کی چادر سب کی اپنی اپنی ہے اور اعمال کی اسی چادر کے باعث عطا مخفی اور اعمال ظاہر ہیں اور اسی کی مثال مہربانو اور میران شاہ بھی تھے اور اس کا ہر لمحہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا بھی اسی باعث تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذرا سی غلطی اس کے اعمال کی چادر پر دھبا بن کر ظاہر ہو۔

چلتی بس کے مناظر کے ساتھ ساتھ جانے کب تک اس کی سوچوں کا سلسلہ چلتا رہتا کہ اُن کا مطلوبہ اسٹاپ آنے پر بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور اُن سے پہلے چند دوسرے لوگ بس کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میری اور کنول نے بھی اپنے اپنے کانوں پر لگائے ہیڈ فون اتار کر پرس میں ڈالے اور باہر جاتے مسافروں کی قطار کا حصہ بن گئیں۔

دس پندرہ منٹ پیدل چلنے کے بعد اب وہ لوگ سرخ اینٹوں سے بنی ایک قدرے قدیم عمارت کے سامنے موجود تھیں۔ بیرونی گیٹ پر ہی قطار سے دائیں بائیں موجود درخت آنے والوں کے اذہان کو تروتازہ کرنے میں اپنا کردار بخوبی نباہ رہے تھے۔ نہ صرف باہر بلکہ اندر بھی مختلف قسم کے خوب صورت اور دلکش پھول پودوں کی موجودگی بڑا خوب صورت تاثر دے رہی تھی۔ باہر سے انتہائی وسیع نظر آنے والی چرچ کی یہ عمارت حقیقت میں اس سے کہیں کم تھی۔ وسیع دکھائی دینے کی وجہ ملحقہ مشنری اسکول تھا جو دو منزلہ اور انتہائی کشادہ رقبے کا حامل تھا اور جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کو پہلا تاثر یہی ملتا کہ شاید یہ عالی شان رقبہ چرچ کے زیرِ استعمال ہے۔

اپنی والدہ کی بات پوری کرنے اور انہیں مطمئن کرنے کی خاطر آج میری نے چرچ کا رخ کیا تھا۔

”تم جاؤ اندر جا کر اپنی پرے (Pray) وغیرہ کر آؤ ہم تھوڑی دیر یہاں گھومتے ہیں۔“ کنول چرچ کے اندر جانے سے کترا رہی تھی۔ جبھی میری کو اکیلے ہی اندر جانے کا بھی مشورہ دے ڈالا۔

اس کے برعکس مہربانو چرچ کو اندر سے بھی دیکھنے کی خواہش مند تھی اور خود میری بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ دونوں اس کے ساتھ اندر چلیں مگر کنول کے یوں ہچکچانے پر اسے حیرت ہوئی۔ ”گھومتے ہیں؟ کیا مطلب کیا تم یہاں گھومنے کے لیے آئی ہو؟“

”او ہو یار! پرے تو تمہیں کرنی ہے نا ہم تو بس ویسے ہی تمہارے ساتھ آئے ہیں۔“

”یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں نا کہ یہاں تک میرے ساتھ آ گئی ہو تو اندر بھی آ جاؤ مجھے اچھا لگے گا اگر تم لوگ بھی مجھے دیکھو تو۔“

”فضول میں بچوں کی طرح ضد نہ کرو یار! ہم نے پہلے بھی تمہیں اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔“

ہنوز اپنی بات پر اڑتے ہوئے کنول نے مسکراتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ مہربانو البتہ ان دونوں کی بات چیت خاموشی سے سنتے ہوئے اپنی رائے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ کنول کا خیال تھا کہ شاید اس کی بات پر میری بھی مسکرا دے گی مگر ہوا اس کے برعکس۔

”تم جس بات سے ڈر رہی ہو نا کنول! وہ خوف اپنے دل سے نکال دو، چرچ کے اندر چلے جانے سے تمہارا مذہب نہیں بدل جائے گا، کرسچن نہیں ہو جاؤ گی، رہو گی مسلم ہی۔“ طنزیہ انداز میں میری نے کہا تو کنول کا لہجہ بدلنے میں بھی دیر نہ لگی۔

”مذہب تو وہ لوگ بدلتے ہیں جن کا عقیدہ کمزور ہو، جو حق پر نہ ہوں، میں بھلا کیوں مذہب بدلوں گی، تم اپنی خیر مناؤ کہ گھر والوں نے زبردستی چرچ بھیجا ہے۔“ میری کے مسکراتے مگر طنزیہ جملوں کے جواب میں کنول کا لہجہ کاٹ دار ہو گیا تھا۔

”وہ تم پر زبردستی کر سکتے ہیں مگر معاف کرنا تم ہمیں زبردستی اندر نہیں لے جا سکتیں اور پہلے خود تو مکمل کرسچن بن جاؤ پھر ہمیں بنانے کا بھی سوچنا۔“

”کنول! تمہارا دماغ ٹھیک ہے یہ کس طرح کی فضول باتیں کر رہی ہو آج؟“

مہربانو کو خود بھی کنول کی باتیں انتہائی تحقیر آمیز اور بری لگی تھیں جبھی اسے درمیان میں بولنا ہی پڑا۔

میری کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے کنول سے ان باتوں اور اس لہجے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

”میری! میں تم سے کنول کی طرف سے معافی مانگتی ہوں دیکھو۔۔۔“

مہربانو نے میری کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچھ سمجھانا تو چاہا مگر وہ ہاتھ چھڑا کر اکیلی ہی چرچ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔

"کیوں کہا تم نے یہ سب کنول؟ ہم تینوں تو ایک دوسری کے بہت اچھی دوست تھیں نا، کیوں ہرٹ کیا تم نے اسے؟ اور وہ بھی اس معاملے میں؟" کنول خاموش رہی البتہ وہیں نیچے گھاس پر بیٹھتے ہوئے وہ دروازہ جہاں سے ابھی ابھی میری اندر گئی تھی اس کی نظروں کے حصار میں تھا۔

"تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی کہ وہ مکمل کرسچن ہے یا نہیں، کیا تم خود ایک مکمل انسان ہو؟" کنول کیا کہتی کیونکہ ظاہر ہے وہ جانتی تھی کہ جواب نفی میں ہے۔

"نہیں نا۔۔۔ تو پھر تمہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ کھڑے کھڑے کسی پر بھی کوئی بھی فتویٰ دے ڈالو۔ اگر تم مسلم ہو تو اس میں تمہارا کیا کارنامہ ہے اور اگر کوئی اور نہیں ہے تو اس میں اُن کا کیا قصور؟ یہ سب تو رب کا احسان ہے کہ اُس نے ایک مسلم گھرانے میں ہمیں پیدا کیا ورنہ ہم میں سے کتنے فیصد لوگ ہوتے جو اپنی فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ کی ایکٹیویٹیز چھوڑ کر ایک سچے دین کی تلاش کرنے اور پھر اُس دینِ حق کے ساتھ اپنے آباء و اجداد کے مذہب کو کمپیئر کرنے کے بعد تو مسلم قرار پاتے۔۔۔" مہربانو چند لمحے رکی۔

"تم ہوتیں تو کرتیں؟ ہرگز نہیں نا، تو پھر دوسروں پر تنقید کیوں یار؟ جبکہ ہم خود صحیح معنوں میں مسلمان ہونے کا حق ادا نہیں کرتے۔" اس بات پر کنول نے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

"دن کے بیس گھنٹے ٹیکنالوجی استعمال کرنے والی ہماری اپنی جنریشن میں سے تناسب نکالو تو کتنے لوگ ہوں گے جو سیرتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو دور کی بات ہے تمام امہات المومنین کے نام ہی ترتیب سے بتا دیں، تو جب ہم خود نقائص سے بھرپور ہیں تو دوسروں کی خامی کی نشان دہی کرنے سے پہلے اپنا تو نقص دور کریں نا۔"

"ہوں۔۔۔" کنول نے گھاس کے درمیان اگنے والے ننھے پودے کے ارد گرد گھاس اکٹھی کرتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔

"اگر ہم اندر چلے جاتے تو وہ خوش ہو جاتی اور بس، کیا بگڑتا تمہارا؟"

مہربانو کبھی بھی اُن پر اپنی کوئی بات مسلط نہیں کرتی تھی، تھوپتی نہیں تھی مگر آج اس سے میری کا چہرہ دیکھا نہیں گیا تھا سو جذباتی ہو گئی۔

"بس میرا دل نہیں مان رہا تھا یار۔۔۔!" دھیمی آواز میں وہ بولی تو مہربانو نے اسے بولنے کا موقع دیا۔

"کہ بے شک وہ اہلِ کتاب سہی مگر۔۔۔ عقائد میں موجود بنیادی فرق جو ہے نا، مجھے انہی بنیادوں نے جکڑ لیا تھا اُس وقت۔"

"پتا ہے کنول! ہم جس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی ہیں نا اُن کے حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کو دیکھ کر تو کافر بھی کلمہ پڑھ لیتے تھے، مسلمان ہو جایا کرتے تھے، مگر معاف کرنا مجھے افسوس ہے کہ تمہارے جیسے طرزِ عمل کے لوگ ہی لوگوں کو اسلام سے دور کر رہے ہیں، جو بندہ پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھنے لگے وہ خود کو دین کا عالم سمجھ کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر جس طرح دوسروں کو ٹوکنا شروع کرتا ہے اس سے صرف وہ اپنا ایک مکمل مسلمان ہونا ثابت کرتا ہے اور دوسروں کو خطاؤں سے بھرا۔"

"آئی ایم سوری یار۔۔۔! مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے، اندازہ ہی نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔"

"سوری مجھے نہیں میری کو کہنا، جسے تم نے ہرٹ کیا اور پھر اللہ سے بھی سوری کرنا۔" تائید میں سر ہلاتے ہوئے کنول نے مہربانو کے دائیں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی گرم جوشی سے دبایا۔

"اور سنو، ایسا کرنا ابھی جب شاپنگ پر جائیں گے تو میری کو کچھ گفٹ کر دینا، خوش ہو جائے گی۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کیونکہ میں خود بہت گلٹی فیل کر رہی ہوں۔"

یوں فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لینے پر مہربانو نے کنول

کو مسکرا کر دیکھا اور دونوں میری کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ یوں بھی غلطی کرنا برا نہیں، انسان روزِ اول سے غلطی کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہی رہیں گی لیکن غلطی کرنے کے بعد احساسِ ندامت کو دبا دینا اور خود اپنے ہی ضمیر کے سامنے بھی پشیمان نہ ہونا حقیقت میں بُرا فعل بھی ہے اور دل کے مُردہ ہو جانے کا واضح ثبوت بھی۔

☆☆☆

ہم نے سوچ رکھا ہے
چاہے دل کی ہر خواہش
زندگی کی آنکھوں سے اشک بن کے بہہ جائے
چاہے اب مکینوں پر
گھر کی ساری دیواریں، چھت سمیت گر جائیں
اور بے مقدر ہم۔۔۔
اس بدن کے ملبے میں
خود ہی کیوں نہ دب جائیں
تم سے کچھ نہیں کہنا
کیسی نیند تھی اپنی، کیسے خواب تھے اپنے
اور اب گلابوں پر، نیند والی آنکھوں پر
نرم خو سے خوابوں پر
کیوں عذاب ٹوٹے ہیں
تم سے کچھ نہیں کہنا
گھر گئے ہیں گھاتوں میں، بے لباس باتوں میں
اس طرح کی راتوں میں
کب چراغ جلتے ہیں، کب عذاب ٹلتے ہیں
اب تو ان عذابوں سے بچ کر بھی نکلنے کا، راستہ
نہیں جاناں
جس طرح تمہیں سچ کے لازوال لمحوں سے،
واسطہ نہیں جانا
ہم نے سوچ رکھا ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے
تم سے کچھ نہیں کہنا۔

ندی اس وقت پاؤں کہاں رکھ رہی تھی اور پڑ کہاں رہا تھا اس بات کی خود ندی کو کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ ان کی گلی سے نکل کر یہ جانے بغیر کہ رستہ کس طرف جاتا ہے۔ بس یونہی اپنی سوچوں میں گم سر جھکا کر تھکے تھکے قدموں سے بس چلتی چلی گئی۔ حال اس جواری کا سا تھا جو جوئے میں اپنی تمام تر متاع ہار کر گھر کو لوٹ رہا ہو۔ آگے کی زندگی میں اس کے لیے اندھیرے ہی تھے، یہ گمان بھی ذہن پر پوری طرح غالب تھا۔ شاہ زین نے اس کے ساتھ یہ کیسا سلوک کیا کہ وہ خود اپنے آپ پر یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ لڑکی ہو کر اتنا بولڈ اسٹیپ لیتے ہوئے اس قدر نامساعد حالات میں اس سے ملنے آ پہنچی تھی تو وہ مرد ہو کر اس کے لیے کچھ بھی کیوں نہیں کر پایا تھا اور رابطہ کرنا بھی بھلا اس قدر مشکل یا ناممکن کہاں تھا، کرنے والے تو ہزار رستے نکال لیتے ہیں، لاکھ تدبیریں کرتے ہیں مگر وہ۔۔۔ شاہ زین۔۔۔

اس نے اتنی آسانی سے خود کو حالات پر کیوں چھوڑ دیا؟ کیا اسے ایک لمحے کے لیے بھی ندی کا خیال نہیں آیا ہوگا اور پھر شادی۔۔۔

یہ اور اس سے ملتی جلتی کئی سوچیں ندی کے ذہن کو گارے اور مٹی کی طرح اپنی لپیٹ میں لی ہوئی تھیں۔ کبھی سوچتی کہ گھر واپس نہ جائے، بہتر ہے کسی دارالامان میں جا کر اپنی زندگی کی نئی شروعات کرے یا کہیں ویمن ہاسٹل میں جا کر رہ لے اور ساتھ کوئی بھی جاب شروع کرے۔ آپشنز تو ایک کے بعد ایک ذہن میں آتے جا رہے تھے مگر جہاں خیال گھر بیٹھی ماں کا آتا تو تمام خیال، ارادے اور منصوبہ بندی دِن موسم کے بادلوں کی طرح جھٹ پٹ غائب ہو جاتے۔ سو جیسے تیسے وہ مرتی یا جیتی، گھر واپس اپنی ماں کے پاس پہنچنا ہی اس نے اپنے لیے واحد ترجیح خیال کی اور رکشا کی تلاش میں سر اوپر اٹھا کر دھیان سڑک کی طرف مبذول کیا تو جیسے ایک دنیا تھی جو بھاگی چلی جا رہی تھی، بسوں، ٹیکسیوں، گاڑیوں اور رکشوں میں۔ دونوں اطراف پیدل چلنے والے بھی اپنی ہی دھن میں بس چلے جا رہے تھے۔

یہاں سے وہاں ایک سفر تھا جو جاری تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے لگا کہ وہ جو اپنے غم کو دنیا بھر کے غم سے

www.paksociety.com

بڑا اور اپنی زندگی کو سب سے کٹھن خیال کیے ہوئے تھی تو ایسا نہیں تھا۔ تمام لوگ جو اس وقت زمین کے کشادہ سینے پر اپنے قدموں کے نقش ثبت کیے جا رہے تھے، سبھی کے پاس ایک الگ ہی کہانی تھی۔ سڑک کنارے فٹ پاتھ پر بنا کسی چھاؤں کے بیٹھی بوڑھی عورت چھوٹی چھوٹی اشیاء سامنے دری پر سجائے اپنے ساتھ اس جھریوں بھرے چہرے کی داستان بھی تو لیے بیٹھی تھی۔ ایک ایک جھری میں جانے کتنے غم کروٹ لیے پڑے ہوں، روئی کے گالوں سے سفید بالوں کی ہر ہر تار میں اپنوں کی بے رخی کے نہ جانے کتنے زخم پاؤں پسارے دنیا والوں کے ظاہری پیار و محبت اور اپنائیت کے ڈھکوسلوں کو مطلب کی میلی چادر کی اوٹ سے دیکھ کر تمسخر اڑاتے ہوں مگر شاید یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اپنا غم اور دوسروں کی خوشی ہمیشہ محدب عدسے کی اوٹ سے نظر آتی ہے اور مصیبت میں چلا اٹھنا اور دوسروں سے حسد کا بے دار ہوتا جذبہ بھی اسی محدب عدسے سے نکلنے والی حسرت کی شعاعوں کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔

دو رویہ سڑک پر دائیں سے بائیں اور مخالف سمت جانے والے تمام رکشے اپنی پیٹھ پر مالک اور مسافر کا بوجھ لادے سر پٹ دوڑے چلے جا رہے تھے۔ اُدھر ندی کے لیے اس وقت خود اپنے جسم کا بوجھ اٹھانا محال تھا۔ سو وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی کہ اب مزید کھڑا رہنا اس کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

شاہ زین کے ساتھ یونیورسٹی میں ہونے والی پہلی ملاقات سے لے کر آخری دن بیک اسٹیج پر ہونے والی دونوں کی بات چیت تک ندی کے ذہن میں خالی جھولے کی مانند ٹھہر گئی تھی۔ گھر پر امی کی پریشانی کا بھی خیال تھا اور رکشا بھی نظر نہیں آ رہا تھا، قریب سے گزرتے دو تین لڑکوں نے اسے دیکھ کر ہونٹ سکیڑتے ہوئے سیٹی بجانا اپنا فرض سمجھا اور اسے اوپر سے لے کر نیچے تک بغور دیکھتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیر کر آنکھ بھی مار ڈالی۔

"وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔"

یہ خیال آتے ہی ندی کی آنکھیں بھر آئیں۔

یہ وہی ندی تھی، جس سے بات کرتے ہوئے خود کو شاہ رخ خان کا جانشین سمجھنے والے بھی محتاط ہوا کرتے تھے اور آج راہ چلتے اوباش اور چھچھورے لڑکے اسے میلی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور وہ خاموش ہے۔

اس نے بھیگی نظروں سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر ان لڑکوں کو جن کی نظریں ہوس کے شیرے سے لتھڑی ہونے کے باعث اب تک اس پر چپکی ہوئی تھیں۔ باوجود اس کے کہ وہ چادر میں لپٹی اور نقاب کیے ہوئے تھی۔

اس سے چار پانچ گز کے فاصلے پر کھمبے سے ٹیک لگائے نوجوان بھولے بیٹھے تھے کہ نظریں ہماری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں اور میلی نظروں کی کثافت کسی دوسرے کا کچھ بھی بگاڑنے کے بجائے اپنی ناگوار باس سے دیکھنے والے ہی کی شخصیت کو بدبودار اور روح کو مردہ کیے دیتی ہے۔ اس کے برعکس صاف اور پاکیزہ نظروں کے مالک لوگوں کی شخصیت خوشبو کی طرح معطر اور چاہے جانے والی ہوتی ہے۔

بحالتِ مجبوری ندی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قدرت کی مدد یوں پہنچی کہ جس رکشا میں بیٹھ کر وہ شاہ زین کے گھر گئی تھی وہی رکشا والا ایک بار پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"بیٹا! گھر واپس جانا ہے کیا؟"

اسے یوں فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا دیکھ کر رکشا والے چاچا نے رکشا سے سر باہر کی سمت نکالتے ہوئے کہا تو وہ دل ہی دل میں سکون کا سانس لیتی بغیر کچھ کہے یوں رکشا کے اندر جا بیٹھی گویا اس کی اپنی ذاتی گاڑی ہو۔ رکشا والے نے بیک مرر سے دیکھا وہ رکشا کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھ گئی تھی۔ جاتے ہوئے آنکھوں پر لگایا گیا چشمہ اب ہاتھ میں تھا۔ چہرہ تو نقاب میں تھا مگر آنکھیں یوں ساکت تھیں گویا مراقبہ کیا جا رہا ہو۔ نہ پلکوں کا کوئی ارتعاش تھا نہ ہی آنکھ کی پتلی کی مخفی حرکت۔ چاچا کو جیسے ندی سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں تو سارا دن کتنے ہی مسافر اس سیٹ پر بیٹھا کرتے، مرد ہوتے تو چاچا سے بات چیت کرنے لگتے۔ خواتین ہوتیں تو آپس میں ہی باتیں کرتی رہتیں۔ مگر اتنا چپ چاپ اس قدر خاموش مسافر۔۔۔ آخر ان سے رہا نہ گیا اور وہ بول ہی اٹھے۔

"کیا بات ہے بیٹا! پریشان ہو؟ جس کام سے گئی تھیں نہیں ہوا کیا؟" تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے سے انہوں نے دو تین سوالات کیے تو ندی نے گہری سانس کے ساتھ تمام تر صدمہ باہر نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ میں پکڑے گلاسز سے ایک بار پھر آنکھوں اور دنیا کے درمیان باڑھ کھڑی کر دی۔

"نہیں چاچا! جیسے خالی ہاتھ گئی تھی اس سے بھی تہی داماں ہو کر لوٹی ہوں۔" ٹوٹے بکھرے لہجے میں اس نے کہا تو چاچا کو اس سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔ مگر اس کے بعد کچھ اور پوچھنے کی جانے کیوں انہیں ہمت نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کا دکھ ان کا دل شاید جذب نہ کر پائے۔ اسی لیے خاموش رہے۔ مگر دل سے ندی کے تمام مسائل کے حل اور اس کے اچھے نصیب کی دعا ضرور مانگتے رہے۔

ادھر ندی جلد از جلد امی کے پاس پہنچ کر انہیں سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی دل کو دھڑکا تھا کہ کہیں ثروت آپا یا عائشہ بھابھی کو اس کے آنے کا پتا نہ چل گیا ہو، ناصر بھائی گھر لوٹ نہ آئے ہوں اور اب اسے گھر کے اندر چوروں کی طرح داخل ہوتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے۔ سب کچھ بھلا کر اس وقت وہ گھر میں سب کے "بے خبر" رہنے کی دعا مانگ رہی تھی کہ اپنی وجہ سے وہ ایک بار پھر ماں کا جھکا ہوا سر یقیناً برداشت نہیں کر پاتی۔ انہیں دعاؤں اور خیالات کے تسلسل کے ساتھ ہی رکشا والے نے اس کے کہے بغیر ہی اس جگہ آ کر رکشا روک دیا جہاں سے صبح جاتے ہوئے وہ بیٹھی تھی۔

"بیٹا! یہیں اتار دوں یا گھر کے سامنے تک جانا ہے؟" گردن عقب میں موڑے وہ ندی سے پوچھ رہے تھے جو پاؤں ہٹا کر، اِدھر اُدھر اور کبھی سیٹ پر ہی دائیں بائیں کچھ ڈھونڈتی دکھائی دی۔

"نہیں نہیں، گھر نہیں، ادھر ہی ٹھیک ہے۔" اس نے یوں برق رفتاری سے کہا گویا وہ اس کے گھر کی طرف رکشا موڑ چکے ہوں۔

"لیکن چاچا۔۔۔! وہ۔۔۔" انہوں نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ میرا والٹ شاید کہیں گر گیا ہے، مگر پتا نہیں کہاں۔" بے چارگی سے وہ بولی تو وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے اور بولے۔

"چلو خیر ہے کوئی بات نہیں، وہ میرا نصیب ہی نہیں تھے اسی لیے مجھے نہیں مل سکے۔"

"چاچا! معاف کیجیے گا، لیکن میں بے حد شرمندہ ہوں کہ آپ کی سو فیصد جائز کمائی اور حق ادا نہیں کر پائی۔" اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کس طرح انہیں کرایہ ادا کرے اور اس کا والٹ کب گرا اور کہاں گر گیا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا اور پتا نہ چلنے کی ایک وجہ شاید ہاتھ میں پکڑے گلاسز تھے جنہیں وہ اپنی سوچوں کی پٹڑی پر چلتے چلتے والٹ سمجھے بیٹھی تھی۔

"ہم مسلمان ہیں نا بیٹا! اور ہمارا ایمان ہے کہ جو نصیب میں لکھا ہو وہ مل کر رہتا ہے چاہے کچھ ہو جائے اور جو نہیں لکھا وہ نہیں ملے گا چاہے کچھ ہو جائے۔ وہ پیسے میرے نصیب کے تھے ہی نہیں اس لیے تم فکر نہ کرو اور گھر جاؤ۔" چاچا کے سمجھانے پر وہ رکشا سے اتر آئی تھی کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ سو اچھی طرح چادر کو ایک بار پھر پھیلایا۔ نقاب درست کیا اور گھر کی سمت مڑتے مڑتے ایک بار پھر چاچا کی طرف پلٹی۔

"جو نہیں ملا، وہ لکھا ہی نہیں گیا تھا کیا؟" کتنی حسرت اور بے بسی تھی اس کے لہجے میں۔ چاچا کا بھی دل کھنچ گیا۔ نفی میں گردن ہلائی مگر اس سے پہلے کہ وہ رخ موڑتی پُرشفقت انداز میں بولے۔

"مگر دعا سے نصیب بدل جایا کرتے ہیں بیٹا!"

اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ اس انجان لڑکی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر اسے رخصت کرتے۔ اسی طرح جیسے ایک باپ اپنی بیٹی کو کرتا ہے۔ گردن کی ہلکی سی جنبش کے بعد اب وہ تیز قدموں سے چلتی دائیں طرف مڑ گئی تو چاچا نے بھی گہرا سانس لیا اور رکشا اسٹارٹ کر کے کسی نئی سواری کی تلاش میں پہیوں کو سڑک پر دوڑانے لگے۔

اس وقت ندی کی رفتار پہیوں سے کہیں بڑھ کر تھی جبھی گھر کے نزدیک پہنچ کر اچھی طرح دائیں بائیں اور عقب میں دیکھ کر کسی "اپنے" کے نہ ہونے کی یقین دہانی کی اور بالکل لاشعوری طور پر ڈور بیل پر انگلی رکھ کر اپنے مخصوص انداز میں ایک یا دو نہیں تین بار بجا ڈالا۔ ہوش آیا تو تب جب اسی بیل کی آواز اپنی ہی سماعتوں سے ٹکرائی اور تب جو اس نے بیل سے ہاتھ اٹھایا تو اس طرح کہ گویا بیل کے ذریعے اس کے جسم میں ننگی تار کو چھو جانے سے کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ گھر میں عائشہ بھابھی اور ثروت آپا کی موجودگی کی وجہ سے یہ امکان تو ہرگز نہیں تھا کہ امی باہر آ کر گیٹ کھولتیں اور یہ بات بھی جانتے تھے کہ گھر کے باقی افراد محض ایک دفعہ بیل دے کر انگلی ہٹا لیا کرتے ورنہ اکثر اوقات تو گاڑی کے ہارن سے ہی آمد کی اطلاع مل جاتی جو کہ ایک ہی دفعہ دیا جاتا۔

☆☆☆

فیکٹری اور حویلی میں کچھ اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ گاؤں کے وہ لوگ جو فیکٹری میں کام کرتے تھے وہ تو گاؤں ہی کی سواریوں کو اپنے آنے اور جانے کے لیے استعمال کیا کرتے۔ گاؤں کے کتنے ہی لوگ تھے جنہوں نے چنگ چی رکشے کو اپنا روزگار کا وسیلہ بنا رکھا تھا، سو جس نے فیکٹری بھی جانا ہوتا وہ پینتیس چالیس کلومیٹر کے اس فاصلے کو چنگ چی پر بیٹھ کر ہی طے کیا کرتا۔ شہر البتہ کافی فاصلے پر تھا اور گاؤں شہر سے کافی ہٹ کر واقع تھا۔ اس غیر آباد علاقے میں فیکٹری بنانے کا مقصد بھی اپنے گاؤں کے لوگوں کو نزدیک ترین جگہ پر روزگار دینا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس فیکٹری میں روزگار دینے سے ان کا ووٹ بینک اردگرد کے دیہاتوں تک بھی پھیل گیا تھا۔

چند محافظوں کی موجودگی میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے حویلی پہنچنے تک ان کے ذہن میں شاہ زین کی باتیں اور اس کا انداز ہی گھومتا رہا تھا۔ سرمئی آنکھوں کی چمک ایک انجانی کشش بن کر جیسے انہیں اپنی طرف کھینچتی محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھیں انہیں پھر سے اپنی جانب بلا رہی ہیں۔ لبوں پر چھلکتی وہ دھیمی سی ہلکی مسکراہٹ اور ان کی باتوں میں لی گئی دلچسپی ان کے دل کو ایک عجیب طرح کا لطف دیتی محسوس ہونے لگی تھی، حالانکہ آج تک وہ کتنے ہی لوگوں سے ملتے رہے تھے، کوئی خوشامد اور مطلب کا چولا اوڑھے ملتا تو کوئی خود انہی کی ذات کو رعب و دبدبہ اور جاہ جلال کے منصب پر بٹھا کر خود عقیدت کا لبادہ پہنے اتنا عاجز ہو جاتا کہ آنکھیں ملانا تو دور کی بات نظریں اوپر کر کے انہیں دیکھنا بھی بے ادبی خیال کرتا۔

ایسے میں شاہ زین جس طرح ان کے ساتھ شریک گفتگو ہوا تھا، وہ انداز تو جیسے ان کے دل کو چھو گیا تھا۔ اس کے برعکس میران بھی ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے بے حد محتاط ہوا کرتا، ملکانی سائیں سے چاہے وہ کسی بھی طریقے اور لہجے سے مخاطب ہوتا مگر ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے ادب اس قدر حاوی ہو جاتا کہ باپ اور بیٹے کے بجائے ان دونوں میں بعض اوقات حاکم اور محکوم کا سا رشتہ محسوس ہونے لگتا اور شاید یہی حویلی کی ریت بھی رہی تھی کہ خود وہ بھی اپنے والد کے سامنے ہمیشہ نظریں جھکا کر ہی بیٹھے رہا کرتے۔ بات کرتے ہوئے الفاظ کا چناؤ بھی ناپ تول کر بڑے محتاط انداز میں ہوتا اور ایسے میں وہ اکثر سوچا کرتے کہ وہ اپنے بچوں اور خصوصاً بیٹے کے ساتھ باپ بیٹے کے بجائے دوستی کا رشتہ بنائیں گے۔

یوں بھی دنیا میں میاں بیوی کے رشتے سے لے

کر ماں بیٹی تک، ہر رشتہ میں مٹھاس تبھی شامل ہوتی ہے جب اس میں دوستی کی شیرینی بھی موجود ہو اور نامی طور پر وہ والدین جو اپنی اولاد کی عمروں کو اس طرح تقسیم کر لیں کہ شروع کے دس سال ان کے ساتھ استاد بن کر رہیں۔ گیارہویں سال میں داخل ہونے سے لے کر بیسویں سال کی دہلیز عبور کرنے تک اسی استاد میں دوست ہونے کا روپ شامل کر کے اپنے بچے کا دوست بن جائیں اور اکیسویں برس سے لے کر اکتیس برس کی حد پھلانگنے تک دوست کے رشتے کو نبھاتے ہوئے ان کے لیے ایک گائیڈ، ایک رہنما کے طور پر سامنے آئیں۔ تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کبھی ان بچوں یا والدین میں کوئی جنریشن گیپ آئے، اعتماد کا فقدان ہو یا پھر والدین یا اولاد دونوں میں سے کوئی بھی زندگی میں خلا محسوس کرے۔

شاہ سائیں نے جو کچھ اپنی ہونے والی اولاد کے متعلق سوچا تھا اسے پورا نہ کر کے وقتی طور پر تو حالات سے منہ زوری کرتے رہے، ملکانی سائیں کو عمر میں خود سے کہیں بڑا ہونے کی وجہ سے وہ کئی برس تک ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے تھے جبھی دانستہ طور پر نہ ہی کبھی بچوں کو پیار سے بلایا اور نہ ہی ملکانی سائیں سے بھی ڈھنگ کی بات کی۔ بچوں اور ان کے درمیان بڑھنے والے فاصلوں کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی اور ملکانی سائیں تو پھر خود کو زیور اور میک اپ سے آراستہ رکھ کر ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتیں مگر بچے۔۔۔ وہ تو ظاہر ہے کسی بھی طرح کے ایسے ان ڈائریکٹ راستے سے ناواقف تھے جس سے ان کا پیار اور توجہ حاصل کی جا سکتی۔

جب انہیں اس چیز کا خیال آیا تو ظاہر ہے کہ وقت گزر چکا تھا۔ سو کفارے ہی کے طور پر سہی، انہوں نے مہربانو کو تمام روایات توڑ کر نہ صرف ہائی اسکول تک بھیجا بلکہ کالج اور پھر طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہاسٹل تک میں قیام کی اجازت دے ڈالی۔ برادری یا رشتے دار کیا کہہ رہے ہیں، اس بات کی البتہ انہیں فکر نہیں تھی۔

دوسری طرف میران شاہ جسے ننھیال والے ویسے بھی شاہ سائیں کی طرف سے توجہ نہ دینے پر خصوصی لاڈ پیار سے نوازتے اور اس کی ہر خواہش کی تکمیل کرتے، اسے جب شاہ سائیں کی طرف سے بھی توجہ ملنا شروع ہوئی تو اس نے خود کو گویا ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا۔ شروع ہی سے ننھیال والوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے باعث البتہ اس کے ذہن میں خود کو باقی تمام سے برتر سمجھنے والی بیماری ضرور موجود تھی۔ اس کے برعکس شاہ زین کے انداز و اطوار اور بغیر کسی بناوٹ یا ملمع کے سادہ بھی تھے اور بہترین بھی۔

حویلی میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور ملکانی سائیں کا نہ صرف خیال تھا بلکہ پرزور خواہش بھی تھی کہ مہربانو اور رحمٰن شاہ کی شادی بھی مہران کے ساتھ ہی کر دی جائے۔ ہتھیلی پر سرسوں اگانے کا محاورہ ان کی باتوں کے بالکل حسب حال تھا۔ ان کے بھائیوں نے کب اس رشتے کے لیے ہاں کی اور کب اتنے بڑے فیصلے ہوئے انہیں اس تمام معاملے سے قطعی طور پر لاعلم رکھا گیا تھا اور اب مسئلہ آن پڑا تھا انا اور زبان کا۔

انہیں لگتا تھا کہ بیٹھے بٹھائے اُن کا پورا وجود ایک الجھے ہوئے ریشم میں جکڑ دیا گیا ہو۔ نہ کوئی سرا ہی سامنے نظر آتا اور نہ کوئی دوسرا نقش، جو انہیں اس سے آزاد کروا پاتا، اسی الجھن میں شکار اُن کی قیمتی گاڑی حویلی کے بلند و بالا آہنی گیٹ کے سامنے رکی ہی تھی کہ ہارن کی آواز پر بجلی کی سی رفتار پر چوکیدار نے یوں گیٹ کھولا کہ ابھی ہارن بھی پورا نہ ہو پایا۔ پورچ میں گاڑی کے جانے تک انہوں نے تنقیدی نظروں سے دائیں بائیں موجود وسیع و عریض لان کو دیکھا۔ ملازمین ہر درخت اور پودوں کے پھول پتوں کو بھی جگمگاتی ہوئی لائٹوں سے سجا دینا چاہتے تھے تاکہ سورج غروب ہونے پر جب اُن میں برقی رو دوڑنے لگے تو پوری حویلی بقعۂ نور دکھائی دے۔

وقت کم اور مقابلہ سخت ہونے کے مصداق زیادہ

ملازمین کو کام میں شامل کیا گیا تھا تاکہ جلد از جلد سجاوٹ اور آرائش کی اصل شکل سامنے آسکے۔ حویلی کی چھت اور دیواروں پر قمقمے سجانے کا کام الگ الگ گروپس کی شکل میں کیا جارہا تھا۔ شاہ سائیں جب سے نکلے تو ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ ان کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ اس ہونے والے جشن پہ خوش ہوں یا بیٹی کے مستقبل پر لٹکتی تلوار سے غمگین۔ اُن کے اندر موجود یہ دھوپ چھاؤں کا منظر جیسے ان کا ذہن شل کیے دے رہا تھا۔ جبھی گاڑی کو پھر پورچ میں لاکر بے دلی سے باہر نکلے اور انہی سوچوں میں گم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے تمام تیاریوں اور گہما گہمی کو نظر انداز کرتے سیدھے اپنے بیڈ روم جا پہنچے، جہاں وہ کچھ دیر تنہائی اور تاریکی میں صرف اپنے ساتھ وقت گزارنا چاہتے تھے۔ مگر دروازہ کھولتے ہی ناگواری سے ان کی پیشانی پر اس وقت شکنیں ابھر آئیں جب میران اور ملکانی سائیں وہیں بیٹھے میران کی کی گئی شاپنگ دیکھ رہے تھے۔

"شاہ سائیں! میرا تے خیال ہے کہ مہربانو آکے اپنی مرضی تے پسند کے کپڑے خریدے۔" مختلف ڈیزائنرز کے خوب صورت اور دیدہ زیب لباس جو میران اپنی پسند کے اپنی ہونے والی دلہن کے لیے خرید کر لایا تھا۔ ملکانی سائیں نے ایک طرف رکھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تو وہ بغیر کوئی جواب دیے خاموشی سے بیٹھ گئے۔ شاید ملکانی سائیں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس وقت اپنے اندر ہوتی اعصاب کی جنگ کے کس سنگین اور پُرخطر مرحلے پر ہیں۔

یوں بھی اعصاب کی جنگ، احباب کی جنگ سے کہیں زیادہ کٹھن ہوتی ہے اور اس میں صرف وہی لوگ کامیاب قرار پاتے ہیں جو کسی بھی قسم کے غیر متوقع اور مشکل حالات میں بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اعصاب کی اس جنگ میں احباب کا بھی ساتھ حاصل ہو تو فتح پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں آگرتی ہے۔ میران نے ان کی اس خاموشی، تھکے ہوئے انداز اور اکتاہٹ کو تشویشی نظروں سے دیکھا اور جان بوجھ کر نظریں یہاں وہاں گھماتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے بابا سائیں؟ فیکٹری میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے کیا؟" یہ سوال اس نے بالکل اپنی مرضی کے خلاف پوچھا تھا ورنہ اس وقت تو وہ چاہتا تھا کہ صرف اور صرف اس کی شادی کی بات چیت ہو، تیاریاں کیسی جارہی ہیں؟ انتظامات اب تک مکمل ہوئے کہ نہیں؟ اور کچھ تو نہیں چاہیے؟ تمام فنکشنز شان دار ہونے چاہئیں اور وہ بھی ایسے کہ آج تک کسی کے نہ ہوئے ہوں وغیرہ وغیرہ۔۔۔

مگر اس تمام کے برعکس شاہ سائیں نے پہلے تو جس طرح چونک کر اندر آتے ہی انہیں دیکھا پھر دیکھنے کے بعد ناگواری کے جو تاثرات ان کے چہرے پر ابھرے اور اس کے بعد سامنے رکھے زرق برق لباس دیکھ کر کسی بھی قسم کی خوشی کا اظہار کیے بغیر جس طرح بددلی سے وہ صوفے پر ڈھے گئے تھے یہ سب میران شاہ نے بھی محسوس کیا تھا اور ملکانی سائیں نے بھی۔ مگر اپنے تئیں دونوں ہی نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ان کے یہ تمام تاثرات وہ نوٹ نہیں کرپائے ہیں۔ جبھی اپنی ہی دھن میں ملکانی نے انہیں مخاطب تو کیا مگر کسی بھی قسم کا جواب نہ پاکر میران کی طرف متوجہ ہوئیں تو اس نے شادی کی تقریبات وغیرہ سے بالکل ہٹ کر مکمل طور پر ایک مختلف سوال پوچھا اور حسب توقع جواب بھی آگیا۔

"نہیں، مسئلہ تو خیر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔" ایک اچٹتی نظر سامنے پڑے عروسی ملبوسات پر ڈالتے ہوئے بند ہونٹوں کے اندر یونہی جبڑوں کو حرکت دیتے ہوئے وہ بولے تو ملکانی سائیں پھر بول پڑیں۔

"فیکٹری وچ وی مسئلہ کوئی نئیں تے پھر پریشان کیوں ہو؟" شاہ سائیں نے ملکانی سائیں کی بات سنی مگر اسی طرح گویا کہ نہ سنی ہو۔

"میران! تمہیں میں نے ایک روز کہا تھا کہ کبھی کبھار فیکٹری کا چکر لگالیا کرو، کتنی دفعہ گئے ہو آج تک وہاں؟" ایک اور سوال اور وہ بھی موقع اور محل سے بالکل متضاد۔۔۔ دل ہی دل میں میران کھسیا کر رہ گیا تھا مگر ظاہر ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا جبھی آواز کو دھیما رکھتے ہوئے بولا۔

"بابا سائیں! جانا تو تھا مگر پچھلے دنوں مصروفیت کچھ ایسی رہی کہ چاہنے کے باوجود بھی جا نہیں سکا۔"

"شکار اور دوستوں کے علاوہ بھی دنیا میں بہت کچھ ہے، بہت لوگ ہیں، مگر تم کبھی غور کرو تو تب نا۔۔۔" میران خاموش رہا، بس چلتا تو وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا مگر شاہ سائیں کے رعب کے سامنے یہ بات صرف سوچی جاسکتی تھی، اس پر عمل کرنا میران شاہ کے لیے ناممکنات میں سے تھا۔

"کسی بھی کام کو ہیڈ کرنے کے لیے پہلے اس کام سے مکمل واقفیت ہونا لازمی ہوتا ہے نا۔" میران کی تائید چاہتے ہوئے وہ رکے اور تائید میں اس کے سر ہلانے پر پھر بولے۔

"بڑھئی سے لے کر صنعت کار تک جب تک وہ خود اپنے کام سے واقف نہیں ہوگا وہ دوسروں سے کام نہیں لے سکے گا، ناواقف ہوا تو اسے کیا پتا کون سا کاری گر کیا ڈنڈی مار رہا ہے یا پھر کام میں کس طرح ردوبدل کرکے اسے مزید کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔"

"جی بابا سائیں!"

"بس اسی لیے تمہیں کہا تھا کہ فیکٹری جاکر دیکھو کہ ہمارا کام کیا ہے، کس طرح کیا جاتا ہے، مگر تمہیں تو شاید یہ بھی پتا نہ ہو کہ ہماری فیکٹری ہے کس چیز کی؟"

"نہیں بابا سائیں! ایسی بات نہیں ہے۔" ان کے طنز پر وہ کھسیا گیا تھا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے کل سے دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے اپنی مرضی کے منتخب کردہ ایک گھنٹے میں تم فیکٹری جاؤ گے۔" شاہ سائیں نے گویا مختصر فیصلہ جاری کیا تھا۔

"پر شاہ سائیں! اتاں دناں وچ تے شادی دیاہ دے سو کم۔۔۔"

"شادی بیاہ کے وہ سو کام صرف فون کال پر ہونے ہیں۔ کرنے والے لوگ بھی ہیں اور نگرانی والے بھی اور پھر میں پورے دن کے لیے اسے فیکٹری نہیں بھیج رہا ملکانی سائیں۔۔۔! صرف ایک گھنٹہ کہا ہے اور میران! تم تو اچھی طرح جانتے ہونا میرے ایک گھنٹے میں پانچ دس منٹ نہیں پورے ساٹھ منٹ ہوتے ہیں۔" میران کی امداد طلب نظروں پر ملکانی نے اسے مدد فراہم کرنے کی کوشش تو ضرور کی مگر شاہ سائیں نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ البتہ میران شاہ خاموشی سے بیٹھا تھا۔

"جی بابا سائیں! جانتا ہوں۔"

"شاباش! ایک ایک ہفتہ ہر ڈیپارٹمنٹ ہیڈ کے ساتھ ان کے آفس میں بیٹھو، کام کو سمجھو، ان کا طریقہ کار دیکھو، اب تمہاری شادی ہونے جارہی ہے تو ذمہ داریوں کا بھی تو کچھ احساس بڑھنا چاہیے نا۔"

"تے جدوں شادی ہوئی اس دن وی۔۔۔؟" ملکانی سائیں کو ابھی تک پریشانی لاحق تھی کہ یہ شاہ سائیں کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھ رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ شادی کے معاملات پر بات کریں وہ کاروبار کے لیے فکر مند نظر آرہے ہیں۔

"نہیں نہیں، شادی کے لیے تو چھٹیاں مل جائیں گی۔" اس بار وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔

"پیکنگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بہت اچھا اور نفیس لڑکا ہے۔ تعلیمی قابلیت تمہاری طرح ماسٹرز بھی نہ ہونے کے باوجود انتہائی گہری نظر ہے اس کی تمام کاروباری امور پر۔۔۔ میرا خیال ہے اپنا پہلا ہفتہ تم اسی کے ساتھ گزارو، کیونکہ اس کے ساتھ رہ کر تم نہ صرف کاروبار کو اچھی طرح سمجھ جاؤ گے بلکہ ہوسکتا ہے اس کی شخصیت کی خوب صورتی اور خیالات کی میچورٹی بھی تمہاری ذات میں مثبت تبدیلی کا باعث بنے اور میں خود آج اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" ایک تنخواہ دار ملازم کی اپنے مقابلے میں ہونے والی اس قدر تعریف نے اس کا منہ بدمزا کردیا تھا۔ شکایتی نظروں سے ملکانی سائیں کو دیکھا مگر ظاہر ہے کہ شاہ سائیں نے کہہ دیا سو تعمیل تو کرنا ہی تھی ورنہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا تو پتا چلتا کہ وہ اس وقت اس بے وقت کی راگنی پر کس طرح نوحہ کناں تھا۔

(باقی آئندہ)

مکمل ناول

فاخرہ گل



آٹھویں قسط
-۸-

تو نے کیا کچھ نہیں دیا مجھ کو
میں بہت شاد ہوں اداس نہیں
اس میں کچھ تلخیاں بھی ہوتی ہیں
دوستی شہد کا گلاس نہیں

میری چرچ سے باہر آئی تو چہرے کے تاثرات حسب توقع تھے۔ پھولا ہوا منہ اور روٹھے روٹھے انداز۔۔۔ اسے باہر آتا دیکھ کر مہربانو اور کنول دونوں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ کنول نے کھسیا کر شرمندگی سے مہربانو کی طرف دیکھا اور اس کے لبوں پر بکھری ہمت بڑھاتی مسکراہٹ پر اپنے اندر حوصلہ مجتمع کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میری کی طرف متوجہ ہوئی جو مکمل طور پر اسے نظر انداز کرتے ہوئے مہربانو کے پاس آکر رک گئی تھی۔

''آئی ایم سوری یار! میری باتوں سے تم ہرٹ ہوئی ہونا؟''

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔'' میری کی طرف سے بڑا روکھا سا جواب آیا۔

''دراصل میں یہ سب کہنا نہیں چاہتی تھی، پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔۔۔ تم یقین کرو میری! آئی نیور ایون تھنک لائک دز۔'' کنول کسی طریقے اس کا دل صاف کرنا چاہتی تھی مگر دل میں آیا میل لفظوں سے نہیں انسانی رویوں سے صاف ہوتا ہے اور اس کے لیے رویوں کا سچا اور پرخلوص ہونا بھی شرط ہے۔

''یہ سب صرف کہنے کی باتیں ہیں کنول! کیونکہ آئی بلیو کہ غصے میں انسان کے منہ سے صرف اور صرف وہی نکلتا ہے جو اس کے ذہن کی سوچ ہوتی ہے اور تم نے بھی وہی کہا جو تم سوچتی ہو۔ بٹ اٹس او کے، کوئی بات نہیں۔''

''کوئی بات کیوں نہیں یار۔۔۔! یہ بہت بڑی بات ہے اور خاص طور پر میرے لیے تو بہت شرمندگی کی بات ہے کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا، مگر تم یقین کرو غصے میں انسان بعض اوقات خود اپنے نفس کی تسکین کے لیے بہت مبالغہ آرائی بھی تو کرنے لگتا ہے صرف اس لیے کہ اس طرح وہ سمجھتا ہے کہ اس کا غصہ کم ہو جائے گا۔''

مہربانو نے خاموش رہ کر دونوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا بھرپور موقع دیا تھا۔ جو مکمل خاموشی سے دونوں اطراف کا مکالمہ اس امید پر سنتی رہی کہ ان دونوں کا یوں ایک دوجے کے لیے دل میں بدگمانی رکھنا خود اس کے لیے بھی تو قابل برداشت نہیں تھا۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ اس کی کسی بھی طرح کی دخل اندازی کے بجائے وہ دونوں خود ہی آپس میں ان تمام غلط فہمیوں کو دور کرلیں جن کا اب سے چند گھنٹے پہلے تک کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

''ایک ماں جب اپنی اولاد کو غصے میں برا بھلا کہتی ہے تو بھلا بتاؤ کیا وہ دل سے کہتی ہے؟ نہیں نا۔۔۔ اُسے تو اپنی اولاد دنیا کی ہر قیمتی چیز سے بڑھ کر محبوب ہوتی ہے تو پھر وہ کیوں کرتی ہے ایسا؟'' کنول نے مثال ہی کچھ اس طرح کی دی تھی کہ میری لاجواب ہو کر رہ گئی تھی مگر چہرے سے ناراضی کا اظہار البتہ ابھی تک ہو رہا تھا۔ کنول کو امید تھی کہ وہ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہے گی مگر میری کی خاموشی اس کے لیے مزید دل گرفتگی کا سبب بنتی رہی۔ سو چند

لمحے انتظار کے بعد شکایتی نظروں سے اس نے خاموش بیٹھی مہربانو کو دیکھا اور جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرکے یہاں وہاں دیکھتی میری سے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم مجھے معاف نہیں کرتیں تو میں ابھی چرچ سے جا کر کسی کو بلا لاتی ہوں کہ وہ ہی اب ہمارے درمیان کا فیصلہ کریں۔" بات کرتے ہی وہ تیز قدموں سے اس سے پہلے کہ چرچ کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھتی، میری اس کی غیر متوقع بات پر بری طرح چونکتے ہوئے اس کے پیچھے لپکی اور ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"پتا ہے کنول! جب ہم ایڈمیشن کے بعد پہلی دفعہ ملے تھے تو یہی الفاظ تھے، یہی ہمارا رویہ تھا جو ہمیں ایک دوسرے کے اتنے قریب لے آیا کہ سب ہمیں رشتے دار خیال کرنے لگیں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ہمارے یہی الفاظ اب ہمیں ایک دوسرے سے اس قدر دور لے جائیں کہ لوگ تو کیا ہم خود بھی ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے باوجود ایک دوسرے کو اجنبی سمجھنے لگیں۔" سر جھکا کر کنول نے نفی میں سر ہلایا۔

"اپنے لفظوں کو ادھار کی رقم کی طرح سوچ سوچ کر اور احتیاط سے استعمال کرنے والے لوگ ہی ہر دل عزیز قرار پاتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ میں تمہارے لفظوں سے بہت بری طرح ہرٹ تو ہوئی تھی مگر اس بات کا بھی اتنا عرصہ اکٹھا رہنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ تمہاری سوچ ایسی نہیں ہے۔ بس شاید "پائے کے سالن" سے دوری ہی کی وجہ سے تمہیں جو فرسٹریشن تھی وہ تم نے مجھ پہ نکالی ہے۔" شگفتہ انداز میں کہے گئے میری کے آخری جملے نے تینوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

"ریئلی لو یو میری! تم واقعی میری بہت اچھی دوست ہو۔" بے اختیار کنول، میری کے گلے لگ گئی تھی۔

مہربانو بھی دونوں کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ میری نے کنول کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے دل صاف کرکے یقیناً دوستی جیسے اہم رشتے کو بچا لیا تھا جس کے لیے خود مہربانو اس کی شکر گزار تھی۔

"ویسے اگر آج تم مجھے معاف نہ کرتیں نا تو۔۔۔ میں ایک انتہائی قدم اٹھانے کا سوچ چکی تھی۔" چھوٹے بچوں کی طرح گردن نیچے کرکے اوپر دیکھتے ہوئے کنول نے اس انکشاف سے دونوں کو حیران کر دیا تھا۔

"کیا۔۔۔؟ آر یو میڈ؟" میری حیرت سے چیخی۔

"ہاں میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ اگر آج تم نے مجھے معاف نہ کیا تو میں ہاسٹل جا کر۔۔۔۔" کنول نے منہ بسورتے ہوئے دونوں کو دیکھا جو حیرت سے آنکھیں پھیلائے اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"کیا کرنے والی تھیں تم؟" مہربانو نے اس جذباتی لڑکی کو لمحہ بھر کے لیے انتہائی تشویش ناک نظروں سے گھورا۔

"یہی کہ اگر میری نے مجھے معاف نہ کیا تو میں ہاسٹل جا کر "پائے کا سالن" نہیں کھاؤں گی۔" بات ختم کرکے خود کنول ہی کی ہنسی کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ میری اور مہربانو بھی یوں بے ساختہ ہنسیں جیسے تیز دھوپ کے بعد ایک دم برسات ہونے لگی ہو۔ اسی ہنسی کے ساتھ ہی اب وہ تینوں اسٹاپ کی طرف بڑھ رہی تھیں جہاں سے انہیں شاپنگ کرنے جانا تھا اور کنول یہی سوچ رہی تھی کہ میری کو تو گفٹ دینا ہی ہے اس لیے مہربانو کے لیے بھی کوئی اچھی سی چیز خرید کر اسے بھی گفٹ کرے گی۔ یوں بھی وہ اپنے طے شدہ ٹائم ٹیبل کے عین مطابق صحیح وقت پر چرچ سے واپس آ گئی تھیں جبھی مطمئن تھیں۔

☆☆☆

آج کا دن ہمیشہ گزرنے والے دنوں سے کہیں مختلف ثابت ہوا تھا۔ جبھی تو شاہ زین شام کے وقت حسب معمول جب آفس سے اپنے گھر کے لیے نکلا تو کچھ منفرد سا محسوس کیا۔

شاہ سائیں سے ملنے کے بعد سے اب تک وہ اپنی ذات میں جو تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا اس کا سبب خود اس کی سمجھ سے باہر تھا اور یہ کوئی اس کی پہلی ملاقات بھی نہیں تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ علیحدگی میں آج اس کی اُن سے پہلی ملاقات تھی اور شاید اسی لیے خود کو اہمیت دینے کے خیال سے وہ اپنے مزاج کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آفس ٹائمنگز کے دوران ہی اب سے کچھ دیر پہلے ہی جب ثمینہ نے گھر سے اسے فون کیا تھا اور اسے گھر آتے ہوئے ایک گڈ نیوز کے بارے میں اشارہ دیا تھا، تب بھی اسے حیرت ہوئی تھی کہ آخر یہ آج کا دن اس کے لیے کیا کیا سمیٹ کر لانے والا ہے۔ اسی کیفیت میں گھر میں داخل ہوا تو زمین اپنی کتابیں سنبھالے نکل رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک کر اسے دیکھا، سلام کرنے کے انداز میں گردن کو نیچے کی طرف ہلکی سی جنبش دی اور آگے بڑھ گئی۔

"بھائی! آج اتنی دیر کر دی آپ نے۔۔۔؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں آپ کا۔" ثمینہ نے اسے اندر آتا دیکھا تو صوفوں پر کشن ترتیب سے رکھنے کا عمل چھوڑ کر فوراً لپکی۔ اماں بھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں مگر اس کی آمد کی اطلاع ہوتے ہی قرآن پاک بند کرکے آنکھوں اور سینے سے لگانے کے بعد ہونٹوں سے لگا کر چوما اور جزدان میں لپیٹ کر رحل کے ساتھ ہی الماری کے سب سے اوپری شیلف میں رکھ کر ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"دیر۔۔۔؟" شاہ زین حیران ہوا تھا۔ "ٹائم دیکھو ذرا، بلکہ میں تو آج پانچ سات منٹ پہلے ہی آ گیا ہوں۔"

"ثمینہ۔۔۔! جاؤ بیٹا جلدی سے کھانا گرم کر لاؤ، تب تک شاہ زین بھی ہاتھ منہ دھو لے۔" شاہ زین اماں کے پاس جا کر بیٹھا تو انہوں نے فوراً ثمینہ کو کچن میں جانے کا کہہ دیا ورنہ جانتی تھیں کہ ثمینہ فوراً سے پہلے شاہ زین سے وہی بات ڈسکس کرنا چاہے گی جس کے بارے میں وہ شام ہی کو اسے اشارہ دے چکی تھیں۔

نہ چاہتے ہوئے چار و ناچار ثمینہ کچن میں گئی اور منٹوں کا کام سیکنڈوں میں کرنے کی دھن میں لگ گئی۔ شاہ زین بھی اٹھا، آفس شوز اتار کر آرام دہ سلیپرز پہنے، موبائل چارجنگ پر لگایا اور ثمینہ کے کھانا رکھنے کے دوران کپڑے تبدیل کرکے آ بیٹھا۔ ثمینہ کو آج اس کے چہرے پر کچھ تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ خود اماں کو بھی لگا کہ جیسے آج کچھ منفرد سا ہے۔ جبھی خوشی سے مسکراتے لبوں کے ساتھ اسے دیکھے گئیں مگر ثمینہ بھلا اتنی دیر کہاں برداشت کرنے والی تھی جبھی سالن کا ڈونگا اور خالی پلیٹ شاہ زین کی طرف بڑھانے کے بعد سلاد سے گاجر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے مخاطب اماں کو مگر در پردہ شاہ زین سے دریافت کرنے کے انداز میں آخر بول ہی پڑی۔

"اماں۔۔۔! آپ کو کیا لگتا ہے کہ صرف خوش خبری کا اشارہ دینے پر بھائی اتنے خوش ہیں تو مکمل خوش خبری پتا چلنے پر بھائی کا کیا ردِ عمل ہوگا؟"

"خوش خبری۔۔۔؟" شاہ زین کو جیسے کچھ یاد آیا۔

"ارے ہاں۔۔۔ وہ خوش خبری تو بتاؤ کہیں کالج کی چھٹیاں تو نہیں آ رہیں اگلے ہفتے؟" مسکراتے ہوئے شاہ زین نے پوچھا اور کھانے سے پہلے ایک گلاس پانی پینے لگا۔

"جی نہیں، کوئی چھٹیاں نہیں آ رہیں اور ویسے اگر آپ کو گڈ نیوز کے بارے میں یاد بھی نہیں تھا تو اتنے خوش باش ہونے کی کیا وجہ تھی؟"

نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے شاہ زین کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے جو ثمینہ کے منہ پر سجے تفتیشی انداز کو دیکھ کر مزید گہرے ہوئے تو اس نے استفہامیہ انداز سے دیکھتے ہوئے اماں کی طرف رخ موڑا جو کھانا کھانا چھوڑ کر بڑی پُر شفقت نظروں سے اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

"کسی دوست سے ملاقات ہوئی ہے کیا آج؟"

"لیکن اماں! آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" مائیں اپنی اولاد کا چہرہ پڑھ سکتی ہیں، اس بات کا تجربہ اور یقین تو اسے پہلے سے تھا آج پھر تجدید ہو گئی تھی۔

"تمہارا چہرہ بتا رہا ہے بیٹا! کہ آج معمول سے ہٹ کر کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جو تم بتانا چاہ رہے ہو۔" چھوٹا سا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ دھیما سا مسکرائیں۔

"ہاں بھائی! جلدی سے بتائیں کیونکہ میرے پاس بھی ایک گریٹ نیوز ہے آپ کو بتانے کے لیے۔"

"چلو پھر پہلے تم کہو کہ کیا بات ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں بھائی! چیٹنگ نہیں چلے گی بالکل بھی، میں نے آپ سے پہلے پوچھا تھا نا اس لیے پہلے آپ ہی بتائیں گے۔"

"ارے ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" چمچے سے دہی پودینے کی چٹنی اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔

"دراصل آج ہماری فیکٹری کے اونر آفس آئے تھے، اُن کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھ کر جو بات چیت ہوئی، اس نے ذہن پر اتنا مثبت اثر ڈالا کہ بس تب سے پتا نہیں کیوں خود میں بڑی فریشنس محسوس ہو رہی ہے۔"

"ہاں بیٹا! ہوتا ہے ایسا بھی۔" اماں نے تائید کی۔

"کچھ لوگوں کو بات کرنے کا ڈھنگ ہوتا ہے، الفاظ کی جادوگری سے ہر شخص آگاہ ہی نہیں رکھتا، مگر جو لوگ حساس دل و دماغ اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ دوسرے دلوں کو یک دم تسخیر کر لیتے ہیں۔"

"ہاں بالکل، میں بھی کہیں پڑھ رہی تھی کہ ایک نابینا شخص خالی ٹوپی سامنے رکھ کر بیٹھا تھا اور ساتھ ہی تختی لگا رکھی تھی کہ "میں اندھا ہوں میری مدد کیجیے" مگر کافی دیر گزرنے کے بعد بھی ٹوپی میں محض دو چار ہی سکے گرے تو اس کی مخالف سمت میں موجود دکان کا مالک اٹھا اور تختی کی عبارت بدل ڈالی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹوپی میں سکوں کی جھنکار بڑھنے لگی، پتا ہے اماں! اُس دکان دار نے کیا لکھ دیا تھا؟" ثمینہ نے اماں کو مخاطب کیا اور ان کی مکمل دلچسپی محسوس کر کے اپنی بات جاری رکھی۔

"میں اندھا ہوں میری مدد کیجیے" کو مٹا کر اس نے لکھا "آج کل بہاروں کا موسم ہے اردگرد رنگ برنگے پھول کھلے ہیں مگر میں انہیں دیکھ تو کیا محسوس بھی نہیں کر سکتا، ایسے میں کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

"میٹنگز تو میں پہلے بھی اُن کے ساتھ اٹینڈ کر چکا ہوں مگر پتا نہیں کیوں اماں! آج کی ملاقات میں وہ خود سے قریب بھی محسوس ہوئے اور اپنائیت کا بھی احساس کچھ ایسا کہ گویا کوئی دوست بہت عرصے بعد ملا ہو، پہلے کبھی ایسے احساسات نہیں ہوئے میرے۔" اماں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"حالانکہ شاہ سائیں کی شخصیت میں اتنا رعب ہے کہ فیکٹری کے لوگ ان کے سامنے بہت محتاط رہتے ہیں، باوجود اس کے کہ انہوں نے آج تک کسی کو کچھ کہا بھی نہیں سب کے سامنے۔"

"شاہ سائیں۔۔۔!" اماں نے زیر لب دوہرایا۔

"نام کیا ہے اُن کا؟"

"حیدر شاہ نام ہے اُن کا۔"

اماں نے غیر محسوس طریقے سے منہ میں جاتا نوالہ واپس رکھ دیا تھا۔

"اوہو اماں! ان باتوں کو چھوڑیں نا تا کہ میں بھی بھائی کو گڈ نیوز بتاؤں۔" ثمینہ کو اپنی بات کرنے کی جلدی تھی۔

"اچھا چلو تم بتاؤ فوراً کیا بات ہے؟" شاہ زین نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اماں نے کھانا کھاتے کھاتے کیوں پلیٹ آہستگی سے پرے کھسکا دی تھی یہ بات دونوں محسوس نہیں کر پائے تھے۔

"ہم آپ کی شادی کر رہے ہیں اور وہ بھی ہمر جنسی بنیادوں پر۔" شرارت سے کہتے ہوئے وہ مسکرائی۔

"شادی۔۔۔؟ میری۔۔۔؟ تم ٹھیک تو ہو؟" شاہ زین نے بے یقینی سے پہلے اسے اور پھر اماں کو دیکھا۔

"کیوں اماں۔۔۔! بتائیں نا بھائی کو کہ ہم آج کل ان کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔" شاہ زین نے ثمینہ کی بات پر استفہامیہ انداز میں اماں کو دیکھا جو ان دونوں کی بات پر تاثرات سے عاری چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔

"اماں! کیا کہہ رہی ہے یہ؟"

"ہاں بیٹا! تو کچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہی نا، میرا خیال ہے کہ اب تمہاری شادی کر دینی چاہیے۔" ایک گہری سانس کے ذریعے انہوں نے ذہن میں مجتمع خیالات کو رخصت کیا اور خود کو حال کا حصہ بناتے ہوئے شاہ زین کی بات کا جواب دے کر اسے مزید حیران کر دیا۔

"لیکن اماں۔۔۔ یہ سب، اس طرح کیسے؟" گھر میں یہ معاملہ بغیر کسی وجہ کے بس یونہی غیر متوقع طور پر اٹھایا گیا تھا سو اس کا حیران ہونا لازمی تھا۔ یوں بھی تب اور اب میں بہت فرق تھا۔ اگر آج سے پہلے وہ سب کچھ نہ ہو چکا ہوتا جس کے بعد ندی اسے چھوڑ گئی تھی تو معاملہ قدرے مختلف ہوتا مگر اب تو وہ یہ سب سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ثمینہ اور اماں کی باتوں نے اس کی رگ رگ میں تھکن بھر دی تھی۔ جبھی ان کا جواب سنے بغیر ہی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اس سے پہلے اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی وہ یوں اماں کے سامنے سے اٹھ کر تنہائی کی تلاش میں چلا آیا ہو۔ مگر وہ ان کے سامنے اپنا ضبط توڑنا نہیں چاہتا تھا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اس قدر جذباتی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ پناہ لی۔ بصورت دیگر اسے ہمیشہ سے اپنے احساسات و جذبات پر مکمل کنٹرول رہا تھا۔ نہایت ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کا مالک ہونے کے باوجود جانے کیوں اس وقت وہ انتہائی جذباتی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

اماں اور ثمینہ نے خاموشی سے اسے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔

ثمینہ نے چپ چاپ ٹیبل پر سے کھانے کے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے۔ چند لمحوں پہلے اس کے مزاج میں اتری شوخی ساون کی دھوپ کی طرح اچانک ہی کہیں جا چھپی تھی۔ لگتا تھا جانے کتنے ہی عرصے سے گھر کی دیواروں پر خاموشی کا ڈیرہ ہے۔ اماں نے جان بوجھ کر شاہ زین کو کچھ دیر کے لیے تنہائی کو سونپا مگر پھر برداشت نہ ہو سکا تو اٹھ کھڑی ہوئیں مگر اپنے ساتھ ہی کھڑی ہوتی ثمینہ کو دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے شاہ زین کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال سنائیں کیا
کوئی مہر نہیں کوئی قہر نہیں
پھر سچا شعر سنائیں کیا

بنا آہٹ کے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی اماں کے قدم تو وہیں کمرے کی دہلیز پر ہی رک گئے تھے۔ بیڈ کے دائیں طرف آرام دہ کرسی پر آنکھیں سامنے رکھی کتابوں پر جمائے اس وقت وہ خود اپنے ہی وجود سے بے خبر معلوم ہو رہا تھا۔ ندی سے دوستی ہونے کے بعد اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمکتی دمکتی روشنیوں کی جو لہریں خود اماں نے دیکھی تھیں وہ اب ماند پڑ چکی تھیں۔ عجیب بے حس و حرکت انداز میں یوں اسے سامنے بک ریک پر نظریں گاڑے دیکھ کر اماں کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ ساتھ والے گھر میں بجتے دھیمے میوزک کا فسوں تھا یا اندرونی خلفشار۔۔۔ اماں کے اپنے کمرے میں آمد کو وہ ہرگز محسوس نہیں کر پایا تھا۔

اک آگ غم تنہائی کی
جو سارے بدن میں پھیل گئی
جب جسم ہی سارا جلتا ہو

پھر دامنِ دل کو بچائیں کیا

انہیں اُس پل شدت سے احساس ہوا تھا کہ شاہ زین کس قدر تنہا ہے، نہ دوست نہ رشتے دار۔۔۔ وہ پھر سے اپنے اُسی خول میں سمٹ کر رہ گیا تھا جس میں ندی سے ملنے کے بعد دراڑ پڑ گئی تھی۔ اپنی ذات کی قید میں وہ رفتہ بہ رفتہ بے بس ہوتا جا رہا تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کی یہ کیفیت دیکھ کر خود اماں کا دل لہولہو ہو رہا تھا۔ مگر کیا کرتیں خود وہ بھی تو بے بس و مجبور تھیں۔ ہزار چاہنے کے باوجود بھی وہ اس کے دل کی یہ خواہش پوری نہیں کر پا رہی تھیں اور بدلے میں چاہتی تھیں کہ وہ حالات سے سمجھوتہ کرے، بالکل اسی طرح جیسے وہ بچپن سے اپنے ہم عمر اور کلاس فیلوز کے پاس مختلف چیزیں دیکھ کر کرتا آیا تھا مگر اب معاملہ قدرے مختلف تھا اسی لیے دل کی طرف سے مزاحمت کا گراف بھی نسبتاً بلند تھا۔

اماں ہلکے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئیں اور بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئیں تو ان کی آمد کا احساس ہوتے ہی وہ چونکا۔ انہیں یوں اچانک بنا آہٹ کے اپنے سامنے دیکھ کر وہ چند لمحے کے لیے حیران ہوا مگر پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر حسب عادت ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ اماں کی انگلیاں اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے سے اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھیں جبکہ آنکھیں بند کیے شاہ زین کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا، دماغ بھی سُن لگ رہا تھا۔ باوجود کوشش کے وقت کا دماغ سے کوئی بھی رابطہ نہیں بن رہا تھا اور اسی گومگوی کیفیت میں وہ بہت دیر تک خاموش رہنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ندی کے لیے اپنے جذبات کو بس خود تک ہی محدود رکھ کر اپنی وجہ سے کبھی بھی اماں کو پریشان نہیں کرے گا مگر کیا کرتا آج آخر ایسا ہو گیا تھا اور پھر وہ بھی تو ایک انسان ہی تھا۔ آخر کب تک اپنے اوپر ملمع چڑھائے اماں اور ثمینہ کے سامنے اداکاری کرتا رہتا سو آج شاید وہ تھک گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ تمہیں اچھا نہیں لگا یہ تذکرہ؟“

اماں کی دھیمی مگر پُرشفقت آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”آپ کو کیا لگتا ہے اماں؟ مجھ سے تو کہیں زیادہ آپ سمجھتی ہیں نا مجھے۔“ سر اٹھا کر اس نے اماں کو دیکھا تو ان کے لیے کچھ بھی کہنا مشکل سا ہو گیا۔

”میری جان، زندگی میں ہمیشہ وہ سب تو نہیں ہو پاتا جس کی ہم توقع کر رہے ہوں اور اسی کا ہی نام زندگی ہے۔ جسے ہم نے اس کی تمام تر تلخ و شیریں حقیقتوں کے ساتھ قبول بھی کرنا ہے۔“ شاہ زین کی سرمئی آنکھوں میں زندگی ساکت و جامد حالت میں ہونے نہ ہونے کے درمیان کہیں معلق تھی۔

”دن کے کسی پہر کمرے میں بھاری سیاہ پردے گرا کر اور روشنی کی تمام راہیں بند کر کے اگر ہم رات تخلیق کرلیں یا رات کو ہزاروں روشنیاں جلا کر اپنا کمرہ جگمگالیں تو پھر بھی دن اور رات دونوں اپنی جگہ اسی طرح قائم و دائم رہیں گے اور اس جھوٹی تسلی کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا، یہ بات تم اچھی طرح جانتے بھی ہو اور سمجھتے بھی۔۔۔ سمجھتے ہو نا؟“

انہوں نے اس بات کی یقین دہانی کرنی چاہی تھی کہ آیا وہ ان کی باتیں سن رہا بھی ہے یا نہیں مگر جواب میں اثبات میں گردن ہلاتے شاہ زین کو دیکھ کر اب وہ مطمئن ہو گئی تھیں سو بولیں۔

”بیٹا! کبھی بھی کسی بھی انسان کی طرف سے اپنی ناقدری پر نہ کڑھنا کیونکہ قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ وقت کرتا ہے اور درجات اوپر متعین ہوتے ہیں۔ اگر انسانی رویوں میں الجھو گے تو زندگی بھر الجھ کر رہ جاؤ گے۔ بس عیب اور غیب کے جاننے والے کے ساتھ اپنے معاملات سلجھائے رکھو۔ ساری الجھنیں اور مسائل دور ہو جائیں گے۔“

شاہ زین نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اس صبر کے پیکر کو دیکھا تو دل جیسے درد سے بھرتا چلا گیا۔ آج تک اپنی زندگی میں انہوں نے کون سا سکھ دیکھا تھا۔ خوشیوں کا موسم کب ان کی ذات پر اترا تھا، خود شاہ زین کو یاد نہیں پڑتا تھا۔ جوانی میں ہی بیوگی کی چادر

اوڑھ کر جس طرح سے انہوں نے بغیر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اپنے بچوں کی پرورش کی انہیں تعلیم دلائی یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میکے اور سسرال کا کوئی بھی فرد ان سے آخری بار کب ملا ہو، یہ شاید انہیں خود بھی یاد نہیں ہوگا۔ ان کی اپنے بچوں کے ساتھ اس قدر محبت اور ان کے لیے کی گئی دن رات کی شبانہ روز محنت ہی تھی جس نے انہیں محلے کے تمام باسیوں میں انتہائی معتبر بنا دیا تھا۔

آج سے پہلے ان کی زندگی میں آنے والی مشکلات اور دکھوں کو کم کرنا شاہ زین کے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر اب جب کہ وہ اپنی زندگی میں آنے والی اس ممکنہ خوشی کی آس اس کی ذات سے لگائے بیٹھی ہیں تو کیا وہ ان کی خوشی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا اور اگر وہ ابھی ان کے اس ارادے کو ملتوی بھی کرلے تو کیوں؟ کس کے لیے؟ اور کس کے انتظار میں؟

اس نے دل گرفتگی سے سوچا۔

یوں بھی ہم زندگی کو محض انفرادی طور پر صرف اور صرف اپنی زندگی سمجھ کر بھی تو نہیں گزار سکتے کیونکہ ہماری زندگی میں بہت سے دوسرے لوگوں کا بھی حصہ اور حقوق شامل ہوا کرتے ہیں اور اگر ہم اپنے حصے کے اور کیے جانے والے حقوق اور فرائض کو رد کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے بھی تو امکان غالب ہے کہ خود زندگی ہمیں رد نہ کر دے اور اب یہ وقت شاہ زین کے لیے اپنے حصے کے حقوق اور فرائض ادا کرنے کا تھا جبھی چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے اماں کے ہاتھ تھام لیے۔

”میں آپ کی بات کبھی ٹال سکتا ہوں کیا؟“

خاموش آنکھوں مگر مسکراتے ہونٹوں سے شاہ زین نے ان کے آگے سر جھکا کر گویا ان کے جینے کی عمر دگنی کر دی تھی۔ جس طرح سوتے جاگتے کی کیفیت انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے اور چند لمحوں کی گہری نیند بھی ذہن کو پرسکون کر دیتی ہے بالکل اسی طرح وہ آج تک ندی اور اس کی یادوں میں جکڑا ہونے کے باعث جس اذیت سے دوچار تھا اور اس سے بڑھ کر اماں اور ثمینہ کے سامنے جو ہر وقت خوش رہنے کی اداکاری کرنا پڑتی تھی اس نے شاہ زین کو اب تھکا دیا تھا۔ یہ امر اپنی جگہ ایک روشن حقیقت کی طرح موجود تھا کہ شاہ زین کو ندی سے محبت تھی اور رہے گی جو جگہ اس کے دل میں ندی کے لیے ہے وہ اب کسی اور کو دینا خود شاہ زین کے بس کی بات نہیں تھی مگر وہ اتنا خود غرض بھی نہیں تھا کہ اماں کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتا، ان کے جذبات، ان کے ارمان، ان کی چھوٹی چھوٹی حسرتیں اور خواہشات بھی تو اسی نے پورے کرنے تھے۔

سو بے حد سوچ و بچار کے بعد اس نے بغیر کسی بحث کے اماں کی خواہش کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ انہیں بتا دیا تھا کہ اس کے لیے اُن کی خوشی سے بڑھ کر نہ تو دنیا کا کوئی جذبہ اہم ہے اور نہ ہی کوئی احساس اور اُن کے ساتھ جڑا یہ پکا اور کھرا رشتہ اس کے لیے دنیا بھر کے تمام رشتوں سے معتبر بھی ہے اور سچا بھی۔

مختصر الفاظ میں آج شاہ زین نے اماں کو اپنی آنے والی تمام زندگی کے لیے پاور آف اٹارنی تھما دی تھی اور تب ایک بار پھر اماں نے اس کی خوشیوں کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ ایک بار پھر اس نے اماں کے گھٹنے پر سر ٹیک دیا تھا، اُن کی انگلیاں پھر سے اس کے بال سنوار رہی تھیں اور دل بے اختیار دعائیں دیے چلا جا رہا تھا۔ تب شاہ زین نے آخری مرتبہ ندی سے بات کرنے کا سوچا جو اب تک یقیناً اس کی بھابھی کی اطلاع کے عین مطابق کسی اور کی ہو چکی تھی۔ ”تو کیا اب اس کا ندی سے بات کرنا مناسب ہوگا؟“

دماغ پھر سے عقل کی چھڑی تھامے سامنے آن کھڑا ہوا تھا مگر اس نے فی الحال کچھ بھی سوچنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

گول ٹکیا سے زرد سورج کی شعاعیں دھیرے دھیرے منعکس ہو رہی تھیں۔ شام کے سائے بڑی

آہستگی اور غیر محسوس طریقے سے کھجور، ناریل اور یوکلپٹس کے درختوں پر اپنا عکس ثبت کیے جارہے تھے۔ لان کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر پام کے پودوں کی بے حد قریب محرابی سیڑھیوں کے ساتھ بالکونی سے گرتی بوگن ویلیا کی شاخیں زمین کی سمت جھکی سبک ہوا کے ساتھ یہاں وہاں خراماں خراماں جھول رہی تھیں۔ پام کے مور پنکھ جیسے پتوں والے پودے ہوں یا بوگن ویلیا کی کاسنی پھولوں سے ڈھکی ہلکورے لیتی بیل، بلو بیل کے پھول ہوں یا گلاب، چنبیلی اور موتیا کے خوب صورت پودے، آج سبھی کی چھب نرالی نظر آتی تھی اور کیوں نہ آتی منشی چاچا کی زیر نگرانی ایک ایک پودے کو رنگین برقی قمقموں سے سجا جو دیا گیا تھا۔ وسیع وعریض لان میں گھاس کا مخملی سبز قالین بچھا تھا۔

تین چار ملازمین بڑی تن دہی سے ان مقامات پر مچھر مار اسپرے کرنے میں مصروف تھے جو فرداً فرداً اُن کے ذمے لگائی گئی تھیں۔ میران بھی لان کے عین وسط میں دائیں سے بائیں ٹہلتا ہوا فون پر کسی سے بات چیت میں مصروف تھا۔ اس کی باڈی لینگویج سے یہ بات جاننا بالکل مشکل نہیں تھا کہ کوئی کام اس کی مرضی کے برعکس ہونے جارہا ہے جسے وہ روکنے کی کوشش میں ہے۔ فون پر اس کے اس طرح بات کرنے یا سمجھانے کا انداز شاذ ہی دیکھا جاتا تھا اور شاید ابھی مزید کچھ دیر وہ اسی طرح بے چینی کے عالم میں یہاں سے وہاں چکر کاٹتا رہتا کہ حویلی کے بیرونی اطراف سے گاڑی کے نامانوس ہارن کی آواز پر فون بند کر کے اس طرف متوجہ ہوا۔

اسلحے سے لیس چوکیدار نے بڑی سرعت سے گیٹ کھولا۔ حسب معمول دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جاکر معمولی سا جھکتے ہوئے سلام کیا اور گاڑی کے اندر داخل ہوجانے کے بعد اسی تیزی سے گیٹ بند بھی کر دیا۔ بیش قیمت گاڑی روش پر سے گزرتی ہوئی وسیع و عریض لان کا فاصلہ طے کر کے پورچ تک پہنچ کر رک گئی تھی۔ جہاں اس سے پہلے میران کی چمچماتی سیاہ جیپ موجود تھی۔ مہران کی Luxus کی جیپ، شاہ سائیں کے زیر استعمال Porsche اور اب آنے والی گہری سرمئی رنگ کی Rolls Royee۔۔۔

روپیہ پیسہ بڑی خاموشی سے گفتگو کیے جارہا تھا۔

چند ہی ساعتوں بعد سفید کلف دار شلوار سوٹ کے ساتھ، تلّے والی سنہری جوتی پہنے رحمٰن شاہ گاڑی سے نکلا۔ نزدیک ہی موجود مزارعوں کے سلام کا جواب دینے کا تکلف کیے بغیر ایک اچٹتی ہوئی نظر چاروں طرف کی گئی آرائش وزیبائش پر ڈال کر میران کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کے اپنی طرف بڑھتے قدموں کی پروا کیے بغیر اندر کی طرف چل دیا۔ میران جو پہلے ہی فون پر ہونے والی بات چیت کے نتیجے میں اکھڑا اکھڑا سا تھا اب رحمٰن شاہ کے اس رویے نے اسے جلا کر رکھ دیا تھا اور رحمٰن شاہ کا تعلق ایک تو اس کے ننھیال سے تھا اور پھر اب مستقبل قریب میں وہ جس رشتے پر فائز ہونے جارہا تھا اس نے میران کو ہر صورت احتیاط اور صبر کا دامن تھامنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر دراصل حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کا زور ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں پر ہی چلتا ہے۔ اس بھول کے ساتھ کہ بعض اوقات زمین پر پڑا بظاہر حقیر سا پتھر بھی اسے منہ کے بل گرا سکتا ہے۔ سو ہاتھ میں تھامے ہوئے موبائل کو بند مٹھی میں بھینچتے ہوئے حویلی کے اندر پہنچا تو دیوار پر ٹانگے گئے بارہ سنگھے کے سینگوں کے عین نیچے موجود صوفے پر رعب اور طنطنے کے ساتھ رحمٰن شاہ کو بیٹھے دیکھا۔ آگے بڑھ کر مصافحہ کرنے کے بعد میران نے سامنے ہی کڑھائی والی رنگین چادر اوڑھے ملکانی سائیں کو کندھے جھکائے بیٹھے دیکھا تو ایک عجیب سے احساس نے آن گھیرا۔

وہ آج تک کبھی بھی کسی کے بھی سامنے یوں اپنا آپ چھوڑ کر بیٹھی نظر نہیں آئی تھیں۔ چال ڈھال میں تو اکڑ تھی ہی مگر بیٹھتی بھی یوں تھیں کہ ریڑھ کی ہڈی تک میں خم نہ آنے دیتیں۔ گردن بھی کھجور کے درخت کی طرح ہمیشہ سیدھی ہی رہتی مگر آج۔۔۔ اُن کا یوں شکست خوردہ سا چہرہ۔۔۔ میران کو لگا تھا جیسے

کہ اس کے دل میں ماں کے لیے محبت آج پہلی دفعہ جاگی ہو، ایک عجیب طرح سے اس کے ذہن میں جیسے نامانوس سے جذبات ڈوب اور ابھر رہے تھے۔ سامنے بیٹھی ملکانی سائیں کا چہرہ سر شام ڈوبنے والے چاند کی مانند بے رنگ تو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور پھر اس وقت رحمٰن شاہ کے سامنے ان کا یوں بیٹھنا گویا سیاہ فام مفتوح کا سفید فام قیدی حاکم کی یاد دلا رہا تھا اور تب اسے پتا نہیں کیوں سامنے بیٹھا شخص انتہائی برا لگا تھا۔ جبھی خاموش قدموں سے چلتا ہوا اس صوفے تک پہنچا جس پر ملکانی سائیں بیٹھی تھیں۔ ان کے دائیں طرف کی نشست پر سوتی اپنے اگلے پنجوں پر سر رکھے بیٹھی گول مٹول آنکھوں سے ملکانی سائیں کو دیکھ رہی تھی سو میران نے بائیں طرف جگہ سنبھالی تو رحمٰن شاہ نے اپنی بات دوبارہ سے شروع کی جسے وہ یقیناً اس کے آنے سے پہلے کر رہا تھا۔

"چاچی! یہ تو تمہیں بھی پتا ہے نا کہ نہ تو میرا باپ ہے گا اور نہ ہی ماں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ جب باقی سارے کام تو بے شک وہ ہی کریں گے مگر مہربانو کے لیے کپڑے، جوتے، زیور وغیرہ یہ سب میں خود ہی خریدوں گا۔ بس مجھے انگوٹھی وغیرہ کا ناپ دے دو۔"

ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بائیں پاؤں کو ہلاتے رحمٰن شاہ نے بازو صوفے کی پشت پر دراز کرتے ہوئے کہا تو ملکانی سائیں نے چور نظروں سے ساتھ بیٹھے میران کو دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے بولیں۔

"ہاں تے پتر وہ تے سب ٹھیک ہے پر۔۔۔"

رحمٰن شاہ کی پیشانی پر چند سلوٹیں بڑی سرعت سے نمودار ہوئی تھیں۔ مہران شاہ البتہ خاموشی سے بیٹھا ان دونوں کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اگر شادی بعد وچ کر لیتے تے فیر۔۔۔؟"

"بعد میں۔۔۔؟" رحمٰن شاہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"او چاچی! بعد میں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کوئی کھیتوں کو پانی لگانا ہے یا فصلوں میں کیڑے مار دوا کا اسپرے کرنا ہے کہ آج نہیں تو کل کر لیں گے۔"

ملکانی سائیں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر رحمٰن شاہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"اور میرا احسان مانو چاچی احسان، کہ اُس سے شادی کر رہا ہوں ورنہ اس ہبنظین کے لیے مہربانو کو اگلے بارہ سال تک بٹھائے رکھنا تا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے کم از کم بالغ ہو جائے۔" احسان جتاتے ہوئے رحمٰن شاہ نے بڑا گہرا طنز کیا تھا جس پر میران کا ردِ عمل یقینی تھا۔ یوں بھی کسی بھی عمل پر ردِ عمل کے حق سے دستبردار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کی طرف سے جذبات کے باب میں رکھے گئے اپنے حصے سے دستبردار ہو رہا ہے۔ اچھا یا برا، شدید یا کم مگر ردِ عمل بہرحال فطرت کا خاصہ ہے۔

"یہ آپ کس لہجے میں بات کر رہے ہیں اماں سائیں سے؟ یہی بات آرام سے اور دھیمے لہجے میں بھی تو ہو سکتی ہے کہ نہیں۔" میران کے لفظوں سے زیادہ اس کی باہر کو ابلتی آنکھیں بول رہی تھیں۔ رحمٰن سے اپنی تعلق داری کا لحاظ تھا ورنہ شاید اب تک وہ اس کا گریبان پکڑ چکا ہوتا۔

"چل چل منہ بند رکھ اپنا۔ تیرے تو میں منہ نہیں لگنا چاہتا۔۔۔" رحمٰن شاہ کی آواز مزید بلند ہوئی۔

"اور یہ جو آنکھیں دکھا رہا ہے نا مجھے، نکال کر ہاتھ پہ رکھ دیتا اگر تیرے ننھیال والوں کا لحاظ نہ ہوتا تو۔۔۔" میران شاہ بھلا اس طرح کی دھمکیاں سننے کا کب عادی تھا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا مگر اس سے پہلے کہ آگے بڑھتا یا مزید کچھ کہتا ملکانی سائیں بڑی سرعت سے اس کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔

"پتر! یہ کیا کر رہے ہو دونوں۔ او ماں صدقے جائے رحمٰن سوہنا میں نے تے بس اک بات کی تھی پر توں تے ایک دم ہی غصہ ہو گیا۔"

"جانتا ہوں چاچی سب جانتا ہوں، تیری اک بات کے پیچھے بھی سو باتیں ہوتی ہیں ہمیشہ۔" ایک زہر خند مسکراہٹ میران کی طرف اچھالتے ہوئے ایک بار پھر اس نے ملکانی سائیں کو دیکھا۔

"اور چاچی سمجھا دے اپنے لاڈلے کو بھی۔۔۔ ادب کیا کرے اب میرا، آخر کو اس کی بہن کا گھر والا بننے والا ہوں۔"

میران اس بات کے جواب میں محض دانت پیس کر رہ گیا تھا۔

"اگر تھوڑا سا بھی پڑھ لکھ جاتے تو شاید خود بخود ادب کرنے لگتے۔ مگر اب ویسے نہ سہی تو اپنی بہن ہی کے واسطے رحمٰن بھائی عزت تو آپ کی کرنی ہی پڑے گی۔"

رحمٰن شاہ اس وقت میران کے ضبط کا امتحان بنا ہوا تھا اور ہزار بار زبان کو دانتوں تلے دبا کر رکھنے کی کوشش کے باوجود بھی بات منہ سے نکل ہی گئی۔ حالانکہ وہ اپنے اور اس کے درمیان نئے جنم لینے والے رشتے کی باریکی سے بخوبی واقف بھی تھا اور اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا کوئی بھی ایسا لفظ جو رحمٰن شاہ کی ناپسندیدگی کا باعث بنے وہ مہربانو کی زندگی میں بھی تلخیاں گھول سکتا ہے۔ مگر کیا کرے اسے زبان پر قابو رکھنے کی عادت ہی نہیں تھی جبھی یہ پہلی کوشش بھی مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی۔ مگر خلافِ توقع اور حیرت انگیز طور پر رحمٰن شاہ کا قہقہہ اس کے ساتھ ساتھ ملکانی سائیں کو بھی چونکا گیا تھا۔

"ہاہاہا۔۔۔ اچھا ہی ہے نا میں نہ تو تیری طرح یونیورسٹی گیا اور نہ ہی کسی لڑکی نے دُم پکڑ کر باہر پھینکا، آخر عزت تو ہے نا میری، کوئی گالی دے تو اس کی زبان کھینچنے کی تو ہمت ہے میرے اندر۔" زہر میں کھلی ہلکی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انتہائی تلخ جملوں کو ان کی سماعت کے حوالے کرتا رحمٰن شاہ میران کے لیے مکمل طور پر سیر کے ساتھ سوا سیر بنا ہوا تھا اور ملکانی سائیں جو میران کے ساتھ یونیورسٹی میں ہونے والے تمام واقعات کی تفصیل سے ناواقف تھیں، نا سمجھی سے ان دونوں کے چہرے دیکھنے لگیں۔ غصے کے مارے میران کا برا حال تھا اور جس کی بڑی وجہ یہ بھی کہ وہ اپنے غصے کا اظہار کر نہیں پا رہا تھا۔

"رحمٰن سوہنیا کنا مسلیاں (مسئلوں) وچ پے گئے ہو؟" میران کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کرتے ہوئے خوشامدی انداز اختیار کرتے ہوئے انہوں نے موضوع بدلنا چاہا تھا۔

"چاچی! کوئی ناپ دے دے، انگوٹھی اور چوڑیوں کا، نہیں تو میں اندازے سے ہی بنوا لیتا ہوں۔"

"رات کو نو بجے پتر میں نے بات کرنی ہے اُس سے، حویلی آنے کا کہوں گی نا فیر توں کل یا پرسوں آ کے تے ناپ لے جائیں۔"

"ہوں۔۔۔" رحمٰن شاہ نے پُرسوچ انداز میں مونچھوں کو بل دیا اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ نو بجے سے پہلے وہ بات نہیں کر سکتی؟"

"اس کا مسئلہ نئیں ہے پُتر! مینوں بہت کم نیں ابھی، بس ایس لئی۔"

"ویسے چاچی ایک بات مانے گی میری؟" سر کھجاتے ہوئے اس نے میران کے وجود کو مکمل طور پر نظر انداز کر رکھا تھا۔

"آج نہیں تو اور دو چار دنوں میں ہماری شادی تو ہونے ہی والی ہے تو۔۔۔ اگر مجھے مہربانو کا نمبر مل جاتا تو۔۔۔"

"یہ رسم و رواج ہمارے خاندان کے نہیں ہیں، بھول گئے کیا آپ۔۔۔" میران نے لفظ چباتے ہوئے کہا تو رحمٰن شاہ کے لہجے کی تلخی پھر سے لوٹ آئی۔

"وہاں اتنی دور غیر مردوں کے ساتھ لکھائی پڑھائی کرنا اور تمہارا یہاں اجنبی لڑکیوں کے ساتھ عیاشیاں کرنا، ہاں یہ بھی تو رسم و رواج ہیں ہمارے خاندان کے۔ ہے نا چاچی؟" ملکانی سائیں نے بے چارگی سے میران کی طرف دیکھا۔

"اگر کسی کے بھی دل میں کوئی بھی غلط فہمی ہے تو وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ ان حیلوں بہانوں سے میں اپنے حق سے پیچھے ہرگز نہیں ہٹوں گا اور ساری دنیا کو پتا ہے کہ میں بارات لے کر آؤں گا عین اُسی روز جب ہمارا یہ شہزادہ بارات لے کر جائے گا۔ یہی بات ہوئی تھی نا چاچی تیرے بھائیوں کے سامنے۔۔۔" رحمٰن شاہ نے تائید چاہی۔

"او تے سب ٹھیک ہے پر ایہہ گل ٹھیک نئیں کہ مہربانو کی تعلیم مکمل ہو جائے۔"

"نہ چاچی نہ، تعلیم مکمل کر کے بھی تو اس نے تیری طرح ملکانی بن کر حویلی میں ہی بیٹھنا ہے نا تو پھر کیا ضرورت ہے اتنے سال اور ضائع کرنے کی۔ ویسے بھی میں لڑکیوں کو پڑھانے لکھانے کے حق میں نہیں۔ قرآن پڑھیں اور اللہ اللہ کریں بس۔۔۔" بات ختم کر کے رحمٰن شاہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"چاچی تیرے لیے اماں سائیں نے جھمکا سیٹ بنوایا ہے، وہ بھی کنگن سمیت، بابا سائیں بھی سگے نہ ہونے کے باوجود پیسہ ہوا کی طرح اڑا اور پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔"

جواب میں مکمل خاموشی تھی۔ جسے رحمٰن شاہ نے اچھی طرح محسوس کیا اور اسی بات کے ردعمل کے طور پر جاتے ہوئے سلام دعا کیے بغیر باہر نکل گیا۔ البتہ اس کے ملبوس سے اٹھتی تیز خوشبو دیر تک ملکانی سائیں اور میران کو اس کی موجودگی کا احساس دلاتی رہی۔

اور اسی دن درحقیقت میران کو احساس ہوا کہ وہ ایک بہن کا بھائی ہے اور اسی کی خاطر آج وہ رحمٰن شاہ کی عزت کرنے پر خود کو زبردستی آمادہ کرتا رہا تھا۔ کیا یہ رشتہ واقعی اتنا پاورفل ہے کہ آج وہ اپنی عادت کے برعکس صبر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ملکانی سائیں جو ہمیشہ ہر ایک کے ساتھ انتہائی فاصلہ رکھ کر بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کیا کرتی ہیں، آج رحمٰن شاہ کے سامنے خوشامدی لہجہ اپنانے پر مجبور ہو گئیں۔ کیا بیٹیوں کے والدین اس قدر بے بس ہوتے ہیں؟ رحمٰن شاہ جو کہ شادی سے پہلے ہی اس انداز میں بات چیت کر رہا ہے تو داماد ہونے کے منصب پر بیٹھتے ہی اس کا اندازِ گفتگو کیا ہونے والا ہے؟ اور اگر اتنی زمین جائیداد اور روپے پیسے کی مالکن ہونے کے باوجود بیٹی کا معاملہ سامنے ہونے پر ان کا انداز ایسا تھا تو عام لوگوں کو کیا کیا نہیں سہنا پڑتا ہو گا ان مکار اور جلاد نما دامادوں کے ہاتھوں۔

اور رحمٰن شاہ جیسے لوگ جو اپنے ساس سسر کے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھتے ہوں تو وہ ان کی نازوں پلی بیٹیوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار نہیں کرتے ہوں گے۔

اور سچ ہی تو ہے کہ زیادہ تکلیف دہ دانت کا درد، بازو کا یا سر کا نہیں ہوتا بلکہ سب سے زیادہ تکلیف دہ درد وہی ہوتا ہے جس میں انسان خود مبتلا ہو، جو دکھ ہم خود محسوس کرتے ہیں وہی ہمیں سب سے بڑا دکھ معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے آج میران شاہ کے یہ احساسات تھے۔ اس نے ملکانی سائیں کو دیکھا جو سونی کو سینے سے لگائے اس کے نرم و ملائم فر جیسے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے صوفے کی بیک سے اپنی پشت ٹکا کر بند آنکھوں سے جو کچھ سوچ رہی تھیں۔ آج میران کے لیے یہ کوئی معمہ نہ تھا۔ اس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر انہیں کچھ مطمئن کر لے مگر ہاتھ میں پکڑے موبائل فون کی اپنی طرف متوجہ کرتی آواز سن کر اس کی اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

☆☆☆

پڑے جب دھوپ تو سر پر کبھی سایہ نہیں کرتے
ہم ایسے دوستوں پر وقت کو ضائع نہیں کرتے
ہنسی جن کی کبھی سورج کی کرنوں سی مثالی تھی
تمہارے بن قسم لے لو وہ مسکایا نہیں کرتے
تمہاری یاد میں گزارا ہوا ہر پل اثاثہ ہے
تمہاری یاد میں تو گل بھی مرجھایا نہیں کرتے

خدا اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ضرور ہے مگر پھر اس آزمائش سے نکلنے کی تدبیر بھی انسان کے ذہن میں وہی ڈالتا ہے اور جب اس تدبیر کے عمل میں آنے کا وقت ہو تو حالات کو سازگار اور موافق بنانے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہوتی ہے۔

ندی کی مخصوص بیل کی آواز سن کر عادل کو سلاتی

ثروت آپا اور بیڈ روم میں موجود عائشہ بھابھی لحہ بھر کے لیے چونکی ضرور تھیں مگر پھر ثروت آپا اوں آں کرتے ننھے منے کی جانب متوجہ ہوگئیں اور عائشہ بھابھی کی توجہ اسی وقت بجتے فون نے اپنی جانب مبذول کروالی۔ البتہ دل کے بے حد گھبرانے پر کمرے سے نکل کر لان میں موجود چترالی لکڑیوں کی کرسی پر بیٹھی امی کی جان گویا کسی نے مٹھی میں لے لی تھی اور دل اچھل کر حلق میں چلا گیا۔ بیل دینے کے اس انداز سے ندی کے علاوہ کسی اور کا ہونا خارج از امکان تھا۔ جبھی سوکھتے حلق اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ یہاں وہاں دیکھ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے بیرونی گیٹ کھول کر دیکھا مگر وہاں کسی کو بھی نہ پا کر مایوسی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔

''کوئی بھی نہیں ہے؟''

دائیں بائیں دیکھتے ہوئے انہوں نے خود کلامی کی پھر گیٹ کے عین بائیں طرف موجود نیم کے درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے چادر میں لپٹی لپٹائی ندی کو دیکھا تو اس پل انہیں ایسا لگا جیسے وہ ابھی اپنی ٹانگوں پر مزید کھڑا نہیں رہ پائیں گی۔

''ندی بیٹا۔۔۔!''

اُن کی آواز سنتے ہی ندی درخت کے پیچھے سے نکل کر اُن کے پاس آ کر رکنے لگی مگر انہوں نے فوراً آنکھوں کے اشارے سے اسے کمرے کی لان میں کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے فوراً سے پیشتر اندر جانے کے لیے کہا اور چند لمحوں بعد خود پیچھے کے رستے کے بجائے سیدھے رستے سے لاؤنج کی طرف بڑھیں جہاں سامنے ہی موجود عائشہ بھابھی ہاتھ میں فون پکڑے ان کی منتظر تھیں۔

''کون تھا باہر؟'' کھوجتی نظروں سے تفتیشی لہجے میں پوچھا گیا سوال امی نے سنا ضرور مگر نظر اٹھا کر انہیں دیکھنے کے بعد جھوٹ بول کر جواب دینے کے بجائے خاموش رہ کر گزر جانے کو ترجیح دی تو یک دم ذہن میں ابھرنے والے خیال کے باعث انہی قدموں پر پلٹ کر انہوں نے امی کے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور ندی کی کھوج میں یہاں وہاں کمرے میں نظریں دوڑانے لگیں اور اس سے پہلے کہ وہ ندی کی غیر موجودگی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کر کے واپس پلٹتیں واش روم کا دروازہ دھیرے سے کھلا اور ڈھلے ہوئے چہرے کے ساتھ ندی ان کے سامنے سے گزر کر قطعاً انہیں نظر انداز کر کے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔

''اکمل کب سے ثروت کے نمبر پر فون کر رہا تھا اٹھایا تو چاہیے تھا تمہیں، وہ کوئی فارغ نہیں ہے کہ بس بیٹھا تمہیں فون ہی کرتا رہے۔''

ان پر عجیب جھنجھلاہٹ سوار ہو چکی تھی، جبھی خوامخواہ اس پر برس پڑیں۔ اسی دوران امی بھی کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔

''لو بات کر لو، اب اس نے میرے موبائل پر کیا ہے۔''

وہ بھائی کے سامنے بری نہیں بننا چاہتی تھیں اسی لیے فون اسے دے رہی تھیں بصورت دیگر انہیں کبھی بھی گوارا نہ ہوتا کہ ندی ان کے فون سے انہی کے بھائی کی ہمدردیاں سمیٹے۔

''میں جب تک یہیں بیٹھی ہوں۔''

سوجی ہوئی آنکھوں اور بے رونق چہرے کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بھابھی نے فون اسے دینے سے پہلے کان سے لگایا مگر رابطہ تو جانے کب کا منقطع ہو چکا تھا۔ سو انہوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ایک گہری سانس لیتے ہوئے بیٹھنے کا ارادہ ترک کیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں نے کہا تھا نا کہ وہ اتنا فارغ نہیں ہے، فون بند کر دیا ہے اس نے۔''

اب اگر فون آتا بھی تو وہ ریسیو نہ کرنے کے بعد فون کے کمرے میں ہونے اور اپنے کچن میں ہونے کا بہانہ کر سکتی تھیں۔ جبھی مطمئن بھی تھیں اور صرف وہی نہیں ان کے اٹھ جانے پر خود امی اور ندی نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ جیسے ہی وہ اٹھ کر کمرے سے نکلیں ناصر بھائی کی گاڑی بھی گھر میں داخل ہو گئی تھی جس کی آواز ندی کے کانوں میں طوفان سے قبل چلتی تیز ہواؤں کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ امی بیڈ پر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی تھیں۔ ندی نے کمرے کو اندر والی سائیڈ سے لاک کیا اور خود بھی دونوں ٹانگوں کو سمیٹ کر گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر چند لمحے کے لیے لفظوں کو اپنے اندر ترتیب دیتی رہی۔ بار بار تھوک نگلتی اور ہونٹوں پر زبان پھیرتی ندی نے سامنے موجود صبر اور ہمت کے پیکر کو دیکھا۔ ان کے سامنے آنسو نہ بہانے کا عہد تو وہ خود سے کر لی ہی آئی تھی اور اب اسے نبھانے کی باری تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پے در پے جذباتی دھچکوں کے باعث اب ان کے لیے یہ آخری امید ٹوٹنے کا صدمہ بڑا کٹھن ثابت ہو سکتا ہے اسی لیے پہلے تو سوچا کہ اصل بات کو چھپا جائے اور ان کو اس حقیقت سے بے خبر رکھا جائے کہ اب دنیاوی طور پر اس کے پاس کسی سہارے کی امید تو کیا خیال بھی باقی نہیں بچا ہے اور شاید وہ یہ بات کہہ بھی دیتی کہ امی نے بڑے دھیمے مگر پر سوچ انداز میں خود ہی بات کا آغاز کیا۔

''اگر شاہ زین اور اس کی فیملی گھر چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے ہیں اور آج کل میں اس کی شادی بھی متوقع ہے تو۔۔۔ تم نے پھر کیا سوچا ہے؟''

''امی۔۔۔!'' حیرت نے اس کی زبان کو جیسے گنگ کر ڈالا تھا۔ بھلا وہ یہ سب کیسے جان سکتی ہیں جسے چھپانے کی کوشش خود وہ کر رہی تھی۔

''آ۔۔۔ آپ کو کیسے پتا چلا سب کچھ؟'' ندی کی بات کے جواب میں انہوں نے بڑی خاموشی سے تکیے کے نیچے سے اس کا وہی والٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جو اس سے کہیں کھو گیا تھا جواباً ایک بار پھر حسب سابق ندی کی سوالیہ آنکھیں ان کے چہرے پر جا رکیں۔

''شاہ زین کے گھر کے سامنے ہی تمہارا والٹ گر گیا تھا اور ان کا پڑوسی موٹر سائیکل پر گھر تک پہنچا کر گیا ہے، اللہ کی رحمت سے میں اس وقت لان میں ہی بیٹھی تھی اس لیے گیٹ میں نے ہی کھولا اور مختصراً شاہ زین کا بھی پوچھ لیا اور تب سے میں وہیں باہر ہی بیٹھی تھی۔'' ندی نے سر جھکا لیا تھا۔

''بچے کو اندر بلا کر چائے پانی نہیں پوچھ سکی، اس بات کا بھی دل کو بہت ملال ہے، اب اللہ معاف کرے۔''

''میری وجہ سے جانے ابھی کتنے ہی ملال آپ کے دل کو سہنے پڑیں گے نا۔'' وہ شاہ زین کے یوں ساتھ چھوڑ جانے پر خود کو پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ مجرم تصور کر رہی تھی۔ میاں محمد بخش کے کلام کا ایک فقرہ ''جناں پیچھے پاپ کمائے کتھے نئیں تیرے گھر دے'' رہ رہ کر اس کے ذہن میں بانسری کی افسردہ سی دھن کی طرح پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ امی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما تو وہ ان سے لپٹ گئی۔

''مجھے معاف کر دیں امی۔۔۔! خدا کا واسطہ ہے مجھے معاف کر دیں، میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں اور میں۔۔۔ شاید میں یہی کچھ ڈیزرو کرتی ہوں جو میرے ساتھ ہو رہا ہے۔''

''میری جان۔۔۔! تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا، کوئی تکلیف نہیں دی، ہم نے خود اپنا ہی بویا ہوا کاٹا ہے۔۔۔ تم تو بچی تھیں تمہیں کیا خبر، جیسی تربیت ہم نے کی تم اسی تراش خراش کے ساتھ پروان چڑھتی گئیں۔ قصور ہمارا اپنا ہے۔۔۔ اگر ہمیں آج تمہاری کچھ عادتوں پر اعتراض ہے تو غلطی ہم بڑوں سے ہوئی، کیوں تمہاری شخصیت میں ان عادات کو پروان چڑھنے دیا جن کے باعث آج تمہیں موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔۔۔ تم ناصر کے سامنے پلی بڑھیں جوان ہوئیں اور آزادی کے ساتھ دوستوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہیں، تب تک تو وہ خود تمہیں لاتا لے جاتا رہا، اب ایک دم۔۔۔'' امی نے ناصر بھائی کے متعلق کوئی بھی بات کرنا تقریباً چھوڑ رکھی تھی مگر آج اپنی بچی کے ڈانواڈول ہوتے مستقبل نے شاید ان کی زبان کا قفل کھول دیا تھا۔

"تیز رفتار سے چلتی گاڑی کو بھی یوں ایک جھٹکے سے روکا جائے تو حادثہ یقینی ہوتا ہے پھر تم سے یا کسی بھی انسان سے یہ توقع کیوں کر لیتے ہیں ہم لوگ۔"

"نہیں امی! غلطی میری ہی ہے، آپ خود کو یا کسی بھی اور کو پلیز قصور وار نہ سمجھیں۔۔۔ جانے انجانے میں مجھ سے ہی کچھ ایسا ضرور ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ وقت دیکھنا پڑا۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ بس جو قدرت کو منظور۔" امی نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے تقدیر اور نصیب کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"ویسے امی ایک بات سمجھ نہیں آئی اب تک۔" امی کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش میں پوری طرح کامیاب ندی کا پست اور تھکاوٹ سے چور لہجہ اس کے چہرے کے ساتھ مل کر اس کوشش سے بغاوت کر چکا تھا۔

"قدرت بعض اوقات ایسے فیصلے کیوں کرتی ہے جس سے ہنستے بستے گھر اجڑ جائیں، دل ٹوٹ جائیں اور کئی زندگیاں تباہ ہو جائیں۔ وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا اس قدر دکھی کیوں کرتا ہے انسان کو۔"

"شش۔۔۔۔!" امی نے فوراً گردن نفی میں ہلاتے ہوئے اس کے خشک ہونٹوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ دی تھی۔

"دکھی نعوذ باللہ وہ نہیں کرتا بیٹی! اکثر اوقات ہمارے اپنے اعمال کا عکس ہی ہماری خوشیوں کو دھندلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح جیسے گرم پانی کھولنے پر اس کی بھاپ سے شیشہ دھندلا جائے تو غلطی شیشے یا بھاپ کی کون گنے گا۔ فطری بات ہے نا کہ نہ پانی کھولایا جاتا اور نہ ہی شیشہ دھندلاتا۔"

"لیکن امی۔۔۔!"

"جب بھی کوئی مشکل، پریشانی یا دکھ آ پہنچے نا بیٹا! تو اس کی رحمت کی طرف دیکھ کر یہ گمان کرو کہ یقیناً یہ آزمائش ہے کیونکہ جو جتنا محبوب ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی کڑی ہوتی ہے۔۔۔ لیکن ہاں یہ بھی یقین رکھنا کہ اللہ آزمائش میں ڈالنے کے بعد بخوبی نکال بھی لیتا ہے۔" ندی کو محسوس ہو رہا تھا کہ شاید امی بیٹھ نہیں پا رہیں، شاید کافی دیر سے لان میں بیٹھے رہنے سے ان کی کمر میں درد ہو رہا تھا۔ جبھی ذرا سا پیچھے کھسک کر انہیں لیٹنے میں مدد دی اور ان کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

"پتا نہیں امی! مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتا کہ پہلے ہماری آزمائش کیا کم ہو چکی ہے کہ سلسلہ تھم ہی نہیں رہا۔" امی نے عینک اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی

"ویسے آپ کو کیا لگتا ہے ہمارے ختم ہونے سے پہلے کیا یہ آزمائش ختم ہو جائے گی۔" ان کی طرف کروٹ لے کر کہنی تکیے پر ٹکانے کے بعد اس نے دائیں ہاتھ کا تکیہ بنا کر اس پر سر رکھا۔ ندی کی اس بات پر امی کا روم روم دکھا اور کرب کی حدت سے سلگ اٹھا تھا۔ اس دفعہ انہوں نے اپنا رخ ندی کی طرف موڑا۔ آج کا دن ان کی زندگی کے سخت ترین دنوں میں سے ایک تھا کہ جب ندی کے گھر سے جانے کے بعد سے ان کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ دعائیں مانگ کر اب تو جیسے زبان بھی تھکن سے نڈھال تھی اور سامنے وہ لاڈلی بیٹی جس کی آنکھیں وقت بے وقت رونے سے اصلی شکل کھوتی جا رہی تھیں۔ سفید مگر بے رونق چہرہ جس پر اب انہیں ازلی سرخی مفقود نظر آتی تھی اور ضبط کے باعث انار کے دانوں جیسے ہموار دانتوں تلے دبنے والے ہونٹ۔۔۔ جس کے ذرا سے منہ بسورنے پر گھر والوں کا خون خشک ہو جاتا تھا اب رو رو کر اپنے اصلی نقش کھو رہی تھی تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کے بال سنوارتے ہوئے بالآخر اسے حوصلہ دینے کو وہ بولیں۔

"سب آزمائشیں ختم ہو جائیں گی میری جان! تم بس خود کو اپنے رب کے حوالے کر دو اور۔۔۔ اور پرسکون ہو جاؤ۔" بلاشبہ اس وقت وہ اپنے ضبط کی آخری حدوں پر تھیں۔

"پرسکون ہو جاؤں امی؟" ندی تڑپ اٹھی تھی،

حیرت اور ناسمجھی اس کے چہرے پر مئی جون کی دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

"یونیورسٹی سے گھر آتے ہوئے پوائنٹ کی بس میں قدم رکھتے ہی تم کس قدر بے فکر ہو جاتی ہوگی نا کہ بس اب ڈرائیور انکل تمہیں بحفاظت منزل تک لے ہی جائیں گے، ان پر بھروسہ ہونے کی وجہ سے نہ تو تم نے کبھی روٹس پر دھیان دیا ہوگا اور نہ ہی روڈ پر موجود ٹریفک کی مشکلات کا۔" وہ یہ سب تمہید سمجھ نہیں پا رہی تھی مگر پھر بھی اثبات میں سر ہلا کر انہیں بات کو جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔

"تم اپنی منزل تک پہنچ تو جاتی ہو لیکن رستے میں دوسرے کئی لوگ مختلف اسٹاپس پر اتر کر تمہارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ ان کی منزل اور رستہ وہیں تک کا ہوتا ہے۔"

"لیکن امی۔۔۔!"

"بالکل ایسے میری بیٹی تم بھی اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لو کہ تمہاری زندگی کی گاڑی کو چلانے والی وہ ذات صرف اور صرف خدا کی ہے جو یقیناً تمہیں بحفاظت منزل تک تو لے جائے گا مگر شاید کچھ لوگوں کی منزل تم سے پہلے ہو اور ان کے لیے متعین کردہ رستہ تم سے پہلے ختم ہو جائے اور وہ رستے میں ہی تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں۔"

"جیسے بابا۔۔۔!" ندی کے منہ سے بالکل لاشعوری طور پر اچانک ہی نکلا تھا۔ امی نے حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور سوچا کہ کس قدر محروم ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہوتا۔ قدرت کی طرف سے عطا کردہ سب سے بڑی نعمت، سب سے منفرد انعام اور سب سے بڑھ کر ایک ایسا رشتہ جس کے ہوتے ہوئے دنیا والے اپنی زبانوں کے آگے بند باندھنے پر ہر صورت مجبور ہوتے ہیں، ایک ایسا سائبان جس کے نیچے پناہ گزین موسم کی شدت سے بے خبر سکون سے اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک ایسا درخت جو سورج کی جھلسا دینے والی شعاعوں کو خود تک روکے رکھتا ہے۔ جو آندھیوں کے جھکڑوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ جو ہر سرد گرم سہہ کر بھی دوسروں کو اپنی گھنی چھاؤں تلے پرسکون اور محفوظ رکھتا ہے۔

"ہاں۔۔۔ اور شاید شاہ زین بھی۔" انہوں نے ندی کے سامنے حقیقت کا آئینہ لا رکھا تھا اور حقیقت بلاشبہ ندی کے لیے بے حد کڑوی اور تلخ تو ضرور تھی مگر وہ اسے تبدیل بھی تو نہیں کر سکتی تھیں۔

"اس کا اور تمہارا ساتھ یہیں تک تھا، اس لیے اب اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچو کہ اب آگے تمہیں کیا کرنا ہے؟"

میں کیا کروں گا اگر وہ نہ مل سکا امجد
ابھی ابھی میرے دل میں یہ خیال آیا ہے

اور ندی جو کبوتر کی طرح اب تک آنکھیں بند کیے خطرہ موجود نہ ہونے کا یقین کیے بیٹھی تھی۔ امی کی باتوں نے جیسے اس کی آنکھیں ایک جھٹکے سے یوں کھول دیں کہ سامنے چکا چوند روشنی ہونے کے باعث ایک دم چندھیا گئیں۔ اسی پل ثروت آپا کے موبائل کی بجتی بیل نے دونوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ استفہامیہ نظروں سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ندی نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف انکل تھا جو اس کے لیے بے حد پریشان معلوم ہو رہا تھا اور ڈرائیو کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے بات کر کے مسئلے کا کوئی دائمی حل نکالنا چاہتا تھا۔

"کیسی ہو ندی؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"بس ٹھیک ہی ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں تلخی در آئی تھی

"ہوں۔۔۔ معلوم ہوا ہے مجھے سب کچھ، لیکن۔۔۔"

"پرسہ دے رہے ہو مجھے؟" کم از کم ندی کو اس کے لہجے سے یہ محسوس ہوا تھا۔ یوں لگا تھا گویا اس نے ندی سے تعزیت کرنے کو ہی فون کیا ہو۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارا لہجہ اور الفاظ دونوں سن کر مجھے واقعی افسوس ہوا ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔ میری تو ہر چیز ہی غلط اور قابل

افسوس ہے اب، یہ مجھے پہلے بھی پتا چل گیا ہے۔ اس اطلاع کی ضرورت نہیں تھی۔"

"تم میری بات کو غلط لے رہی ہو ندی اور تم جانتی ہو کہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" وہ اس کے دوستانہ استفسار کو منفی رنگ دے رہی تھی اور یہ بات اس کے لیے کسی طور بھی قابل برداشت نہیں تھی اور خود ندی کو بھی اس چیز کا احساس ہو چلا تھا کہ وہ اسے بغیر کسی غلطی کے سرزنش کر رہی تھی۔

"آئی ایم سوری اگو۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"ڈونٹ وری، آئی نو دیٹ۔" وہ سمجھ سکتا تھا کہ ندی جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ محض اس کی وقتی فرسٹریشن تھی اور بس۔

"لیکن ندی اب تمہیں ایک نئی زندگی جینی ہے۔ یہ مایوسی، اداسی اور بے بسی کا غلاف اتار پھینکو خود سے اور ایک دفعہ پھر پہلے جیسی۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ نہیں اگو! مجھے پہلے جیسا نہیں بننا، اب مجھے وہ بننا ہے جو میں شاید کبھی تھی ہی نہیں اور یا پھر۔۔۔ پتا نہیں۔"

وہ لفظوں کے آگے ہتھیار ڈال گئی تھی۔

"سب سے پہلے خود کو ریلیکس کرو ندی اور۔۔۔"

"اگو! ایک لمحے کے لیے تصور کرو کہ کوئی شخص رات کو ہنسی خوشی اپنے بھرے پرے کنبے کے ساتھ سوئے اور رات میں سونے کے دوران ہی گھر کی چھت گر جائے اور تمام افراد لمحہ بھر میں ملبے تلے دب کر ایک دوجے کے لیے اجنبی ہو جائیں، ساتھ ہونے کے باوجود بہت دور، سامنے ہونے کے باوجود پوشیدہ۔ ایسے میں ایک انسان اسی ملبے تلے زندہ بچ جائے اور وہیں پڑا کراہ رہا ہو، رشتوں کے یوں پل بھر میں چھن جانے پر نوحہ کناں ہو، اپنوں کے یوں ساتھ چھوڑ جانے پر نہ تو ماتم کر سکے نہ بین۔۔۔ اور خود اسے بھی خبر نہ ہو کہ وہ اس حالت میں کب تک جیے گا، تو اس پر کیا بیتے گی؟ موت تک کا سفر ان صدیوں نما گھڑیوں میں کیسے طے کرے گا؟"

ایک بار پھر اکمل کی بات کاٹ کر عجیب بے خودی کے عالم میں وہ بولتی ہی گئی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ امی کی آنکھوں سے نکلتے بے آواز آنسو اب ان کا تکیہ بھگو رہے تھے۔ اکمل جان گیا تھا کہ اس وقت وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی ہے اسی لیے چپ چاپ ہوں ہاں کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے ایک بہترین سامع کا کردار ادا کیا۔

"میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، سب کے ہوتے ہوئے بھی میں نے تنہائی کا عذاب اور کرب سہا۔ جب مجھے سہارا چاہیے تھا میرے اپنے خونی رشتے میرے لیے اجنبی ثابت ہوئے۔ میری ماں کے علاوہ کوئی کندھا ایسا نہ تھا جس پر سر رکھ کر میں اپنے اعتبار اور بھروسے کی میت پر آنسو بہا سکتی۔۔۔ اور شاید ہمیں اپنی ماں کے وجود کی قدر و قیمت کا احساس شدت سے ہوتا ہی تب ہے جب ہم دکھی ہوں، جب ہم چاہتے ہوں کہ کوئی ایسا ہو جو ہمارا دکھ درد بانٹ کر ہمیں تسلی دے سکے، ہماری آزمائشیں ختم ہونے کی دل سے دعا کرے۔۔۔ اگو! یقین جانو مجھے انہی دنوں میں احساس ہوا کہ خدا نے اپنی کتنی ہی صفات کی جھلک ایک ماں کے پیار میں عطا کی ہے اور پھر انہی صفات کے بدلے اور صدقے اس کے پاؤں میں جنت اتار دی۔"

لمحہ بھر رک کر اس نے سانس لیا اور آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش میں آنکھیں مسلتی امی کو دیکھ کر پھر بولی۔

"لیکن اگو! بس، اب اور نہیں۔ اب مجھے ہر حال میں اپنی ماں کی مسکراہٹ واپس لانی ہے، ایک نئی زندگی شروع کرنی ہے۔ ایک ایسی زندگی جس میں ماضی کی ہلکی سی شبیہ بھی نظر نہیں آئے گی کسی کو and you know i always follow my words۔"

"ویری گڈ ندی! I really appriciate it۔"

ندی نے اوپر تلے دونوں ہونٹوں کو دباتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کیں۔

"ایک بات کہوں اگر مائنڈ نہ کرو تو۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے جھجک گیا تھا۔

"ہاں بولو!"

"میں اور آپی بہن بھائی ضرور ہیں مگر ہم دونوں ایک الگ شخصیت اور مختلف مزاج کے لوگ ہیں۔ عائشہ آپی نے تمہاری زندگی دشوار کرنے میں بہت کردار ادا کیا ہے، شرمندگی تو ہے مگر حقیقت ہے اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں لیکن تمہارے رستے میں ان کے ہاتھوں بچھائے گئے کانٹے اگر میں چننا چاہوں تو۔۔۔؟"

"جذبات کا شکار مت بنو اگو! اور حقیقت کو تسلیم کرو۔" وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ چکی تھی جبھی فوراً ٹوک دیا۔

"تمہاری نئی زندگی میں ماضی کی کوئی جھلک نہیں ہوگی۔ ابھی تمہی نے تو کہا تھا نا۔" اس نے دفاع کرنا چاہا۔

"بے شک ایسا ہی ہوگا، لیکن مجھے اپنی نئی زندگی کے لیے کسی کی بھیک یا رحم نہیں چاہیے، خدا کے لیے اگو مجھ پر ترس مت کھاؤ۔"

"تم غلط سوچ رہی ہو، میں بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کسی اور کے گناہوں کی تلافی کرنے کے لیے تم اپنے جذبات کو فراموش کر دو گے؟ سب کو اپنا بویا خود کاٹنے دو اکمل! یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ میں نے شاہ زین کو کتنی شدت سے چاہا تھا اور اس دل نے کتنا ٹوٹ کر اسے پانے کی دعا کی تھی تم مجھ سے میری زندگی میں کیا حیثیت چاہتے ہو؟ اور میں یہ جاننے کے باوجود کہ تم آئس کریم پارلر میں ملنے والی لڑکی کو ہر جگہ صرف اس کی جھلک دیکھنے اور اس سے بات کرنے کی خواہش میں کس طرح پاگل ہو تمہیں کیا جگہ دے پاؤں گی اپنی زندگی میں؟" اکمل شرمندہ ہو گیا تھا کیونکہ اپنی تمام کیفیات سے اس نے خود ہی تو آگاہ کیا تھا ندی کو۔

"میں تمہارے خلوص کی قدر کرتی ہوں اگو! بس میرے لیے دعا کرتے رہنا اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" اور تب اکمل نے ایک بار پھر اس کی دائمی خوشیوں کے لیے بے حد دعا کرتے ہوئے بوجھل دل کے ساتھ گاڑی ایک سپر اسٹور کے سامنے جا روکی۔

☆☆☆

ستارے جو دمکتے ہیں
کسی کی چشم حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمال ابرو باراں میں
یہ نا آباد وقتوں میں
دل ناشاد میں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی
یہ کچھ دن بعد میں ہوگی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہوگی

اسکول، کالج اور اس کے بعد زندگی کا خوب صورت دور "یونیورسٹی کا زمانہ" جس کا سحر ساری زندگی انسان کو جکڑے ہی رکھتا ہے۔ جس کی حسین یادیں خاموشی میں بھی لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیتی ہیں اور دل ایک مرتبہ پھر ماضی میں پلٹ جانے کو مچلتا رہتا ہے اور سونے پہ سہاگہ اگر اس دور میں اچھے دوست میسر ہوں تو یہی دن ایک اثاثہ ثابت ہوتے ہیں۔

مہربانو، کنول اور میری بھی بلاشبہ آپس کے تعلقات کی کسوٹی پر خود کو پرکھنے کے بعد ہمیشہ خود کو خوش نصیب خیال کرتیں، وہ تینوں ہی دوستی کے رشتے کو ایک فرض سمجھ کر نبھایا کرتیں اور اسی بات کا نتیجہ تھا کہ تھوڑی دیر بھی ایک دوسرے سے نہ تو خفا رہ پاتیں اور نہ ہی دل میں کسی بھی قسم کی کوئی بدگمانی پالتیں۔ سو آج بھی جو کچھ ہوا اسے ان تینوں نے ہی رات گئی بات گئی کے مصداق اپنے ذہن سے نکال پھینکا تھا اور اب خوش گپیاں کرتے ہوئے شہر کے مشہور ترین ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہو رہی تھیں۔ مہربانو کی تمام شاپنگ تو ان دنوں میں ہوتی جب وہ چھٹیوں

میں گاؤں جاتی۔ تب ملکانی سائیں اور وہ ڈرائیور کے ساتھ جاتیں اور ضرورت کی ہر چیز خرید لاتیں۔ اسی لیے مہربانو کو کبھی بھی ہاسٹل میں کسی ایسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی تھی جس کے لیے خاص طور پر اسے یہاں آنا پڑتا۔ البتہ کنول اور میری چونکہ بہت جلدی جلدی اور ہر چھٹیوں کے بجائے چند طویل چھٹیوں میں ہی گھر جانے کو ترجیح دیتی تھیں اس لیے انہیں کسی نہ کسی چیز کی ضرورت پڑ ہی جاتی تھی اور جس کے لیے وہ اکثر اوقات اسی شاپنگ مال پر آنے کو بہتر خیال کرتیں جس کی بنیادی وجہ ایک ہی جگہ پر کپڑوں، جوتوں اور ہیئر بینڈز سے لے کر کتابوں اور میوزک سی ڈیز کا مل جانا تھا۔ اس سے پہلے وہ کالج ٹائم آف ہونے کے فوراً بعد دوپہر میں ہی آجایا کرتی تھیں اور آرام سے اپنی مطلوبہ اشیاء کی خریداری کر کے اور بعض اوقات وہیں کھانا کھا کر ہاسٹل کے طے کردہ وقت سے پہلے واپس بھی پہنچ جاتیں۔

مگر آج صورتِ حال اس لیے ذرا مختلف ہو چکی تھی کہ ان کا کافی سارا وقت چرچ آنے جانے میں بھی صرف ہوا تھا۔ اسی لیے آج جب وہ اس کئی منزلہ شاپنگ مال پر پہنچیں تو اس کے بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ اکثر دکان دار رش کم ہونے اور وقت ختم ہونے کے باعث اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ اکا دکا دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ تینوں نے منہ بسورتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیا خیال ہے واپس چلیں؟ شاپس بھی دیکھو آہستہ آہستہ بند ہو رہی ہیں۔" مہربانو نے تجویز دی۔

"اگر ابھی چلے گئے تو پھر دو ڈھائی ہفتے تک تو پتا ہے ناشیڈول کتنا ٹف ہے، پھر کہاں ٹائم ملے گا۔"

"اور پھر ڈائی سیکشن کے لیے کل جو بک چاہیے اس کا کیا کریں گے؟ وہ تو ہم تینوں میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہے نا۔" کنول نے بھی میری کی بات کی تائید کی۔

"یا ایسا کیوں نہ کریں، تم نے تو کوئی اور چیز نہیں لینی نا۔"

"نہیں تو۔۔۔" کنول کے مخاطب کرنے پر مہربانو بولی۔

"تو پھر تم اوپر سے جا کر بک لے آؤ، ہم جب تک اپنی کچھ چیزیں خرید لیتے ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے، اس طرح ٹائم بھی سیو ہو جائے گا اور ہمارا کام بھی نبٹ جائے گا۔" میری کی بات سے مہربانو بھی متفق نظر آئی اور انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی چادر مزید ماتھے تک کھینچی۔

"جس کا کام پہلے ختم ہو جائے وہ فون کر کے دوسروں سے پوچھ لے گا اور اس کے بعد بس اسٹاپ سے بس پکڑ کر ہاسٹل۔" میری نے قصہ نبٹایا اور تینوں مختلف سمتوں کی طرف رخ کر کے چلی گئیں۔

کنول نے میری کے ساتھ ساتھ مہربانو کے لیے بھی کچھ گفٹ لینے کا سوچ رکھا تھا مگر کیا۔۔۔؟

اور اس کیا کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان بھی اس کے سامنے جھول رہا تھا اور سر پر شاپنگ مال کے بند ہونے کے ساتھ ساتھ رات نو بجے سے پہلے واپس ہاسٹل پہنچنے کی تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ جبھی تو وقت کم اور مقابلہ سخت ہونے کے باعث پہلے تو ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں گھمانے کے بعد سب سے پہلے ان دونوں کے لیے فرینڈشپ کارڈ سلیکٹ کرنے کا سوچا اور اس کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں کو کوئی اچھا سا پرفیوم گفٹ کرے گی۔

میری کو اپنے شوز لینے تھے سو وہ اِدھر اُدھر ونڈو شاپنگ کرنے اور ڈریسز میں آج کل کے ٹرینڈز چیک کرنے کا اردہ ملتوی کرتے ہوئے ڈائریکٹ اسی سمت کی طرف چل دی جہاں سے ایک بار پہلے بھی وہ اپنے لیے جوتے خرید چکی تھی۔

مہربانو نے چونکہ بک لینی تھی اس لیے اسے لفٹ کا سہارا لے کر تیسری منزل پر آنا پڑا۔ اتنے بڑے شاپنگ مال میں جوتوں، کپڑوں، زیورات وغیرہ کی تو کئی دکانیں تھیں مگر کتابوں کی محض ایک ہی دکان تھی، جس سے یہاں آنے والوں کی علمی پیاس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں آکر ہمیشہ مہربانو کو ایک عجیب سا سکون ملتا۔ نئی کتابوں کو کھول کر ان کی ورق گردانی کرنے کے دوران ناک سے ٹکرانے والی نئی کتابوں کی مخصوص اور مانوس خوشبو اسے ہمیشہ اپنے بچپن کے دنوں میں لے جاتی جب وہ اپنی نصاب کی نئی کتابوں کو یونہی بار بار سونگھ کر تمام خوشبو اپنے اندر اتار لینا چاہتی تھی۔ مطلوبہ کتاب منتخب کرنے کے بعد ہاتھ میں تھام لینے کے بعد میری اور کنول کے فون کے انتظار میں وہ یونہی مختلف کتابیں دیکھتی رہی کیونکہ اس کے خیال میں نیچے جا کر ان کے انتظار میں کھڑا ہونے سے کہیں بہتر تھا کہ وہ اپنا وقت ان کتابوں کیساتھ گزارتی اور اسی دوران اس نے دو مزید کتابوں کو بھی خریدنے کے لیے منتخب کر لیا۔ آرام سکون سے دکان میں گھوم پھر کر کتابوں کا جائزہ لیتی مہربانو کو یہ احساس تک نہیں ہوا تھا کہ شاپ کیپر اب صرف اس کے انتظار میں کھڑا ہے۔ پتا چلا تو تب، جب خود اس نے مخاطب کیا۔

"میڈم! اگر آپ کو مزید کتابیں چاہئیں تو پلیز کل تشریف لے آئیں، مارکیٹ بند کرنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔" دکان دار نے بڑے مہذب انداز میں اسے وقت کا احساس دلایا تو وہ چونکی اور کاؤنٹر پر پیسے دیتے ہوئے اطراف میں نظر دوڑائی تو اس فلور پر تقریباً تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں اور اکا دکا لوگ اب لفٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اس نے بھی عجلت میں پیسے دیے اور جس لفٹ کی طرف سارے لوگ جا رہے تھے اسے چھوڑ کر دوسری لفٹ کا بٹن پریس کیا تو احساس ہوا کہ لفٹ پہلے سے خالی اور اسی فلور پر موجود تھی جبھی فوراً ہی لفٹ کا دروازہ کھلا، وہ اندر داخل ہو کر ابھی سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی اور بھی لفٹ کے اندر آن کھڑا ہوا۔

"آپ۔۔۔؟"

لفٹ کا دروازہ بند ہوتے ہی جہاں مہربانو، اکمل کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی وہیں اکمل بھی قدرت کے اس حسین اتفاق پر ایک خوش گوار حیرت کا شکار تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مہربانو کو یوں اتنے نزدیک سے بھی کبھی دیکھ سکے گا۔ یہ سب تو شاید اگر خواب میں بھی ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ یقین کرتا مگر یہ ایک حقیقت تھی۔ اس بات کا یقین کرنے کے لیے دل تو چاہا کہ لمحہ بھر کے لیے خود کو چٹکی ہی کاٹ لے مگر اس کی نوبت لفٹ کے تینوں اطراف میں موجود شیشوں کے باعث آئی ہی نہیں کہ جہاں نظر اٹھتی اکمل کو اپنے ساتھ مہربانو کا وجود نظر آتا اور روم روم خوشی سے جھوم اٹھتا کہ آٹھ اشخاص کی گنجائش والی اس لفٹ میں اس وقت صرف وہی دونوں موجود تھے اور اس کا دل چاہ رہا تھا اس سے پہلے کہ چند ہی لمحوں میں لفٹ انہیں گراؤنڈ فلور پر پہنچائے وہ کم از کم اسے اپنے دل کا کچھ احوال تو سنا ہی دے۔ آج ملنے والے قربت کے یہ چند لمحے پھر جانے کبھی نصیب ہوں یا نہیں۔

تیری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

اب سے کچھ دیر پہلے تک ندی کی وجہ سے دل میں جو بوجھل پن پیدا ہو چکا تھا وہ مہربانو کو دیکھتے ہی کہیں جا چھپا تھا۔ اس کے برعکس مہربانو یہ بات محسوس کرنے کے باوجود کہ وہ ایک شریف انسان ہے انتہائی ڈری ہوئی تو ضرور تھی مگر اس کے سامنے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش میں اپنے جوتوں پر نظر جمائے اس لیے بھی کھڑی تھی کہ سر اٹھا کر جہاں بھی دیکھتی شیشوں کی مہربانی سے اکمل کی پرشوق نظریں اس کے سامنے ہوتیں۔ جس کے وجود سے اٹھتی پرفیوم کی مسحور کن خوشبو کو وہ گہری سانس لے کر گویا اندر اتار چکی تھی۔ وہ جو کبھی بلاضرورت لڑکوں سے مخاطب نہ ہوتی تھی اور انتہائی ضرورت کے وقت بھی وہ کنول یا میری ہی کے ذریعے کام نکالتی اور لاسٹ آپشن کے طور پر کسی سے بھی براہ راست بات کیا کرتی آج اس کے ساتھ لفٹ میں تنہا موجود تھی اور اگر کبھی، کسی طور میران اسے دیکھ لے تو۔۔۔؟

اس خیال نے ذہن میں آتے ہی اس کے جسم پر کپکپی کی ایک لہر دوڑائی تھی جسے خود اکمل نے بھی محسوس کی اور وہ جو اس سے بات کرنے کا سوچ رہا

تھا، اس کے رویے کو دیکھ کر خاموش رہنے پر اپنے ذہن کو تیار کیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر مخالف سمت رخ کر لیا وہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ مہربانو کے ذہن میں تاثر پیدا ہو کہ وہ اسے اکیلا سمجھ کر تنگ کر رہا ہے اور اس کے یوں رخ موڑنے پر مہربانو جس کا دل پہلے ہی عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا اس کی شرافت کی قائل ہو گئی تھی اور اس کے دل میں اکمل کے اس عمل سے بلاشبہ اس کی عزت پیدا ہوئی تھی مگر ایک بات جو دونوں کو ہی خلافِ معمول محسوس ہوئی تھی یہ کہ اب تک تو انہیں گراؤنڈ فلور پر پہنچ جانا چاہیے تھا مگر وہ دونوں ہی لفٹ میں موجود تھے اور وہ بھی یوں کہ انہیں لفٹ کے حرکت میں آنے کا بھی احساس تک نہیں ہوا تھا۔ دو، تین، پانچ منٹ مگر آخر کب تک۔۔۔

ان کا چونکنا لازمی تھا۔ مہربانو نے بوکھلاہٹ میں ایک دو تین دفعہ مسلسل لفٹ کے بٹنز پر ہاتھ مارا۔ خود اکمل بھی تشویش کا شکار تھا کیونکہ بٹنز کے عین اوپر موجود تین کے ہندسے کے مطابق وہ لوگ ابھی تک اسی فلور پر موجود تھے جس پر سے وہ لفٹ کے اندر داخل ہوئے تھے۔

''لفٹ خراب تو نہیں ہے؟''

پہلی مرتبہ مہربانو نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں اسے مخاطب کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اکمل کی کیفیت اور مختلف ہوتی مگر اس وقت موقع کی نزاکت کو وہ خود بھی سمجھ سکتا تھا۔ جبھی پوری طرح کوشش کر لینے کے بعد بولا بھی تو محض چند الفاظ۔

''آئی تھنک سو۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟ مگر اب کیا ہوگا؟ کب کھلے گی یہ؟ باہر لوگوں کو کیسے پتا چلے گا کہ ہم اندر ہیں؟ کون آئے گا ہمیں نکالنے؟'' حیرت اور خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ یہ سب تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور اب اگر لفٹ نہ کھلی تو۔۔۔؟ اس سے آگے وہ کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔

''پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ یہ سامنے لفٹ سروس کا فون نمبر موجود ہے نا۔ ابھی انہیں فون کرتے ہیں اینڈ آئی ہوپ کہ وہ فوراً آکر لفٹ کھول دیں گے۔'' اکمل نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سادہ سے لہجے میں اس نے یوں دوستانہ انداز میں اسے تسلی دی تھی کہ مہربانو کو لگا جیسے اب واقعی مسئلہ حل ہونے والا ہے اور جیسے اسے سب مسئلے سلجھانے کا گر آتا ہو۔

بمشکل تھوک نگلتے ہوئے اس نے ہینڈ بیگ سے پانی کی چھوٹی بوتل نکالی اور انہیں قدموں پر بیٹھ کر منہ سے لگا لی۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ گویا ٹھنڈے ہوتے جسم کے ساتھ اب وہ دوبارہ ٹانگوں پر کھڑی نہیں ہو پائے گی۔ مساموں میں سے ٹھنڈے پسینے کے قطرے نکل کر لباس میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے نمودار ہوتی نیم تاریکی اور نارنجی و نیلے رنگ کے چھوٹے بڑے دائرے شاید اس کا ذہن دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے میں کامیاب ہو جاتے مگر صورت حال کی سنگینی اس کے سامنے تھی اور وہ کسی صورت اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ کر خود کو محض آتی جاتی سانسوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی، جبھی آنکھیں آخری حد تک کھول کر بار بار پلکوں کو جھپکاتے ہوئے اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ لفٹ کے اندر سروس کے فون نمبرز ہوتے ہی اس قسم کی ایمرجنسی یا پرابلم کے لیے ہیں مگر اکمل کے چہرے کے تاثرات شاید کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ مہربانو گردن اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے اس لمبے چوڑے انسان کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے سے لگتا تھا کہ جیسے کسی نے اسے بلندی سے ایک دم اچانک نیچے کی طرف یوں دھکا دیا ہو کہ اس کا وجود ہوا میں معلق اپنے ہونے نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے میں مصروف اور پاؤں زمین کو چھونے کے انتظار میں بے یقینی کا شکار ہوں۔

''وہ۔۔۔ فون تو میرا گاڑی میں ہی رہ گیا ہے۔''

مہربانو کو یوں ٹکٹکی باندھ کر خود کو دیکھتے پا کر اکمل کی شرمندگی مزید گہری ہو گئی تھی۔ ندی سے بات کرنے کے بعد دل پر یوں اداسی کی دھند کہر بن کر چھائی تھی

کہ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ وہ اپنا فون لیے بغیر ہی گاڑی سے باہر نکل آیا۔

''چچ، چچ۔۔۔ چلیں کوئی بات نہیں، میرے پاس ہے نا فون۔'' نفسیاتی مریضوں کے سے انداز میں مہربانو نے اپنے ہینڈ بیگ سے فون نکال کر اسے پکڑایا تو ضرور مگر اکمل کے چہرے کے تاثرات میں کوئی کمی نہ آئی۔

''مہربانو! آپ کا فون تو بند ہے، شاید اس کی چارجنگ ختم ہو چکی ہے۔'' اکمل نے آہستگی سے فون واپس اس کی طرف بڑھایا تو اسے یاد آیا کہ کنول کے کہنے پر جب وہ ہاسٹل فون کرنے والی تھی چارجنگ تو تب سے ختم تھی اور اگر اس نے پورے ٹائم پر ملکانی سائیں کو فون نہ کیا اور یا ان کی آئی ہوئی کال ریسیو نہ کی تو۔۔۔ حویلی میں کیا ہنگامہ مچ جائے گا اور وہ یہاں سے نکلے گی بھی کیسے۔۔۔ کیا پوری رات اسے یہاں اکیلے اس شخص کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔

گلے میں نمودار ہوتے خوردرو کانٹوں کی بدولت اس سے تھوک بھی نگلا نہیں گیا تھا اور پھر لحہ بھر میں جانے کیا دل میں آئی کہ اٹھ کر لفٹ کے دروازے کو بری طرح پیٹنے لگی کہ شاید کوئی متوجہ ہو جائے۔ مگر یہ ممکن بھی کیسے تھا۔ اس وقت وہ تیسری منزل پر موجود تھی جہاں سے اس کے سامنے ہی اکثر دکانیں بند ہو چکی تھیں اور باقی ہو رہی تھیں۔ اکا دکا لوگ بھی اس وقت نیچے کی طرف رخ کیے ہوئے تھے جب وہ لفٹ کے اندر داخل ہوئی۔

اکمل نے دروازہ پیٹتی مہربانو کو دیکھ کر بے بسی سے لب بھینچے۔

معاملے کی حساسیت اور نزاکت اس کے سامنے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پوری رات ہاسٹل سے باہر رہنے پر اسے کیا فیس کرنا پڑ سکتا ہے اور وہ خود۔۔۔ وہ بھی تو اسی معاشرے کا حصہ تھا یہ الگ بات تھی کہ مرد ہونے کے ناتے اس کے سب عیب اور خامیاں جلدی چھپ سکتی تھیں مگر وہ۔۔۔ مہربانو۔۔۔!

دروازہ پیٹ پیٹ کر وہ وہیں تھک کر بیٹھ گئی تو اس کی آنکھوں سے ابلتی وحشت اور چہرے کی موت سی خاموشی نے اکمل کو لاشعوری طور پر لفٹ کے کونے کے مزید نزدیک کر دیا تھا۔

☆☆☆

اچانک پھر بچایا ہے کسی نادیدہ ہستی نے
مگر کیسے ہوا یہ معجزہ معلوم کرنا ہے
تجھے کچھ یاد ہے کس وقت کل میں یاد آیا تھا
مجھے اے ماں! تیرا وقتِ دعا معلوم کرنا ہے

ثمینہ اماں کے کہنے پر چائے بنا کر لائی تھی اور ابھی چائے پینے کے دوران جان بوجھ کر ثمینہ نے شاہ زین کے سامنے زرمین کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ ابھی بات ابتدائی دور میں ہی تھی کہ اماں نے زرمین کے متعلق اپنے خدشات ثمینہ کے آگے رکھے۔ شاہ زین البتہ خاموشی سے چائے پینے میں یوں مصروف تھا کہ گویا بولنے سے اس میں سے ذائقہ ختم ہو جائے گا اور یا پھر اسے لگتا تھا کہ ذہن سے وہ الفاظ بھی محو ہو گئے ہوں جن سے گفتگو کا آغاز یا اختتام کیا جا سکتا۔

''ثمینہ بیٹا! تم جو زرمین کی بات لے کر بیٹھی ہو، جانتی بھی ہو کہ وہ کون ہے، کہاں سے ہے؟ یا یہ کہ اس کی کہیں اور بات چیت تو طے نہیں ہو چکی؟''

''تو اماں! اس میں کیا پرابلم ہے بھلا؟ میں ابھی فون کر لیتی ہوں۔'' ثمینہ کی ایکسائٹمنٹ کا تو عالم ہی نرالا تھا۔ فون کے نزدیک ہی تو بیٹھی تھی سو وہیں سے رخ موڑ کر فون اٹھایا، ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی سامنے گول میز پر رکھی اور کشن گود میں رکھ کر نمبر ملایا۔ فون کسی معمر خاتون نے اٹھایا تھا، جن کی آواز ان کی عمر اور کمزوری کی گواہی دے رہی تھی۔ زرمین کا دریافت کرنے پر انہوں نے ہولڈ پر فون رکھ کر زرمین کو آواز دی اور چند لمحوں بعد زرمین کی سوئی سوئی آواز ثمینہ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ ساتھ ہی اس نے فون پر موجود بٹن دبا کر اسپیکر آن کر دیا تاکہ اماں ساری ہونے والی بات چیت خود سن لیں اور اسے دہرانا نہ پڑے۔

''آئی ایم سوری زرمین! شاید آپ سو رہی تھیں

اور میں نے ڈسٹرب کر دیا۔"

"نہیں تو، نہ ہی میں سو رہی تھی اور نہ ہی آپ نے مجھے ڈسٹرب کیا، ان فیکٹ میں تو خود اگلے چند منٹوں میں آپ کو فون کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کنفیوژ تھی۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟" ثمینہ نے الجھ کر اماں کی طرف دیکھا جو پوری توجہ سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"وہ دراصل۔۔۔ثمینہ۔۔۔!" چند لمحے رک کر زمین نے لفظوں کو ترتیب دیا۔

"اب شاید ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔"

"نہیں ہوگی کیا مطلب؟" خلاف توقع ہوتی بات چیت ثمینہ کو حیران کیے ہوئی تھی۔ اماں اور شاہ زین کے چہرے پر البتہ حیرت یا چونکنے کے کوئی تاثرات نہیں تھے، دونوں ہی بڑے کمپوز طریقے سے ان دونوں کے درمیان ہوتی بات چیت سن رہے تھے۔

"مطلب تو نہ ہی پوچھو تو میرا خیال ہے بہتر ہے کیونکہ میں بتانا نہیں چاہتی۔"

"لگتا ہے شادی ہو رہی ہے آپ کی اچانک۔" ثمینہ کی سوچ آج یہیں پر ختم تھی اور اس کے انداز نے زمین کو ایک تلخ ہنسی ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ جسے خود ثمینہ نے بھی محسوس کیا۔ اس نے جس امید اور خیال سے فون کیا تھا وہ ٹوٹنے پر یوں بدمزا ہوئی گویا کسی نے سوتے میں اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو، سامنے پڑی گرما گرم چائے اب صرف ایک رنگ دار محلول کے طور پر نظر آتے ہوئے اپنا مزا اور خوشبو کھو کر بے وقعت محسوس ہو رہی تھی۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یوں اچانک۔۔۔؟"

"ہوں۔۔۔" زمین نے ہنکارا بھرا۔ اتنے سارے دنوں میں وہ یہ تو جان چکی تھی کہ ثمینہ یوں ٹلنے والی نہیں ہے اور اس کا یوں ایک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ حافظ کہنا یقیناً اسے دنوں تک پریشان رکھے گا جبھی کچھ سوچنے کے بعد بولی۔

"یہ سمجھو کہ آنٹی کی دعاؤں نے تم سب کو ایک بڑی مصیبت سے بچالیا ہے۔ ایسی مصیبت سے جو میرے توسط سے تم سب تک پہنچتی مگر ڈونٹ وری اب ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔" زمین کے اس انکشاف نے جہاں ثمینہ کو اچھلنے پر مجبور کیا تھا وہاں اماں اور شاہ زین بھی چونک گئے تھے۔

"ثمینہ! سچ کہوں تو شروع کے دنوں میں مجھ سے ناواقفیت کا اظہار اور حیرت سب درست تھا کیونکہ میں واقعی کبھی اس کالج میں گئی ہی نہیں تھی اور نہ ہی میں کوئی اسٹوڈنٹ ہوں، بس اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ضرور تھی۔"

"مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہا زمین!"

"خود کو اتنا مت الجھاؤ، بس اتنا ہی جان لو کہ میں آئی نہیں تھی مجھے بھیجا گیا تھا جس کی محبت میں، میں پاگل تھی اور جسے حاصل کرنے کی خواہش میں، میں نے اپنی عزت وقار سب داؤ پر لگا دیا، اس نے میرے خالی دامن میں اپنی محبت اور عمر بھر کی رفاقت کی بھیک ڈالنا اس شرط پر گوارا کیا تھا کہ میں کسی بھی طریقے سے اس شخص کو نیچا دکھاؤں جس کی وجہ سے اس کی بدنامی پوری یونیورسٹی میں بھی ہوئی تھی اور دوستوں میں بھی۔"

چائے کا گھونٹ کے لیے شاہ زین کے لبوں تک جاتا جاتا کپ وہیں رک گیا تھا، ایک جھٹکے سے تینوں کی نظریں ایک دوجے سے یوں ٹکرائیں کہ آنکھوں کا حجم حقیقت سے دوگنا ہو چکا تھا، ثمینہ کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہا اور اماں کے چہرے پر یوں دھیرے دھیرے زردی پھیلنے لگی جیسے شفاف پانی میں نیل کا ایک قطرہ گرے اور آہستہ آہستہ سارے پانی میں نیلاہٹ گھول کر اس کی اپنی شناخت ختم کر دے۔

"میں شاہ زین کی کلاس فیلو تو نہیں مگر یونیورسٹی فیلو ضرور تھی اور سارے معاملے سے واقف بھی۔۔۔ جب تک شاہ زین ہماری یونیورسٹی میں نہیں آیا تھا، میران اور میری بہت اچھی دوستی تھی، لیکن اس کے یونیورسٹی جوائن کرنے اور ندی سے دوستی کے بعد ہم

دونوں کی دوستی آہستہ آہستہ یک طرفہ ہوتی گئی اور محبت تو ویسے بھی ہمیشہ بس میں نے ہی اس سے کی تھی۔ ہونہہ۔۔۔ کیونکہ پہلے میران کا خیال تھا کہ ندی کسی بھی لڑکے سے اس طرح کی دوستی کرنا پسند نہیں کرتی جیسی اس کی اپنے بچپن کے دوست زبیر سے تھی اور وہ بھی صرف چونکہ دوستی تھی اس لیے سب کی طرح وہ بھی مطمئن تھا لیکن۔۔۔"

لہجے میں صدیوں کی مسافت کی تھکن لیے وہ چند لمحے رکی۔ ادھر ثمینہ، اماں اور شاہ زین اپنی اپنی جگہ یوں منجمد بیٹھے تھے جیسے کسی جادوگر نے منتر پھونک کر ساکت و جامد کرتے ہوئے صرف اور صرف سانس لینے کی آزادی بخشی ہو۔

"شاہ زین کے یونیورسٹی آنے، ندی سے دوستی ہونے اور پھر ان کی دوستی کے محبت میں بدل جانے کا علم ہو جانے پر وہ تلملا اٹھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک اعلا سیاسی اور مال دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ندی پر پہلا "حق" اس کا ہے اور یہ بھی کہ ندی شاہ زین پر اسی کو فوقیت دے گی مگر۔۔۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہ ہوا، پتا نہیں میری دعاؤں کا اثر تھا یا ان کی محبت۔۔۔ ہمیشہ ہی میران کو ناکامی ہوئی اور پھر آخر کار وہ سب ہوا جو شہر والوں نے اخباروں میں پڑھا اور زبانوں سے سنا۔"

"زمین یہ سب۔۔۔؟"

"ہاں ثمینہ! یہ سب سچ ہے، اتنا ہی سچ جتنا یہ کہ وہ ایک انتہائی خود غرض انسان ہے، وہ جانتا ہے کہ میں اس سے کس قدر محبت کرتی ہوں اور مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی شرط اس نے یہ رکھی کہ میں کسی بھی طریقے تم لوگوں کے قریب ہو کر تم سب کا اعتماد حاصل کر کے اس کے شہر والے فلیٹ پر لے جاؤں اور پھر ساری کالونی میں تم لوگوں کو بے عزت کر کے شاہ زین پر ایسے الزامات لگاؤں کہ وہ کبھی اس شہر میں نظر نہ آئے۔"

"اوہ میرے خدا!" اماں نے خود کلامی کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ شاہ زین نے بھی ذہن پر زور دیا تو زمین کا یونیورسٹی میں کبھی کبھار نظر آنا اور مہران ہی کے گروپ میں ہونا بھی یاد آگیا۔ گھر پر تو شاہ زین نے اسے بمشکل ایک دو مرتبہ ہی دیکھا تھا کیونکہ اس کے آنے کے اور زمین کے واپس جانے کے اوقات قدرے مختلف ہوا کرتے تھے۔

"اگر پہلے تم اس کے ساتھ پروپیگنڈا کر کے ہماری ہر طرح بے عزتی کروانے پر تیار تھیں تو اب۔۔۔ اب کیسے ضمیر جاگ گیا تمہارا خود غرض لڑکی!" ثمینہ نے دانت چباتے ہوئے نہ تو اپنے لفظوں سے غصے کو پوشیدہ رکھا اور نہ ہی لہجے سے۔

"مجھے احساس ہے کہ میں نے غلط فیصلہ ضرور کیا تھا، مگر میں مطمئن ہوں کہ اس کے لیے دل میں موجود بے پناہ جذبے کے باوجود میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے کسی بھی طریقے سے شاہ زین یا اس کے گھر میں موجود کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچے۔۔۔ اماں کی محبت اور تمہاری سادہ طبیعت، ہمیشہ سے میرے کسی بھی ارادے کی راہ میں رکاوٹ ہی رہے۔"

"ہونہہ! یوں کہو کہ اب وہ ہی تمہیں لفٹ نہیں کرا رہا۔" زمین کے اعتراف جرم کے بعد ثمینہ نے یونہی اندھیرے میں تیر چلایا جو کہ عین نشانے پر جالگا۔ البتہ شاہ زین اب تک تقدیر کے اس معمہ پر حیران تھا۔ وہ جو کہ خاموشی سے ایک کنارے پر ہو گیا تھا اب تک کسی کی تیر کمان کی زد میں تھا اور یہ الگ بات تھی کہ اماں کی کی گئی تمام دعائیں ڈھال بن کر ان تیروں کے سامنے آکر اسے اب تک محفوظ رکھے ہوئے تھیں۔

"ہاں۔۔۔ اور اب وہ مجھے لفٹ کروائے گا بھی کیوں؟ اگلے ہفتے اس کی اور ندی کی شادی جو ہے۔" زمین کے شکست خوردہ لہجے کے ساتھ ہی ثمینہ نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ اس کے کیے گئے انکشافات درحقیقت ان تینوں ہی کے لیے باعث تشویش بھی تھے اور وجہ فکر بھی۔

”ندی اور میران کی شادی اب ہو رہی ہے تو پھر عائشہ بھابھی کے مطابق جہاں شادی ہونے والی تھی کیا وہاں نہیں ہو پائی؟ کیا انہوں نے انکار کر دیا تھا؟ کیونکہ ندی نے بھی اپنے بھیجے گئے میسج میں شادی کا بتایا تھا اور اگر اب شادی ہو رہی ہے تو وہ بھی میران کے ساتھ۔۔۔؟ اور ندی جیسی لڑکی میران سے شادی پر رضامند بھی ہو گئی؟ اگر یہ سب حقیقت ہے تو پھر یونیورسٹی میں جو کچھ ہوا وہ کیا تھا؟

ایک کے بعد ایک خیالات کا تانا بانا یوں بندھا کہ محسوس ہی نہیں ہو پایا کہ اتنی دیر سے فون بند کر دینے کے بعد بھی وہ لوگ ایک دوسرے سے کچھ بھی شیئر یا ڈسکس کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنے ہی اندر گم ہیں۔ احساس ہوا تو تب جب اماں نے شاہ زین کو پکارا، ان کی طبیعت بگڑ رہی تھی، شاید ایک دم ذہن پر بوجھ ڈالنے سے ان کا شوگر لیول ہائی ہو گیا تھا۔

شاہ زین اور ثمینہ نے انہیں دیکھا تو سب کچھ بھول بھال کر ان کی طرف لپکے۔ وہ صوفے پر ہی نیم دراز ہو چکی تھیں، شاہ زین نے فوراً انہیں جھنجھوڑا، ثمینہ فوراً ہی سامنے میڈیکل باکس میں رکھی گلوکو میٹر نکال لائی اور ان کی انگلی کی پور پر سوئی چبھونے کے بعد نکلنے والے خون کے ایک قطرے کو گلوکو میٹر میں ڈالی جانے والی ننھی سی اسٹرپ پر لگایا اور انگلی کو روئی کی مدد سے صاف کرنے کے دوران دو تین سیکنڈز میں اسکرین پر نظر آنے والا ہندسہ دیکھا تو گویا پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ رزلٹ کے مطابق ان کی شوگر انتہائی زیادہ تھی۔ شاہ زین نے فوراً ہی انہیں ثمینہ کے حوالے کیا۔ کمرے میں جا کر اپنا والٹ اور موبائل اٹھایا اور اسی طرح ٹریک سوٹ اور سلیپرز میں فوراً گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد ثمینہ کی مدد سے انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر اسے اچھی طرح گھر لاک کر لینے کی ہدایت کی اور ہوا کی رفتار سے گاڑی اڑاتا ہوا ہاسپٹل پہنچنے کی سعی کرنے لگا۔

☆☆☆

یہ دنیا جھوٹ مکر سائیں
یہاں کسی کا کون سا گھر سائیں
یہاں گھونگھٹ پیچھے لاج نہیں
یہاں آنچ تو ہے پر سانچ نہیں
یا تو اور میں تو بھول ابھی
یا مانگ میں لکھ لے ڈھول ابھی
دانتوں میں جیبو نہ داب سکھی
تیری چپ میں ہے سیلاب سکھی
جگ پتھ نہیں سائیں آپ سکھی
تجھے کھا گیا پیت کا تاپ سکھی

گاؤں کی عورتیں جوق در جوق ان کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے آ رہی تھیں اور ویسے بھی یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ شاہ سائیں کی طرف سے دعوت عام ہو اور لوگ نظر انداز کر دیں۔ آس پاس کے مختلف گاؤں کی سردارنیاں بھی آج پہلا روز ہونے کی وجہ سے مدعو کی گئی تھیں اور سبھی فروٹوں کی ٹولیاں اور مٹھائیوں کی ٹوکریوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کے ہار بھی لا رہی تھیں۔

میران اپنے دوستوں کے ساتھ حویلی کے بائیں کونے کے آخری مگر انتہائی کشادہ ہال نما کمرے میں موجود مبارک بادیں وصول کر رہا تھا۔ شاہ سائیں کو کسی پارٹی عہدے دار کی عیادت کے لیے فوری طور پر شہر جانا پڑا تھا۔ گھر آنے والے سبھی مہمانوں کو حویلی کی طرف سے صرف اور صرف میران کی شادی کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی مگر آنے والوں کا استفسار مہربانو کے متعلق بھی اس لیے تھا کیونکہ رحمٰن شاہ سب کو اپنی اور مہربانو کی شادی کی بھی نہ صرف اطلاع دے چکا تھا بلکہ آج سے وہاں پر بھی رسوم کا آغاز ڈھولک رکھ کر کر دیا گیا تھا۔ اس بات کا انکشاف مہمانوں کے آنے سے ہی ہوا ورنہ رحمٰن شاہ نے ایسا کوئی پیغام نہیں بھجوایا تھا اور یوں بھی اگر اس مسئلے میں شکوک و شبہات اور ہاں یا نا کی کیفیت تھی تو وہ بھی صرف ملکانی اور شاہ سائیں کے بیچ تھی ورنہ وہ لوگ تو ملکانی سائیں کے بھائی کی دی گئی زبان کے باعث رشتہ پکا ہی خیال کر رہے تھے اور ایسے میں جبکہ وہاں

پر مہربانو کے نام سے رسومات کا آغاز بھی ہو چکا تھا اگر یہاں سے کسی بھی قسم کی پس و پیش کا مظاہرہ کیا جاتا تو زبان سے پھر جانے کی بدنامی رحمٰن شاہ اور اس کے گھر والوں کے نہیں بلکہ شاہ سائیں ہی کے حصے آتی۔ اب تو خود ملکانی سائیں بھی پریشان تھیں کہ اتنا بڑا فیصلہ انہوں نے آخر کن جذبات میں آ کر شاہ سائیں کی مرضی تو دور کی بات ان کے علم میں بھی لائے بغیر کر دیا۔ اپنے تئیں تو انہوں نے بس باتوں میں ایک بات کی تھی مگر اس بات کو ہی پکڑ لیا گیا اور ان کی شرکت کے بغیر ہی ان کے بھائی رحمٰن شاہ کو آس دلاتے رہے اور اب مسئلہ آن پڑا تھا زبان، انا اور عزت کا۔۔۔

حویلی کی ملازمائیں، مہمان خواتین کے ساتھ گاؤں کی عورتوں کو بھی برابر کا درجہ دے رہی تھیں کہ یہی شاہ سائیں کا حکم بھی تھا۔ جن مشروبات سے دوسری ملکانیوں اور سردارنیوں کی تواضع کی گئی تھی وہی مشروبات گاؤں کی عورتوں کو بھی اسی انداز میں پیش کیے جا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے کبھی خشک میووں، ریوڑیوں، گجک اور رنگ دار میٹھی مصری ملی سونف سے بھرے تھال سب کے آگے پیش کیے جاتے تو کبھی سبز چائے، قہوہ اور کشمیری چائے میں سے حسب پسند مشروب حاضر ہوتا۔ ڈھولک کی تھاپ، تالیوں کی گونج اور قہقہوں میں جانے ایک ادھیڑ عمر عورت کو کیا سوجھی کہ مختلف ماہیے گاتی لڑکیوں کے رکتے ہی انہوں نے اداسی بھرا گیت چھیڑ دیا۔

دھیاں رانیاں
ہائے او میریا ڈاہڈیا ربا
کناں جمیاں کناں نے لے جانیاں

چند لمحے پہلے شوخ و چنچل گیتوں، ٹپوں اور ماہیوں کے فوراً بعد درد بھری آواز میں گائے جانے والے اس گیت نے سب پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ قدرت کے طے کردہ قوانین و ضوابط کے آگے سبھی کو اپنی بے بسی کا اظہار ہونے لگا تھا ورنہ نازوں اور لاڈوں سے پالی ہوئی اپنی راج دلاری بیٹیوں کو بھلا کون یوں کسی اور کے حوالے کرتا۔ دوسری خواتین کے ساتھ صوفے پر بیٹھی ملکانی کو کنیزاں نے آ کر ان کی ہدایت کے مطابق نو بج جانے کی یاد دہانی کروائی تو وہ معذرت کر کے اپنے بیڈ روم میں آ گئیں۔ سوہنی بھی خراماں خراماں ان کے پیچھے ہی تھی کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہونے پر جیسے ہی آوازیں آنا کم ہوئیں سوہنی یوں گداز کارپٹ پر نیم دراز ہوئی گویا بہت طویل مسافت چل کے آئی ہو اور یہ بات فطری بھی تھی کہ حویلی کے پرسکون در و دیوار بھلا اس شور و ہنگامے کے عادی ہی کب تھے۔ ملکانی سائیں پڑھی لکھی تو تھیں نہیں مگر اس کے باوجود میران، مہربانو اور شاہ سائیں کے فون نمبرز موٹے موٹے لکھ کر وہ پیپر انہوں نے اپنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر لگا رکھا تھا۔ جہاں بھی فون کرنا ہوتا وہیں پر کھڑے ہو کر نمبروں کی مشابہت دیکھ کر فون ملا لیا کرتیں اور ہمیشہ ہی دوسری طرف سے ملکانی کا نام فون اسکرین پر دیکھنے کے بعد فوراً ریسیو بھی کر لیا جاتا لیکن خلاف معمول آج ایسا نہ ہونا ملکانی سائیں کے لیے اچنبھے کا باعث ضرور بنا۔ ایک دو تین کتنے ہی دفعہ انہوں نے کتنی ہی دفعہ نمبر ملا ڈالا تھا مگر دوسری طرف سے فون بند ہونے کی اطلاع ایک تکرار کی صورت بار بار سنائی دینے لگی تو ان کا گھبرانا اس لیے بھی لازم تھا کہ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ خود مہربانو کو فون کریں اور وہ ریسیو نہ کرے یا پھر ٹیپ سنائی دے۔

بے چینی کے عالم میں وہ کمرے کے دروازے کی اندرونی سائیڈ سے اٹیچڈ باتھ کے دروازے تک چکر کاٹنے لگیں۔ کریں تو کیا کریں اور کہیں تو کس سے؟

موقع ایسا تھا کہ حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی، ادھر میران اپنے دوستوں کے ساتھ شغل میلے میں لگا تھا ایسے میں اگر ان کے منہ سے نکلی بات کسی اور کے کانوں میں پڑی تو جانے سننے والے کیا رنگ دے ڈالیں۔۔۔ اور آج سے پہلے تو کبھی ایسا ہوا بھی

نہیں تھا کہ اس کے فون کی بیٹری نہ ہو، یا فون کبھی ہاسٹل بھول گئی ہو، اس لیے ملکانی سائیں ان تمام خیالات کو خارج از امکان ہی قرار دے رہی تھیں مگر پھر ایسا کیوں ہے کہ اس نے عین اس وقت فون بند رکھا ہے جبکہ ان کا آپس میں بات کرنا اسی وقت کے لیے طے ہے۔

کمرے کے یہاں سے وہاں چکر کاٹتے ہوئے ان کے ذہن میں جیسے خیالات کے بھنور تھے جو مسلسل بنتے ہی چلے جا رہے تھے۔ کبھی سوچتیں کہ شاہ سائیں کو اعتماد میں لیں تو کبھی خیال آتا کہ میران سے ساری بات شیئر کرنی چاہیے۔ ان کو یوں بے چین ٹہلتے دیکھ کر سونی اپنا آرام کرنا بھول کر ان کے قدموں سے جا لگی تو وہ وہیں ٹھہر گئیں اور اسے گود میں لے کر بے اختیار پیار کرنے لگیں۔ مہربانو سے متعلق عجیب سے الٹے سیدھے خیالات ان کے دل کو بھیگی روئی کی طرح بوجھل کرنے لگے تھے۔ باہر سے آتی ڈھولک، تالیوں اور گیتوں کی مسلسل آوازیں اب ان کے کانوں میں ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ ''اب وہ کیا کر سکتی ہیں اور ایسا کون ہے جس سے انہیں مہربانو کے متعلق کوئی اطلاع مل سکتی ہے۔'' اسی خیال پر سوچتے ہوئے ان کے ذہن میں جیسے جھما کا سا ہوا۔ سونی کو گود سے نیچے اتارا، چادر ایک مرتبہ پھر اچھی طرح پھیلائی اور اپنے کمرے سے نکل کر طویل راہداری عبور کرنے کے بعد مہربانو کے کمرے کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔

انہیں یاد تھا کہ ایک دفعہ مہربانو نے انہیں بتایا تھا کہ اس کی دوستوں کے نمبر اس کی ڈائری میں لکھے ہوئے ہیں اور اگر کبھی نیٹ ورک پرابلم کی وجہ سے بات نہ ہو پائے تو وہ بے شک اُن میں سے کسی کو بھی فون کر لیں تو بات ہو جایا کرے گی کیونکہ وہ تینوں ہر وقت ایک ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ کمرے میں سجی خوب صورت کتابوں کے اوپر نیچے گولائی میں بنے چاروں شیلف پر ڈائری نظر نہ آنے کے بعد ملکانی سائیں نے سامنے سے الماری کھول کر دیکھی اور پھر یونہی بیڈ کے ساتھ رکھی سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولا تو اس میں بالکل سامنے ہی ڈائری رکھی نظر آ تو گئی مگر مسئلہ وہی تھا کہ گہرے نیلے رنگ کی خوب صورت مخملیں ڈائری میں ایک یا دو نہیں بہت سے نمبرز مختلف ناموں کے ساتھ لکھے ہوئے تھے، ایسے میں ان کے لیے یہ اندازہ لگانا کہ کون سے نمبرز اس کی حالیہ دوستوں کے ہیں بے حد مشکل اس لیے بھی تھے کہ وہ پڑھنے کی صلاحیت سے محروم تھیں۔ اس وقت ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طور معجزے کے طور پر ہی سہی اور چند منٹوں ہی کے لیے پڑھنا سیکھ کر ان لڑکیوں کے نمبرز ڈھونڈ لیں جن سے مہربانو کے متعلق کچھ پتا چل پاتا۔۔۔ لڑکی ذات، رات کا وقت اور انجانا شہر۔۔۔

دل میں سو طرح کے وسوسے آنے لگے تھے اور پھر آخر وہ کب تک مہمان خواتین کو چھوڑ کر کمرے میں بیٹھ سکتی تھیں۔ ایک تو ویسے ہی وہ ٹینشن میں تھیں اوپر سے یہ مہربانو کے ساتھ رابطہ نہ ہونا ان کے وجود کو آندھیوں کی زد میں لیے ہوئے تھا۔

''ہو سکتا ہے مہربانو کو رحمٰن شاہ کے متعلق پتا چل گیا ہو اور اسی وجہ سے اس نے جان بوجھ کر فون بند کیا ہوا ہو۔۔۔'' ایک یہ بھی خیال ذہن میں چند لمحوں کے لیے پناہ گزین ہوا تو ضرور، لیکن انہوں نے فوراً ہی رد بھی کر دیا۔ میران کے بجائے اپنے بھائیوں سے رابطے کا خیال بھی انہوں نے ذہن سے جھٹک دیا تھا اور میران کے غصے کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔

اسی وقت دروازے پر بڑی مدھم سی دستک ہوئی اور ان کی اجازت پا کر کنیزاں اندر چلی آئی۔

انہوں نے بغیر کچھ بولے استفہامیہ نظریں اس کے چہرے پر جما کر اس کے بولنے کا انتظار کیا۔

''ملکانی سائیں! باہر سب آپ کا پوچھ رہے ہیں اور اب مجھے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے۔''

''آ جاتی ہاں باہر وی۔'' انہوں نے بہت ہی روکھے انداز میں جواب دیا اور اس سے پہلے کہ وہ واپس لوٹتی پھر سے اسے آواز دے ڈالی۔

''نی کنیزاں۔۔۔!''

''جی ملکانی سائیں۔۔۔!'' وہ بڑی تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہی قدموں پر پلٹی تھی۔

''کنج نا کنج سکول تے توں وی جاتی رہی ہے نا؟'' ''جی ہاں ملکانی سائیں!''

''تے ایدر آ، ایس ڈیری میں سے کج نام تے پڑھ کے بتا مجھے، میں وی ویکھوں کہ آخر کرتی کیا رہی ہے توں وی اسکول وچ۔۔۔''

ملکانی سائیں کے حکم کی تعمیل تو کرنا فرض تھی ہی سو وہ ان کے قریب چلی آئی ورنہ درحقیقت وہ چھوٹی ملکانی کے ذاتی استعمال میں رہنے والی ڈائری کھولنے میں بے حد جھجک محسوس کر رہی تھی۔ ملکانی سائیں اس کے سامنے فون نمبرز والا صفحہ کھول کر خود بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ کنیزاں نیچے دبیز ایرانی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی اور آہستہ آہستہ جیسا تیسا پڑھ کر بتانے لگی۔ میری کا نام آتے ہی ملکانی سائیں اچھلیں اور نمبر پر انگشتِ شہادت رکھ کر اسے جانے کو کہا اور خود اسی کمرے سے نمبر ملا لیا۔

دوسری طرف سے جواب آنے میں بمشکل ایک دو بیلز کا ہی وقفہ ہوا تھا کہ میری کی آواز سنائی دی۔

''پتر! میں مہربانو کی ماں بات کر رہی ہوں، ذرا میری گل تے کروا دیو مہربانو کے ساتھ۔''

''وہ۔۔۔ آنٹی۔۔۔! دراصل۔۔۔'' وہ بس سے اتر کر اب کنول کے بس سے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی اور یوں میری کو ان کے یوں فون کرنے کی ہرگز توقع نہیں تھی جبھی کوئی مناسب جواب ڈھونڈنے لگی۔

''میری! مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ مہربانو کو کہاں ڈھونڈیں اور اب ہاسٹل جا کر یہ بات کیسے چھپائیں گے کہ وہ آج رات ہمارے ساتھ نہیں ہے۔''

بس سے باہر آ کر جیسے ہی کنول میری کے قریب آئی، ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ یہ جانے بغیر کہ وہ فون پر بات کر رہی ہے مخاطب ہوئی کہ ہاسٹل آتے ہوئے آج انہیں قوانین سے کہیں زیادہ تاخیر ہو چکی تھی اور اب یہی سوچ رہی تھیں کہ وارڈن کو کیا جواب دیا جائے۔

''مہربانو نہیں ہے؟ کدر گئی وہ؟ کس دے ساتھ چلی گئی؟''

کنول کی آواز کانوں میں پڑتے ہی ملکانی سائیں کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔ ذہن میں اپنی بیٹی، میران شاہ یا شاہ سائیں کے بجائے رحمٰن شاہ کا چہرہ پوری نخوت کے ساتھ ابھرا۔۔۔

''نن، نن، نہیں۔۔۔ نہیں تو آنٹی! ایسی بات نہیں ہے وہ دراصل۔۔۔''

ایک تو ان کے اپنے اوسان خطا تھے پھر اب آنٹی کو پتا چل جانے سے وہ مزید خوف زدہ ہو گئیں کہ مہربانو کے گھر کے ماحول کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔

''میرے کولوں اتنی باتیں نا چھپاؤ، تے صحیح صحیح بتاؤ مسئلہ کی اے؟'' ملکانی سائیں کی رعب دار اور غصیلی آواز پر میری نے سب کچھ سچ سچ بتا کر انہیں حیران پریشان چھوڑتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

شاپنگ مال پر اپنی اپنی خریداری کر کے وہ دونوں تو مقررہ جگہ پر اکٹھی ہو گئی تھیں مگر مہربانو کے نہ پہنچنے اور فون کرنے کی صورت میں اس کے فون کے بند ہونے کا یاد آنے پر وہ کافی دیر وہیں اسے ڈھونڈتی رہی تھیں۔ انتظامیہ چونکہ شاپنگ مال بند کرنے میں مصروف تھی اور ان کے یہ بتانے پر کہ اوپر کے بھی فلورز بند کیے جا چکے ہیں وہ بس اسٹاپ پر بھی کافی دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی تھیں مگر ظاہر ہے کہ نہ اس نے آنا تھا نہ آئی۔ سو تھک ہار کر وہ ہاسٹل آ گئی تھیں، وقت پر آ جاتیں تو اتنا مسئلہ نہ تھا مگر اب چونکہ تاخیر ہو چکی تھی اس لیے ان کی کوشش تھی کسی طرح وارڈن کے سامنے یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ اندر ہاسٹل ہی میں ہے تاکہ بات نہ پھیلے۔ مگر درحقیقت اس وقت وہ کہاں ہے، یہ خیال ان کے ہونٹ خشک اور آنکھیں ویران کیے ہوئے تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

مکمل ناول

فاخرہ گل

-۹-
نویں قسط



☆☆☆

لاؤنج سے ناصر بھائی کی آمد کے ساتھ ہی ایک غیر معمولی ہلچل کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اکیلے نہیں آئے ہیں بلکہ ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ جن سے بات چیت کا سلسلہ جاری تھا اور پھر ان کی یقینی طور پر چائے سے تواضع بھی کی جا رہی تھی اس بات کا احساس برتنوں کے ٹی ٹرالی سے اٹھا کر ٹیبل تک منتقل کرنے کی آوازوں سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ یوں بھی امی بابا کا بیڈ روم مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے مختص ٹی وی لاؤنج سے ملحق ہی تھا اور اس جگہ عام طور پر فارمل مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا بصورتِ دیگر اپنے دوست احباب یا فیملی فرینڈز اور رشتے دار ڈرائنگ روم میں بیٹھا کرتے جس کے بالکل سامنے کچن ہونے کی وجہ سے آسانی رہتی اور کچن میں موجود بندہ بھی باآسانی مہمانوں کی گپ شپ سنتا بھی اور اس میں حصہ بھی لے پاتا۔

ندی، امی کے ساتھ بیڈ پر لیٹی یونہی اِدھر اُدھر کی، اپنے بچپن کی اور پھر بابا کی باتیں کر رہی تھی، خود کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر وہ خود کو امی کے سامنے بے حد کمپوز محسوس کروا رہی تھی۔ ان کا ملائم محبت بھرا چہرہ کس قدر ضعیف معلوم ہو رہا تھا۔ تار تار سفید ہوتے بال زندگی سے ان کا دل اچاٹ ہونے کی طرف اشارہ کر رہے تھے تو خاموش آنکھیں بھی حالات کی ستم ظریفی پر شکوہ کناں تھیں۔

''امی! آپ کے بال کتنے سفید ہو گئے ہیں نا، پہلے تو کبھی اتنے سفید نظر نہیں آئے۔''

''اس لیے کہ اب بہت کچھ وہ ہو رہا ہے جو پہلے نہیں ہوتا تھا۔'' امی نے مسکرانے کی صرف کوشش ہی کی۔

''جی نہیں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، میں کل ہی آپ کے بالوں کو کلر کرتی ہوں۔۔۔ یا ایسا کیوں نا کروں کہ ابھی لے آؤں۔'' بات کرتے کرتے وہ جوش میں اٹھ بیٹھی تو وہ حقیقتاً مسکرا دیں۔

''ارے نہیں بیٹا! اب ضرورت نہیں ہے ان چیزوں کی۔''

''ارے واہ! کیوں ضرورت نہیں ہے بھلا ایویں ہی۔۔۔ خوامخواہ۔۔۔ ضرورت ہے اور بالکل ہے اور میں آپ کو ہیئر کلر لگا کر ہی چھوڑوں گی۔ ہاں البتہ صبح تک رعایت دینے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'' دونوں ہاتھ باندھ کر بڑی فراخ دلی سے صبح تک کی رعایت کا اعلان کرتی ندی کے انداز میں انہیں اپنی اسی نٹ کھٹ، شوخ شرارتی اور معصوم سی ندی کا عکس نظر آیا تھا جس کی مسکراہٹ اور شوخیاں حالات چپکے سے کہیں لے اڑے تھے۔

کروٹ لے کر دائیں ہتھیلی پر زور ڈال کر وہ بیٹھ گئی تھیں۔ ندی نے ان کی کمر کے پیچھے کشن رکھے تو انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

''اللہ تمہیں سدا خوش رکھے اور تم ہمیشہ دل سے مسکراتی رہو۔''

انہوں نے دانستہ طور پر ''یونہی مسکراتی رہو'' کے بجائے یہ الفاظ ادا کیے تھے کہ جانتی تھیں اس وقت وہ مسکراہٹ بھول چکی ہے اور یہ اقدام محض ان کی خوشی اور ذہنی تسکین کے لیے ہے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی اور ناصر بھائی اندر داخل ہوئے۔ لاؤنج سے آتی آوازیں نسبتاً کم ضرور ہوئی تھیں، مگر ابھی تک بات چیت جاری تھی۔ ناصر بھائی آ کر اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے تھے۔ ساتھ ہی ثروت آپا بھی اندر آئیں اور دوستانہ نظروں سے ندی کو دیکھتے ہوئے امی کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گئیں۔

چند لمحے سب نے ایک دوسرے کی وہاں موجودگی کو تسلیم کرنے میں صرف کیے اور بالآخر ناصر بھائی بولے۔

''آج تک ہمارے ساتھ پچھلے کچھ عرصے میں جو بھی ہوا اور جس کا بھی قصور تھا وہ سب ایک الگ کہانی ہے لیکن پھر بھی الحمدللہ میں مطمئن ہوں امی کہ اتنا بہت کچھ ہونے اور اس کا نام لوگوں کی زبان پر عام ہونے کے باوجود میں اس کے لیے ایک بہترین رشتہ تلاش کرنے کے معاملے میں سرخرو ہو رہا ہوں۔''

ندی اور امی کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں، امی کے کمزور پڑتے چہرے کو دیکھ کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہارا دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ خود اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا وہ امی کا ہاتھ سہلانے لگی۔

''اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں، سیاسی خاندان سے تعلق ہے، لڑکا پڑھا لکھا بھی ہے، قبول صورت بھی اور عمر میں بھی اس سے بمشکل چند سال ہی بڑا ہوگا۔۔۔ میں اپنے ساتھ ہی جیولر اور ٹیلر ماسٹر کو بھی لے آیا ہوں، البم میں سے آپ اور یہ جو ڈیزائن چاہے پسند کر لیں اور جتنی بھی جیولری کا آرڈر کرنا ہو، کر دیں۔ میری طرف سے کوئی حد نہیں بس۔۔۔ اس طرح ٹیلر ماسٹر کو بھی اپنا درست ناپ اور پسند وغیرہ اسے کہیں کہ بتا دے تاکہ ریڈی میڈ لیے جانے والے تمام ڈریسز اس کے ناپ کے مطابق ہوں۔''

ناصر بھائی نے ندی کو براہِ راست مخاطب کرنا اور اس کا نام لینا تو جانے کب سے چھوڑ دیا تھا۔ تبھی امی کو مخاطب کر کے ساری بات کی گئی۔

''اور امی! مزید سکون کی بات تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی سید ہیں، دیکھا اللہ نے ندی کی زندگی میں کتنی بہتریاں اور سکون لکھا ہے۔ پریشانیوں کا وقت تو سمجھیں ختم، اب اس کی نئی اور خوش گوار زندگی کا آغاز ہونے والا ہے۔'' ثروت آپا نے ناصر بھائی کی گفتگو کی حمایت کی تھی۔ ندی جو ابھی ان کے آنے سے چند لمحے پہلے ہی امی کے سامنے خود کو مطمئن اور پہلے جیسی پرسکون ظاہر کرنا چاہتی تھی لگتا تھا اب لبادہ اترنے کو تھا۔ خشک آنکھیں نم ہو کر ایک بار پھر کانچ سی چمکنے لگی تھیں۔ وہ اس وقت امی سے نظریں ملانے کی سکت نہیں رکھتی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ ان سے نظریں ملنے کے بعد وہ خود پر قابو نہیں رکھ پائے گی۔ اپنے ہاتھ میں لیے ان کے ہاتھ کا سرد ہوتا محسوس ہونے کے ساتھ ہی اسے بابا کی یاد بڑی شدت سے آئی تھی۔

''اگلے ہفتے کی تاریخ پکی ہو گئی ہے۔ کسی کو دعوت نامہ بھیجنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور نہ بھی بھیجیں تو میرا خیال ہے کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں بنتا اور۔۔۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''آپ دونوں ثروت آپا کے ساتھ باہر آ کر جیولر اور ٹیلر ماسٹر کو گائیڈ کر دیں۔'' وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔

ایک تو اپنی لاڈلی بیٹی کی جدائی اور پھر ان حالات میں، یوں نکالے جانے کے انداز میں۔۔۔ امی کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ خود ندی کی کیفیت بھی اُن سے کچھ مختلف نہ تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح بابا اور ان کا پیار ایک بار پھر سے لوٹ آئے۔ والدین شاید بیٹیوں سے اسی لیے زیادہ پیار کرتے ہیں کہ نہ جانے ان کی آئندہ زندگی میں انہیں اتنا پیار، لاڈ اور مان میسر آ بھی سکے گا کہ نہیں۔۔۔ جس شخص کے ہاتھوں میں وہ اپنے ہیرے سی بیٹی دے رہے ہیں وہ اس کی قدر کر سکے گا کہ نہیں کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بیاہی بیٹیوں کے دکھ بابل کی دہلیز کے اندر بیٹھی بیٹیوں سے کہیں زیادہ دل شکن اور اعصاب توڑ ہوتے ہیں جو اچھے خاصے والدین کو ریت کی بھربھری دیوار کی طرح آہستہ آہستہ زمین بوس کرتے چلے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اس کو دی جانے والی تمام دعاؤں میں نصیب کے اچھے ہونے کی دعا سر فہرست ہمیشہ سے رہی ہے اور پھر ندی جس کو ملنے والے لاڈ پیار کی ایک دنیا گواہ تھی۔

''مجھے اتنا پیار نہ دو بابا
کل جتنا مجھے نصیب نہ ہو
یہ جو ماتھا چوما کرتے ہو
کل اس پر شکن عجیب نہ ہو
میں جب بھی روتی ہوں بابا
تم آنسو پونچھا کرتے ہو
مجھے اتنی دور نہ چھوڑ آنا
میں روؤں اور تم قریب نہ ہو
میرے ناز اٹھاتے ہو بابا
میری چھوٹی چھوٹی خواہش پر

تم جان لٹاتے ہو بابا
کل ایسا نہ ہو اک نگری میں
میں تنہا تم کو یاد کروں
اور رو رو کر فریاد کروں
اے اللہ! میرے بابا سا
کوئی پیار جتانے والا ہو
میرے ناز اٹھانے والا ہو
مجھے اتنا پیار نہ دو بابا
کل جتنا مجھے نصیب نہ ہو"

"ندی! معاف کر دینا میرے بچے!" امی نے اپنے ہاتھوں میں موجود ندی کے ہاتھوں کو بھینچ کر اپنی آنکھوں سے لگایا تھا اور ان کے اس انداز پر ندی تڑپ ہی تو گئی تھی۔

"ایسا نا کہیں، میں مطمئن ہوں، جو کچھ ہو رہا ہے میری بہتری اور بھلے کے لیے ہو رہا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔ جب میں خوش ہوں تو آپ کو یہ پریشانی کیوں؟" ان کے ہاتھ اپنے ہونٹوں تک لے جا کر انہیں بوسہ دیتے ہوئے ندی نے اپنے اندر ابلتے یقین کے لاوے کو پس پشت ڈال کر انہیں حوصلہ دیا۔

"آپ ہی نے مجھے کہا تھا نا کہ اپنی زندگی کی گاڑی کو اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے حوالے کر دو اور خود مطمئن ہو جاؤ تو وہ بحفاظت منزل پر پہنچاتا ضرور ہے چاہے راستہ کٹھن یا دشوار ہی کیوں نہ ہو۔"

"میری بچی! اللہ تجھے خوش رکھے آباد اور مطمئن رکھے۔"

"میرا خیال ہے میں بھی ٹیلر کو اپنا ناپ گھر پر ہی دے دوں، پھر کیا جاؤں گی دوبارہ بوتیک پر صرف ناپ لکھوانے۔" ثروت آپا کو اپنی فکر نے آن لیا تھا۔

"انھیں امی! وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر جیولری کے ڈیزائن دیکھتے ہیں البم میں۔" ثروت آپا کا جوش و خروش روایتی تھا۔

ندی نے گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور خود کلامی کے انداز میں زیر لب بولی۔

"یا اللہ! میری زندگی اور میرا نصیب سب تیری رضا کے لیے تیرے حوالے، جو تُو بہتر سمجھتا ہے وہ کرنا۔" ثروت آپا اٹھ کر امی کے تکیے کی سائیڈ پر آ کھڑی ہوئیں تو امی نے سرزنش کرتے ہوئے ہٹ جانے کو کہا۔

"ابھی اتنی لاغر نہیں ہوں بیٹا کہ کسی کے سہارے کی ضرورت پڑے، اکیلی چل پھر سکتی ہوں ابھی۔۔۔" بیڈ سے اتر کر بات کرتے ہوئے ثروت اور ندی کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئیں تو عائشہ بھابھی اپنے لیے جیولری پسند کر رہی تھیں۔ بس یہیں تک کا منظر انہوں نے واضح دیکھا پھر جانے کیا ہوا کہ آنکھوں کے سامنے دھندی چھانے لگی اور ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی اور وہ وہیں کارپٹ پر ڈھیر ہو گئیں۔

☆☆☆

میران شاہ کے دوست ہوں، خوشی کا موقع ہو اور محفل رنگین نہ ہو، یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ یوں بھی اس وقت وہ جس حصے میں موجود تھا وہاں حویلی کے غیر متعلقہ ملازمین کا بھی آنا ممنوع تھا۔ الگ تھلگ سے اس حصے میں اس وقت میران کی شادی کو دنیا کی واحد اور آخری خوشی سمجھ کر منایا جا رہا تھا۔ یوں تو شادی میں چند روز باقی تھے مگر آج پہلا دن ہونے کی وجہ سے جوش و جذبہ کچھ انوکھا ہی تھا اور پھر اپنا آپ دکھانے کا موقع بھی تھا۔ اب تک کی ہونے والی شادیوں میں سب سے بڑھ کر داد وصول کرنے کی کوشش اور واہ واہ سننے کی خواہش میں میران تو ایک طرف، سارا انتظام اس کے دوستوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پہلے تو گاؤں کے اور نزدیکی گاؤں سے بلائے جانے والے گانے بجانے والے روایتی لوک گیتوں اور جگتوں سے محفل گرماتے رہے تھوڑی دیر بعد شہر سے چند ڈانسرز بھی پہنچنے والی تھیں جنہیں میران کے دو تین دوست خود اپنی جیپ میں لینے گئے ہوئے تھے اور جن کے ساتھ رات بھر کے پروگرام کی بکنگ کی گئی تھی۔ یوں بھی آج کل اسٹیج پر صرف ان کا ڈانس دیکھنے کے لیے لوگ کتنی ہی دیر ٹکٹ کے لیے قطار میں کھڑے رہتے تھے اور ان کا نام مارکیٹ میں ہاٹ کیک کی طرح بکتا تھا جبھی انہیں منہ مانگے ریٹ پر آج کے فنکشن کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

گہرے گلوں، چست چمک دار مگر باریک لباس زیب تن کیے میک اپ کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جب وہ تینوں ڈانسرز داخل ہوئیں تو وہ تمام لوگ جو ان کی آمد سے بے خبر تھے کھلے منہ اور پھٹی آنکھوں سے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ہی میران کے وہ دوست جو انہیں لے کر آئے تھے فخر سے یوں سینہ تان کر چلتے آ رہے تھے گویا کوئی علاقہ فتح کر کے آئے ہوں۔ جب حیرت سے گنگ حاضرین اپنی جاگتی حالت میں واپس آئے تو سیٹیوں اور جملے اچھالنے کا کوئی لمحہ بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا گیا۔ جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکلنا شروع ہوئیں، میوزک سیٹ ہونے لگا تو ان تینوں ڈانسرز کے ساتھ آئے ان کے اسلحہ بردار باڈی گارڈز بھی تماشائیوں کے "لطف" کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتے ہوئے سائیڈ پر ہو گئے۔

ایک دو اور پھر مسلسل میران ملکانی سائیں کی طرف سے کی گئی مسلسل فون کالز پر بدمزا ہو رہا تھا۔ جبھی ایک سائیڈ پر ہو کر آخر کار فون سننا ہی پڑا۔

"اماں سائیں! کیا مسئلہ ہے؟" وہ بھنایا ہوا تھا۔ سامنے جلوے دکھاتی حسینائیں اور کانوں میں پڑتی ماں کی آواز، اسے لگا وہ قورمہ کی لذیذ پلیٹ میں چینی ڈال کر کھا رہا ہو۔

"پتر بوت وڈا مسئلہ ہو گیا ہے، توں جلدی نال میرے پاس حویلی آ۔"

"اوہو اماں سائیں! میں اس وقت حویلی نہیں آ سکتا اور اب مجھے فون نہیں کرنا۔"

"پتر! ہم کسی نوں منہ دکھان جوگے نئیں رہیں گے، عزت خاک وچ مل جائے گی ساری۔۔۔ تو اک واری جلدی نال حویلی آ۔۔۔"

ان کے لہجے کی فریاد میران کو مزید طیش دلا گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ انہیں کسی نے ان ڈانسرز کے یہاں آنے کے متعلق بتا دیا ہے جس کی وجہ سے انہیں اپنی عزت خاک میں مل جانے کی فکر تھی۔ مہربانو کے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

"جو ہوتا ہے نا اماں سائیں! ہو جائے، عزت خاک میں ملے یا راکھ میں، میں صبح سے پہلے حویلی نہیں آؤں گا۔"

تلخ ہوتے ہوئے اس نے ملکانی سائیں کو جواب دیا اور میوزک کی تال پر تھرکتی کم عمر رقاصہ کو دیکھا جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اپنے ساتھ ڈانس کرنے کی آفر کی تو میران نے دوبارہ ملکانی سائیں کی کال سے بچنے کے لیے فون سائیلنٹ پر کر کے جیب میں ڈالا اور مقناطیسی کشش کی طرح کھنچتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو دوستوں، یاروں نے دائرے میں کھڑے ہو کر وہ نوٹ نچھاور کیے کہ زمین پر نوٹوں کے علاوہ یہ ڈھونڈنا مشکل تھا کہ اس میں موجود کارپٹ کس رنگ کا ہے۔

☆☆☆

ناصر بھائی کی گاڑی ٹریفک میں سے رستہ بناتی ہاسپٹل کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹوں پر ندی امی کا سر گود میں لیے ان پر ذہن میں محفوظ ہر آیت ہر سورہ پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہوئے اللہ سے ان کی صحت اور زندگی کی دعائیں بھیک کی طرح مانگ رہی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی، فریاد کر رہی تھی اور لڑی کی مانند بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس کی عدالت میں رحم کی اپیل کر رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ناصر بھائی بیک مرر سے بڑی دل گرفتگی کے عالم میں اسی کو دیکھ رہے تھے اور اسے یوں روتا بلبلاتا اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتا دیکھ کر ان کا دل پسیج رہا تھا۔

جتنی تیزی سے ان کے پاؤں کا وزن ایکسیلیٹر پر بڑھ رہا تھا اتنی ہی برق رفتاری سے انہیں پچھلا ایک ایک وقت یاد آ رہا تھا جب وہ ندی کے بغیر کھانا نہ کھایا کرتے تھے۔ اسے دیکھے بنا ان کے لیے سونے کا تصور ناممکن تھا۔ جسے خوش رکھنا اور دیکھنا ان کی زندگی

کی اولین ترجیح ہوتی تھی۔ آج وہ یوں رو رہی تھی، بلک رہی تھی اور وہ اسے تسلی کا حوصلے کا ایک بول بھی نہیں بول پا رہے تھے۔

''اگر اس نے غلطی کی تھی تو کیا اس کے لیے اتنی سزا کافی نہیں تھی؟'' ان کے اندر سے ہی ایک آواز ندی کی حمایت میں ابھری۔

''اسے کہاں، سزا تو مجھے مل رہی ہے نا، لوگوں کا سامنا تو میں کرتا ہوں، باتیں تو مجھے سننا پڑتی ہیں۔'' ایک دم ہی کسی دوسری آواز کی بازگشت بھی ابھری۔

''تم باتیں سنو گے اور دو چار دن پھر بس۔۔۔ مگر ندی کو شادی کے نام پر جہاں جھونک رہے ہو وہاں تو وہ ساری زندگی یہی باتیں، طعنے اور شاید ظلم بھی سہتی رہے۔ تم تو اسے تہی داماں کرکے بھیج رہے ہو نا، نہ کوئی میکے کی امید نہ بھائیوں کا مان۔۔۔ اور جانتے ہو جن لڑکیوں کو میکے میں یاد کرنے اور عید تہوار پر بلانے والا کوئی نہ ہو انہیں سسرال میں چاہے کتنی ہی عزت اور مان کیوں نہ دیا جائے ہر چاند رات کو ان کے تکیے آنسوؤں سے ضرور بھیگتے ہیں، ہر خوشی منانے سے پہلے ان کے دوپٹے کے پلو وہ آنسو ضرور جذب کرتے ہیں جنہیں وہ دنیا والوں کے سامنے خوشی کے آنسوؤں کا نام دیتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے ہنس پڑتی ہیں۔

''میں نے اس کے لیے ایک بہترین رشتے کا انتخاب کیا ہے اور میں مطمئن ہوں۔''

''نہ لڑکا دیکھا اور نہ ہی اس کے قول و کردار کا کچھ معلوم۔۔۔ ہونہہ! لیکن رشتہ بہترین ہے۔ تم اپنی ذات میں اپنے مزاج کے خدا بن ہی گئے ہو تو انصاف بھی تو کرو۔۔۔ بھائی، بہنوں کی دعاؤں کے حصار میں ہی رہیں تو کامیاب ہوتے ہیں، جن بھائیوں کے تعاقب میں ان کی اپنی ہی بہنوں کی آہیں لگ جائیں تو لاکھ رستہ بدلیں، منزل بے سکون ہی رہتی ہے'' بابا کو تو خود سے ناراض دنیا سے رخصت کر ہی چکے ہو، اب ماں اور اپنی چھوٹی اور لاڈلی بہن کے ذریعے ہی ان کی روح کو خوش کرو۔''

اپنے اندر ہوتی جنگ کے باعث انہیں پتا ہی نہ چلا کب ان کی گاڑی ہاسپٹل کے عین سامنے جا پہنچی تھی۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے بریک لگایا۔ سامنے ہی موجود اسٹریچر لیا اور ساتھ ڈیوٹی پر کھڑے وارڈ بوائے کی مدد سے امی کو گاڑی سے نکال کر اسٹریچر پر لٹا کر برق رفتاری سے اسپتال کے اندر کی طرف بھاگے۔ ندی بھی بڑی سی سیاہ چادر کو سنبھالتی ہوئی ان کے پیچھے تھی۔

ناصر بھائی اس وقت ارد گرد سے بے خبر ایک ایک لمحہ بھی ضائع ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ بجلی کی سی رفتار سے ایمرجنسی وارڈ میں اسٹریچر لے کر داخل ہوئے تو وارڈ بوائے نے ندی کو معذرت خواہانہ انداز میں باہر ہی روک دیا۔

''معاف کیجیے گا بی بی! مریض کے ساتھ صرف ایک ہی شخص اندر جا سکتا ہے۔'' اور تب وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی ذرا سائیڈ پر دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ باوجود ضبط کے اس کے آنسو رک نہیں آ رہے تھے۔ وہ اپنی ماں کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنی دونوں ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر یوں روئی کہ چاہنے پر بھی اپنی ہچکیوں کو نہیں روک پائی تھی اور اسے یوں منہ چھپا کر تنہا تنہا کھڑے روتا دیکھ کر ہی اماں کے کمرے کی طرف جاتی ثمینہ کے قدم رک گئے تھے۔

اس وقت تو جلدی میں شاہ زین گھر سے اماں کو لے کر نکل آیا تھا مگر بعد میں زرمین کے حالیہ کیے گئے انکشافات کے بعد اسے ثمینہ کا گھر میں اس وقت اکیلا رہنا غیر محفوظ محسوس ہوا تو جا کر اسے بھی لے آیا۔ ابھی وہ باہر سے آئی ہی تھی کہ ندی کو دیکھ کر وہ مزید آگے نہیں بڑھ سکی اور اس کے قریب جا کر ندی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خیریت تو ہے نا؟ کسے لے کر آئی ہیں یہاں؟''

ثمینہ کے یوں مخاطب کرنے پر اس نے منہ سے ہاتھ ہٹائے تو ثمینہ اتنا مکمل حسن دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بڑی بڑی شفاف سی آنکھیں جو یقیناً مسلسل رونے سے متورم اور سوجی ہوئی تھیں۔ بے داغ سفید چہرہ جو گریہ وزاری سے بہت زیادہ سرخ نظر آتا تھا۔ گلابی

ہونٹ اور روئی کے گالوں سے نرم ہاتھ۔ وہ لڑکی ہو کر بھی اسے یک ٹک دیکھے گئی تھی۔

لانبی پلکوں پر ابھی تک اکا دکا آنسو شبنم کے قطروں کی طرح اٹک گئے تھے اور اس پر گہری سیاہ چادر، جو اسے مزید حسین بنا رہی تھی۔

''پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا، بس پلیز آپ روئیں مت۔''

ثمینہ نے دلاسا دیتے ہوئے ندی کو گلے لگا لیا تھا اور یہی ہمدردی کے دو بول، اپنائیت کا ذرا سا لمس اور احساس کے چند لمحے، یہی سب کچھ تو تھا جس کی خواہش یہ دل بار بار کرتا اور سر پٹختا تھا۔ اب ثمینہ نے اتنی محبت سے بات کرتے ہوئے اسے دلاسا دیا اور گلے لگایا کہ اس کا دل چاہا وہ زور زور سے روئے، چیخے اور اپنی آواز کو بلند کرکے دنیا والوں کو بتائے کہ ''دیکھو میں اتنی بری بھی نہیں ہوں، اب بھی دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو مجھے گلے لگا کر پیار کر سکتے ہیں، جن کے لیے میں کوئی اچھوت نہیں ہوں، جو خود کو فرشتہ سمجھ کر مجھے دھتکارنے کے بجائے اپنے ہی جیسا ایک ایسا انسان سمجھتے ہیں جو کہ غلطیوں کا پتلا ہے۔''

اس نے ثمینہ کو جس طرح بھینچ کر گلے لگایا تھا وہ جان چکی تھی کہ معصوم حسن والی یہ لڑکی کس قدر تنہا ہے۔ سوائے حوصلہ دیتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی کمر تھپکنے لگی اور ندی جو چند لمحوں پہلے دل کھول کر رونے کی خواہش کر رہی تھی، ثمینہ سے گلے مل کر یوں سیراب ہوئی کہ آنسو جہاں تھے وہیں رک گئے اور زبان دل اور آنکھیں سب اپنی ماں کے لیے مجسم دعا بن گئے مگر اس سے پہلے کہ وہ خود کو ثمینہ سے الگ کر کے اس کا شکریہ ادا کرتی سامنے ریسپشن کی طرف سے آتے شاہ زین کو دیکھ کر اس کا دل تو جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ خود شاہ زین بھی ثمینہ اور ندی کو آپس میں گلے ملتا دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

مدت کے بعد آج اسے دیکھ کر منیر
اک بار دل تو دھڑکا مگر پھر سنبھل گیا

سائیاں رات ادھوری ہے، سائیاں مات ادھوری ہے
دشمن چوکنا ہے لیکن، سائیاں گھات ادھوری ہے
سائیاں راہیں تنگ بہت، دل کم ہیں اور سنگ بہت
پھر بھی تیرے رنگ بہت، خلقت ساری دنگ بہت
سائیاں رات ادھوری ہے، سائیاں گھات ادھوری ہے

بار بار فون کرنے کے بعد بھی میران شاہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ سرد ہوتے جسم اور زرد پڑتے چہرے کے ساتھ ملکانی سائیں اپنے نیم مردہ وجود کو لیے مہمان خواتین کے ہمراہ بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیوانوں کی طرح دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں اور کبھی گردن جھکا کر قدموں میں بیٹھی سونی کے جسم کے بال گننے لگتیں۔ مکمل ہوش و حواس میں ہونے کے باوجود ان کا ذہن بالکل سپاٹ تھا۔ ان کے گرد ڈھولک کی تھاپ اور تالیوں کی گونج میں کون سے گیت گائے جا رہے ہیں، گاؤں کی عورتیں کس گانے پر لڈی ڈالتے ہوئے گیت کے کون سے فقرے پر شرماتے، لجاتے اور دوپٹے میں منہ چھپاتے ہوئے قہقہے لگاتی پنجوں کے بل بیٹھنے لگتی ہیں، ملازمائیں سب کی خاطر مدارات کس انداز میں کر رہی ہیں، یہ سب باتیں ان کے لیے بالکل نہ سمجھ میں آنے والی اور ناآشنا سی معلوم ہو رہی تھیں۔ اتنے تمام لوگوں کی موجودگی میں بھی تنہائی اور بے بسی کے اس احساس کے تحت ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

ان کی لاڈلی بیٹی، ایک انجان شہر میں رات کے اس پہلے پہلے پہر جب ان کے خاندان کی کوئی لڑکی اس وقت کھلے آسمان تک کے نیچے کھڑی نہ ہوا کرتی تو وہ کہاں اور کس کے ساتھ ہے اس وقت؟ اور کیا صرف آج یا۔۔۔ پہلے بھی وہ ہاسٹل سے یوں اس وقت کہیں چلی جایا کرتی ہے؟ کیونکہ اس سے پہلے تو کبھی رات کو کم کم ہی بات ہوا کرتی تھی۔ ہمیشہ ہی ملکانی سائیں شام سات بجے رات کا کھانا کھانے سے کچھ دیر پہلے اُس سے بات کر کے خیریت معلوم کر لیا کرتیں۔ کیا میران شاہ اور شاہ سائیں کو مہربانو کے متعلق بتا دینا چاہیے یا صبح تک کا انتظار کرنا بہتر ہوگا اور اگر ان دونوں میں سے کسی کے علم میں یہ بات آ گئی کہ مہربانو آج رات ہاسٹل کے علاوہ کسی اور جگہ پر گزارے گی تو کس قدر ہولناک وقت ہوگا وہ۔۔۔ اور اگر یہی بات رحمٰن شاہ کے کانوں سے جا ٹکرائی تو۔۔۔؟

دہشت اور خوف کے مارے ان کی آنکھیں گویا باہر ابلنے کو تھیں اور یہ بات بھی ایسی تھی کہ وہ کسی اور سے مشورہ تو کیا کسی اور کے ساتھ شیئر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ چاروں طرف سب خوش و خرم چھوٹی چھوٹی باتوں پر دیر تک ہنستے ہی چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے موقع غنیمت جانا اور کنیزاں کو ایک بار پھر سب کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے شاہ سائیں کے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھتی چلی گئیں۔ خراماں خراماں چلتی سونی ان کے تعاقب میں بڑی خاموشی کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ شاہ سائیں کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر لمحہ بھر کے لیے ملکانی سائیں نے اپنے اوسان بحال کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے تھوک نگلا اور دروازے کے ہینڈل پر دائیں ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر کھولنے کے بعد اندر داخل ہوئیں مگر لائٹ براؤن اور انگوری

رنگ کے فرنیچر سے مزین کمرہ خالی تھا۔ اپنا وجود تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہ صوفے پر گر سی گئی تھیں۔ یہ آج ان کی زندگی میں کیسا موڑ آ گیا تھا جب ہر طرف سے ہی ان کا ذہن آندھیوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ ظاہری طور پر ان کی حویلی کے در و دیوار پر خوشیاں رقصاں اور رونقیں جلوہ افروز تھیں مگر یہ ان کا دل جانتا تھا کہ پس پشت کیا کہانی تھی۔ ہر طرف سے خوف اور بے یقینی کے بادل جس طرح امڈ کر آ رہے تھے، اس میں انہیں اپنا آپ اس زرد پتے کی طرح محسوس ہونے لگا تھا جو بارش برسنے سے پہلے ہی اس کی شدت اور ہواؤں کی تیزی کے خوف سے لرزتا رہتا ہو۔

انہیں یوں پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا دیکھ کر سونی ان کی گود میں آ بیٹھی تھی اور اسی دوران واش روم سے پانی کی آواز آنے پر ملکانی سائیں کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا یعنی شاہ سائیں کمرے میں ہی موجود تھے۔ ملکانی سائیں چادر درست کرتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھیں، اسی دوران واش روم کا دروازہ کھلا اور شاہ سائیں کمرے میں داخل ہو کر ان پر نظر پڑتے ہی چونک گئے۔

”خیریت تو ہے نا سب؟“ خلاف معمول انہیں یوں مہمانوں کو چھوڑ کر بیڈ روم میں بیٹھا دیکھ کر ان کے منہ سے نکلنے والا سوال برجستہ تھا۔

”آہو خیر تے ہے پر۔۔۔ وہ۔۔۔ مہربانو دے بارے وچ بات کرنی تھی۔“ رک رک کر انہوں نے بالآخر اپنا جملہ مکمل کیا تو شاہ سائیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر بیڈ کے دائیں طرف موجود صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔

”مہربانو کے بارے میں اب کوئی بھی بات کرنے کا وقت نہیں بچا ہے ملکانی۔“ ملکانی چونکیں۔

”تم اور تمہارے بھائی مل کر میری اجازت تو دور مجھے بتائے بغیر رحمٰن شاہ کو ہاں کر چکے ہو، انہیں زبان دے چکے ہو، اُن کے گھر شادی کی رسومات شروع ہو چکی ہیں۔۔۔ اور اب۔۔۔ اب کیا بات کرنا باقی رہ گئی ہے؟“

تلخ ہوتے لہجے کو انہوں نے آواز کے دھیمے پن میں چھپانا چاہا کیونکہ درحقیقت وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ یہ سب کیا کرایا ملکانی کے بھائیوں کا تھا جنہوں نے اس وقت ملکانی کی موجودگی کو محض استعمال کیا تھا اور اس کے بعد رحمٰن شاہ کو انہی کی طرف سے آس دلائی جاتی رہی اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ مہربانو پر اپنا حق سمجھنے لگا۔

”اب اگر میں رحمٰن شاہ کو اس موقع پر انکار کرتا ہوں تو تمہارے بھائیوں کو اپنی عزت اور انا داؤ پر لگتی محسوس ہوگی۔ وہ تمہیں پریشان کریں گے اور مجھے پتا ہے کہ تم ان کی ناراضی کسی طور برداشت نہیں کر پاؤ گی ہاں البتہ اپنی بیٹی کو اس اندھے کنویں میں جھونک کر شاید تمہیں اتنی تکلیف نہ ہو جتنی اپنے بھائیوں کی ناراضی سے ہوگی۔“

ملکانی سائیں نے بڑی ترحم آمیز نظروں سے شاہ سائیں کو دیکھا۔ خود وہ بھی اس رشتے کے حق میں صرف اس لیے تھیں کہ رحمٰن شاہ سے شادی نہ ہونے کی صورت میں مہربانو کو اگلے کئی برس تک شادی کے لیے انتظار کرنا پڑتا اور اسی وجہ سے انہوں نے اپنے بھائیوں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی لیکن اس وقت تو مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔

”لیکن ایک بات میں تم پر واضح کر دوں کہ میں نے اس معاملے پر بہت سوچا ہے اور میں اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گا، چاہے وہ شادی کی رسومات کریں یا بارات لے آئیں۔۔۔ اور اسی مقصد کے لیے میں نے صبح برادری کے بڑوں کو مدعو کر رکھا ہے۔“

”کس دی شادی شاہ سائیں! مہربانو تے رب جاندا ہے اج اپنے ہوسٹل دے بجائے ساری رات کدر گزارنی ہے؟“ شاہ سائیں کے فیصلہ سنانے پر اب ان سے رہا نہ گیا تھا۔ اُن کی وجہ سے ان کے بھائیوں کا سر نیچا ہو اس خیال نے سونے پر سہاگہ کا کام کرتے ہوئے لہجے کو زہر خند بنا دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" یوں لگا گویا شاہ سائیں کے جسم کو کوئی برقی رو چھو گزری ہو، یہ بات تھی، طعنہ تھا یا پھر تشویش بھرا محض ایک جملہ، وہ سمجھ نہیں پائے تھے اور نہ ہی سمجھنا چاہتے تھے کہ اس بات کو سننے کے بعد ان کا ذہن لہجہ جانچنے کی پوزیشن میں بھلا رہا ہی کب تھا۔

"مہربانو اج اپنے ہوسٹل نئیں گئی، میں نے آپ اس دی سہیلیوں کے ساتھ بات کی ہے اور وہ دونوں بوت پریشان تھیں کہ رب جاندا اے او کدر گئی؟" ملکانی سائیں نے میری اور کنول کی زبانی سننے والی تمام روداد بیان کر دی تھی۔

"بوت منع کیا تھا نا کہ نہ بھیجو دھی ذات کو اتنی دور۔۔۔ میکوں تے چلو عقل نئیں، میرے بھائیوں نے دی منع کیا تھا نا، پر کسی نہ منے، ہون دیخ لیا نا انجام۔" وہ ایک بار پھر اپنے بھائیوں کو سچا ثابت کرنے پر تلی تھیں۔

"شاہ سائیں! میرے بھائیوں نے کدی غلط گل نئیں کیتی اور ایہہ تے اب ثابت بھی ہو گیا ہے۔"

"مہربانو آج رات ہاسٹل نہیں گئی، یہ کس طرح ممکن تھا اور اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اس وقت وہ کہاں ہے؟" شاہ سائیں نے خود کلامی کی۔

"میرا تے اپنا کالجا پھٹ رہا ہے، رحمٰن شاہ کو یا اللہ زندگی دے، میرے بھائیوں نوں پتا لگا تے فیر کی ہووے گا' وناں تے یہی کہنا ہے کہ منع کیتا سی ناں تے بات ماں جائے تے اج ایہہ دن نہ دیخنا پڑتا۔"

"میری بیٹی کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی، اتنا تو یقین ہے مجھے اُس پر۔" انہوں نے مضبوط لہجے سے کہا۔

"نئیں اٹھا سکتی تے فیر گئی کدر؟ سہیلیاں نے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر چلیاں گھیاں ہوسٹل تے وہ خود کدر گئی، کیوں نا پہنچی واپس شاہ سائیں؟" شاہ سائیں خاموش رہ کر ذہن کو ہر قسم کے ممکنات پر دوڑا رہے تھے۔

"حویلی مہمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ کوئی ایسی ویسی گل ہو گئی تے کیہڑا منہ دکھائیں گے دنیا نوں؟"

"ملکانی! دنیا والوں کی نہیں صرف اور صرف اپنی بیٹی کی فکر کرو اور دعا کرو کہ وہ خیریت سے ہو۔" اضطراب کے عالم میں وہ اٹھ کر کمرے میں ہی ادھر اُدھر ٹہلنے لگے تھے۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ عجیب کشمکش کا شکار تھے کہ آخر اتنی دور بیٹھ کر وہ کریں تو کیا کریں۔۔۔ یوں بھی بیٹی کا مسئلہ تھا وہ کسی دوسرے کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے لہٰذا جو بھی تھا اور جیسے بھی تھا خود وہاں جا کر ساری صورت حال کا جائزہ لینا تھا سو فوراً فون پر نمبر ڈائل کر کے ایئر ٹکٹ کا کہا اور ملکانی سائیں کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کسی کے سامنے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ میران ہو یا تمہارے بھائی، سمجھیں نا؟"

"او تے سب ٹھیک ہے پر کسی۔۔۔"

"میں خود جا کر دیکھتا ہوں اصل بات کیا ہے، تب تک کسی کو اس بات کی خبر نہ ہو، میران بے شک ہمارا بیٹا ہے مگر بے حد جذباتی، اس لیے اس کے سامنے اس بات کا تذکرہ تک نہ کرنا۔" شاہ سائیں نے عجلت میں اپنا والٹ چیک کرتے ہوئے چند ہدایات دیں۔ اس بات سے وہ قطعی طور پر لاعلم تھے کہ ملکانی سائیں تو میران کو آگاہ کرنے کے تمام جتن کر چکی تھیں مگر سوئے اتفاق کہ ایسا ہو نہ سکا ورنہ اب تک یقیناً میران شاہ کے جذباتی پن کی وجہ سے سبھی اس بات سے آگاہ ہو چکے ہوتے۔

"میں چلتا ہوں، مہربانو کے لیے دعا کرنا، اللہ ہماری بیٹی کی حفاظت کرے۔" برق رفتاری سے کمرے سے نکلتے ہوئے انہوں نے کہا اور ملکانی سائیں کا جواب سننے میں وقت ضائع کیے بغیر کمرے سے نکل گئے۔

وہ جانتے تھے کہ حسد میں آ کر انسان واقعی اندھا ہو جاتا ہے اور اگر وہ ایک بھاری اکثریت میں مقبول تھے تو ان کے مخالفین کی تعداد بھی تو کم نہ ہوگی۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو ڈنکے کی چوٹ پر مخالفت کا

اعلان کرتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھر کے بھیدی بن کر لنکا ڈھانے میں مصروف رہتے ہیں اور شاہ سائیں ہمیشہ انہی کی طرف سے محتاط رہنے کی کوشش کرتے تھے مگر اب ایسا کیا ہوا مہربانو کے ساتھ کہ وہ واپس ہاسٹل نہ پہنچ سکی۔ سب سے پہلے وہ اس کی دوستوں سے خود ملنا اور بات کرنا چاہتے تھے۔ باقی تمام آپشنز استعمال کرنے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا گیا تھا تاوقتیکہ وہ ساری صورت حال سے مکمل طور پر آگاہ ہو جائیں۔

☆☆☆

میں نے اس طور سے چاہا تجھے اکثر جاناں
جیسے ماہتاب کو بے انت سمندر چاہے
جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اترے
جیسے خوشبو کو ہوا رنگ سے ہٹ کر چاہے

کتنی عجیب بات تھی اور کس قدر دل چسپ صورت حال تھی کہ وہ جس سے ملنے کی آرزو اکمل کے دل میں روز بروز بڑھ رہی تھی اور جس سے صرف ایک بار مل لینے اور اپنے جذبات اس تک پہنچا لینے کو وہ اتنا بے قرار تھا کہ ایک روز ندی تک سے دعا کرنے کو کہہ ڈالا آج وہ اس کے سامنے تو تھی، دعا تو قبول ہو چکی تھی مگر وہ اس سے ایک بھی لفظ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ ایک کونے میں دروازے کے بالکل ساتھ وہ کھڑا تھا اور سامنے لفٹ کی دیوار کے ساتھ چپکی مہربانو بیٹھی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائی دونوں ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے یقیناً کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔ قدرت نے آج اُن دونوں کو ایک عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے اور اس قدر نزدیک ہونے کے باوجود آپس میں بات چیت کا کوئی امکان پیدا ہوتا نظر نہیں آتا تھا اور پانچ دس منٹ کی تو بات تھی نہیں، انہیں پوری رات اسی لفٹ میں گزارنا تھی۔ جبھی اکمل نے مہربانو کے چہرے پر لرزتے خوف کے سائے کچھ کم کرنے کا سوچتے ہوئے گلا صاف کیا تو مہربانو کے تیزی سے ملتے ہونٹ لحہ بھر کو رک گئے اور آنکھیں پلکیں جھپکنے کا عمل ملتوی کرتے ہوئے پھر سے یوں

پھیل گئیں جیسے اندھیری رات میں کسی نے دروازے پر پراسراری دستک دے ڈالی ہو۔

"مہربانو۔۔۔!" اکمل کے منہ سے نکلتے یہ چند حروف جب اس کے نام کا روپ دھارتے ہوئے کانوں سے ٹکرائے تو مہربانو کو لگا جیسے نہ تو یہ لہجہ اجنبی ہے اور نہ ہی آواز البتہ دل کے دھڑکنے کی جو رفتار تھی وہ پہلے سے کہیں تیز ضرور ہو گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ آج اچانک پیش آ جانے والی یہ صورت حال پریشان کن تو ضرور ہے مگر آپ پلیز مجھ سے خوف زدہ نہ ہوں۔ میں کوئی غلط قسم کا انسان نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کو مجھ سے کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔۔۔" اکمل چند لمحے رکا۔

"یہ جو کچھ بھی ہوا، اس میں نہ میرا کوئی عمل دخل تھا اور نہ ہی کوئی کوشش، یہ سب اچانک کس طرح ہو گیا خود مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں نے بس یونہی آنکھیں بند کر کے لفٹ میں قدم رکھ کیسے دیا، کیونکہ یقینی طور پر اگر لفٹ خراب ہے اور اس کا انتظامیہ کو بھی علم ہے تو باہر نوٹس ضرور لگا ہوا ہوگا، جو ہم دونوں ہی دیکھنے سے رہ گئے۔"

"اگر لفٹ خراب تھی تو چھوٹا سا کیوں بہت بڑا لکھ کر لگانا چاہیے تھا کہ لفٹ استعمال نہ کی جائے یا پھر لفٹ کے آگے ریڈ ربن لگا دیتے تاکہ جو نہیں بھی پڑھ سکتا اسے بھی پتا چل جاتا۔" سر اسی انداز میں جھکائے ہوئے مہربانو بولی تو تلخی اس کے لہجے میں بھرپور نمایاں تھی۔ مگر اکمل کے لیے یہ بات ہی تسلی بخش تھی کہ وہ کچھ بولی تو سہی کیونکہ جو خوف کے عالم میں خاموش رہتا ہے خوف اسے دہشت میں بدل کر دماغ پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔

"یہی تو المیہ ہے کہ ہم بنیادی حفاظتی اصول تک سے غفلت برت جاتے ہیں حالانکہ اس کے نقصان بعض اوقات شدید بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اور میں جانتی ہوں کہ اس حادثے کے بعد ہونے والا میرا نقصان کسی صورت پورا ہونے والا نہیں۔" مہربانو نے بہت دھیمی آواز میں خود کلامی کی

تھی جسے اکمل سن لینے کے باوجود اَن سنی کر گیا تھا۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو اپنے متعلق کچھ بتاؤں۔۔۔ آئی مین انٹروڈکشن۔۔۔" وہ مہربانو کی خاموشی کو گفتگو میں بدلنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا کہ وقت تو گزرنا ہی ہے یونہی خاموش رہ کر بھی لفٹ کے اندر ہی صبح ہونی ہے اور بات چیت کرلی جائے تب بھی صورت حال یہی رہنی ہے ہاں البتہ بات چیت کرنے سے ذہنوں کا بوجھل پن ضرور کم ہو سکتا تھا، جبھی وہ چاہتا تھا کہ کچھ اپنی کہی جائے اور کچھ اس کی سنی جائے مگر یہ صرف وہی چاہتا تھا، مہربانو کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خاموش رہنا چاہتی ہے جس کی تصدیق اس نے زبان سے بھی کردی۔

"میرا خیال ہے آپ یہ تکلیف رہنے ہی دیں۔" مہربانو کے یوں صاف جواب پر تو وہ حیران رہ گیا تھا کیونکہ اس طرح کے بغیر لگی لپٹی کے جواب کی اسے مہربانو سے ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس کا یہ انداز بے اختیار اسے ندی کی یاد دلا گیا تھا مگر صرف اس جملے تک ہی، ورنہ تو دونوں ہی کی شخصیت ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھی۔

"چلیں ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی، ویسے میری ایک بہت اچھی دوست اور کزن کی یاد دلا دی آپ نے، اتنے روکھے انداز میں جواب دے کر۔" وہ کہے بنا رہ نہیں پایا تھا۔ مہربانو کی روشن پیشانی پر سلوٹیں ابھریں اور اس نے گردن کو ہلکا سا موڑ کر اکمل کے جوتوں کو دیکھا۔

"نام تو اس کا ندرت ہے مگر قریبی لوگ اسے ندی ہی کہتے ہیں اور جس طرح آپ نے ابھی لمحہ بھر میں حساب چکتا کیا ہے وہ بھی اسی طرح کسی کا ادھار نہیں رکھتی تھی جو بات ہو فوراً اسے منہ پر۔۔۔" دائیں ٹانگ موڑ کر جوتا دیوار سے ٹکاتے ہوئے اس نے گہری سانس لی۔

"لیکن اب تو وہ سب باتیں اور اس کا وہ انداز خواب سا لگتا ہے، حالات نے بہت بدل دیا ہے اسے۔۔۔" وہ افسردہ ہوگیا تھا اور اس کی آواز میں چھپے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے مہربانو سے رہا نہ گیا اور وہ پوچھ بیٹھی۔

"ایسا کیا ہوا اُس کے ساتھ؟"

"وہی ہمارے معاشرے کا سطحی رویہ۔۔۔ ہونہہ! یونیورسٹی میں کسی میران نامی وڈیرے سے ایک دو دفعہ اس طرح جملوں کا تبادلہ ہوا جسے میران نے اپنی بے عزتی تصور کرتے ہوئے اس طرح بدلہ لیا کہ ندی کو خود گھر والوں کے سامنے اپنے کردار کی گواہیاں دینی پڑیں۔"

"میران۔۔۔" مہربانو کے ذہن میں ہر طرف اس نام کی گونج سنائی دینے لگی تھی۔ اس کا اپنا بھائی، ایک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کا ذمہ دار بنا اور یونیورسٹی چھوڑے جانا بھی یقیناً اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ چونکہ ان دنوں میں یہاں تھی اور یہاں میڈیکل کی سخت پڑھائی کے بعد نہ تو روزمرہ اخبارات کی ورق گردانی کا وقت ملا کرتا اور نہ ہی اسے ان حالات حاضرہ کے پُرزوں سے کوئی خاص دلچسپی تھی کہ وہ ان کے لیے ٹائم نکالا کرتی۔ حویلی میں یوں بھی اخبار روزانہ کی بنیاد پر نہیں آیا کرتا تھا کیونکہ شاہ سائیں زیادہ وقت شہر میں گزارا کرتے تھے اس لیے جب وہ گاؤں میں ہوتے تو منشی چاچا ہر صبح ان کے اٹھنے سے پہلے مختلف اخبارات ناشتے کی میز پر پہنچا دیا کرتے جن کا مطالعہ وقتاً فوقتاً سارا دن جاری رہتا۔

"یہ جاگیردار، وڈیرے خود کو سب سے اعلا وارفع کیوں سمجھنے لگتے ہیں؟ یہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی ہی طرح کا کوئی انسان سمجھنے کے بجائے انہیں کیڑے مکوڑوں کا ہی درجہ دینے پر بضد کیوں نظر آتے ہیں؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ رستے میں پڑا ایک چھوٹا سا پتھر جسے وہ حقیر جانتے اور سمجھتے ہیں وہ بھی کسی دن ٹھوکر لگنے کا باعث بن کر انہیں منہ کے بل گرا سکتا ہے۔ اسی طرح جیسے ایک ننھی اور بے ضرر سی چیونٹی ہاتھی کی موت کا سبب بنتی ہے۔" ندی اس کی بچپن کی سب سے بہترین دوست تھی جسے وہ ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا تھا اور آج کل اسے مشکل میں جان کر افسردہ رہنے لگا تھا۔ جبھی اس کا ذکر آیا تو وہ اپنا دکھ چھپا نہیں پایا اور چھپاتا بھی کیوں اور کس سے؟

"یقین کرو مہربانو! مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ اس کی کردار کشی ہونے پر خود اس کے سگے بھائی نے اس پر اعتماد نہیں کیا، اسی صدمے میں اس کے بابا اللہ کو پیارے ہوگئے، دنیا والوں کی باتیں اور طعنے الگ سنے، صرف اس وجہ سے کہ اسے اپنوں کی ڈھال نہیں ملی اس وقت جب اسے ان کی سخت ضرورت تھی۔ ابھی میں گاڑی میں آتے ہوئے اسی سے بات کر رہا تھا اور تبھی دل ایسا بوجھل ہوا کہ فون اٹھانے کا خیال بھی نہیں رہا۔" مہربانو نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا وہ دیوار سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے باتیں کرتے ہوئے اکمل کو دیکھ کر مہربانو نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس وقت لفٹ کے اندر وہ موجود ہے اگر اس کی جگہ کوئی اور آدمی اس کے ساتھ اندر داخل ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔۔۔ یہ سوچ ذہن میں آتے ہی اس کے پورے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی تھی۔

لیکن اب صبح لفٹ سے باہر نکلنے پر کیا ہوگا؟ یہ خیال ہی اس کا خون خشک کیے دے رہا تھا۔ میری اور کنول نے اسے کہاں کہاں ڈھونڈا ہوگا، ملکانی سائیں کا رات کو اس سے بات نہ ہونے پر کیا ردِعمل ہوگا اور اگر ان کے علم میں اس کا رات بھر ہاسٹل نہ جانا آ گیا تو کیا ہوگا؟ یہ اور اس جیسے بہت سے سوالیہ نشان مہربانو کے ذہن کو بری طرح اپنے شکنجے میں لیے ہوئے تھے۔

"ایک بات بتائیں مہربانو!" اکمل کی آواز ایک بار پھر اسے خدشات کے بھنور سے کھینچ کر حقیقت کی دنیا میں لے آئی تھی مگر اس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی۔

"آپ کو کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟" اس کے یوں ایک دم سابقہ گفتگو سے ہٹ کر کیے گئے سوال پر مہربانو کا حیران ہونا لازمی تھا۔ وہ بات کر کے خاموش ہو چکا تھا یعنی اب وہ اس سے جواب چاہتا تھا سو کچھ دیر بعد مہربانو بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

"میں نکاح سے پہلے کی گئی محبت پر یقین نہیں رکھتی ہوں۔ زندگی میں بعض اوقات یقینی طور پر ہمیں کچھ لوگ اچھے لگتے ہیں جو کہ ایک فطری عمل ہے مگر اس احساس کو خود پر حاوی کر لینا کہ وہ محبت کے جذبے کی شکل اختیار کر جائے یہ میرے لیے ناقابلِ قبول ہے۔" اکمل کو ایک بار پھر جہاں اس کے جواب نے حیران کیا تھا وہیں وہ اس کے لیے پہلے سے بھی کہیں زیادہ قابلِ احترام انداز میں سامنے آئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ شاید بہت کم بولتی ہے مگر جب بھی بولتی ہے اس کی کی گئی بات میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ اکمل اس کی سوچ کی بلندی کا قائل ہونے لگتا ہے۔

"گھر سے یہاں اتنی دور میرے والدین نے اگر مجھے بھیجا ہے تو صرف اور صرف پڑھائی کی غرض سے نا کہ اپنا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے اور مجھے اپنے جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ دل و دماغ پر بھی مکمل کنٹرول ہے اس لیے میں کبھی بھی شادی سے پہلے محبت کے ڈھونگ رچا کر اپنے والدین کا سر کسی اور کے سامنے نیچا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔"

مہربانو کی باتیں سن کر اکمل جو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ آج کسی طور وہ مہربانو کے ساتھ اپنی فیلنگز شیئر کر ہی لے گا اب ایک بار پھر ان تمام لفظوں کو غلاف پہنا کر پھر سلا آیا تھا۔ ندی اور مہربانو کی سوچ کس قدر مختلف تھی اور شاید ندی کو زیادہ ہزیمت شاہ زین کا ساتھ نہ ملنے پر ہوئی تھی جب اس کے علم میں یہ بات آئی کہ عنقریب اس کی شادی ہو رہی ہے۔

"میں آپ کی سوچ کو سلام کرتا ہوں مہربانو! لیکن میرا یہ سوال پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب بندہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اس پر محبت سے بڑھ کر اعتماد ہونے لگتا ہے اور اگر وہی نہ رہے تو پھر خود کو سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے بس یہی کچھ ندی کے ساتھ

بھی ہوا۔" بات کرنے کے لیے کوئی تو موضوع چاہیے تھا سو اس نے مہربانو کے ساتھ ندی کے واقعے کو بڑی تفصیل سے شیئر کیا تھا۔

"اور میران۔۔۔؟ اس کے ساتھ اس پورے واقعے میں کیا ہوا؟" مہربانو نے جاننا چاہا۔

"اس کے ساتھ کیا ہونا تھا، ہونہہ! آج تک اس جیسے کسی بھی شخص کے ساتھ پہلے کبھی کچھ ہوا جو اس کے ساتھ بھی ہوتا۔ بس زیادہ سے زیادہ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔" اکمل میران کے نام پر تلخ ہوا تھا اور یہ تلخی لہجے کے ذریعے مہربانو تک بھی پہنچی۔

"آپ جانتے ہیں نا کہ اللہ کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے۔" اکمل اس کے اس جملے کی گہرائی اور یہاں استعمال کرنے کو سمجھ نہیں پایا تھا جبھی گردن جھکا کر سامنے بیٹھی مہربانو کو دیکھ کر اس کی بات کی معنویت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اسی طرح گردن جھکا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھی مہربانو نے انگوٹھے کو دائیں ہتھیلی پر مسلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اسے یوں خود پر نظریں جمائے دیکھ کر گڑبڑاتے ہوئے پھر سے سر جھکا لیا اور بولی۔

"میرا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ اگر ہم کسی دوسرے کے لیے گڑھا کھودتے ہیں تو خود بھی اسی گڑھے میں ضرور گرتے ہیں جو دوسروں کی بہن بیٹیوں کو سرِ بازار رسوا کرتے ہیں ان کی اپنی بہنیں بیٹیاں چاہے کتنی ہی پاک دامن کیوں نہ ہوں ان کے اعمال کی بدولت رسوائی کا کچھ حصہ ان کے اپنوں کے اعمال کے عکس کے باعث ان کے حصے میں بھی ضرور دیکھا جاتا ہے۔۔۔

جیسے آپ نے بتایا کہ میران نے ندی کی ہوٹلز میں بیٹھے ہوئے جعلی تصاویر اخبارات میں چھپوائیں اور بے گناہ ہونے کے باوجود اس پر ہر طرف سے تہمتیں لگیں تو شاید تقدیر کے گھومتے پہیے میں اس وقت اوپر نظر آنے والا میران اب پہیے کے نیچے کی طرف آنے کو ہے۔"

"میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا مہربانو! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا آپ میران کو جانتی ہیں؟" اکمل اس کی باتوں سے الجھ رہا تھا۔

"جی ہاں۔۔۔" مہربانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میران کی بہن ہوں میں۔۔۔ اور مجھ سے بڑھ کر بھلا کون جانتا ہوگا اسے۔"

"کیا۔۔۔؟" اکمل کے لیے یہ بات ایک انکشاف ہی تو تھی۔ وہ لڑکی جس کے کردار کی عظمت اور سوچ کی پختگی کا وہ دل سے معترف ہو چکا تھا۔ اس کا اور میران کا آپس میں اس قدر نزدیکی رشتہ ہوگا وہ یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک ہی ماں باپ کے خون سے جنم لینے والی اولادیں یوں متضاد شخصیت اور سوچ کی مالک ہو سکتی ہے۔ یہ بات وہ تسلیم تو کرتا تھا مگر آج نہ جانے کیوں ذہن یہ بات ماننے سے انکار کرتا نظر آتا تھا۔

"آپ اپنی دوست کے ساتھ ہونے والی نا انصافی پر پریشان تھے نا تو شاید آج قدرت کی طرف سے انصاف کرنے کا دن آ گیا ہے۔ جس طرح میران نے کسی دوسرے کی بہن، بیٹی کی عزت اچھالی تھی، کون جانتا ہے کہ پوری رات آپ کے ساتھ اس لفٹ میں گزارنے کے بعد اس کی اپنی بہن کی عزت اور کردار کو کن کن نظروں سے نہیں دیکھا جائے گا۔ ندی کی پاک دامنی کے بے شمار گواہ ہونے کے باوجود وہ کسی کو اپنا یقین نہیں دلا پائی تھی نا تو میں۔۔۔ میں کس سے گواہی کی امید رکھوں؟" باوجود ضبط کے اس کی خشک آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے سو اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔

اکمل اب تک چپ چاپ کھڑا اس کی باتوں کے معانی میں گم تھا۔ جانتا تھا کہ آج کی رات کے بعد بے دار ہونے والے بے شمار سوالات کے جواب اس سے کہیں زیادہ مہربانو کو دینے ہوں گے مگر میران کو اس کے کیے کی سزا یوں ملے یہ تو اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا اور مہربانو جو بڑے غیر محسوس طریقے سے بغیر کچھ کہے سنے اس کے حواسوں پر چھا چکی تھی۔ اس کا تعلق میران سے جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت شخص لگا کرتا تھا اس قدر نزدیکی ہے کہ اس کے اعمال کی پرچھائیں بھی مہربانو پر پڑ رہی ہیں۔ بڑی بے بسی سے اکمل نے اپنے سامنے موجود اس معصوم اور سچی لڑکی کو بڑی بے دردی سے بار بار اپنی ہی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو مسلتے دیکھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر اس کے سارے آنسو سمیٹ لے، اسے بتائے کہ اگر کبھی ایسا وقت آیا کہ ندی کی طرح تمہیں تمہارے گھر والوں کا ساتھ اور اعتماد نصیب نہ ہوا تو میں دنیا میں وہ پہلا شخص ثابت ہوں گا جو کہ تمہیں آگے بڑھ کر سہارا دے گا، تھام لے گا اور تمہیں کسی کے سامنے اپنی ذات کے متعلق صفائیاں نہیں دینا پڑیں گی۔ کہنے کو تو وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہمیشہ ہی، بھلا ایسا کب ہوتا ہے کہ ہم جو کہنا چاہیں وہ کہہ بھی ڈالیں بعض اوقات ذہن میں ترتیب دیے جانے والے بے شمار جملے، کئی باتیں ان کہی بھی تو رہ جاتی ہیں اور اِن اَن کہی باتوں کی اذیت انسان کو ہمیشہ بے قرار رکھتی ہے۔ مہربانو سے ملاقات کی اس کی دعا پوری بھی ہوئی تو کس طرح کہ وہ اب تک حیران تھا اور تہہ دل سے اس صاف دل لڑکی کے لیے دعا گو بھی تھا کہ صبح کا طلوع ہونے والا سورج اس کے عزت و وقار میں کسی قسم کی کوئی کمی لانے کا سبب نہ بنے۔

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

☆☆☆

"کسے لے کر آئی ہیں ہاسپٹل؟ اور اتنی پریشان کیوں ہیں؟" ثمینہ نے ندی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے دریافت کیا تو وہ جو ٹکٹکی باندھے شاہ زین کو دیکھ رہی تھی خیالات سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ تو آج کل اپنی شادی کی تیاریوں میں مگن ہے اور اسے بھول بھال چکا ہے وہ جو شاید اس کے لیے یونیورسٹی میں وقت اچھا گزارنے کا ایک ذریعہ تھی اور بس۔

"امی بیمار ہیں میری، بس دعا کرو کہ اللہ انہیں جلدی سے ٹھیک کر دے۔۔۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔ تو میں بھی مر جاؤں گی۔" شاہ زین سے توجہ ہٹاتے ہوئے اس نے ثمینہ کو جواب تو دیا مگر غیر ارادی طور پر اب بھی وہ اسی کو دیکھے جا رہی تھی جو وہیں ریسپشن کے پاس ٹھہر گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے انہیں؟ آئی مین کوئی بیماری وغیرہ۔۔۔" ثمینہ کے پوچھنے پر وہ چپ چاپ بس اسے دیکھے گئی، بھلا کہتی بھی تو کیا کہ ان کی بیماری تو وہ خود تھی اور اسی کی وجہ سے بابا اس دنیا سے چلے گئے اور اب امی کی یہ حالت ہو گئی ہے تو ذمہ دار اس کے علاوہ بھلا کون ہے۔

"دراصل میں بھی اپنی امی کو لے کر آئی تھی، اُن کا شوگر لیول بہت بڑھ گیا تھا تو بھائی انہیں فوراً یہاں لے آئے۔ اب ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ ان کی حالت کافی بہتر ہے۔ بس اسی لیے میں نے آپ سے بھی پوچھا تھا کہ آپ کی امی کو خدانخواستہ کیا ہوا ہے؟" ندی کو یوں اپنی طرف خاموشی سے دیکھنے پر وہ گھبرا گئی تھی کہ شاید اس نے کوئی غلط بات پوچھ لی ہے اسی لیے وضاحت دے ڈالی۔

"میری امی کو تو کوئی بیماری نہیں ہے مگر۔۔۔ وہ اعصاب کی جنگ ہارتی جا رہی ہیں بس۔" ثمینہ اس کی بات سمجھ نہیں پائی تھی اور اسے اماں کا کمرہ نمبر بھی معلوم نہیں تھا۔ اس لیے شاہ زین کے آنے تک اسے یہیں رہ کر اس کا انتظار کرنا تھا سو وہیں موجود کرسیوں پر ندی کے ساتھ ہی اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کی پشت شاہ زین کی طرف تھی اور شاہ زین جس کے لیے اب تک یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ آیا یہ سامنے بڑی سی سیاہ چادر اور شکنوں سے بھرے ملگجے کپڑوں میں ملبوس لڑکی ندی ہی ہے یا کہ اس کی کوئی ہم شکل۔۔۔ کیونکہ اس کا ذہن ندی کو اس حلیے میں قبول کرنے پر آمادہ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ندی جس کی خوش لباسی کے پورے ڈیپارٹمنٹ میں چرچے ہوا کرتے تھے اور جسے دیکھ کر لڑکیاں فیشن کے ٹرینڈز جانا کرتی

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

تھیں آج اس طرح اس کے سامنے ہوگی یہ تو کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر یونہی ریسپشن پر کچھ کاغذات رکھ کر انہیں اوپر نیچے کرتے ہوئے خود کو مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کے دوران جب جب اس نے ندی کو دیکھا ثمینہ سے باتیں کرتے ہوئے ندی کی نظروں کو خود پر مرکوز ہی پایا۔

جذبۂ محبت میں تیر بے خطا پایا
ہم نے جب اسے دیکھا، دیکھتا ہوا پایا

اور پھر آخر جب وہ خود پر مزید جبر نہیں کر پایا تو بالآخر چھوٹے چھوٹے قدم لے کر اس کی جانب آیا اور اس کے قریب آتے ہی پتا نہیں ندی کو کیا ہوا کہ میکانکی انداز میں ثمینہ کی بات سنتا چھوڑ کر ایک دم کھڑی ہوگئی۔ چہرہ مجسم شکایت تھا تو آنکھیں سراپا سوال۔۔۔ ثمینہ اسے یوں ایک دم کھڑا ہوتے دیکھ کر اس کی نظروں کے تعاقب میں پہنچی تو سامنے شاہ زین کو دیکھ کر وہ بھی ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔

''شاہو۔۔۔!'' ندی کا انداز بے تکلفانہ اور لہجے کی بے تابی ثمینہ کو یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔

''بھول گئے ہو کیا مجھے؟ کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟ کیا ہمارا ساتھ صرف یونیورسٹی تک کا تھا اور بس؟'' ندی کے سوالات ایک لمبی قطار میں اس کے منتظر تھے۔ ثمینہ اب تک یہ سمجھ چکی تھی کہ یہی ندی ہے جس کے ساتھ نے پہلے شاہ زین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیری اور آنکھوں میں زندگی کی رمق جگائی اور پھر ذہن و دل پر اداسی کے ڈیرے ڈال کر خود منظر سے غائب ہوگئی۔

''وقتی رشتے، دوستیاں اور جذبات وقت کے ساتھ اسی طرح اوجھل ہو کر اپنا ہر نشان یوں مٹا دیتے ہیں کہ پھر وہ یادیں جو ان رشتوں، دوستوں اور جذبات سے وابستہ ہوتی ہیں، یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتیں۔''

یہ کیسا جواب تھا۔ ندی سر اٹھا کر بس اسے دیکھے ہی گئی۔

لمبے چوڑے شاہ زین کی آنکھیں اسے اتنی اجنبی کیوں لگ رہی تھیں؟ اور کیا وہ واقعی اسے محض یونیورسٹی کی حد تک ہی دوست سمجھتا تھا؟ اس کا لہجہ اور الفاظ کیا پیغام دے رہے تھے؟ یعنی کہ اب وہ ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہوئے اسے یاد ماضی کی طرح بھول جانا چاہتا ہے؟

''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا مجھے بے حد افسوس ہے، میری وجہ سے میران نے تمہیں اخلاقی طور پر جو نقصان پہنچایا اس کی بھی میں تم سے معافی چاہتا ہوں کیونکہ میرا دل صاف تھا اور میں نے کبھی بھی یہ سب اس طرح سے نہیں چاہا تھا۔'' شاہ زین بولا بھی تو انتہائی نپے تلے لہجے میں اور اجنبیت کی حد کو پھلانگے بغیر اور اس کا یہی انداز ندی کے لیے باعث حیرت تھا کیونکہ اس کے خیال میں ان دونوں کی ایک ملاقات ہوتے ہی راوی بس چین ہی چین لکھنے لگے گا۔ ابھی مزید آزمائش شاید باقی ہے یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

''لیکن یہ بات میرے ساتھ ساتھ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ اکثر اوقات جرم سرزد ہو جانے کے بعد دنیا والوں کی نظر میں مجرم پھر بھی سرخرو ہی رہتا ہے اور سزا کاٹتا ہے تو بس کوئی میری طرح کا عام سا مگر شریف انسان۔''

ثمینہ اگر اب سے کچھ دیر پہلے ندی کے اس تعارف سے قبل اس سے اپنی علیحدہ اور ذاتی حیثیت میں نہ مل چکی ہوتی تو یقیناً وہ بھی ندی کو ایک ایسی ہی لڑکی سمجھتی جس نے اس کے بھائی کی خوشیوں کا خون کر دیا تھا اور جو اسے بینائی لوٹانے کے بعد ایک بار پھر نابینا کر گئی تھی مگر اب ایسا نہ تھا۔ اب اس کے دل میں سامنے کھڑی اس خوب صورت سی لڑکی کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور بن چکا تھا۔ جبھی شاہ زین کی باتوں سے اس کے چہرے پہ ہلدی اترتے دیکھ کر خود ثمینہ کو بھی افسوس ہونے لگا تھا کہ ایک تو وہ اپنی ماں کے لیے اپ سیٹ تھی اور دوسرا شاہ زین اس کی ذہنی حالت کی پروا کیے بغیر اس سے مزید طنزیہ باتیں کیے

جا رہا تھا اور خود ندی کو بھی تو اس سے بے شمار گلے شکوے تھے، لاتعداد شکایات تھیں لیکن پھر بھی وہ اسے اپنے سامنے پا کر سب کچھ بھلا بیٹھی تھی۔ اتنے سخت اور مشکل ترین حالات میں شاہ زین نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر اس کی خبر لینے کے بجائے نئی زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ندی کو اگر یکسر نظر انداز کر ڈالا تھا تو خفا تو وہ بھی تھی اور سوچا تو اس نے بھی یہی تھا کہ اب اگر زندگی کے کسی موڑ پر وہ سامنے آ بھی گیا تو وہ قطعاً اس سے بات نہیں کرے گی مگر پھر ایسا کیا ہوا کہ اسے دیکھتے ہی وہ تمام ارادے ریت کی بھربھری دیوار کی طرح زمین بوس ہو گئے۔

سوچا اسے تو ہم نے نہ ملنے کی ٹھان لی
دیکھا اسے تو سارے بہانے بدل دیے

''میں نے آج تک تم کو کیا سمجھا، اپنے دل میں تمہارے لیے کیا محسوس کیا اور اب تک کا یہ وقت کیسے گزرا میرا خیال ہے اب جبکہ زندگی ایک نئی کروٹ لینے کو ہے تو یہ سب باتیں کرنا بس وقت کے زیاں سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔۔۔ تمہاری زندگی تمہیں مبارک ہو۔'' بات ختم کرنے کے بعد شاہ زین نے لمحہ بھر رک کر اسے یوں الوداعی نظر سے دیکھا جیسے اس کا چہرہ اپنی آنکھ کی پتلیوں پر منجمد کر لینا چاہتا ہو اور ندی تو نہ کچھ بول پا رہی تھی اور نہ ہی شاید اس کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا سوائے ان باتوں کے مفہوم کے جو ابھی ابھی شاہ زین نے کی تھیں۔

''بھائی دراصل وہ۔۔۔'' ثمینہ نے شاید ندی کی صفائی دینا چاہی تھی اور تبھی ندی کو معلوم ہوا کہ وہ جس سے ابھی کچھ ہی دیر پہلے اپنا دکھ سکھ کر رہی تھی وہ کوئی اور نہیں شاہ زین کی بہن تھی۔

''ثمینہ! تم چپ رہو اور چلو میرے ساتھ۔۔۔''

شاہ زین نے ثمینہ کو سرزنش کرتے ہوئے جاتے جاتے مڑ کر ایک بار پھر ندی کو دیکھا جو ہونق سی اب تک اسی طرح کھڑی تھی۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' ندی کو مخاطب کر کے کہنے کے بعد وہ رکا نہیں تھا اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اماں کے وارڈ کی طرف نکل پڑا۔ ثمینہ نے البتہ جاتے جاتے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اچھی طرح بھینچے اور آہستہ سے اللہ حافظ کہہ کر شاہ زین کے پیچھے جاتے ہوئے مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ یوں بھی ثمینہ کا دل بے حد بوجھل ہو گیا تھا۔ شاہ زین تو اپنا بھائی تھا اس کا دکھ تو جو تھا سو تھا مگر اسے تو ندی کا دکھ بھی ہلکا معلوم نہیں ہو رہا تھا اور پھر میران کے ساتھ کہیں اس کی شادی کسی زبردستی کا نتیجہ ہے یا پھر خود ندی اور میران کی خواہش؟ جو بھی تھا اور اس نے شاہ زین کے جذبات کو کتنا ہی ہرٹ کیوں نہ کیا ہو، ثمینہ کو اس کانچ کی آنکھوں والی لڑکی سے بے حد ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو ان کو یوں جاتے ہوئے بڑی ہی بے بسی سے بس دیکھے جا رہی تھی جس کے ساتھ کچھ بھی حسب توقع نہیں ہو رہا تھا اور یہی بنیادی وجہ تھی کہ وہ بار بار سنبھلتی اور گرتی جا رہی تھی۔ خود کو لاکھ جتن کر کے مجتمع کرتی ہی تھی کہ ایک اور امید ٹوٹ جانے پر پھر سے سارا وجود کرچی کرچی ہو جاتا۔ اُن دونوں کے نظر سے اوجھل ہو جانے پر وہ جہاں کھڑی تھی انہیں قدموں پر پیچھے رکھی کرسی پر ڈھے گئی تھی۔ وہ جو خود کو بڑی ہی مضبوط قوت ارادی کی مالک سمجھا کرتی تھی اب اپنی اس خوش گمانی کے آگے ہار مان گئی تھی۔ اسے اعتراف تھا کہ شاہ زین کے مقابلے میں خود اس کا دل اس کے اپنے مدمقابل ہے سوچاہ کر بھی وہ نہ تو شاہ زین کے متعلق کچھ غلط سوچ سکتی ہے اور نہ ہی اس کی طرف سے برتے گئے کسی بھی غلط رویے پر اسے قصوروار ٹھہرا سکتی ہے۔ جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر دل اس کی حمایت میں ایسی ایسی دلیلیں پیش کرتا کہ دماغ کی سرزنش بھی کسی کام نہ آتی اور وہ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس کی حمایت میں سوچنے لگتی اور شاید اسی کا نام محبت ہے۔

کرسی پر سر جھکا کر بیٹھی ندی کا دھیان کبھی امی کی طرف جاتا تو کبھی اس آخری رہی سہی امید کے ٹوٹ جانے کی طرف اور شاید وہ ابھی مزید کتنی ہی دیر اسی کیفیت میں بیٹھی رہتی کہ ایک مانوس سی چاپ پر

چونک کر رہ گئی۔ سر اٹھایا تو سامنے ناصر بھائی انتہائی شکستہ حالت میں کھڑے تھے۔ خود سے ندی کو مخاطب کرنا تو ظاہر ہے ان کی انا کے سر پر پاؤں رکھنے کے مترادف ہوتا جبھی اسے پکارنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ندی نے دیکھا تو ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

''امی کو ہوش آ گیا؟ کیسی ہیں وہ؟ میں مل سکتی ہوں ان سے؟'' ایک ہی سانس میں اُس نے بے تابی سے کئی سوال کر ڈالے تھے۔ جواب میں ناصر بھائی کی نفی میں ہلتی گردن۔۔۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی کہ وہ بولے۔

''وہ ابھی ہوش میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹرز نے ان کے لیے فوری خون کا بندوبست کرنے کا کہا ہے۔ میں ابھی۔۔۔''

''تو میرا لے لیں نا خون۔ ایک ایک قطرہ نکال لیں میرے جسم کا لیکن خدا کا واسطہ ہے بھائی! میری امی کو بچا لیں۔۔۔ اُن کے سوا اب کون ہے میرا۔۔۔ میں مر جاؤں گی اگر انہیں کچھ ہوا تو۔۔۔'' ندی نے ناصر بھائی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی تھی۔

''اگر یہ بات ہوتی تو کیا تم مجھے اتنا ہی خود غرض سمجھتی ہو کہ میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی انہیں پیش کرنے سے کتراتا؟''

کتنے ہی عرصے بعد آج دونوں ایک دوسرے کو براہِ راست مخاطب کر رہے تھے مگر اس وقت تو ندی کو لگ رہا تھا کہ درمیانی عرصے میں جیسے آج تک کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ یاد تھا تو بس یہ کہ اس وقت امی کی حالت تشویش ناک ہے اور بس۔۔۔

''ہم دونوں کا بلڈ گروپ ان سے مختلف ہے اور اتفاق سے اس وقت ہاسپٹل میں بھی ان کا بلڈ گروپ اسٹوریج میں موجود نہیں ہے۔''

''پھر۔۔۔ اب کیا ہو گا؟''

''اللہ بہتر کرے گا، میں اپنے ایک دوست کو فون کرتا ہوں وہ ایک آدھ گھنٹے میں اپنے ساتھ چند رضا کاروں کو لے آئے گا لیکن اس کے لیے مجھے پہلے گھر جانا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا نمبر میرے پاس فون میں نہیں ہے۔ تم یہیں مت بیٹھی رہو، اندر چلی جاؤ، میں بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' ندی کو اپنی جگہ ڈاکٹرز کے روبرو کروا کر ناصر بھائی جب حواس باختگی کے عالم میں تیز قدموں کے ساتھ پارکنگ کی طرف دوڑے تو ریسپشن پر اماں کی ڈسچارج سلپ پر دستخط کرتے شاہ زین نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

میری اور کنول کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رات گیارہ بجے کے بعد ہاسٹل کے سامنے کھڑی اندر جانے کے لیے ہچکچاہٹ کا شکار تھیں۔ کیا بہانہ کریں اور مہربانو کا ساتھ نہ ہونا کیسے چھپائیں۔ یہ بات دونوں کے لیے اس وقت ایک بھوت کی جگہ لے چکی تھی۔

''کسی کو کیا پتا چلے گا کہ مہربانو ہمارے ساتھ تھی یا اپنے کمرے میں ہے؟'' کنول نے ہاسٹل گیٹ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر کچے چوروں کی طرح کا رویہ اختیار کیا۔ گھور اندھیری رات اور وہ دونوں اکیلی جس طرح اتنی دیر شاپنگ سینٹر کے چاروں طرف خوار ہوتی پھری تھیں اور پھر جس طرح بس پر بیٹھ کر یہاں تک پہنچی تھیں یہ وہی دونوں جانتی تھیں اور اب اندر داخل ہونا بھی ان کے نزدیک ایسا مشکل ترین عمل بن چکا تھا جسے کرنے کے لیے دونوں ہی میں ہمت مفقود نظر آتی تھی۔

''ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے، پھر اس کا مطلب ہے بس یونہی چپ چاپ سر جھکائے گزر جائیں گے کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ ہمیں نہیں معلوم۔۔۔'' میری نے بھی اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا۔

''لیکن خود سوچو، اس طرح تو مہربانو زیادہ قصور وار ٹھہرائی جائے گی نا کہ ہمیں بھی نہیں بتایا اور کہیں چلی گئی۔ کم از کم ہمیں تو ہر حال میں اس کی سپورٹ کرنی ہی ہے حالانکہ خود ہم بھی اس کی پراسرار گمشدگی پر حیران ہیں۔''

''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ پھر کیا کریں؟'' میری نے کنول سے اتفاق کرتے ہوئے حل بھی اسی سے طلب کر لیا تھا۔

''میرا تو خیال ہے پہلے ہاسٹل کے اندر داخل تو ہوں پھر دیکھتے ہیں، شاید وہیں پر کسی سے مشورہ مل جائے۔'' کنول نے کہا اور دونوں دھڑکتے دل کے ساتھ ہاسٹل کے گیٹ پر جا پہنچیں جہاں پر گیٹ کیپر اپنے مخصوص کیبن میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ ان دونوں کو یوں گھبرائے گھبرائے اندر داخل ہوتے دیکھا تو پکار لیا اور اس کی آواز سنتے ہی دونوں کے اوسان خطا ہونے میں کوئی بھی کسر باقی نہ رہی۔

''بیٹا! آج اتنی دیر؟ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا؟'' گیٹ کیپر نے ازراہ شفقت پوچھ ڈالا تھا۔ جسے وہ دونوں ہی اس کی شک کی نظر سمجھ بیٹھیں۔

''جی وہ دراصل۔۔۔ آج کچھ دیر ہو گئی۔۔۔ یہ چیزیں لینی تھیں نا۔۔۔'' گھبراہٹ میں کنول نے بات کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز بھی سامنے کر ڈالے جس میں میری اور مہربانو کے لیے خریدے جانے والے گفٹس کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی ذاتی استعمال کی بھی چند اشیاء موجود تھیں۔

''اچھا اچھا۔۔۔ لیکن بیٹا! اس رجسٹر پر ابھی کا وقت لکھ کر آپ کو اپنے اپنے سائن کرنا ہوں گے۔'' گیٹ کیپر نے دونوں کے درمیان میں رکھے میز پر رجسٹر کھول کر رکھ دیا تھا جس پر آج کی تاریخ میں رات دس بجے کے بعد ہاسٹل کے اندر آنے اور ہاسٹل سے باہر جانے والی لڑکیوں کے نام، وقت اور دستخط موجود تھے اور یہ بات میری اور کنول کے بھی علم میں تھی کہ مہینے میں تین سے زائد دفعہ اس رجسٹر پر نام کا اندراج ہونے کی صورت میں ایک تحریری اطلاعی لیٹر گھر پر ارسال کر دیا جاتا ہے مگر اُن دونوں کا یہ پہلا موقع تھا اس لیے دونوں نے لمحہ بھر ایک دوجے کو دیکھا اور رجسٹر کے اوپر رکھے گئے پین سے سائن کر کے ابھی اس سے پہلے کہ وہ مڑتیں گیٹ کیپر کی آواز پر ایک دفعہ پھر چونک کر پلٹیں۔

''بیٹا! کیا بات ہے، لگتا ہے آپ کی اپنی تیسری دوست سے لڑائی ہو گئی ہے۔'' گیٹ کیپر نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کپ میں موجود چائے کا آخری گھونٹ لیا اور کپ ایک طرف رکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یوں بھی ان لوگوں کا واسطہ سارا دن انہیں طالبات سے پڑتا رہتا ہے اور اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ اکثر اوقات بہترین فیس ریڈرز بھی ثابت ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کا بھی بہت اچھی طرح علم ہوتا ہے کہ ہاسٹل میں موجود کس لڑکی کی کس سے دوستی ہے اور لڑکیوں کو کون سا گروپ ہاسٹل سے زیادہ باہر کی سرگرمیوں میں تفریح محسوس کرتا ہے۔

''مہربانو سے۔۔۔؟'' میری حیران ہوئی۔

''جی جی، نام تو مجھے نہیں معلوم تھا لیکن دراصل آج تک کبھی ایسا ہوا نہیں کہ آپ تینوں ایک دوسرے کے بغیر ہاسٹل سے باہر نکلی اور واپس آئی ہوں، بس اسی لیے پوچھ لیا۔''

''گئے تو ہم ایک ساتھ ہی تھے لیکن۔۔۔'' کنول کو ذرا سی ہمدردی گیٹ کیپر کے لہجے میں محسوس کیا ہوئی مختصراً سارا قصہ کہہ سنایا اور نہ صرف یہ بلکہ مشورہ بھی طلب کر لیا۔

''یہ تو بڑی پریشان کن بات ہے بیٹا! خود سوچو آج کل کے حالات کس قدر خراب ہیں اور اگر اسے کسی نے وہیں سے اغوا کر لیا ہو تو۔۔۔؟'' بجائے حوصلہ تسلی یا کوئی بہتر مشورہ دینے کے گیٹ کیپر کے اس ''اگر'' نے انہیں مزید خوف زدہ کر دیا تھا۔

''پھر اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیسے ڈھونڈیں گے اُسے؟'' میری نے مشورہ چاہا تھا۔ یوں بھی لڑکیوں کی ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ جہاں ذرا سی ہمدردی کے دو بول سننے کو ملے وہیں پر اپنی تمام تر کہانی بیان کر ڈالی۔ یہ سوچے بغیر کہ کوئی بھی یاد، قصہ کہانی یا راز اُن کے دل میں ہے تو محفوظ تر ہے البتہ زبان پر آتے ہی کسی اخباری خبر کی طرح ہر ایک

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

کی ملکیت ہوگا جس کا جس ذہن سے دل چاہے پڑھے اور پھر اپنی مرضی کا تبصرہ کرتے ہوئے اوروں کی رائے بھی چاہے۔

"پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگی؟ اور اگر اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا کہ وہ اغوا ہوگئی ہے تو وہ کیا کریں گے؟"

"سب سے پہلا کام جو وہ کریں گے وہ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کروانے کا ہی ہوگا کیونکہ اس کے بغیر اسے ڈھونڈنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہے۔" گیٹ کیپر دور کی کوڑی لایا تھا۔

"اس کے گھر والے تو یہاں نہیں ہیں اور پھر وہ ہماری دوست ہے، ہمارے ساتھ گئی تھی اور اس کے لیے کوشش کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم خود پولیس میں رپورٹ درج کروادیں۔" میری بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

"لیکن اس طرح تو یہ خبر ہر ایک کو پتا چلے گی اور بدنامی الگ۔"

"مگر اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔" کنول کی طرف سے خدشے کا اظہار کیے جانے پر گیٹ کیپر بولا۔

"اور ویسے بھی اس واقعہ کو یوں حالات کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ آج رات کو وہ نہیں ملی اور اگر کل کا دن بھی اسی طرح گزر گیا اور پرسوں کا بھی پھر۔۔۔؟ پھر بھی تو یہی کچھ کرنا پڑے گا نا۔۔۔؟ تو کیوں نہ ابھی فوری طور پر یہ قدم اٹھالیا جائے تاکہ کامیابی کا تناسب تو بڑھ جائے ورنہ یہاں ہمارے ملک میں وزیراعظم کا بیٹا بھی اغوا ہوجائے تو مہینوں اس کی خبر نہیں ملتی یہ تو پھر ایک عام شہری ہے اور لڑکی ذات ہے۔" میری اور کنول دونوں ہی کشمکش و پیچ کا شکار تھیں اور اپنے آپ میں فیصلہ کرنے کی قوت موجود نہیں پارہی تھیں۔ سو بے یقینی کی کیفیت میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کرنے لگیں۔ گیٹ کیپر نے یوں دونوں کو تذبذب کے عالم میں دیکھا تو کچھ سوچ کر بولا۔

"اگر آپ دونوں کہو تو میں وارڈن سے بات کروں؟"

"نن۔۔نن۔۔نہیں، بالکل نہیں۔" دونوں بلا تاخیر یک زبان ہوکر بولی تھیں۔

"کیا آپ کے پاس مہربانو کا کوئی فون نمبر وغیرہ۔۔۔؟"

"ہے تو۔۔۔ مگر اس کے فون کی چارجنگ تو دوپہر سے ختم تھی۔" کنول نے مایوسی سے کہا۔

"تو بیٹا! پھر آپ لوگ مجھے اجازت دو کہ جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ کروں اور آپ دونوں بھی اپنے کمرے میں جاؤ کیونکہ اتنی دیر تک رات کو آپ کا میرے کیبن میں کھڑا رہنا بھی کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

گیٹ کیپر کے سمجھانے پر وہ دونوں اس کے کیبن سے نکل کر تقریباً خود کو گھسیٹتے ہوئے کمرے کی طرف سے جانے لگیں۔

☆☆☆

میری بستی سے پرے بھی میرے دشمن ہوں گے
پر یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اُترا؟
آشنا ہاتھ ہی اکثر میری جانب لپکے
میرے سینے میں میرا اپنا ہی خنجر اترا

"اولاد جب نو ماہ اپنی ماں کے خون سے پرورش پاتی ہے تو دنیا میں آتے ہی اس کا بلڈ گروپ بھلا تبدیل کیوں ہوتا ہے؟ کیوں زندگی میں کسی بھی مشکل وقت میں اپنے ہی ماں یا باپ کے لیے خون حاصل کرنے کی غرض سے اوروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے؟ ہماری رگوں میں دوڑتا ہوا خون کا ایک ایک قطرہ بھی پھر کس کام کا اگر اپنے ہی ماں باپ کی زندگی محفوظ کرنے کے کام نہ آسکے؟"

یہ اور اس جیسے کئی مکالمات خود سے ہی کرتے ہوئے ناصر بھائی نے گاڑی ہارن دے کر اندر کرنے کے بجائے باہر ہی روکی کیونکہ ان کا ارادہ گھر میں ٹھہرنے کا نہیں تھا بلکہ اپنے دوست کا نمبر لے کر اسے فون پر صرف مطلع کرنا تھا کہ انہیں اس بلڈ گروپ کی فوری ضرورت ہے اور انہیں یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں وہ ہاسپٹل پہنچ جاتا جبھی متبادل چابی کا استعمال کرتے ہوئے گیٹ کھولا تو لان سے اندر تک کا فاصلہ طے کرنے کے دوران انہیں محسوس ہوا بے شک امی کی پریشانی سے ان کا دل تو بوجھل تھا ہی مگر پاؤں بھی ساتھ دینے پر تیار نظر نہ آتے تھے۔ بابا اس دنیا سے اس کیفیت میں رخصت ہوگئے کہ جب وہ ندی کی وجہ سے ان سے ناراض تھے اور اب امی جو عرصہ ہوا ان سے بات چیت چھوڑ چکی تھیں وہ بھی بسترِ علالت پر تھیں۔ وہ ایسا نہیں چاہتے تھے جو کچھ ہو رہا تھا اور نہ ہی وہ امی کو خفا رکھنا چاہتے تھے مگر ہمیشہ سب کچھ ویسا بھی تو نہیں ہوتا نا جیسا ہم چاہتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں مین گیٹ کے دونوں اطراف روشن لائٹس کی روشنی میں لان میں رکھی امی، بابا اور ان تینوں کی کرسیاں جن پر وہ سب آخری دفعہ شام کو کب بیٹھے تھے، ناصر بھائی کو یاد کرنے پر بھی وہ دن ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ خیال تھا تو بس اتنا کہ وہ سب ایک ٹوٹی ہوئی تسبیح کی طرح اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے کوئی موتی تسبیح سے ٹوٹ کر مٹی میں جاملا تھا تو کوئی اپنی پہچان ہی گنوا بیٹھا تھا۔

جس طرح پانی کی کمی پودوں کیا کھڑی فصلوں تک کو مار ڈالتی ہے اسے طرح رشتے کتنے ہی نزدیکی کیوں نہ ہوں رابطوں کی کمی اُن کے وجود کو بھی یوں ختم کردیتی ہے کہ ان کا ہم سے تعلق صرف ذکر چھڑنے اور ان کا نام آنے پر ہی یاد آتا ہے اور خود اس گھر کے مکینوں میں بھی بھلا کوئی رابطہ کب باقی رہا تھا۔ تعلق بھی تھا تو بس برائے نام۔ ناصر بھائی کی ساری زندگی بس عائشہ بھابھی سے شروع ہوکر انہیں پر ختم ہونے لگی تھی اور یہ بات آج امی کو اپنے ہاتھوں سے گاڑی سے نکال کر اسٹریچر پر اٹھا کر ڈالتے ہوئے انہیں بڑی شدت سے محسوس ہوئی تھی اور وہ جو سب لوگوں میں بے حد مضبوط اعصاب کے مالک سمجھے جاتے تھے وہ بھی امی کو ڈاکٹرز کے حوالے کرکے ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر اکیلے میں رو پڑے تھے اور واقعی وہ جو اتنے عرصے سے اپنے دل کا غبار اپنے ہی اعصاب پر لیے پھرتے تھے یوں تنہائی میں کھل کر روئے تو انہوں نے جانا کہ بے شک رونا بھی اس خدائے واحد کی کس قدر بڑی نعمت ہے کہ جب دل رنج و غم سے بوجھل ہو اور سینے سے سانس تک خارج ہونے کے بجائے کہیں حلق میں ہی اٹکی محسوس ہونے لگے تب اس کرب کا اظہار آنسوؤں کے ذریعے ہوجانے سے روح پر سے دکھ کی کثافت ہٹتی تو نہیں مگر ہاں انسان کو اپنا آپ قدرے ہلکا ضرور محسوس ہونے لگتا ہے اور اس مشکل وقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے مزید توانائی میسر آتی ہے۔

گھر میں داخل ہوئے تو ثروت آپا کے کمرے سے تلاوت کی آواز لاؤنج تک آرہی تھی۔ رات کے اس پہر وہ خدا کے حضور اس کی اپنی ہی کتاب کا واسطہ دے کر اپنی ماں کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو تھیں۔ سو ان کی دعاؤں میں خلل آنے کے خیال سے ناصر بھائی نے انہیں پکارنا اور ان کے کمرے میں داخل ہونا مناسب نہ سمجھا، جانتے تھے کہ ان کے سامنے ہوتے ہی وہ امی کے بارے میں پوچھیں گی اور جواب میں ان کے پاس یقیناً کوئی حوصلہ افزا جملہ نہ پاکر وہ مزید پریشان ہوتیں جبھی ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی آمد پوشیدہ رکھتے ہوئے دبے پاؤں بیڈروم میں جاکر محض نمبر لینے کے بعد باہر نکل آئیں گے تاکہ کسی بھی قسم کے سوالات کا سامنا کرنے سے بچ سکیں اور پھر اللہ کی رحمت سے امی کی صحت بہتر ہونے کے بعد ہی انہیں کسی بھی قسم کی اطلاع دی جائے اس سوچ کے تحت وہ آہستگی سے نرم قدموں کے ساتھ ثروت آپا کے کمرے کے سامنے سے گزر کر ہینڈل پر ہلکا سا غیر محسوس دباؤ ڈال کر اس سے پہلے کہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوتے، عائشہ بھابھی کی آواز نے انہیں وہیں رکنے پر مجبور کردیا۔

"پہلے تو صرف ڈراموں میں یہ چالبازی دیکھتی تھی، اب تو خود ہمارے اپنے گھر میں ہر وقت کی ڈرامہ بازی شروع ہوگئی ہے، جہاں اُس ندی سے

جان چھوٹنے کی امید نظر آتی ہے، امی خود پر بیماری طاری کر کے سب کی ہمدردیاں جمع کرنے لگتی ہیں۔ اچھا خاصا آج زیورات تک کا آرڈر دے دیا تھا، دو چار دنوں میں اسے بھی رخصت کر دیتے مگر اب پھر بستر سنبھال لیا ہے خیر سے اور بیٹا بیٹھے گا پاٹکی پکڑ کر، تم دیکھنا۔" انتہائی زہر خند لہجے میں فون پر یقیناً وہ کسی دوست سے گفتگو میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ غصے کے عالم میں تیزی سے اپنے دائیں کندھے پر پڑنے والے بالوں کو انگلی پر مروڑتی جارہی تھیں۔

"تمہیں تو پتا ہی ہے کتنے جتن سے تو ناصر کے دل سے اس کی بہن کی محبت کھرچی ہے لیکن ان بہن بھائیوں کا کیا اعتبار، کچھ نہیں معلوم کہ ہاسپٹل میں ماں کی محبت میں روتی ندی کو دیکھ کر ناصر کے دل میں ایک بار پھر بھائی کا پیار جاگ جائے، ورنہ میں جب سے تو تب سے اب تک ناصر کو اسی خدشے کی وجہ سے کبھی اس ندی کے سامنے تک نہیں ہونے دیا تھا۔ اگر پھر سے دونوں بہن بھائی پہلے جیسے ہوگئے تو میرے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔" خدشات بھرے الفاظ اور تاسف سے بھرپور لہجہ ناصر بھائی کے سامنے عائشہ کی شخصیت کا ایک نیا روپ لارہا تھا ورنہ تب سے اب تک تو ناصر بھائی کے سامنے ہمیشہ انہوں نے ایسی کوئی حرکت کرنے سے گریز ہی برتا تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ اندرونی طور پر گھر اور گھر والوں کے خلاف کہیں پروپیگنڈے کو پال رہی ہیں۔ یوں بھی یہ بات وہ جانتی تھیں کہ اتنا بڑا واقعہ ہوجانے کے بعد بھی ناصر کے سامنے ندی کے خلاف کوئی بات کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا جبھی وہ بڑے ہی دھیان سے سارا کھیل یوں کھیل رہی تھیں کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

"میرے ہیرے جیسے بھائی کو رد کر کے سمجھتی تھی کہ جو چاہے گی کرلے گی لیکن چلو اور چار چھ دن انتظار کرلے، پھر جب شادی کے بعد اسے پتا چلے گا تا کہ وہ اسی میران کی دلہن بنی ہے جس نے اس کی ہوٹلوں میں تفریح کرتے ہوئے جعلی تصویریں اخباروں میں لگوائیں اور شاہ زین جیسے شریف انسان کے ساتھ اس کا جھوٹا اسکینڈل بنا کر سارے شہر میں رسوا کیا، تب سوچے گی کہ کاش! میں عائشہ بھابھی کی منتیں اور درخواستیں مان کر اکمل ہی کے لیے ہاں کر دیتی۔"

الفاظ کیا تھے زہر میں بجھے نیزے کی انی کی طرح ناصر بھائی کے ذہن و دل میں پیوست ہوتے جارہے تھے۔ بابا کی موت، امی کی بیماری، بے چارگی اور بے بسی، ثروت آپا کے سسرال میں ان کی ہونے والی شرمندگی، عزیز و اقارب کی اٹھتی انگلیاں، احباب کے چبھتے سوالات اور سب سے بڑھ کر تکلیف کہ وہ بہن جوان کے لیے زندگی کا سب سے بہترین رشتہ اور آتی جاتی سانسوں کی طرح ان کے دل کی دھڑکن تھی، اس کی چہرے کی پیلاہٹ، آنکھوں کی اداسی اور اس کا جھکا ہوا سر اور ناصر بھائی کے اتفاقیہ سامنے آجانے پر ان کے مخاطب کرنے کا انتظار۔۔۔ ان سب کا ذمہ دار اگر میران تھا تو عائشہ بھابھی بھی اس میں برابر کی حصہ دار تھیں کیونکہ میران نے اگر بدنامی کا بیج بویا تھا تو اسے روزانہ کی بنیاد پر سینچا عائشہ بھابھی نے ہی تھا۔ ناصر بھائی کے سامنے ہر وقت دبے لفظوں اس واقعے کو بڑھا چڑھا کر اس کا باقاعدگی سے اعادہ کرنے والی اور انہیں بارہا یہ باور کروانے والی کہ اب وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، کوئی اور نہیں وہی تو تھیں۔ یہ سب جاننے کے باوجود کہ تصاویر جعلی اور اسکینڈل من گھڑت ہے وہ اسی بات کو مخفی رکھتے ہوئے زور دیتی رہیں کہ یہ سب سچ ہے اور اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ناصر بھائی جو آج سے پہلے ہی بری طرح ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے، عائشہ بھابھی کے اس کریہہ روپ پر ایک نئے صدمے کا سامنا کر رہے تھے۔

"لیکن تم دیکھنا، اکمل کے لیے ایسی لڑکی لاؤں گی کہ۔۔۔"

اس سے پہلے کہ عائشہ بھابھی جملہ مکمل کرتیں، ناصر بھائی کے فون پر ہوتی بیل نے انہیں چونک کر ہلکے سے کھلے دروازے کی طرف مڑنے پر مجبور کر دیا جہاں ہینڈل پر ہاتھ رکھے ناصر بھائی سامنے موجود انہیں یوں خاموش نظروں سے بغیر پلکیں جھپکائے دیکھے جارہے تھے کہ خوف سے عائشہ بھابھی کے ہاتھ سے اپنا موبائل چھوٹ کر کارپٹ پر جاگرا۔ متوحش نظروں سے دروازے کے باہر کھڑے ناصر بھائی کا آدھا وجود اور دائیں آنکھ کا ارتکاز انہیں اس پل بے حد خوف ناک محسوس ہو رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے انہوں نے سوچا کہ شاید یہ ان کا خیال یا کوئی وہم ہے اور درحقیقت ناصر بھائی یہاں موجود نہیں ہیں مگر اگلے ہی پل فون پر ہوتی بیل نے اس وہم کو یقین میں بدل دیا کہ وہ خود اس وقت عائشہ بھابھی کے سامنے موجود ہیں۔ بمشکل تھوک نگلتی عائشہ بھابھی کے قدم پھر بھی جم کر رہ گئے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ چاہتی تھیں کہ چند قدم آگے بڑھ کر دروازہ پورا کھولیں اور انہیں کمرے میں بلا کر اس بات کی یقین دہانی کریں کہ ناصر بھائی نے کچھ سنا تو نہیں اور اگر ایسا ہے تو کوشش کر کے ان کے ذہن میں اپنا اعتماد بحال کریں مگر۔۔۔ ایسا کچھ بھی کرنے کے بارے میں وہ محض سوچ کر ہی رہ گئی تھیں کہ اس وقت ان کا پورا جسم ان کے خلاف کھڑا تھا البتہ ان کے فون کی بیل رات کے سناٹے میں گونجی تو ثروت آپا تلاوت موقوف کر کے بھاگتی ہوئی ان کے بیڈروم کی طرف آئیں تب تک ناصر بھائی فون ریسیو کر چکے تھے مگر آنکھیں اب تک عائشہ بھابھی پر جمی ہوئی تھیں اور اپنی جگہ سے نہ تو ایک قدم آگے گئے تھے اور نہ ہی پیچھے۔

"ہاں ندی! میں بس نکل رہا ہوں۔" فون ریسیو کر کے ندی کی آواز سنتے ہی وہ اسے بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر بولے تھے۔

"نہیں بھائی! آپ بے شک آرام سے آئیں اور اب بلڈ کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، ڈاکٹرز نے بتایا ہے کہ بلڈ ارینج ہوگیا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے ان شاء اللہ کچھ دیر تک ہوش بھی آجائے گا۔" ندی نے تفصیلی طور پر انہیں آگاہ کیا تو بے اختیار انہیں اپنی اس ننھی پری کی آواز پر بے حد پیار آیا۔ تبھی ثروت آپا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اشارے سے امی کی خیریت دریافت کی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" ناصر بھائی نے گہری سانس لی اور ثروت آپا کی طرف مڑتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلائی تو ثروت آپا کی آنکھیں اس تشکر سے بھیگ گئیں اور انہوں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں ملا کر ان پر پیشانی ٹکا دیں۔

"عادل تو سو رہا ہے، میں بھی چلوں آپ کے ساتھ ہاسپٹل؟" ثروت آپا کے انداز میں لجاجت تھی۔

"اور عادل کیا اکیلا سوتا رہے گا؟" عائشہ بھابھی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے موبائل فون پینٹ کی جیب میں ڈالا تو ثروت آپا بڑے جوشیلے انداز میں بولیں۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے ہی تو سویا ہے اور اگر جاگ بھی گیا تو عائشہ ہے نا گھر میں فکر کیسی؟"

"یہ ابھی تک اس گھر میں ہے اسی بات کی تو فکر ہے۔" ان کے لہجے کی کاٹ جہاں عائشہ بھابھی کو یہ یقین دلا گئی تھی کہ وہ تمام گفتگو سن چکے ہیں وہیں ثروت آپا الجھ کر رہ گئیں۔

"جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید۔۔۔ ہونہہ!" زہر خند انداز میں بولتے ہوئے انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے عائشہ بھابھی کو دیکھا جن کے چہرے کے تمام رنگ موسمی پرندوں کی طرح اڑ چکے تھے اور تب وہ ٹھان چکے تھے کہ اب ان کی اس گھر میں کوئی جگہ باقی نہیں ہے ان کے حصے کا جتنا رزق اس گھر میں لکھا گیا تھا شاید اب ختم ہونے کو تھا، انتظار تھا تو محض امی کی اس گھر میں بخیریت و عافیت واپسی کا۔

پلٹ کر آنکھ نم کرنا، مجھے ہرگز نہیں آتا

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

گئے لمحوں کا غم کرنا، مجھے ہرگز نہیں آتا
محبت ہو تو بے حد ہو، نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کرنا، مجھے ہرگز نہیں آتا

☆☆☆

بعض اوقات برس ہا برس گزرنے کے بعد اُن پر لمحہ بھر میں بیت جانے کا گمان گزرتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ایک لمحہ بھی صدیوں کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ سارا کٹھن چکر ہے تو جذبات کا، دل کے اندر بسنے والے اس پانچویں موسم کا جس کے سامنے وقت کی رفتار بھی ہیچ معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ آج گزرنے والی رات ملکانی سائیں کی زندگی کی سخت ترین رات ثابت ہوئی تھی۔ مہمانوں کی موجودگی ان کے لیے سخت اذیت کا باعث بنی۔ ان کی زندگی میں آنے والی بیٹے کی شادی کی سب سے بڑی خوشی یوں دھندلائی کہ مہمانوں کی واپسی پر انہیں ایسا محسوس ہوا گویا وہ سب ان کی خوشی میں شریک ہونے نہیں بلکہ انہیں پُرسہ دینے آئے تھے۔ شاہ سائیں کے جانے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم سے اٹھ کر پھر سے مہربانو کے کمرے میں آگئیں۔ اس کے زیر استعمال رہنے والی ایک ایک چیز کو اٹھاتیں اور محبت سے کبھی آنکھوں سے مس کرتیں تو کبھی چوم ڈالتیں۔ ہزار طرح کے وسوسے اژدھا بن کر اگر مگر کے خیمے تلے وحشت کی بکل مارے بیٹھے تھے۔ وہ اس وقت کہاں ہوگی اور کیا بخیریت انہیں مل پائے گی؟ یہ سوال انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

بیٹا تھا تو وہ اپنی شادی کی خوشی میں مکمل طور پر رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھا۔ یہ جانے اور محسوس کیے بغیر کہ ان کی عزت کس طرح بیٹھے بٹھائے داؤ پر لگ چکی ہے اور ماں باپ کی جان کیسے سولی پر اٹکی ہے مگر وہ جانتا بھی کیسے کہ اس تک تو کوئی بھی اطلاع پہنچ ہی نہیں پائی تھی۔ بھائیوں اور پھر رحمٰن شاہ کا چہرہ ذہن میں آتا تو تھوک کا حلق سے نگلنا ناممکن سا لگنے لگتا۔ اسی کیفیت میں کس طرح صبح کا سورج طلوع ہوا اور چاند منہ چھپا کر اوجھل ہوا ملکانی سائیں کو خبر نہیں ہوئی تھی جیسے ہی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکیں، باہر کنیزاں کھڑی اندر آنے کے لیے ان کی اجازت کی منتظر تھی۔

"ملکانی سائیں کج چاہ پانی ایدر ای لے آواں؟" اجازت ملنے پر کنیزاں اب ان کے سامنے کھڑی ناشتے کے متعلق پوچھتے ہوئے ان کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ یوں بھی ان کا رات بھر بے چین رہنا بھی کنیزاں سے مخفی نہ تھا۔ اس پر رات اپنے کمرے کے بجائے مہربانو کے کمرے میں یوں گزارنا کہ پوری رات ہی وہ جاگتی رہی ہوں، اس کے لیے اچنبھے کا باعث تو تھا ہی مگر پھر خود ہی ان کی اس کیفیت کو اس نے بیٹی کی شادی کے موقع پر خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے موسوم کر دیا۔

"میران کدر اے؟" گم سم سی ملکانی سائیں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کیا۔

"او جی فزر (فجر) دے بعد آئے تھے اپنے کمرے وچ، تے اب سو رہے ہوں گے۔"

"ہوں۔۔۔ اودر کوئی فون شون تے نئیں آیا؟" ملکانی سائیں کا اپنا موبائل تو ان کے پاس تھا مگر لینڈ لائن پر شاید شاہ سائیں نے رات کے کسی پہر فون کیا ہو اسی خیال سے کنیزاں سے دریافت کیا جس کا جواب نفی میں ملنے پر دل پر جو سل نما بوجھ رات سے رکھا تھا اب بھی سرکنے کے بجائے مزید سانس روکتا محسوس ہوا۔

"ملکانی سائیں! آپ دے کھان کے لیے کش ایدر ہی لے آواں؟"

"او نا، نا۔۔۔ بس ٹھیک ہے۔" ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے ناگواری سے کنیزاں کو باہر جانے کا کہا۔

"سونی نے کش کھادا؟ جے نئیں تے اس کو ضرور کھلا دیں کش۔"

"جی اچھا۔۔۔" کنیزاں حسب معمول تابعداری سے سر جھکا کر باہر جاتے ہوئے آہستگی سے دروازہ بند کر گئی تھی، اس کے جانے کے بعد ایک الوداعی نظر مہربانو کے کمرے کی تمام چیزوں پر ڈالتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل کر میران کے کمرے کی طرف گئیں جہاں میران انتہائی گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے موبائل فون تھا، وہ ایک ایک لمحہ بعد اس کی اسکرین کی طرف تکتی جا رہی تھیں۔ شاہ سائیں جب سے حویلی سے گئے تھے اب تک انہوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور خود سے ان کو فون کر کے کچھ بھی معلوم کرنے کی ہمت بھلا ملکانی سائیں میں تھی ہی کب۔ سو محض اس خیال سے کہ شاید انہوں نے میران کے موبائل پر رات کے کسی پہر فون کر کے کوئی اطلاع دی ہو، یا ابھی اس کے سونے کے دوران ان کی طرف سے کوئی فون کال ریسیو ہونے سے رہ گئی ہو، بیڈ کے دائیں طرف موجود سائیڈ ٹیبل پر اس کے موبائل فون کو اٹھا کر انہوں نے کوشش تو کی کہ کچھ معلوم ہو سکے مگر ظاہر ہے کہ اس کے جدید فون کے آگے ان کی سمجھ بوجھ ناکافی تھی جبھی بے بسی سے ہاتھ میں اسے لیے حسرت سے بس دیکھے ہی گئیں۔ اسی دوران کروٹ لینے پر میران کی آنکھ غیر محسوس طریقے سے کھلی اور وہ یوں ان کے ہاتھ میں اپنا سیل فون اور انہیں اپنے کمرے میں موجود پا کر حیران رہ گیا۔ خود ملکانی سائیں نے بھی اسے اپنی طرف متوجہ محسوس کیا تو موبائل واپس اس کی جگہ پر رکھ کر بیڈ کے سرے پر ٹک گئیں اور براہ راست سوال کیا۔

"شاہ سائیں نے تیکوں کوئی فون شون تے نئیں کیا؟"

"بابا سائیں نے؟ نہیں مجھے تو کوئی فون نہیں آیا اُن کا۔ آپ ہی رات کو بار بار ڈسٹرب کر رہی تھیں۔" بے زاری سے کہتے ہوئے اس نے کشن منہ پر رکھ لیا تھا۔ پھر دوبارہ کسی خیال کے تحت کشن پرے کر کے انہیں دیکھا۔

"آپ اس وقت میرے کمرے میں۔۔۔؟ خیر تو ہے نا اماں سائیں؟"

"اللہ خیر ہی کرے۔" گہری سانس خارج کرنے کے دوران وہ بولیں تو میران کو کسی غیر معمولی چیز کا احساس ہوا۔

"کیا مطلب ہے؟ اور رات کو مجھے بار بار فون کیوں کر رہی تھیں؟ اور بابا سائیں کہاں ہیں؟" نیند سے اس کی آنکھوں میں چبھن ہو رہی تھی مگر ملکانی سائیں کے انداز سے دل میں جو کھٹکا سا پیدا ہو رہا تھا اس کی تسلی اس نے لگے ہاتھوں کر ڈالنے کا سوچا اور ملکانی سائیں کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ میران سے تمام باتیں شیئر کر ڈالیں اور شاید وہ رات کو ہی کسی بھی طرح ملازم کے ذریعے اسے بلوا کر اسی وقت سب کچھ بتا بھی دیتیں اگر جو شاہ سائیں انہیں اس متعلق کوئی ہدایات جاری کیے بغیر جاتے تو۔۔۔ مگر اب ظاہر ہے کہ وہ ان کے حکم کے بغیر کچھ بھی کہنے کی مجاز نہیں تھیں۔

"رات دی گل ایہہ سمجھو کہ رات نوں ای ختم ہو گئی تھی تے یا فیر رات دی گل اب کدی وی ختم نئیں ہونی۔" مبہم سی آدھی ادھوری حقیقت والی بات کر کے انہوں نے میران کو کوئی سرا ہاتھ پکڑانے کے بجائے اس کے خیالات کو تجلک ہی رکھا تھا۔

"تینوں کس طرح پتا کہ شاہ سائیں حویلی وچ نئیں؟" ان کی باتوں پر غور کرتا میران اب اٹھ بیٹھا تھا اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے ان کے رویے پر غور کر رہا تھا۔

"اماں سائیں! ظاہر ہے اگر وہ حویلی میں ہوتے تو آپ مجھ سے ان کی فون کال کا نہ پوچھتیں نا۔" ملکانی سائیں کو اپنی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا۔

"اماں سائیں! ایسا کیا ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں؟ رحمٰن شاہ نے تو کچھ نہیں کہا؟" اُن کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے میران نے براہ راست سوال کیا اور ان کے لیے باعث پریشانی رحمٰن شاہ کا نام بھی برمحل تذکرہ لے ڈالا کہ شاید وہ اس کی وجہ سے یوں سہمی ہوئی ہیں۔

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

''اماں سائیں! میں جانتا ہوں کہ عام لوگوں کے درمیان میرے بارے میں کیا باتیں ہوتی ہیں، لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں یہ بھی معلوم ہے مجھے مگر۔۔۔ ہر برا آدمی بھی تو دنیا کے تمام لوگوں کے لیے برا نہیں ہوتا نا۔۔۔ اس کے دل میں بھی کچھ ایسے لوگ ضرور بستے ہیں جن کے لیے وہ اپنا آپ مٹی میں ملا سکتا ہے اور جنہیں خوش دیکھنے کے لیے وہ ساری دنیا اور خود اپنے آپ سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔۔۔ ہوتا ہے نا ایسا؟'' اپنی جگہ سے سرک کر اب وہ ملکانی سائیں کے روبرو آ بیٹھا تھا جو اس کی بات کے جواب میں اس کے کہے ہوئے تمام الفاظ کی مکمل حمایت کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا رہی تھیں۔

''تو اماں سائیں! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس پوری دنیا میں، میں صرف اور صرف آپ کی خاطر کسی کی جان لے بھی سکتا ہوں اور اپنی جان دے بھی سکتا ہوں۔''

''ہائے ماں صدقے، ایسے نہ بول میرے پتر۔۔۔!'' ان کے پورے جسم میں اس کی بات سے بجلی دوڑ گئی تھی۔ یوں لگا جیسے انہوں نے بجلی کی ننگی تار کو گیلے ہاتھ سے چھو لیا ہو۔

''رب کرے میری وی حیاتی تجھے لگ جائے، اج دے بعد میں ایسی گل نہ سناں۔''

''نہیں کروں گا۔'' وہ مسکرا دیا۔

''مگر آج کے بعد آپ نے بھی اس طرح پریشان نہیں ہونا، ٹھیک ہے نا۔''

''آہو۔۔۔ چل ٹھیک ہے۔''

''اماں سائیں! چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے اگر میں آپ کے اور بابا سائیں کے ہوتے ہوئے یہ بات کروں تو۔۔۔''

''کیہڑی بات۔۔۔؟''

''اگر آپ کو مہربانو کے لیے رحمٰن شاہ مناسب نہیں لگتا تو اپنے بھائیوں کی انا کے لیے خود کو ساری عمر کا پچھتاوا دینے سے پہلے اب بھی سوچ لیں کیونکہ ابھی تک اس کا نکاح نہیں ہوا۔''

''ایہہ گل توں کر رہا ہے میران پتر؟'' وہ حیران تھیں کہ صرف انہیں یوں پریشانی کے عالم میں دیکھ کر وہ اپنے ماموؤں کے خلاف بھی اسٹیپ لینے کو تیار تھا جنہیں وہ ہمیشہ سے اپنے بابا سائیں کے مقابلے میں درست قرار دیتا آیا تھا۔

''اماں سائیں! سچ کہوں تو اس دن رحمٰن شاہ کے سامنے آپ کا انداز میرے دل میں اس کے لیے نفرت بٹھا گیا ہے۔ ایک تو اس جاہل اور ان پڑھ کو ہم اپنی اتنی تعلیم یافتہ بیٹی دے رہے ہیں کہ جہیز کے نام پر کتنے بیگھ زمین، جائیداد پھر بھی وہ آپ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے خدانخواستہ مہربانو میں کوئی عیب ہے اور وہ اس سے شادی کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کر رہا ہے۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا اور ملکانی سائیں کو محسوس ہوا کہ ان کے دل کے دھڑکنے کی رفتار سست سے سست ترین ہوتی جا رہی ہے۔

کون جانے کہ اب مہربانو ان سے کن حالات میں ملتی ہے اور خدا جانے اب آگے کیا ہونے والا تھا۔ ان کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا اور جسم جیسے دسمبر کی یخ بستہ ہواؤں کی زد میں تھا۔

''کیا یہ وہی میران ہے جو سب کی نظر میں ایک اکھڑ، بد دماغ اور سخت دل نوجوان ہے۔ کیا ماں کی محبت اس کے لیے بھی اتنی طاقت ور ہے کہ یہ جذبہ اسے اس قدر حساس ہو کر سوچنے پر مجبور کر رہا ہے اور کیا وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے۔'' اس کا رویہ ملکانی سائیں کے دل میں اس کے پیار ارمان کے سر پر غرور کا تاج سجا رہا تھا۔

''اگر آپ اس کی بارات آنے پر بھی کوئی فیصلہ کریں تو یقین رکھیے گا کہ آپ کے ہر فیصلے کی حمایت کے لیے میں ہمیشہ آپ کے پیچھے کھڑا نظر آؤں گا۔''

''رب خوش رکھے تجھے میرا پتر!'' فرط جذبات سے ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں، آگے بڑھ کر میران کو گلے لگایا اور اس کے بالوں میں لاڈ سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''اپنے بابا سائیں نوں وی خوش رکھیا کر، بوہت پریشان ہیں آج کل۔''

''ہونہہ! اماں سائیں! میری اچھی بات بھی تو انہیں اچھی نہیں لگتی۔'' منہ کا زاویہ بگاڑ کر وہ بولا تھا اور ملکانی سائیں اس وقت اسے سمجھانے کی سکت نہیں رکھتی تھیں تبھی اٹھتے ہوئے بولیں۔

''اچھا چل جا فیکٹری دا چکر لگا لے، فیر سو جائیں آ کے۔'' اور تب میران کو یاد آیا تھا کہ شاہ سائیں نے اسے کم از کم ایک گھنٹہ بھر کے لیے فیکٹری جانے اور وہاں وقت گزارنے کا مشورہ نہیں بلکہ حکم دیا تھا اور ساتھ ہی کسی ینگ عہدیدار کی بہت تعریف بھی کی تھی۔

''چلو لگے ہاتھوں اس ہیرو سے بھی ملاقات کر لیتے ہیں آج۔'' منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لیتے ہوئے اس نے سوچا اور مسکرا کر ملکانی سائیں کے سامنے شاہ سائیں کے حکم کی تعمیل کرنے کے بارے میں رضامندی دے کر اپنے تئیں انہیں بھی مطمئن کر ڈالا۔

☆☆☆

آگ لگی تھی سینہ سینہ، ہر شعلہ جوالا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا
امجد تقدیر تھی اس کی یا قدرت کا کھیل؟
گرا جہاں پر رات کا پنچھی، تھوڑی دور اجالا تھا

معاملہ کچھ ایسا انتہائی حساس نوعیت کا تھا کہ اسے مخفی رکھنے ہی کی غرض سے شاہ سائیں اکیلے ہی لاہور پہنچے تھے۔ فلائٹ منہ اندھیرے لاہور پہنچی تو ان کے لیے ایئرپورٹ پر گاڑی اور ڈرائیور دونوں ہی موجود تھے۔ ڈرائیور کو ہاسٹل کے بجائے کالج جانے کا کہہ کر انہوں نے سیٹ سنبھالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ انہیں یاد تھا کہ مہربانو کی پیدائش پر ان کے بابا سائیں نے کسی قسم کی بھی خوشی کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا اس کے برعکس میران شاہ کے پیدا ہونے اور حویلی کو وارث مل جانے کی خوشی منانے میں انہوں نے بلاشبہ زمین آسمان ایک کر دیے تھے۔ مہربانو کے معاملے میں ان کی سوچ وہی روایتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ بیٹیوں کی وجہ سے بڑے بڑے شملہ والے سروں کو بھی کسی کے آگے جھکنا پڑتا ہے اور وہ اپنا سر کسی کے آگے نیچا کر کے بات کریں یہ انہیں گوارا ہی کب تھا کچھ ان کی اپنی بھی بیٹی نہیں تھی اس لیے وہ اس راحت سے قطعی طور پر نا آشنا اور محروم تھے جو بیٹیوں کے وجود سے عموماً والدین کے حصے میں آتی ہے۔ جب تک حیات رہے تب بھی مہربانو ان کے لمس کی خاطر ترستی ہی رہتی۔ میران کبھی ان کی گود اور کبھی کندھوں پر سوار رہا کرتا اور وہ منہ میں انگلی ڈالے جان بوجھ کر ان کے سامنے کھڑی حسرت بھری نظروں سے اپنے دادا سائیں کو دیکھا کرتی کہ شاید محبت کی کوئی نظر اس پر بھی پڑے۔

مگر ان کی وفات تک مہربانو کی یہ خواہش حسرت ہی رہی اور شاید لاشعوری طور پر مہربانو کی اس کمی کو دور ہی کرنے کی غرض سے اسے پھر شاہ سائیں کی طرف سے اتنا پیار ملا کہ وہ سیراب ہو گئی البتہ اس کے ننھیال والوں کی طرف سے شاہ سائیں کو اکثر اپنے لاڈ پیار میں محتاط رہنے کی ہدایت اشاروں کنایوں میں ملا کرتی جسے وہ کسی خاطر میں نہ لاتے اور سب کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے ہی انہوں نے مہربانو کو اعلا تعلیم دلانے کا سوچا تھا مگر اپنے ہی فیصلے پر اب وہ خود نظر ثانی کرنے لگے تو دل نے دماغ کی طرف بڑھتے تمام غلط خیالات کو جھڑک دیا۔ انہیں اپنی بیٹی پر مکمل بھروسہ اور اعتماد تھا اور وہ جانتے تھے کہ وہ ایسے کسی بھی کام پر موت کو ترجیح دے گی جس سے اس کے والدین کی عزت پر حرف آنے کا خدشہ ہو مگر اس سارے واقعے کے پیچھے اصل کہانی دراصل ہے کیا؟ یہی جاننے کے لیے اور کسی بھی قیمت پر جلد از جلد اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے وہ بے حد بے چین تھے۔ سو جیسے ہی ڈرائیور نے کالج کے آگے گاڑی روکی انہوں نے باہر نکل کر اسے کچھ روپے تھماتے ہوئے گاڑی کی چابی لے کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے وہیں سے رخصت کر دیا اور اسٹیئرنگ ہاسٹل کی جانب موڑ

www.paksociety.com

دیا جہاں کچھ ہی دیر بعد وہ میری اور کنول کے ساتھ وزیٹنگ روم میں موجود ان دونوں کے حواس باختہ چہروں اور ہکا بکا نگاہوں سے معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہ رہے تھے۔ میری اور کنول کی ان سے یہ پہلی ملاقات تھی اور ان کی شخصیت میں موجود رعب و دبدبے نے دونوں ہی کی زبان کو گویا تالا لگا دیا تھا۔

''ب۔۔۔باقی بات انکل! آپ چاہیں تو گگ۔۔گیٹ کیپر سے پوچھ سکتے ہیں کیونکہ پھر پتا نہیں اس کے بعد انہوں نے کیا کیا؟''

''لیکن آپ ہمارا یقین کریں اس سارے معاملے میں ہم دونوں بالکل بے قصور ہیں اور خود مہربانو بھی۔۔۔'' کنول نے میری کی بات آگے بڑھاتے ہوئے صفائی پیش کی۔

''نہ ہی اس کی ہمارے علاوہ کسی سے دوستی تھی، اسی لیے ہم خود پریشان ہیں کہ آخر وہ گئی تو گئی کہاں؟''

''کیا اس نے پولیس اسٹیشن میں رپورٹ تو نہیں لکھوادی؟'' شاہ سائیں نے اپنی بیٹی کی نادان دوستوں سے انتہائی فکر مندی سے دریافت کیا جو بجائے اس کے کہ اس کے والدین سے بات کرتیں، گیٹ کیپر کو سارا معاملہ سنا کر مدد طلب کر آئی تھیں۔

''پتا نہیں انکل! ہم تو خود پولیس کے خوف سے آج کالج بھی نہیں گئے۔'' میری بولی اور ساتھ ساتھ اطلاع بھی دے ڈالی کہ وہ دونوں آج کسی بھی وقت اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جائیں گی۔

''نہیں آپ دونوں ابھی کہیں نہیں جاؤ گی، ہوسکتا ہے مہربانو کے حوالے سے آپ کی مدد کی کوئی ضرورت پڑے۔''

''اس کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔'' کنول نے میری کی تائید حاصل کرتے ہوئے انہیں ہر قسم کے تعاون کی مکمل یقین دہانی کروادی تھی۔

''بیٹا! آپ دونوں کی عزت میرے لیے اسی طرح ہے جیسے مہربانو کی۔ اس لیے اللہ کے حکم سے میں آپ کو کوئی گزند پہنچنے نہیں دوں گا۔'' اور وہ دونوں جو ان سے خوف محسوس کر رہی تھیں تھوڑی دیر بات چیت کے بعد ہی خود انہیں پریشان نہ ہونے کا کہہ کر ان کے ساتھ گیٹ کیپر کے پاس پہنچیں تو شفٹ تبدیل ہو جانے کے باعث رات والے گیٹ کیپر کے بجائے دوسرے شخص کو موجود پایا۔ سو ان دونوں کے تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد رات کی ڈیوٹی کرنے والے گیٹ کیپر نے کیا اقدامات کیے تھے اس سے وہ بھی نا آشنا ہی رہے سو شاہ سائیں نے ان دونوں کو ساتھ لیا اور گاڑی شاپنگ مال کی طرف جاتی سیاہ سڑک پر ڈال دی۔

☆☆☆

کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد بالآخر امی ہوش میں آ چکی تھیں۔ ندی اور ناصر بھائی تو رات سے ہی ان کے پاس بیٹھے دعاؤں میں مصروف تھے البتہ ثروت آپا ناصر بھائی کے منع کرنے کے باوجود بھی بیٹے کو عائشہ بھابھی کے پاس چھوڑ کر ہاسپٹل آن پہنچی تھیں اور امی کی نیم وا آنکھیں دیکھ کر بے اختیار ان سے لپٹ کر رونے لگی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ان کو لگائی جانے والی خون کی بوتل ختم ہوئی تھی اور انہیں آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔

آنکھ کھلتے ہی جو دھندلا سا منظر انہوں نے دیکھا اس میں ندی ان کے بیڈ کے دائیں طرف موجود کرسی پر بیٹھی دونوں کہنیاں بیڈ پر رکھے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے میں مصروف تھی اور اس کے عین عقب میں ناصر بھائی بھی دعا کے لیے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کو ایک مدت کے بعد ایک دوجے کے اس قدر قریب اور ایک ساتھ دیکھ کر طمانیت کی جو پرسکون لہر ان کے اندر دوڑی تو انہوں نے دل ہی دل میں اپنی اولاد کے حسنِ اتفاق اور دائمی محبت کی دعا مانگ ڈالی۔

''امی۔۔۔! امی کیا حال ہے اب؟ کیسی ہیں آپ؟'' ان کا ہوش میں آنے کے بعد آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنا سب سے پہلے ناصر بھائی نے ہی نوٹ کیا تھا۔ سو حیرت و خوشی سے لرزتی آواز کے ساتھ فوراً ہی ان پر جھک گئے۔ ندی نے بھی اللہ کا شکر کرتے ہوئے بڑی مسرت سے آنکھیں کھولیں تو ناصر بھائی کو یوں والہانہ انداز میں امی سے پیار کا اظہار کرتے دیکھ کر وہ پہلے تو حیرت سے ناصر بھائی کو دیکھنے لگی اور پھر خود بھی بڑی بے تابی سے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام کر بوسے دینے لگی۔ امی نے بڑے پُرشفقت انداز میں بایاں ہاتھ ناصر بھائی کے کندھے پر رکھ کر انہیں سہلایا۔

''میں نے رات کو کہا بھی تھا کہ مجھے ساتھ لے چلیں، لیکن بھائی نہیں مانے، ورنہ یقین کریں ساری رات مجال ہے جو پل بھر کے لیے بھی آنکھ بند کی ہو۔'' ثروت آپا نے آتے ہی گلہ کیا اور امی سے لپٹ گئیں۔

''ہمارا بالکل خیال نہیں ہے آپ کو۔۔۔ سوچیں نا اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو ہمارے لیے دنیا میں بھلا رہ کیا جاتا۔''

''اللہ نہ کرے کہ امی کو کبھی بھی کچھ ہو۔'' ناصر بھائی نے محبت سے کہا تو ندی اور امی چپ چاپ مگر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھے ہی گئیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹرز چیک اپ کرنے آ گئے تو ناصر بھائی نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! بلڈ کا ارینجمنٹ آپ کی اپنی لیب سے ہو گیا تھا؟''

''ارے نہیں، لیب میں ہوتا تو کیا اس وقت آپ کو یونہی خواہ مخواہ دوڑاتے۔'' فائل پر انہوں نے آج دی جانے والی دوائی کو چیک کر کے اُس پر او کے لکھا اور ساتھ کھڑی نرس کے حوالے کر دی۔

''یہ تو ایک نیک دل نوجوان نے شاید آپ کو پریشان دیکھ کر وجہ پوچھی تو ہماری ریسپشن کے بتانے پر اسی وقت اپنا خون دینے کی آفر کر ڈالی۔''

ناصر بھائی کو لگا جیسے وہ اس نوجوان کے مقروض ہو گئے ہوں۔

''کیا اس کا کوئی ایڈریس وغیرہ مل سکتا ہے؟''

''ہاں بالکل کیوں نہیں، ہم کسی کا بھی بلڈ لیتے وقت ان کا ایڈریس وغیرہ ضرور نوٹ کرتے ہیں، آپ چاہیں تو ان کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے لیب میں جا کر وہ ایڈریس حاصل کر سکتے ہیں۔'' پین پر ڈھکن لگا کر اپنے سفید کوٹ کی اوپری جیب میں ڈالتے ہوئے انہوں نے بتایا تو ناصر بھائی امی سے اجازت لے کر اپنے خاموش مسیحا کا شکریہ ادا کرنے ان کے پیچھے چل دیے۔ ثروت آپا بھی ان سے دو قدم پیچھے اُس فرشتہ صفت انسان سے ملنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ناصر بھائی کے ساتھ ہی تھیں اور ابھی کچھ دیر پہلے کمرے میں ان کا امی کے ساتھ انتہائی دیکھ بھال اور پیار محبت کا خوب صورت سا رویہ دیکھ کر انہیں لگا جیسے وقت پھر سے بدل کر پہلے جیسا ہو گیا ہے اور بیچ میں یہ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں گویا آئی ہی نہ تھیں۔ تب انہوں نے بڑے ہی صدق دل سے اپنے میکے کے پھر سے آباد و شاد ہونے اور آپس کی محبتوں کے سدا قائم رہنے کی دعا مانگی تھی اور اتفاق سے آج گاڑی میں مطلوبہ ایڈریس تک پہنچنے کے دوران انہوں نے ناصر بھائی سے بھی اب اس بدلے ہوئے رویے کو کبھی نہ بدلنے کی التجا کی تھی۔

وہ شاید نہیں جانتی تھیں کہ دل کی دنیا تو اسی لمحے زیر زبر ہو گئی تھی جب انہیں خود عائشہ کی زبانی تمام اصلیت کا پتا چلا تھا۔ اب تو بس پچھتاوے کو اپنے بہتر سے بہترین رویے کے ذریعے مٹانا تھا اور اپنے تمام رویے کی تلافی کرنا تھی جس کے باعث ان کے ہنستے بستے گھر سے مسکراہٹیں روٹھ گئی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ یہی باتیں کرتے رستہ لمحوں میں طے ہو گیا تھا۔ یوں بھی یہ پہلا موقع تھا کہ ثروت آپا کو ناصر بھائی سے علیحدگی میں عائشہ بھابھی کی موجودگی کے بغیر بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس لیے کھل کر بات چیت بھی ہوئی اور اپنی غلطیوں کی تلافی کے راستے بھی ڈھونڈے گئے اور انہی باتوں کے دوران جب انہوں نے گاڑی پارک کرنے کے بعد ایڈریس کے عین مطابق پہنچ جانے پر اطلاعی گھنٹی بجائی تو ثمینہ انہیں دیکھ کر اندر بلاتے ہوئے قدرے جز بز کو شکار معلوم ہوئی۔

"دیکھیں آپ ڈریں نہیں، ہم تو صرف آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں کہ آپ کے دیے گئے خون کی بدولت ہماری امی کی جان بچ گئی۔" ثروت آپا نے وضاحت کی تو ثمینہ کو اندر بلانا ہی پڑا۔ امی ٹیک لگا کر تخت ہی پر لیٹی ہوئی ہاتھ میں تسبیح کے دانے گھما رہی تھیں۔ انہیں اندر آتے دیکھا تو دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر اٹھ بیٹھیں اور ثمینہ کی رہنمائی میں تینوں نے ڈرائنگ روم میں جا کر نشست سنبھالی۔

"معاف کرنا بیٹا! میں آپ دونوں کو پہچان نہیں پائی۔"

"آنٹی! اب تو ہمارا آپ سے خون کا رشتہ ہے اس لیے پہچان ہم خود ہی کروائے دیتے ہیں۔" ثروت آپا خوش دلی سے بولیں۔

"آپ کے بیٹے نے جس طرح اپنا خون بروقت دے کر ہماری والدہ کو بچایا ہے اس کے لیے ہم آپ سب کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔" ناصر بھائی تشکر آمیز لہجے میں بولے تو واقعی ان کا لفظ لفظ احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس ہوا۔

"ارے بیٹا! احسان کیسا، انسان ہی تو انسان کے کام آتا ہے اور درحقیقت ہماری زندگی کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے۔" اماں مسکرائیں۔ بیٹے پر مان تو تھا ہی آج یہ احساس کہ وہ یوں کسی کے کام آیا ہے انہیں فخر میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔

"جی بالکل اور بلاشبہ یہ آپ کی تربیت ہی ہے کہ آپ کے بیٹے نے ایک ماں کی جان بچا کر اس کی گویا ساری اولاد کی جان بچالی۔"

"اور ویسے بھی ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف بھی تو ہوتا ہے نا۔" ثروت آپا نے ناصر بھائی کی تائید کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی تو اماں اب یوں تعریف ہونے پر ذرا جزبز سی دکھائی دینے لگیں۔

"بس ہمارے بھائی کی خوشیوں کے لیے بے حد دعا کیجیے گا۔" ثمینہ نے چائے دونوں کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ضرور ان شاء اللہ کیوں نہیں۔" ثروت آپا نے کپ تھامتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم اُن سے ملاقات کرنا چاہیں تو کیا ابھی مل سکتے ہیں۔" ناصر بھائی بے چین تھے کہ خود مل کر اس شخص کا شکریہ ادا کریں جس نے انہیں مزید پچھتاووں کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا تھا۔

"ہاں بیٹا! کیوں نہیں، لیکن ابھی تو وہ اپنے آفس گیا ہے۔۔۔ آج کتنے بجے تک آئے گا شاہ زین؟" ناصر بھائی سے بات کرتے کرتے اماں نے ثمینہ کو مخاطب کیا تو ناصر بھائی اور ثروت آپا دونوں ہی چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"شاہ زین۔۔۔؟" یہ نام اور اس سے وابستہ ذہن میں موجود کئی یادیں جنہوں نے اُن کے پورے گھرانے کی زندگی مکمل طور پر بدل کر رکھ دی تھی ان دونوں کو بری طرح چونکا کر رکھ گیا تھا۔

☆☆☆

ہر گدا شاہ کا رتبہ مانگے
اک محل اور رعایا مانگے
سرِ دربار سخن ہے درپیش
شاہ دربار قصیدہ مانگے

چڑھتے سورج کے پجاری ہر جگہ بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں جو بادشاہوں کے سامنے سے آئینہ ہٹا کر خود اپنے لفظوں کے ذریعے ان کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ سننے والے اش اش کر اٹھیں اور ایسے ہی لوگ پھر ان کی اس کمزوری سے فائدے بھی اٹھاتے ہیں۔

میران بھی آج فیکٹری میں داخل ہوا تو اسے یوں اچانک اپنے درمیان پا کر بھی پہلے تو حیرت سے اسے دیکھنے لگے اور پھر خاطر مدارات کی طرف دھیان گیا۔ چونکہ اس سے پہلے وہ صرف فیکٹری کے یہاں قیام کے اوائل روز میں ہی یہاں آیا تھا اور اس کے بعد خود شاہ سائیں ہی اکثر و بیشتر یہاں کے حالات اور کام کی رفتار سے واقفیت رکھنے کی غرض سے یہاں کا چکر لگایا کرتے۔ اس لیے کئی اسٹاف ممبرز اس کے لیے اجنبی تھے اور ان کے ساتھ آج اس کی پہلی ہی ملاقات تھی۔

کچھ دیر تک ان کے تعارف کے بعد وہ شاہ سائیں کی ہدایت کے مطابق پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور وہاں کے ہیڈ آفیسر کے آفس میں داخل ہوا جو اس وقت خالی تھا۔ کمرے میں گھوم پھر کر اس نے آفس کا جائزہ لینے کے دوران شاہ سائیں کا اپنے پاس کام کرنے والوں کے خیال رکھنے کے انداز کو جی ہی جی میں سراہا اور کچھ دیر انتظار کی غرض سے ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر سامنے شیشے کی صاف شفاف میز پر رکھی فائلز اور کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے عدم دلچسپی کی بنیاد پر دائیں ہاتھ پر انٹر کام کے ساتھ رکھے ریموٹ کو اٹھایا اور سامنے دیوار میں نصب اٹھارہ انچ کے چھوٹے سے ٹی وی کو آن کر کے اس سے پہلے کہ سامنے موجود نیوز چینل کو بدلتا کمرے میں داخل ہوتے شاہ زین کو دیکھ کر چونک گیا۔ خود شاہ زین ہاتھ میں مکمل شدہ آرڈرز کی لسٹ لے کر اندر آتے ہوئے میران شاہ کو یوں اپنی کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے حاکمانہ انداز میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

یہ بات تو ان دونوں ہی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ یونیورسٹی کے بعد کبھی یوں زندگی کے کسی موڑ پر ان کی ملاقات ہو جائے گی۔ نیوی بلیو کلر کی آفس شرٹ اور لائٹ مسٹرڈ پینٹ میں ملبوس شاہ زین ہمیشہ کی طرح ہینڈسم دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر وہی سنجیدگی، متانت اور ٹھہراؤ جو کبھی یونیورسٹی میں بھی اس کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ میران نے چند لمحے حیرت زدہ رہنے کے بعد جب یہ بات لاشعوری طور پر سوچی کہ وہ اس فیکٹری کا تنِ تنہا مالک اور شاہ زین اس کے ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑا ہے تو اس کی گردن میں بھی اس کے بادامی رنگ کے شلوار سوٹ سے کہیں زیادہ کلف اترتی محسوس ہوئی۔ دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت انگوٹھے کے ساتھ مل کر مونچھوں کو ہلانے لگی تو ہونٹوں پر خود بخود ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔

"آیئے آیئے، مسٹر شاہ زین! آپ رک کیوں گئے، اندر آیئے نا، آپ کا اپنا آفس ہے۔" شاہ زین نے ایک گہری نظر سے اسے دیکھا اور دروازہ بند کر کے یوں اندر چلا آیا جیسے آج سے پہلے تک وہ اسے جانتا تک نہیں تھا اور اس کے آفس میں موجود ہونے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کا یوں نظر انداز کرنا ہی میران کو گیلی لکڑی کی طرح سلگا کر رکھ گیا تھا۔ میران یہاں اس کے آفس میں کیوں موجود ہے؟ اور اس کا اس فیکٹری سے کیا تعلق ہے؟ یہ سوالات خود شاہ زین کے ذہن میں نمودار تو ضرور ہوئے تھے مگر اس نے کسی بھی قسم کی بات کرنے سے گریز برتا تھا۔

"ہونہہ! بابا سائیں بھی کیسے کیسے لوگوں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیتے ہیں اور پھر ان کی تعریفیں بھی کرتے ہیں یہ جانے بغیر کہ وہ ماضی میں کیا کیا گل کھلا چکے ہیں۔" میران نے اپنے ہی انداز میں اپنا تعارف کروایا تو شاہ زین اس کی اور شاہ سائیں کی نسبت جان کر حیران رہ گیا تھا۔ اتنے ڈیسنٹ اور پیار کرنے والی پر اثر شخصیت کے مالک کا بیٹا ان سے اس قدر متضاد عادات کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ کمرے میں ٹی وی سے نشر ہونے والی خبروں کی آواز ان کے درمیان ایک تیسرے فرد کا کردار ادا کرتے ہوئے فضا کی یکسوئی تقسیم کرنے میں کامیاب نظر آتی تھی۔

"ویسے میں کبھی تو سوچتا ہوں کہ تم جیسے کم حیثیت لوگ بھی کس قدر بے وقوف ہوتے ہو نا، جس لیڈر کی خاطر نعرے لگاتے اور جس کے جلسوں میں جا جا کر جوتیاں گھساتے تم لوگوں کی عمریں بیت جاتی ہیں وہ بس ایک دفعہ تمہاری طرف منہ کر کے تمہارے نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلا دے تو وہ بس ایک لمحہ تمہاری پوری زندگیوں پر محیط ہو جاتا ہے اور تم لوگ اپنا بھوکا ننگا وجود لیے اسی کے نام کی مالا جپتے ہوئے زندگی ہار جاتے ہو۔" میران شاہ نے کرسی گھماتے ہوئے اپنا رخ شاہ زین کی طرف کیا جس کے کانوں تک شاید

www.paksociety.com

WWW.PAKISTAN.WEB.PK

www.paksociety.com

اس کی آواز پہنچ ہی نہیں پا رہی تھی، فائل ریک میں مکمل شدہ آرڈرز کی فائل نکال کر اس نے ہاتھ میں موجود پیپرز اٹیچ کیے اور ٹرانسپورٹ اینڈ گڈز کی فائل ڈھونڈنے لگا، یوں بھی اس کا ماننا تھا کہ جاہل سے بحث کرنے سے افضل خاموش ہو جانا ہے اور اس کے حد سے تجاوز کرنے کی صورت میں باوجود اس کے وہ اس فیکٹری کا مالک تھا، شاہ زین نے کمرے سے نکل جانے کا اختیار اپنے پاس محفوظ رکھا۔

''بالکل اسی طرح جیسے یونیورسٹی میں تم ندی کے اس وقتی ساتھ کو ہی اپنے لیے سرمایہ کل سمجھتے ہوئے خود کو سکندر اعظم سمجھنے لگے تھے۔ ہونہہ! یہ جانے بغیر کہ وہ سب تو محض ان نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلانے کے برابر تھا اور بس۔''

''میران شاہ شاید تم بھول رہے ہو کہ میں نے تمہیں پہلے بھی اپنی زبان سے ندی کا نام نہ لینے کی یاد دہانی کس انداز میں کروائی تھی۔'' ندی کا نام آتے ہی شاہ زین جو خود کو خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا خود پر قابو نہ رکھ پایا۔

''بھول تو شاید تم رہے ہو شاہ زین! کہ جس کا نام بھی لینے کی تم نے مجھ پر پابندی لگائی تھی نا، اب وہ مکمل طور پر میرے نام ہونے والی ہے۔'' میران طنزیہ ہنسی ہنسا تو اس کی سیسہ پگھلاتی ہنسی کی آواز کے ساتھ ہی جیسے شاہ زین کی یادداشت لوٹ آئی ہو۔ زمین کے وہ الفاظ اس کی سماعت میں ایک بار پھر بازگشت بن کر گھومنے لگے تھے جن میں اس نے اس روز میران اور ندی کی شادی ہونے کے متعلق بتایا تھا۔ اگر یہی سب کچھ سچ ہے تو پھر سیاہ چادر میں لپٹی ندی کے چہرے پر وہ سوگواریت اور ویرانی کیوں تھی؟ اس کا دل اب تک ندی کی جانب لپک کر اس کی حمایت کیوں کرنے لگتا تھا۔

''یہ میرا ظرف ہی ہے شاہ زین! کہ جس لڑکی کی بدکرداری اخباروں کی زینت بن کر صبح کی دھوپ کی طرح گھر گھر اتری ہو میں پھر بھی اسے اپنے نام کی عزت دے رہا ہوں۔ بڑا غرور تھا نا تمہیں اور بڑا زعم تھا اس کو بھی، یوں۔۔۔۔ یوں چٹکی بجاتے ہوئے میں نے خاک میں ملا دیا تم دونوں کی محبت کو بھی غرور بھی اور عزت بھی۔۔۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے آنکھیں سکیڑیں۔

''مت بھولو میران شاہ! کہ عزت اور ذلت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے جو چاہے تو بادشاہوں کو بھی لمحہ بھر میں بحوالۂ کشکول کر دے اور چاہے تو گداؤں کو تخت و تاج کا مالک بنا دے۔۔۔ تم نے جو کیا اور جو کچھ کر رہے ہو وہ تمہاری نیت اور تمہارے اعمال۔۔۔ میں نے نہ کل تمہارا بُرا سوچا تھا اور نہ ہی آج تمہارے لیے میرے دل میں کوئی برا ارادہ ہے موسمی پرندوں سے الجھنا میری فطرت میں نہیں ہے۔''

ندی کا یوں ذکر آنے پر خود پر مکمل کنٹرول رکھتے شاہ زین نے مناسب لفظوں کے چناؤ سے بات مکمل کی اور مطلوبہ فائل مل جانے پر میران شاہ کی طرف مڑا تو اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر جو اس کی نظروں کے تعاقب میں سامنے ٹی وی اسکرین کو دیکھا تو خود اس کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔

☆☆☆

رحمٰن شاہ کی شادی تو تھی مگر شادی کی تقریب سے کہیں زیادہ اس میں مقابلے کا عنصر نمایاں نظر آ رہا تھا۔ رات ان کے ہاں بھی ڈھولک کی پہلی رات تھی اور خاطر تواضع میں اول و آخر صرف یہی بات مدِ نظر رکھی گئی تھی کہ وہ اشیاء مہمانوں کے آگے پیش کی جائیں جنہیں دیکھ کر سب کے منہ سے صرف ''واہ واہ بہت خوب'' جیسے الفاظ کے اور کچھ نہ نکلے۔ ملبوسات کی خریداری ہوتی یا زیورات کی بناوٹ، اصول صرف اور صرف یہی تھا کہ ان کے ڈیزائن اور تعداد اتنی ہو کہ آج سے پہلے تک کسی کی نہ ہو اور نمود و نمائش کی دوڑ میں وہ بلا مقابلہ منتخب ہو کر اعلا ہونے کی مسند عالیہ پر تنہا براجمان ہو سکیں۔ یوں بھی رحمٰن شاہ کا کوئی اور بہن بھائی تو تھا نہیں جو بھی تھا سب اسی کا ہی تھا اور جو کچھ بھی رسوم و رواج یا چاؤ کرنے تھے سب اسی کی شادی پر کیے جانے تھے۔ اس لیے شاہ سائیں کے مقابلے پر خود کو ان سے اعلا ثابت کرنے کی غرض سے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور ہوا کی طرح اڑایا جا رہا تھا۔ شہر کے سب سے بہترین اور مہنگے ترین ڈریس ڈیزائنر کو آج کل کے فیشن کے عین مطابق بری کے تمام ملبوسات تیار کرنے کا آرڈر دیا گیا تھا۔ عروسی لباس پر سونے کی تاروں سے مکمل طور پر یوں کام کروایا جا رہا تھا کہ لہنگا کا نچلا تمام حصہ صرف اور صرف سونے کا ہی نظر آتا اور بس صرف یہی نہیں تھا بلکہ سر پر رکھے جانے والے تاج میں خصوصی طور پر ڈائمنڈ لگوا کر خاندان کی پچھلی تمام روایات سے چار قدم آگے بڑھائے گئے تھے۔

اسے بخوبی یاد تھا کہ آج سے چند سال پہلے میران کے ماموں کے بیٹے کی شادی پر دلہن کو رخصتی کے بعد جب گاڑی میں بٹھایا گیا اور گاڑی مین روڈ پر چلی تو پانچ پانچ روپے کے نوٹ ہوا میں اڑائے جاتے رہے کئی لوگ ہوا میں اڑتے ان نوٹوں کے پیچھے بھاگتے حیرانی سے اپنی زندگی میں دیکھی جانے والی اس واحد بارات کو یادوں میں محفوظ کرتے کہ جب ہر گاڑی کا شیشہ نیچے اور اس میں سے پانچ اور دس کے نوٹ یوں باہر اچھالے جا رہے تھے جیسے کوئی بدتہذیب انسان کچھ کھا کر گاڑی سے باہر ہی چھلکا پھینکتا جائے۔ اس انوکھی بارات کو لوگ آج تک یاد کرتے تھے سو رحمٰن شاہ نے ظاہر ہے کچھ ایسا کرنا تھا کہ اُن کی بارات کا اثر لوگوں کے ذہن سے زائل ہو جاتا۔ اسی معاملے میں کچھ صلاح مشورہ کرنے وہ آج اپنے ایک جیولر دوست کے پاس بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ دونوں مل کر چائے پی رہے تھے اور اس سے پہلے کہ بات شروع ہوتی، شاپ میں موجود ٹی وی سے نشر ہوتی خبر نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔

بے شمار مائکس کے پیچھے نقاب کیے کھڑی لڑکی اور ساتھ چست و توانا جسم کا حامل لمبا چوڑا نوجوان، اسکرین کے ایک کونے میں ان دونوں کو لفٹس سے نکلتے دکھایا جا رہا تھا اور اس میں اس لڑکی کا چہرہ با آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی اور نہیں مہر یانو ہے جو میڈیا کے ان نمائندوں کے مطابق اس لڑکے کے ساتھ ساری رات لفٹ میں رہی تھی اور صبح لفٹ سروس کے نمائندگان جب اسٹور انتظامیہ کے ساتھ پہلے سے طے شدہ وقت پر لفٹ کی درستگی کے لیے پہنچے اور لفٹ کھولی تو ان دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''صوبائی اسمبلی کے ممبر حیدر شاہ کی بیٹی ڈرامائی انداز میں لفٹ سے برآمد۔'' صحافی حضرات اپنے اپنے چینلز تک خبر پہنچا کر اب ان سے مختلف قسم کے سوالات کر رہے تھے۔ خلاف توقع پولیس بھی وہیں پر موجود تھی اور چاہتی تھی کہ رپورٹرز ان سے بھی بات چیت کر کے آئندہ کے لائحہ عمل اور ان پر لگنے والی ممکنہ دفعات کے بارے میں بھی کچھ بات چیت کریں مگر فی الحال تمام رپورٹر کا رخ ان کی طرف تھا جو کسی طرح وہاں سے نکلنا چاہتے تھے مگر سامنے کھڑے رپورٹرز اور شاپنگ مال میں خریداری کی نیت سے موجود لوگوں کا رش جو کیمرے دیکھ کر مزید بڑھتا جا رہا تھا اس قدر تھا کہ وہ وہاں سے نکل پانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے۔

وہ کس وقت سے لفٹ میں موجود تھے؟ کیا انہوں نے لفٹ نہ کھلنے پر کسی سے رابطہ کیا؟ ساری رات گزر گئی مگر ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی اپنے کسی دوست، عزیز رشتہ دار کو فون تک کر کے مدد کے لیے کیوں نہیں کہا؟ لفٹ کے باہر چھوٹا سا نوٹس جس پر لفٹ خراب ہونے کی صورت میں دی جانے والی ہدایات تھیں وہ کیوں نہ پڑھی گئیں؟ یہ اور اس جیسے کئی سوالات جو یکے بعد دیگرے جواب کے انتظار کے بغیر پوچھے جا رہے تھے۔ کسی چینل نے تو فوراً سے پیشتر ہاسٹل کی انتظامیہ کو بھی لائن پر لے لیا اور ان سے پوچھا جانے لگا کہ اگر ان کی کوئی طالبہ رات بھر ہاسٹل سے باہر رہے تو وہ اس کے خلاف کیا کارروائی کرنے کی مجاز ہیں؟ اور کیا اس سے پہلے بھی وہ کبھی ہاسٹل کے اوقات سے تاخیر سے واپس آئی؟ کچھ چینلز پر یہ بھی قیاس کیا گیا کہ شاید وہ دونوں شادی کرنے کے خواہاں تھے اور گھر والوں کی رضامندی نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہونے کے باعث یہ ایک احتجاجی عمل تھا اور بس۔ اس کے فوراً بعد ماہرِ نفسیات کو بھی آن لائن لے کر نفسیات پر بات شروع ہوئی اور یوں کچھ دیر کے لیے میڈیا کے ہاتھ ایک دلچسپ خبر آ گئی جسے وہ مزے لے کر بیان کرتے اور باوجود اس کے کہ مہربانو نے لفٹ سے نکلنے کے فوراً بعد یوں غیر متوقع طور پر لوگوں کو اپنے سامنے موجود پایا تو فوراً چہرے پر نقاب کر لیا تھا مگر وہ چند لمحات جن میں وہ لفٹ سے باہر نکلی تھی میڈیا والے یوں بار بار دکھا رہے تھے گویا انہوں نے بڑی مہارت سے یہ سین فلمبند کیا ہو اور پھر اکمل کی برداشت کی حد ختم ہو گئی اس نے ساری دنیا کے سامنے مہربانو کا ہاتھ تھاما اور اس کے سرد پڑتے وجود کو لوگوں کی چبھتی نظروں اور زہرخند سوالوں سے بچا کر گاڑی میں بٹھایا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا وزن بڑھاتا چلا گیا۔

یہ سب دیکھ کر مارے غصے کے رحمٰن شاہ کے منہ سے کف نکلنے لگا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً گاڑی میں بیٹھا اور ملکانی سائیں کے پاس جا پہنچا جو سونی کو گود میں لیے کارڈلیس اور موبائل فون سامنے رکھے بیٹھی تھیں اور بند آنکھوں کے ساتھ دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے ہوئے تھیں۔ آندھی طوفان کی مانند رحمٰن شاہ اندر داخل ہوا تو وہ چونک گئیں اور اس کے تیور دیکھ کر اس کے کچھ بھی کہنے کے بغیر ہی سہم گئیں۔

''شاواشے چاچی شاوا۔۔۔ اب سمجھ آیا مجھے کہ تو کیوں اس دن شادی ٹالنے کی ضد کر رہی تھی۔''

وہ سمجھ گئی تھیں کہ اسے مہربانو کے متعلق کوئی سُن گن ملی ہے مگر کیا؟ یہ بات ابھی ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

''میں اتنا ہی ناپسندیدہ تھا تو کیوں مجھے اتنا عرصہ لارے پر رکھا، کہہ دیتی نا مجھے یا اپنے اُن بھائیوں سے کہلوا دیتی جو آج سے پہلے تک بڑا شملہ اونچا کر کے چلتے تھے کہ ہماری بیٹی نے اپنا رشتہ خود ڈھونڈ لیا ہے اور اگر ہم نے اس کی نہ مانی تو وہ سب کے منہ پر کالک مل کر بھاگ جائے گی اُس کے ساتھ۔''

ملکانی سائیں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ کیا کہہ رہا تھا رحمٰن شاہ اور آخر کس بنیاد پر اتنا بڑا الزام لگا رہا تھا ان کی بیٹی پر۔ ہاتھ پاؤں میں فوراً لگتا جیسے ساری دنیا کے حشرات الارض رینگنے لگے تھے۔

''ایہہ کی کہہ رہا ہے رحمٰن شاہ! ہوش نال گل کر، تے دماغ ٹھیک رکھ کے اپنی زبان تے قابو رکھ۔'' اپنی بیٹی پر اس قدر کھلم کھلا الزام لگاتے رحمٰن شاہ کو سامنے صحیح سالم کھڑے دیکھ کر ان کا دل چاہا تھا کہ وہ اس کا منہ نوچ لیں اور اس کی زبان حلق سے کھینچ کر اسے آئندہ کے لیے اپنی بیٹی کا نام لینے کے قابل ہی نہ چھوڑیں اور رات سے چاہے وہ کتنی ہی نڈھال تھیں مگر اب ان کے اندر ایک عجیب سی طاقت اتری تھی اور انہیں لگ رہا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو وہ اسی لمحے اپنی بیٹی پر کیچڑ اچھالنے والے سامنے کھڑے شخص کو منہ کے بل گرا سکتی ہیں۔

''زبان پر بھی قابو ہے چاچی! اور میرا دماغ بھی ٹھیک ہے۔ بھئی ویسے شاواش دینی چاہیے تیرے گھر والوں کو بھی کہ تجھے اسی لیے ہی تو ساری عمر نرا جاہل ہی رکھا کہ خود وہ تینوں باہر جو مرضی گل چھرے اڑاتے رہیں تجھے حویلی بیٹھی کو کچھ خبر بھی نہ ہو۔''

ملکانی دل ہی دل میں جاننا تو چاہ رہی تھیں کہ آخر اس کے ہاتھ کون سا ایسا سرا لگا ہے کہ وہ ڈور کھینچ کر ان کی روح تک ہلا ڈالنے کے درپے ہے مگر فی الحال انہوں نے اس کی بات کے مکمل ہونے کا انتظار کیا۔

''چاچا سائیں ہیں تو وہ رب جانے شہر میں کیا کرتے پھرتے ہوں گے آخر سیاست دان ہیں غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے تو ماہر ہیں ہی نا، میران کو خیر سے رنگ رلیاں منانے سے ہی فرصت نہیں، سمجھتا ہے کہ بس دولت اور حاکمیت تو بس اسی کے پاس ہے۔ دونوں بازوؤں کو ایک ایک فٹ دور رکھ کر اور جو گردن میں سریا ڈال کر چلتا تھا نا۔۔۔ توڑ دیا ہے تیری بیٹی نے آج۔ ٹی وی لگا کر دیکھ چاچی! مہربانو ساری رات اپنے عاشق کے ساتھ صرف دو گز کی لفٹ میں مرزا صاحبہ کی کون سی داستان دوہراتی رہی

ہے اور یہ میں نہیں ٹی وی پر بیٹھے لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں شادی۔۔۔''

''رحمٰن شاہ۔۔۔! بکواس بند کر۔'' ملکانی سائیں اس قدر زور سے چلائی تھیں کہ حویلی کے در و دیوار نے آج تک اُن کی اتنی اونچی آواز نہیں سنی تھی۔ جذبات سے سرخ ہوتا چہرہ اور آنکھوں میں اترتا خون۔۔۔ وہ اب ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں سننا چاہتی تھیں۔ اردگرد موجود ملازمین بھی ان کی آواز کی شدت پر حیرت سے ایک دوجے کو دیکھنے لگے تھے۔ اپنے کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود اب ان کے کان حویلی کی اندرونی خانے کی طرف کھڑے ہو گئے تھے اور رحمٰن شاہ جواب تک صرف مہربانو ہی کی امید پر شادی کے ___ انتظار میں تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طور مہربانو کو وہ سبق سکھائے کہ آئندہ کی ان کی تمام نسلوں میں کسی کو اپنی بیٹی کو پڑھانے کی ہمت نہ ہو اور وہ جو یہ سمجھ رہا تھا کہ مہربانو سے متعلق معلوم ہونے پر ملکانی سائیں فوراً اسے کوستے ہوئے اپنے نصیبوں کو روئیں گی اور اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی و یکجہتی کریں گی ایسا کچھ بھی نہ ہونے پر وہ مزید سیخ پا اور آگ بگولا ہو رہا تھا۔

''آج تو کچھ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تیری بیٹی پکڑی گئی ہے چاچی! ورنہ کون جانے کہ اس سے پہلے اس نے کتنی دفعہ ہاسٹل کے باہر راتیں گزاری ہوں گی اور کتنی دفعہ اپنے سب اگلوں پچھلوں کا منہ کالا کیا ہوگا۔''

''میں کہتی ہاں اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تے میں تیری زبان کھینچ لاں گی، دفع ہو جا ایتھوں۔۔۔ نکل جا۔''

''سچی بات ہے چاچی! برداشت کر برداشت۔'' رحمٰن شاہ نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بات کرتے ہوئے ریموٹ سے ٹی وی لگا کر ریموٹ اُن کی طرف رکھے صوفے پر اچھالا اور خود باہر نکل گیا۔ اسکرین پر ابھی تک وہی منظر دکھایا جا رہا تھا۔ ملکانی سائیں نے شدتِ غم سے سینے پر ہاتھ رکھا اور بیٹھتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بھول جائیں تو آج بہتر ہے
سلسلے قرب کے جدائی کے
بجھ چکیں خواہشوں کی قندیلیں
لٹ چکے شہر آشنائی کے
رائیگاں ساعتوں سے کیا لینا
زخم ہوں پھول ہوں ستارے ہوں
موسموں کا حساب کیا رکھنا
جس نے جیسے بھی دن گزارے ہوں
زندگی سے شکایتیں کیسی
اب نہیں ہیں اگر گلے تھے بھی
بھول جائیں کہ جو ہوا سو ہوا
بھول جائیں کہ ہم ملے تھے بھی
اکثر اوقات چاہنے پر بھی
فاصلوں میں کمی نہیں ہوتی
بعض اوقات جانے والوں کی
واپسی سے خوشی نہیں ہوتی

نیند کی ادویات کے سبب کچھ دیر ندی سے بات چیت کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر غنودگی میں تھیں۔ رات دی جانے والی دواؤں کا اثر بہرحال ابھی موجود تھا ورنہ ڈاکٹرز نے اب ان کی حالت کو تسلی بخش قرار دے دیا تھا۔ رات بھر کی جاگی ندی کی آنکھوں میں البتہ اب بھی نیند کی کوئی رمق تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ کرسی کو دیوار کے ساتھ رکھ کر پاؤں امی کے بیڈ پر ٹکاتے سر کو کرسی کی پشت پر رکھے وہ اپنی اور شاہ زین کی ہونے والی اس غیر متوقع اور انوکھی ملاقات کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ جس سے ملنے اور بات کرنے کی خاطر وہ انتہائی رسک لے کر گھر سے نکلی اور اس کے گھر تک پہنچی، آج اس سے ملاقات ہوئی بھی تو کیسی، ایک ملاقات کے لیے اُس نے کتنی دعائیں مانگی تھیں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شاید شاہ زین سے مل کر اس کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے مگر آج اس کے انداز میں موجود اس بے گانگی نے ندی کو بہت دکھ دیا تھا۔ اس کی امیدوں کے برعکس نہ تو

اس نے ندی کے یوں اچانک نظر آنے پر کوئی گرمجوشی دکھائی اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں ندی کی خوشی کا کوئی تاثر ملا۔ بات کرنے کا انداز بھی ایسا کہ جیسے کوئی جنگ کے پہلے مرحلے پر ہی ہتھیار ڈال دے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی بجائے اس کے کہ وہ ندی سے ہمدردی کے دو بول بولتا خود اس کا انداز ہی ندی کو بے حد روٹھا روٹھا اور شاکی محسوس ہوا اور یہی بات ندی کے لیے باعث تکلیف بھی تھی۔ یونیورسٹی میں اکٹھے گزارے گئے خوش گوار لمحات کی یادیں کسی فلم کی ریل کی طرح ایک بار پھر اس سے پہلے کہ آنکھوں کے پردے پر چلنے لگتیں اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ خود کو بار بار اس اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جبھی خود کو مصروف رکھنے اور اپنا دھیان شاہ زین کی باتوں سے ہٹانے کے لیے اٹھ بیٹھی۔ امی کے بیڈ کی طرف دیکھا تو پھر سے خیال آ گیا کہ خود وہ اس کے لیے کتنی دعائیں مانگا کرتی تھیں کہ اس کی شاہ زین سے ملاقات ہو جائے اور جب اس نے براہ راست اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تب بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

"اس سے تو بہتر تھا شاہو کہ تم سے ملاقات ہی نہ ہوتی کم از کم تمہاری یاد ایک کسک بن کر دل کا حصہ تو رہتی اور میرے دل میں یہ خلش تو ہوتی کہ اگر تم سے ملاقات ہو جاتی اور میں تم کو اپنے ساتھ بیتنے والے تمام حالات بتا پاتی تو تم کوہ قاف کے شہزادے کی طرح مجھے حالات کے ظالم جادوگر سے بچا کر اپنے سفید گھوڑے پر بٹھائے کہیں دور لے جاتے جہاں ہم ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے۔"

وقت گزاری کے لیے وہ کمرے سے نکل کر یونہی ہاسپٹل میں سست قدموں سے گھومنے لگی تھی۔ وہ جگہ جہاں اس کی اور شاہ زین کی ملاقات ہوئی تھی وہاں دیر تک کھڑی اس راہداری کی طرف دیکھے گئی جہاں ثمینہ اور شاہ زین گئے تھے۔ دل تو چاہا کہ وہ بھی اس طرف جائے اور شاید کہیں کسی طرف ایک بار پھر وہ اسے دیکھ سکے مگر کیوں؟ اور آخر اب ان سب باتوں کا کیا حاصل تھا؟ یہی سوچ کر اس نے خود کو اس عمل سے باز رکھا اور ریسپشنسٹ کے بلانے پر اس کی طرف بڑھی۔ ریسپشن پر موجود یہ نرس اس دن ندی کو امی کے لیے روتے بلکتے دیکھتی رہی تھی اس لیے اس کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی زیادہ تھا۔ آتے جاتے ندی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کا حال چال پوچھتی اور حوصلہ بڑھاتی رہی۔

"یہ تمہارے نام خط رکھا ہوا ہے، ابھی تمہیں دیکھا تو یاد آیا ورنہ تو انہی پیپرز میں ہی جانے کب تک پڑا رہتا۔" ندی کے قریب جانے پر اس نرس نے دو تین کاغذات کے نیچے سے جھانکتے لفافے کو اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میرے نام خط؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ ثمینہ نام کی لڑکی تھی جس نے دیا۔ کہہ رہی تھی کہ اسے تمہارا کمرہ نمبر وغیرہ معلوم نہیں ورنہ خود دے دیتی، صرف نام ہی پتا تھا اسے، مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا رکھ دو میں پہنچا دوں گی۔" نرس نے تفصیل بتائی۔

"اور وہ خود؟" ندی نے بغیر کسی نام پتے کے اس سفید لفافے کو الٹتے پلٹتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"وہ لوگ تو رات اپنی والدہ کے ڈسچارج ہونے کے بعد گھر چلے گئے ہیں۔ اس کے بھائی نے ہی تو تمہاری امی کے لیے اپنا خون دیا تھا نا۔" نرس نے مزید اطلاع دی تو ندی کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے مزید پھیل گئیں۔

"واقعی۔۔۔؟" وہ حیران تھی۔

وہ جس شخص کو اب خود سے کوسوں دور محسوس کر رہی تھی وہ اب بھی اس کے ساتھ تھا اور اب ہر گھڑی اسے اس کے ساتھ ہی رہنا تھا کہ اس کا خون امی کی رگوں میں نئی زندگی کی نوید بن کر دوڑ رہا تھا۔ قدرت کی اس دھوپ چھاؤں پر حیران و پریشان کھڑی وہ کچھ دیر یونہی لفافے کو دیکھتی رہی اور پھر سامنے سے آتی ثروت آپا اور ناصر بھائی کو دیکھ کر اس نے بے اختیاری طور پر لفافہ اپنی سیاہ چادر میں چھپایا مبادا ناصر بھائی نہ دیکھ لیں۔

(دسویں اور آخری قسط آئندہ ماہ)



فاخرہ گل

میرے عشق کو سرخرو کرو

۱۰

دسویں اور آخری قسط



روک لیں یا بڑھنے دیں
تھام لیں یا گرنے دیں
وصل کی لکیروں کو
توڑ دیں یا ملنے دیں
راستوں کی مرضی ہے
اجنبی کوئی لا کر
ہمسفر بنا ڈالیں
ساتھ چلنے والوں کی
دھول تک اڑا ڈالیں
یا مسافتیں ساری
خاک میں ملا ڈالیں
راستوں کی مرضی ہے
بے نشاں جزیروں پر
بدگمان شہروں میں
بے زباں مسافر کو
جس طرف بھی بھٹکا دیں
راستوں کی مرضی ہے
بے زمین لوگوں کو
بے قرار آنکھوں کو
بدنصیب قدموں کو
جس طرف بھی لے جائیں
راستوں کی مرضی ہے

اکمل جس طرح مہربانو کو لوگوں کے ہجوم اور میڈیا کی آنکھ سے دور اپنی گاڑی تک لایا تھا انداز محسوس کرنے، سمجھنے یا جانچنے کے لیے اس وقت مہربانو کا ذہن بالکل سپاٹ تھا —— بلکہ ہر قسم کے احساسات و جذبات سے بالاتر ہو کر اس وقت اس کے جسم کا روم روم اکمل کا احسان مند تھا کہ وہ اسے ان تمام نظروں سے اوجھل کر پایا تھا جو اس کے جسم میں زہر سے بجھے نیزے کی مانند داخل ہو کر اس کی روح تک کو زخمی کیے دے رہی تھیں۔

وہ اس وقت اکمل کے ساتھ اس کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی نہیں جانتی تھی کہ آج راستے سے زندگی کے کون سے موڑ کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ اکمل کا خاموش چہرہ اور بھینچے ہوئے جبڑے بتا رہے تھے کہ اسے بھی ذہن و دل میں ہونے والی جنگ کا سامنا ہے۔ یوں میڈیا پر ہونے والی اس افسوسناک رپورٹنگ کے بعد خود مہربانو اپنی ذات کو ہوا میں معلق محسوس کر رہی تھی۔ اب جبکہ میڈیا کی مہربانی سے گھر گھر میں اس کے متعلق عجیب و غریب قیاس آرائیاں

کی جا رہی ہوں گی تو ایسے میں خود اس کے گھر والوں کا کیا ردِ عمل ہوگا؟ میران یا شاہ سائیں یہ ساری حقیقت مختلف ٹی وی چینلز کی زبانی جاننے کے بعد کس کیفیت کا شکار ہوں گے؟ اور اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ یہ اور اس جیسی تمام سوچیں اس کے ذہن کو بری طرح جکڑے ہوئے تھیں۔

وہ خود تو لفٹ سے نکلنے کے بعد سے اب تک ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی البتہ اکمل نے سوالات کی بوچھاڑ کے جواب میں سارا معاملہ واضح کرنے کی کوشش ضرور کی مگر رپورٹرز شاید اس تمام معاملے کی رپورٹنگ حسب منشا کرتے ہوئے معاملے کو اپنی مرضی کا رنگ دینا چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ایسے بے تکے سوالات کرنے لگے کہ اکمل نے ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب دینا مناسب خیال نہ کرتے ہوئے مہربانو کا ہاتھ تھاما اور اس ہجوم سے باہر نکل آیا اور اب شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بس راستوں کے رحم و کرم پر گاڑی سیاہ تارکول کی سڑک کو اپنے پہیوں تلے پیستی جا رہی تھی۔

یوں بھی اس وقت اگر اسے فکر تھی تو صرف اور صرف مہربانو کی کیونکہ وہ اب اس کے فیملی بیک گراؤنڈ سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ اس کا تعلق معاشرے کی ایک ایسی سوچ سے ہے جہاں قدموں کی ہلکی سی لغزش بھی پاؤں کٹوانے کا باعث بن سکتی ہے اور یہ تو پھر بات ہی بہت بڑی تھی۔ میران جس ذہنیت کا انسان تھا اس کے سامنے یہ سارا ماجرا کھلنے پر وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا۔ شاہ سائیں کا بھی ایک مضبوط سیاسی حلقہ تھا۔ ایک جانی مانی حیثیت تھی۔ ان کے دوست دشمن جب ٹی وی پر بارہا چلنے والی یہ خبر دیکھیں گے اور ظاہراً رسمی طور پر جب ان کے ساتھ طنز کے زہر میں بجھے لفظوں سے اظہار ہمدردی کریں گے تو وہ اپنے حلقہ احباب میں خود کو کس طرح Stable کریں گے۔

''کہاں جانا چاہیں گی آپ؟''

اکمل نے گردن موڑ کر ساتھ بیٹھی مہربانو سے پوچھا جس کی بڑی بڑی آنکھیں ڈیش بورڈ پر مرکوز تھیں۔ اس کی آواز پر وہ بے اختیار چونک سی گئی تھی۔ ایسے جیسے کسی ویرانے میں اچانک ہی کوئی اپنے جیسا انسان نظر آ گیا ہو۔

''میں۔۔۔۔'' بغیر آواز کے صرف ہونٹوں کی جنبش سے مہربانو نے خود اپنے آپ سے ہی سوال کرتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

واقعی اب آخر اسے جانا کہاں چاہیے تھا؟ ہاسٹل؟ جہاں اب تک لڑکیاں یقینی طور پر اسے ٹی وی پر دیکھ کر ایک دوسرے سے حیرت کا اظہار کرتی جانے خود سے کیا کیا قیاس آرائیاں کر رہی ہوں گی اور یقیناً میری اور کنول سے سارے واقعے کی تفصیلات کرید کرید کر پوچھنے میں مصروف ہوں گی۔

''سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں، اگر ہاسٹل جاؤں تو وہاں لڑکیوں نے ابھی میڈیا اور رپورٹرز کی طرح ادھر اُدھر کے بے شمار فضول سوال کرنے ہیں۔''

اکمل کو اپنے جواب کا منتظر پا کر مہربانو نے اپنے دل کی الجھن اس کے ساتھ شیئر کی۔ یوں بھی پوری رات لفٹ میں گزارنے کے بعد وہ اس کے کردار کی دلی طور پر معترف ہو گئی تھی اور اس کی نظروں میں اکمل ایک بہت اچھا اور قابل بھروسہ دوست بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اب یہ الگ بات تھی کہ وہ اسے دوست کا درجہ بھی نہیں دے سکتی تھی اور آج کے بعد ایک بار پھر ان دونوں کو اجنبی بن کر بچھڑ جانا تھا۔ کسی اور اچانک اور غیر ارادی ملاقات تک کے لیے۔

''بابا سائیں اور بھائی وغیرہ کو بھی یقیناً اب تک سارے معاملے کی خبر ٹی وی کے ذریعے ہو چکی ہوگی اور وہ بھی اس وقت یقینی طور پر انتہائی غصے میں ہوں گے۔''

اضطرابی کیفیت میں مہربانو اپنی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مسل رہی تھی۔ اکمل نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ صرف وہ جانتا تھا کہ مہربانو بے خطا، بے قصور اور پاک دامن ہے مگر یہ بات ساری دنیا کو آخر کس طرح سمجھائی جا سکتی تھی اور دنیا والوں سے پہلے شاہ سائیں، میران اور ملکانی سائیں کو۔ مہربانو نے سر جھکا کر آنکھوں کو مضبوطی سے بند کرنے کے بعد پھر سے کھولا۔

گاڑی کی اسپیڈ پہلے کی نسبت اب ذرا کم تھی۔ ایک عجیب خوف اور انجانا سا دھڑکا دل کو سرد کیے دے رہا تھا۔ بمشکل تھوک نگلنے کے بعد وہ اکمل کی طرف دیکھنے لگی۔

"اور وہ لوگ غصے میں کس حد تک چلے جائیں گے، اس بارے میں، میں خود بے یقینی کا شکار ہوں۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ مہربانو یوں ارادتاً اسے دیکھ رہی تھی اور تب اکمل نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی دھند ابھرتے دیکھی تھی مگر ساتھ ساتھ باوجود اس کے کہ وہ بات کچھ اور کر رہی تھی مگر اکمل کو لگا جیسے اس کی آنکھیں اکمل کا ساتھ چاہ رہی ہوں۔ اس مشکل وقت میں اسے اکیلا نہ چھوڑ جانے کی التجا کر رہی ہوں اور بھلا وہ جو پہلے ہی یہ سب کچھ سوچ چکا تھا ان غزالی آنکھوں کو نا امید لوٹاتا؟

''مہربانو! میں آپ کو کہیں بھی چھوڑ کر اس وقت تک واپس نہیں آؤں گا جب تک آپ خود وہاں مطمئن نہ ہوں۔۔۔۔ اور یقین کریں میں کسی بھی مشکل گھڑی میں ہمیشہ آپ کو مشکل سے نکال لینے کی ہمت بھی رکھتا ہوں اور جرأت بھی۔ You just trust me۔'' بات دل سے نکلی ہو تو براہِ راست دل تک رسائی بھی حاصل کر لیتی ہے۔ مہربانو کو یقین تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے محض رسماً یا اس کا دل بہلانے کے لیے نہیں کہہ رہا بلکہ ان تمام باتوں میں لفظوں سے کہیں زیادہ سچائی تھی مگر پھر بھی انہونی کا خوف ذہن پر یوں اپنے نوکیلے پنجے گاڑے ہوئے تھا کہ دھڑکنوں کی رفتار بھی سست ہو چلی تھی اور ہاتھ پاؤں سرد ہوتے ہوئے جسم سے الگ محسوس ہونے لگے۔

دعا کے انداز میں دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر وہ چہرے تک لے گئی اور دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں آنکھوں پر رکھ دیں۔

''یا اللہ! میں نے آج تک اپنے والدین کی عزت اور حرمت کو ہمیشہ اپنی پہلی ترجیح کے طور پر سامنے رکھا۔ کبھی کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ تک نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کا سر جھکے، وہ دنیا والوں کے سامنے شرمندہ ہوں یا پھر ان کا مجھ پر قائم اعتماد ڈگمگائے۔۔۔۔ مالک! آج میں اور میرے گھر والے اپنی زندگی کے مشکل ترین موڑ پر کھڑے تیری رحمت کے امیدوار ہیں۔ اے بڑی عزت و عظمت والے رب سائیں! بے شک تو جسے چاہے عزت اور جسے چاہے ذلت دینے پر قادر ہے مگر ہمیں سزا کا وہ بوجھ ڈھونے سے بچا لے جس کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔ تو جو میری شہ رگ سے بھی قریب اور میری خلوت و جلوت کا ساتھی ہے، خوب جانتا ہے کہ میں اس سارے معاملے میں بے گناہ ہوں۔ تو اے خدا تو میری بے گناہی کو ثابت کر کے مجھے میرے بابا سائیں اور سب کے سامنے سرخرو کر دے، اے میرے پاک رب تجھ سے مدد مانگتی ہوں کہ تیرے سوا کوئی میری مدد کرنے والا نہیں یا رحیم یا رحمٰن، رحم کر دے مالک رحم۔۔۔۔

آنسو بڑی خاموشی اور غیر محسوس طریقے سے اس کے چہرے کو بھگوئے جا رہے تھے۔ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ اس کا دھیان مکمل طور پر اس کی طرف ہی تھا مگر اسے اندازہ تھا کہ وہ دعا کر رہی ہے اسی لیے کچھ بھی کہنا مناسب خیال نہ کرتے ہوئے یونہی بے مقصد اپنی گاڑی کو سڑک پر یہاں سے وہاں دوڑاتا رہا مگر جب بہت دیر تک مہربانو کے آنسوؤں میں کوئی بھی کمی نہ آئی تو آخر وہ بول ہی پڑا۔

''مہربانو! یوں رونے سے مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا، میرا خیال ہے آپ کو اپنے بابا سائیں سے بات کرنی چاہیے۔ اگر وہ آپ پر اعتماد کر کے سب کی مخالفت کے باوجود یہاں پڑھنے کے لیے بھجوا سکتے ہیں تو یقیناً آپ کی بات پر بھروسہ کریں گے۔''

ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں مسلتے ہوئے مہربانو نے جھکی ہوئی گردن تائید میں ہلائی۔

''اور اگر ایسا بالفرض نہ ہوا تو پھر بھی آپ خود کو

اکیلا ہرگز نہ سمجھیں، میں ہوں نا آپ کے ساتھ۔“ مہربانو بھی اس دوران سوچتے ہوئے تبھی فیصلہ کرچکی تھی کہ اسے ہر حال میں بابا سائیں کو اعتماد میں لینا چاہیے تبھی بولی۔

”جی ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے کہ والدین سے بڑھ کر کوئی بھی ہماری بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے مجھے اُنہی سے بات کرنی چاہیے کیونکہ اگر انہوں نے میری بات کا اعتبار کرلیا تو دنیا کچھ بھی کہتی رہے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوگی کہ میری دنیا میرے والدین ہی ہیں بس۔“

”اور اگر انہوں نے آپ کی بات پر یقین نہ کیا تو۔۔۔؟“

”سوری اکمل! میں ایسا کوئی بھی ”اگر“ اپنے ذہن میں لانا نہیں چاہتی جو میرے دل سے اس یقین کو متزلزل کرے جو مجھے رب سائیں کی رحمت پر ہے۔“

اکمل نے محسوس کیا کہ وہ خود کو آہستہ آہستہ کمپوز کرنے کی کوشش میں ہے۔

”سنا ہے، رب سائیں کا وعدہ ہے کہ اگر اس کا بندہ اس کی جانب ایک قدم بڑھائے گا نا تو وہ اپنے بندے کی جانب رحمت کے دس قدم بڑھائے گا۔“ گہری سانس لے کر اس نے سڑک کے دائیں طرف قطار سے موجود درختوں کو دیکھا۔ ”میں نے دعا کر کے اور اس کی مدد طلب کر کے اس کی طرف ایک قدم تو بڑھا دیا ہے، اب اس کے دس قدم بڑھانے کی باری ہے اور بے شک وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔“ مہربانو کی باتوں نے خود اکمل کے اندر بھی ایک توانائی پھونک ڈالی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ مہربانو بس ہاتھ پاؤں چھوڑ کر خود کو حالات کے تھپیڑوں کے حوالے کرنے والوں میں سے نہیں ہے

”میرا فون تو بند پڑا ہے، کیا میں آپ کا فون یوز کرسکتی ہوں؟“ مہربانو نے کہا تو اکمل نے فوراً سامنے ہی رکھا موبائل اٹھایا جو خوش قسمتی سے گاڑی سے چوری نہیں ہوا تھا۔

”کیا پوچھنے کی ضرورت تھی؟“ فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اکمل نے گہری نظروں سے اسے دیکھا لیکن مہربانو نے کسی بھی قسم کا جواب دینے کے بجائے فون اس کے ہاتھ سے لیا اور مخالف سمت دیکھنے لگی۔

بابا سائیں، میران اور ملکانی سائیں کے نمبرز تو اسے ویسے بھی یاد ہی تھے لیکن وہ سوچ رہی تھی کہ فون کس کو کیا جائے اور آخر وہ بابا سائیں کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ آگے سگنل پر ریڈ لائٹ آن تھی سو گاڑیاں ایک دوجے کے پیچھے قطار بنانے لگیں مگر اس وقت اس کے قدموں تلے زمین ہی سرکتی محسوس ہونے لگی جب اسے لگا کہ شاید کوئی اسے مسلسل دیکھے جارہا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے گردن موڑی تو چمچماتی ”PORSCHE“ میں ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شاہ سائیں سرخ ہوتی آنکھوں سے اسی کو دیکھ رہے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے موبائل لڑھک کر گود سے ہوتا اس کے قدموں میں آن گرا تھا۔

☆☆☆

بات کردار کی ہوتی ہے وگرنہ عارف
قد میں تو سایہ بھی انساں سے بڑا ہوتا ہے

جب سے عائشہ بھابھی نے ناصر بھائی کو یوں ادھ کھلے دروازے سے خاموش طوفان بنے دیکھا تھا، تب سے لے کر اب تک وہ خود کو شرمندگی کی دلدل سے باہر نہیں نکال پائی تھیں۔ اس وقت اگر ناصر بھائی اپنا غصہ نکال لیتے تو یقیناً اب تک عائشہ بھابھی کی بھی کیفیت ذرا مختلف ہوتی لیکن اب ایک تو انہیں ناصر بھائی کی طرف سے کیے جانے والے کسی بھی ممکنہ اقدام کا خوف تھا تو دوسری طرف اپنی سوچ کے ظاہر ہوجانے کا رنج۔ وقت کا پہیہ ایک بار پیچھے کی طرف گھما ڈالنے کی خواہش دل میں حسرت بن کر ابھرتی اور ڈوبتی جارہی تھی اور ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے اور آخر وہ کس سے مشورہ کریں۔ ممی سے بات کرتیں تو وہ یقیناً جذباتی ہوکر پریشان ہوجاتیں۔ سو اب ناصر کے سامنے ہزیمت

اٹھانے سے بچنے کے لیے ایک واحد رستہ جوان کے ذہن میں آیا وہ ان سب کے آنے سے پہلے گھر چھوڑ کر جانے کا تھا۔ اس سے پہلے کہ ناصر بھائی انہیں گھر سے نکل جانے کا کہتے وہ خود ہی اٹھیں اور ملحقہ اسٹور سے خالی بیگ لے کر اس میں کپڑے ڈالنے لگیں۔

ضمیر تھا کہ پہلے آرام سے تھپکتا رہتا مگر اب کوسنے پر تلا تھا، گھر اور گھر والوں کے لیے کیے گئے منفی اقدام محدب عدسے کے ذریعے دکھا رہا تھا اور صرف عائشہ بھابھی ہی کے ساتھ نہیں بلکہ اکثر اوقات ضمیر جاگتا ہی گناہ کے سرزد ہونے کے بعد ہے مگر پھر وہ جاگنا بھی بھلا کیا جاگنا اور کس کام کا کہ جس میں صرف پچھتاوا ہو، تو یہ احساس، خلش چبھن یا تلافی کا ارادہ کوئی وجود ہی نہ رکھتا ہو۔ اُن کا ارادہ میکے میں کسی کو بھی بتائے بغیر گھر پہنچ جانے کا تھا کیونکہ وہ اپنے اندر اتنی ہمت جمع نہیں کر پارہی تھیں جس کے بل بوتے پر وہ ناصر کا سامنا کرپاتیں۔

”عائشہ۔۔۔!“ وہ وارڈروب کی طرف منہ کیے کھڑی ہینگرز میں سے کپڑے نکال رہی تھیں کہ ثروت آپا کی آواز سن کر چونک گئیں۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دروازے کے عین بیچوں بیچ کھڑی بڑی عجیب سی نظروں سے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

”کیوں کیا تم نے یہ سب؟“

”میں نے؟ کیا کیا ہے میں نے؟“ انجان بننے اور معاملے سے لاتعلقی ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔

”بہت ہوگیا تمہاری مصنوعی معصومیت کا ڈھونگ۔ اللہ کا واسطہ ہے اب ختم کرو یہ ڈرامے بازی۔“ ثروت آپا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیے تھے ان کے سامنے۔

عائشہ جو شاید یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ معاملہ ان میاں بیوی کے درمیان ہی حل ہوجائے گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔ وہ جانتی تھیں کہ ناصر بھائی ساری فون کال سن چکے ہیں اور رات بھر کی سوچ بچار کے بعد وہ یہی نتیجہ اخذ کیے بیٹھی تھیں کہ اگر ان کے گھر ہوتے ہوئے ہی ناصر بھائی واپس آئے تو وہ ان سے سوری کر کے اپنے رویے کی معافی مانگ لیں گی تاکہ گھر کے دوسرے افراد کو اس معاملے کی بھنک نہ پڑے اور اب اتنا وقت بیت جانے کے بعد بھی ان کے نہ آنے پر اب وہ اپنا بیگ تیار کرتے ہوئے ثروت آپا کو سامنے پا کر بوکھلا گئی تھیں۔

”ہوا کیا ہے آخر؟ اور آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”وہی سب کہنا چاہتی ہوں جسے سننے کی تم میں ہمت نہیں ہے۔ میں تو سوچتی ہوں تم کیسی عورت ہو جو اسی گھر کی بنیاد کھوکھلی کرتی رہی جو اس کی بھی پناہ گاہ ہے۔ تم نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ اگر اس گھر کی رسوائی ہوگی تو وہ تمہاری بھی تو رسوائی ہے نا۔ تمہاری جیسی ہی بہوئیں ہوتی ہیں جو سچ جھوٹ ملا کر ہر صورت اپنے سسرال والوں کو دنیا کے سامنے برا بناتی ہیں۔“ عائشہ جان گئی تھیں کہ ناصر کے ذریعے وہ تمام حقیقت سے آگاہ ہوچکی ہیں۔

”یاد کرو عائشہ! ہم میں سے کسی نے بھی کب تمہاری کوئی حق تلفی کی؟ حقوق ادا نہیں کیے؟ تم پر ظلم کیا؟ آخر کیا گناہ کیا تھا ہم نے اور اس معصوم ندی نے کہ تم نے دنیا بھر میں کہیں منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں چھوڑا۔“

”میں جب سے اس گھر میں آئی، مانتی ہوں کہ میرے تمام حقوق ادا کیے گئے مگر ندی نے میرے اس خواب کو بے دردی سے توڑ دیا جس میں، میں نے ہمیشہ اسے اکمل کی شریکِ سفر کے روپ میں دیکھا تھا۔ کوئی میرے بھائی کا دل توڑے یہ میں کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ اس ڈھٹائی پر ثروت آپا کا خون کھول گیا تھا۔

”اکمل نے تو کبھی یہ خواہش کی ہی نہیں۔ یہ زبردستی کا خواب جو تم اس کی آنکھوں میں سجانا چاہ رہی تھیں اس نے ہم سب کی آنکھوں میں مرچیں بھر دی ہیں۔ آنٹی بھی یہ ساری حقیقت جان کر بہت ٹینشن میں ہیں۔“

''کیا؟ ممی کو کس نے کہا یہ سب؟'' عائشہ بھابھی جو ساری بات اپنے انداز میں بتانا چاہ رہی تھیں پہلے ہی انہیں پتا چل نے پر بھونچکارہ گئیں۔

''ناصر نے خود فون کر کے ان سے ساری بات کی ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ تم جب تک اس گھر میں ہو، وہ یہاں قدم نہیں رکھے گا اور آنٹی کو اسی لیے فون کیا تھا کہ وہ تمہیں لے جلیں آ کر۔'' ثروت آپا سے ان کے چہرے کی شکستگی دیکھی نہیں گئی جبھی دانستہ طور پر ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگیں۔

''لیکن۔۔۔؟'' دور کہیں سے عائشہ بھابھی کی آواز آتی محسوس ہوئی۔

''انہوں نے تمہیں گھر لے جانے سے انکار کر دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے معاملے کے بعد وہ تمہیں گھر نہیں رکھیں گی۔۔۔ آ رہی ہیں وہ تھوڑی دیر میں۔'' عائشہ بھابھی وہیں اپنے بیگ کے پاس ہی خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔

اپنے سامان کو باندھے ہوئے اس سوچ میں ہوں
جو کہیں کے نہیں رہتے وہ کہاں رہتے ہیں

نہ تو میکے میں ان کے لیے جگہ تھی اور نہ سسرال میں اور دل چاہ رہا تھا کہ بس کسی کا سامنا نہ کرنا پڑے، کوئی صفائیاں نہ دینی پڑیں اور وہ کسی کے آگے جوابدہ نہ ہوں لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ حساب کا وقت شاید آن پہنچا تھا اور اب انہیں لگ رہا تھا کہ شاید وہ اپنی حد سے واقعی تجاوز کر گئی تھیں۔ وہ ان سب کی نظروں میں کس قدر گر گئی تھیں یہ احساس انہیں مارے ڈال رہا تھا۔ کل تک طنطنے کے ساتھ سر اٹھا کر چلنے والی عائشہ بھابھی کا آج رنگ پھیکا اور سر جھکا ہوا تھا۔ وقت کی یہی تو خاصیت ہے کہ بدل جاتا ہے، رکتا نہیں، ٹھہرتا نہیں۔ اس لیے اچھے وقت میں برے وقت نہ آنے اور اس سے بچنے کی دعا کرنے کے ساتھ برے وقت میں اچھے وقت کے آنے کی امید رکھنی چاہیے۔

''تم نے ہمیں خاندان اور دنیا بھر میں بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی عائشہ! اور اب تمہاری باری ہے۔''

باہر گاڑی کے ہارن کی آواز پر ثروت آپا تاسف بھری نظر شکست خوردہ عائشہ بھابھی پر ڈالتے ہوئے گیٹ کھولنے چلی گئیں جہاں عائشہ کی ممی اپنی بیٹی کا گھر بچانے کی آس میں آئی تھیں۔

☆☆☆

ناصر بھائی جب سے شاہ زین کے گھر سے آئے تھے کچھ الجھے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ندی کے ساتھ وہ اور ثروت آپا امی کے کمرے تک آئے تو ان کی خیریت وغیرہ کے بارے میں تسلی کرنے کے بعد جتنی دیر کمرے میں موجود رہے ندی نے محسوس کیا کہ بس بے چینی سے پہلو بدلتے رہے، خود ثروت آپا بھی مطمئن دکھائی دینے کے بجائے کسی کشمکش کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔

ندی کو اندازہ تھا کہ شاید وہ دونوں اس امر سے واقف ہو چکے ہیں کہ امی کو خون دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ وہی شاہ زین ہے جسے آج سے پہلے تک ناصر بھائی گھر کے امن و سکون کو برباد کرنے کا ذمہ دار سمجھا کرتے تھے۔ لیکن خود سے کچھ بھی کہنے یا پوچھنے کے بجائے اس نے انتظار کیا کہ وہ دونوں کسی بات کا آغاز کریں مگر اس کے برعکس ناصر بھائی نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے ثروت آپا کو بھی اپنے ساتھ آنے کا کہا اور دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ سو ندی کچھ لمحے ان دونوں کے تاثرات میں الجھی رہی اور پھر مٹھی میں توڑ موڑ کر دبایا ہوا ثمینہ کا لیٹر کھول کر پڑھنے لگی۔

''معصوم صورت اور پیاری آنکھوں والی ندی! السلام علیکم۔

اپنے نام میرا خط دیکھ کر یقیناً آپ حیران ہو رہی ہوں گی اتنی ہی حیران جتنی میں اس وقت ہوئی تھی جب مجھے پتا چلا کہ آپ وہی ہیں جن کی بدولت بھائی نے ایک بار پھر مسکرانا اور زندگی کو خوش دلی سے جینا شروع کیا تھا۔ آپ سے ملنے اور روبرو دیکھنے کی خواہش یوں اسپتال میں پوری

ہو گی یہ تو سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ہی یہ سوچا تھا کہ جب آپ سے ملاقات ہو گی تو آپ کے حوالے سے ہماری آنکھوں میں اترنے والے خواب اپنی تعبیر کھو چکے ہوں گے لیکن شاید ہم سب کی قسمت میں ایسا ہی ہونا لکھا تھا مگر اس کے باوجود ایک الجھن جواب تک میرے ذہن سے نکل نہیں پا رہی وہ یہ کہ یونیورسٹی میں تو جو ہوا سو ہوا اگر آپ نے اب چند روز بعد میران شاہ سے ہی شادی کرنی تھی تو میرے بھائی کے جذبات سے کھیلنے کا حق آپ کو کس نے دیا تھا۔ ایک جیتے جاگتے انسان کی فیلنگز کی پروا کیے بغیر آپ محض وقت گزاری کے لیے اتنا آگے نکل گئیں کہ اخبارات میں تصاویر چھپنے کے بعد آپ کو کوئی فرق پڑا ہو یا نہیں لیکن ہمیں اپنا گھر، محلہ بھائی کو یونیورسٹی سب کچھ چھوڑنا پڑا۔

کیا ملا آپ کو یہ سب کر کے؟ اور کیا آپ خود خوش رہ پائیں گی اپنی نئی زندگی میں میران کے ساتھ؟ کبھی وقت ملے تو سوچیے گا ضرور، شاید آپ کو اپنے دل کے اندر پچھتاوے کا احساس ہو، زیادہ دیر تک نہ سہی لمحہ بھر ہی کے لیے مگر مجھے یقین ہے کہ آپ سوچیں گی ضرور کہ آپ نے میران کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی بھابھی اور بہن کے ہاتھوں میرے بھائی کی بے عزتی کروا کر بہت برا کیا ہے، ہو سکے تو رخصتی سے پہلے ایک دفعہ اللہ سے معافی مانگ لیجیے گا تاکہ جو دکھ آپ نے بھائی کو دیے ہیں اس کی پرچھائیاں آپ کی شادی شدہ زندگی پر بھی نہ پڑ جائیں۔

دعا گو
ثمینہ

ہاسپٹل کے پیپر پیڈ کو استعمال میں لاتے ہوئے لکھا گیا یہ خط تھا یا اب تک اسی پر بیتی گئی مشکلات کا راز۔ شاہ زین کے بدلے ہوئے رویے کی تھی اب آہستہ آہستہ ندی کے ذہن میں کھلتی جا رہی تھی لیکن اپنے اور اس کے درمیان موجود غلط فہمیوں نے ندی کو حیران کر ڈالا تھا اور اس پر یہ انکشاف کہ اس کی میران سے شادی ہو رہی ہے، ندی کو معلق ہی تو کر گیا تھا، وہ انسان جس کی وجہ سے اس کی زندگی آج یہاں تک آ پہنچی تھی جس نے اسے اپنوں میں بے گانہ بنا ڈالا تھا۔ اسی کے ساتھ ساری زندگی اور وہ بھی اس کی ملکیت بن کر بھلا وہ کیسے گزار سکتی تھی اور ناصر بھائی وغیرہ شاہ زین سے کب ملے اور کس انداز سے ملے تھے یہ سب تو ندی کو خبر ہی نہیں تھی۔

''اتنا کچھ ہوتا رہا اور وہ بالکل انجان بنی رہی۔'' ندی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ شاہ زین کے کہے گئے لفظوں کا مفہوم اسے اب سمجھ آ رہا تھا۔ یوں بھی دل تو پہلے بھی اسے قصوردار ماننے کو تیار نہیں تھا اور اب تو سارا معاملہ واضح ہو کر سامنے تھا مگر اس کے باوجود ایک گلہ ضرور تھا کہ شاہ زین نے اس کی محبت پر اعتبار نہیں کیا اور یہی سمجھا کہ شاید وہ محض وقت گزارنے کے لیے اس کے ساتھ دوستی رکھے ہوئے ہے۔

وہ اتنی اگر مگر اور لیکن میں الجھی ہوئی تھی کہ ناصر بھائی کے کمرے میں آنے کی آہٹ سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ خط اب تک اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ ناصر بھائی نے کمرے میں آنے کے بعد ندی کو دیکھا، دل تو چاہا کہ اس سے بات کریں مگر وہ سیدھے چل کر امی کے بیڈ کی بائیں طرف آ کھڑے ہوئے۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو، خود کو گھسیٹنے کے انداز میں چلتے ناصر بھائی جو کبھی اس حالت میں اتنے ست نہیں دیکھے گئے تھے۔ ندی کا دل بھر آیا مگر بے حد خواہش کے بعد بھی اس نے انہیں مخاطب کرنے سے خود کو باز رکھا کہ نہیں چاہتی تھی یہاں کوئی بدمزگی ہو یا پھر ان کا کہا ہوا کوئی ایسا جملہ امی کے کان میں پڑے جو انہیں دکھ دے۔ سو یہی کچھ سوچ کر خاموش رہی۔

ناصر بھائی عین امی کے تکیے کے پاس کھڑے ہو کر ان کے بالوں کو سہلانے لگے تو امی نے بائیں طرف گردن لے جا کر آنکھیں کھول دیں۔ ناصر بھائی کو سامنے پا کر جہاں ان کی آنکھوں میں چمک آئی تھی وہیں ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ محسوس ہوئی تھی۔ ناصر بھائی کا سر جھکا ہوا تھا۔ وزیٹرز کے لیے موجود کرسی کھینچ کر وہ بالکل بیڈ کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نظریں نیچے کیے بولے۔

''مجھے معاف کر دیں امی!''

نہ کوئی لمبی چوڑی تمہید اور نہ ہی جذبات کا طویل بیان مگر ان چند لفظوں نے بے انتہا خوش گوار حیرت امی کی آنکھوں میں ضرور بھر دی تھی جیسے پوچھتی ہوں تم جانتے تو ہو نا کہ کہہ کیا رہے ہو؟

''مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں غلط تھا۔ میں نے آپ سب کے ساتھ، بابا کے ساتھ زیادتی کی، دنیا کے ساتھ مل کر اپنے ہی گھر کو برا سمجھا، کسی بھی قسم کی منطق یا دلیل کے بغیر آپ سے بھی بات چیت بند کر دی، ندی کی طرف سے کوئی بھی وضاحت سنے بغیر اسے سزا سنا دی تو یقین کریں صرف اس لیے کہ میرے حواس اس غیر متوقع واقعے کے بعد مفلوج سے ہو کر رہ گئے تھے اور میں تمام مناظر عائشہ کی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا۔ ان آنکھوں سے جن کی سطح پر ہی حسد اور بدگمانی کے منظر چسپاں تھے۔ معاف کر دیں امی! آپ کا صبح کا بھولا شام ہونے سے پہلے گھر آ گیا ہے۔'' انہوں نے اپنا سر جھکا کر پیشانی امی کے ہاتھوں پر رکھ دی تھی اور تب امی کو احساس ہوا کہ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور یقیناً وہ بے آواز رو رہے تھے۔ وہ جو کبھی نہیں روئے تھے یہاں تک کہ بابا کی وفات پر بھی بلاشبہ غمگین تھے مگر کسی کے سامنے انہیں روتا نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ آج یوں گھٹ گھٹ کے رو رہے تھے کہ رونا بھی چاہتے تھے اور آواز دبانا بھی۔

امی کا کلیجہ کٹ کے رہ گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید ان کی اچانک طبیعت بگڑنے پہ ناصر بھائی کا ضمیر جاگا تھا۔ درحقیقت کہانی کیا تھی اس بات سے تو وہ قطعی طور پر لاعلم تھیں۔ خود ندی کی آنکھیں بھی یہ جذباتی منظر دیکھ کر بھیگنے لگی تھیں۔ یہ انہونی کیسے ہو گئی تھی کہ ناصر بھائی کو اپنے کیے پر شرمندگی ہو رہی تھی اور کیا سارے مناظر پر چھائی دھند اب چھٹنے کو تھی۔ خواہش تو بے اختیار دل میں یہی ابھری تھی کہ ناصر بھائی کے پاس چلی جائے اور ان سے کہہ دے کہ وہ اب بھی ان کے لیے ویسے ہی عظیم اور محبت کرنے والے ہیں جیسے پہلے کبھی ہوا کرتے تھے مگر جھجک راستہ روکے ہوئے تھی سو امی کے بیڈ کے ایک طرف بھیگی آنکھیں لیے وہ بیٹھی تو دوسری طرف ناصر بھائی۔ امی نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے سروں پر رکھے اور دھیمی آواز میں بولیں۔

''خوش رہو بیٹا! مجھے تم سے کوئی وضاحت یا معافی تلافی نہیں چاہیے۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ تمہارا احساس جاگ گیا ہے کیونکہ جن رشتوں سے احساس ختم ہو جائے ان کا ہونا نہ ہونے سے کہیں زیادہ اذیت ناک لگنے لگتا ہے۔''

لاڈ سے ان کے بال سنوارتے ہوئے امی نے کہا تو انہوں نے وہیں سر جھکائے ہوئے ہی ایک ہاتھ سے آنکھیں پونچھیں شاید وہ اپنا رونا ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''میں مانتا ہوں ندی! کہ تمہیں اچھا برا بتانا اور صحیح غلط میں تمیز سکھانا ہماری ذمہ داری تھی مگر ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم جَو کاشت کر کے گندم کاٹنے کی خواہش کر بیٹھے تھے۔ سورج مکھی کا بیج بو کر ہم بضد تھے کہ پھول گلاب کا کیوں نہیں نکلا۔'' اس بات کی یقین دہانی ہو جانے کے بعد کہ ان کی آنکھیں خشک ہیں انہوں نے سر اوپر اٹھا کر ندی کو مخاطب کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے ناصر بھائی! غلطیاں مجھ سے بھی ہوئی ہیں لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ اللہ نے ہمیں ایک بار پھر اکٹھے رہنے کا موقع دیا ہے میں امی بھابھی۔۔۔''

''نہیں صرف میں، تم اور امی۔۔۔ عائشہ اب مزید اس گھر میں نہیں رہے گی۔'' ناصر بھائی کے دو ٹوک لہجے پر ندی کے ساتھ ساتھ امی کو بھی حیرت ہوئی تھی۔

''کیونکہ مجھے آپ سب سے دور کرنے اور خاندان بھر میں ہماری ذلت و رسوائی کروانے میں سب سے پیش پیش وہی تھی۔'' ندی اور امی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر خاندان میں لوگ باتیں کرتے بھی تو اس کا رویہ دیکھ کر اس کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہ کرتے مگر وہ تو خود سب کو مبالغہ آرائی کے ساتھ واقعہ بتاتی اور ان کے ساتھ مل کر تبصرے کرتی۔ ندی کے موبائل سے اگر میرے سامنے شاہ زین کو مختلف میسجز کر سکتی تھی تو اب تک موبائل اس کے پاس ہے جانے کس کس کو ندی کے نام سے میسجز کرتی رہی ہو گی۔'' موبائل کی گتھی سلجھنے پر ندی کی حیرت یہ جان کر مزید سوا ہو گئی تھی کہ عائشہ بھابھی اس کی طرف سے میسجز بھی کرتی رہی ہیں۔

''اور اب میں نے ثروت آپا کو بھی یہی کہلوا کر گھر بھیجا ہے کہ میرے آنے سے پہلے ہی عائشہ گھر چھوڑ کر چلی جائے ورنہ جب تک وہ گھر میں رہے گی میں وہاں قدم نہیں رکھوں گا۔'' رات کو عائشہ کی ٹیلیفونک بات چیت سننے کا واقعہ بتانے کے بعد ناصر بھائی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور امی ایک مرتبہ پھر بھونچکا سی رہ گئیں کہ ندی کی طرف سے اگر کچھ سکون ملنے کی امید ہوئی تھی تو اب بیٹے کی ازدواجی زندگی ڈانواڈول دکھائی دے رہی تھی۔

''تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ جذباتیت میں آ کر اپنا بسا بسایا گھر داؤ پر لگا رہے ہو؟'' امی نے نقاہت بھرے انداز میں سمجھانا چاہا۔

''امی جھوٹ کے تو پاؤں نہیں ہوتے نا، اور یہ بات عائشہ بھی اچھی طرح جانتی ہے تو کیا اس نے یہ سب کرتے ہوئے رائی کا پہاڑ بناتے ہوئے اتنا بھی نہیں سوچا ہو گا کہ اگر یہ سب ہمارے سامنے آ گیا تو کیا ہو گا؟ اس کی اپنی زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟'' ناصر بھائی کے لہجے میں یقین ٹوٹنے کا دکھ بول رہا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ یہ سب ان کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا تھا۔ کسی بھی قسم کے شک کی کوئی بھی گنجائش نہیں تھی۔

''بھائی وہ۔۔۔ ایک چھوٹی سی بات کہنا تھی اگر آپ۔۔۔'' ندی اپنے اور ناصر بھائی کے درمیان اب بھی وہ پہلے سی بے تکلفی محسوس نہیں کر پا رہی تھی اسی لیے جھجک گئی۔ یوں بھی تمام رشتوں کو سابقہ حالت میں آنے کے لیے یقینی طور پر ایک وقت درکار تھا۔

''ہاں بولو ندی! کیا کہنا چاہتی ہو؟'' ناصر بھائی نے آواز میں ہر ممکن حد تک ملائمت سمونے کی کوشش کی تاکہ سابقہ محسوسات کی پرچھائیں تک محسوس نہ ہو۔

''وہ بھائی دراصل۔۔۔'' ندی نے ایک نظر امی کو دیکھا تو ان کی آنکھیں اسے حوصلہ بڑھاتی محسوس ہوئیں۔

''اصل قصوروار عائشہ بھابھی تو نہیں ہیں نا، جرم سرزد تو میران شاہ سے ہوا تھا جس نے جان بوجھ کر سازش کے تحت میری تصاویر کسی اور کے ساتھ جوڑ کر انہیں اخبار کی زینت بنا دیا اور بات پھر یہاں تک آن پہنچی۔''

''لیکن اس تمام صورت حال میں اگر عائشہ بات کو اتنا نہ اچھالتی اور ہر وقت میرے سامنے دانستہ طور پر اس بات کا اعادہ نہ کرتی رہتی تو شاید حالات مختلف ہوتے۔۔۔ اور شاید بابا یوں مجھ سے خفا ہو کر یہ دنیا نہ چھوڑ جاتے۔'' ناصر بھائی کو ایک مرتبہ پھر پچھتاووں نے آ گھیرا تھا اور شاید یہ ملال تو اب عمر بھر کا تھا جو بابا کے رخصت ہونے سے ذہن و دل پر پھیل گیا تھا۔

''اُن کا اسی طرح جانا لکھا تھا بیٹا! تم دل چھوٹا نہ کرو، لیکن ہاں اپنی حالیہ زندگی کو ماضی پر قربان نہ کرو۔'' وہ کسی طور نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے چھوٹے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے کہنے میں دراڑیں پڑیں اسی لیے ناصر بھائی کو کسی بھی انتہائی فیصلے سے روکنا بھی چاہتی تھیں مگر موبائل کی بجتی ہوئی گھنٹی نے ان کی بات چیت میں وقفہ پیدا کر دیا۔

☆☆☆

ٹیلی وژن کی اسکرین پر چلتی خبر تھی یا دہکتی ہوئی سرخی سے نکلی ہوئی آگ جو میران شاہ کے جسم کو دھیرے دھیرے اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، جلا رہی تھی مگر ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ پاؤں کے ناخنوں سے شروع ہو کر سر تک پہنچتی اور اس کی سلگتی ہوئی لپٹیں وہاں سے پھر واپسی کا سفر کرنے لگتیں۔ چند لمحوں پہلے شاہ زین پر طنز کرتے اور اپنی باتوں اور طعنوں سے اپنے زعم میں اسے رسوا کرتے میران کی حالت اس شخص کی سی تھی جو خوش گپیوں میں مصروف ہاتھ میں بندوق لیے سامنے اڑتی معصوم فاختہ کا شکار کرنے کا ارادہ باندھے اور شکار کی طرف بڑھتے ہوئے اس سے پہلے کہ بندوق کی لبلبی دبائے خود سامنے موجود گڑھے میں جا گرے اور ساتھیوں کے قہقہوں کے باعث اپنے اندر اتنی بھی ہمت موجود نہ پائے کہ باہر نکل کر ان کا سامنا ہی کر سکے۔

جس طرح میڈیا پر اس نے یہ خبر سنی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس چینل اور خبر پہنچانے والوں کو اڑا ہی دے لیکن یہ سلوک آخر کس کس کے ساتھ کیا جاتا کہ اب تو پاکستان میں ٹی وی چینلز بھی تھوک کے حساب سے کھلنے لگے ہیں۔

خود شاہ زین کے لیے بھی یہ خبر یقیناً چونکا دینے والی تھی جس کی بڑی وجہ اکمل تھا کیونکہ ندی کے حوالے سے اکمل اس کے لیے اجنبی ہرگز نہیں تھا اور پھر مہربانو جس کا تعلق شاہ سائیں سے تھا اور شاہ سائیں دنیا والوں کے لیے جیسے بھی ہوتے، اخبارات و جرائد میں ان کے متعلق جو بھی چھپتا مگر شاہ زین کے دل میں ان کا رویہ گھر کر چکا تھا اور یوں سر عام ان کی بیٹی کا نام اچھلنا شاہ زین کے لیے بھی کوئی خوش کن امر ہرگز نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو دوسروں کی تکلیف میں دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے انہیں وہ وقت یاد دلانے لگتے ہیں جب خود انہیں بھی تکلیف پہنچائی گئی تھی۔ اس نے ایک نظر میران کو دیکھا جو فوراً وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ شیشے کی میز پر ایک زوردار مکا مارا اور کرسی کو پوری طاقت سے یوں گھمایا کہ وہ کتنی ہی دیر دائرے میں گھومتی ہی رہی۔ شاہ زین سے نظریں ملائے بغیر وہ اسی لمحے کمرے سے نکل گیا تھا۔ آندھی طوفان کی رفتار سے پارکنگ میں کھڑی گاڑی نکالی اور ہوا کی رفتار سے حویلی کی طرف موڑ دی۔

مہربانو پوری رات لفٹ میں کیوں اور کیسے بند رہی؟ اس نے فون کر کے حویلی میں یا اپنی کسی دوست کو فوراً مدد کے لیے کیوں نہیں کہا؟ بابا سائیں نے جس طرح سب سے ٹکر لے کر اسے وہاں بھیجا تھا اور سب کی مخالفت لی تھی اس نے ان سب باتوں کو بھی سامنے کیوں نہیں رکھا؟ اور کیا یہ سب سچ بھی ہے کہ نہیں؟ سڑک سے گاڑی زمینوں کی طرف موڑتے ہوئے بھی میران کے ذہن میں بس انہی سوالوں کی بازگشت تھی۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ مہربانو بھی کوئی غلط قدم اٹھا سکتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ حویلی کے سخت ماحول سے اچھی طرح واقف تھی اور دوسرا وہ بھائی ہونے کی حیثیت سے اس کی نیچر کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور پھر اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ان ڈائریکٹ طریقے سے وہ کسی اور کے ذریعے ہاسٹل میں ہی موجود ایک دو لڑکیوں سے مہربانو کے آنے جانے کے معمولات، اس کی تفریح، مشاغل اور دوستوں کی کمپنی کے بارے میں بھی گاہے بگاہے معلومات رکھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ مطمئن تھا کہ اگر بابا سائیں نے اسے اتنی دور اکیلا بھیجا ہے تو وہ اب تک ان کی بات اور اس کی ذات پر کیے جانے والے اعتبار کا مان رکھے ہوئے ہے۔ اسی لیے وہ اوائل روز کے علاوہ اب کبھی بھی اس کی تعلیم اور وہاں رہائش پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ مگر اب جو یہ اتنی بڑی بات پتا چلی تو سب کے ساتھ وہ بھی بھونچکا رہ گیا تھا۔ بات سچ تھی جھوٹ تھی یا فسانہ، یہ تو پتا چلنا ابھی باقی تھا لیکن

لوگوں کے ہاتھ ایک موضوع تھا جو لگ چکا تھا اور یوں بھی لوگوں کے پاس محض وقت گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی موضوع ہونا چاہیے جس سے ان کا وقت گزرے اور بس۔ تصدیق یا تردید میں کسی کو دلچسپ نہیں ہوتی اور یہی بات میران شاہ کا خون کھولا رہی تھی کہ اب ٹکے ٹکے کے لوگوں کے منہ پر اس کی بہن کا نام ہوگا اور حویلی کی عزت اب یوں سر بازار موضوع گفتگو بنے گی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ فوراً سے بیشتر شاہ سائیں سے رابطہ کرے لیکن پھر اس خیال سے کہ نہ جانے اب تک ان کے علم میں یہ بات آ بھی چکی ہے کہ نہیں اس نے یہ خیال ملتوی کرتے ہوئے حویلی کے سامنے پہنچ کر ابھی ہارن کے لیے ارادہ کیا ہی تھا کہ گیٹ کھلا اور فوراً ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کرتے ہوئے چوکیدار نے برق رفتاری سے گیٹ کے دونوں پٹ وا کر دیے۔ ملکانی سائیں برآمدے میں ہی سنگ مرمر کے فرش پر اضطرابی کیفیت میں چہل قدمی کرتی نظر آئیں۔ میران شاہ نے تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کو جاتی چند سیڑھیاں عبور کیں اور ملازموں کی موجودگی کے باعث کچھ بھی کہنے کے بجائے انہیں اپنے ساتھ حویلی کے اندرونی خانے کی طرف لے آیا۔ پیلی پڑتی رنگت اور سرد ہوتے ہوئے ہاتھ، میران شاہ دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اس سارے معاملے سے آگاہ ہو چکی ہیں۔

''اماں سائیں! کوئی آیا تھا کیا یہاں؟'' وہ خود ٹی وی دیکھنے کی قطعاً شوقین نہیں تھیں جبھی میران کو حیرت اسی بات پر تھی کہ وہ کون تھا جو اس سے بھی پہلے آ کر انہیں یہ سب بات بتا گیا تھا۔

بغیر کچھ بھی بولے ملکانی سائیں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بمشکل تھوک نگلا۔

''رحمٰن شاہ آیا تھا پتر! ایہہ سب کی ہو رہیا ہے؟ مہربانو دا کش پتا چلیا؟'' میران شاہ کی صورت میں انہیں گویا ایک امید نظر آئی تھی۔ رحمٰن شاہ کے جانے کے بعد سے اب تک وہ تنہا اس ساری صورت حال کو برداشت کر کر کے نڈھال ہو گئی تھیں۔ جبھی ٹی وی اسکرین پر سے خبر تبدیل ہوئی تو انہیں لگا شاید اب وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو پائیں گی، جسم میں نہ تو طاقت و ہمت موجود تھی اور نہ ہی اتنا حوصلہ کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتیں۔ اسی پل انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہوتا محسوس ہوا اور قریب تھا کہ ہوش و حواس ان کا ساتھ چھوڑ دیتے اپنی تمام تر توانائی مجتمع کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اِدھر اُدھر ہاتھ رکھ کر سہارا لیتے ہوئے وہ بالآخر حویلی کے کشادہ اور طویل برآمدے میں آ کھڑی ہوئی تھیں جنہیں اب میران شاہ اپنے ساتھ لے کر اندر چلا آیا تھا۔

''رحمٰن شاہ کیا کرنے آیا تھا؟'' میران شاہ اس غیر متوقع نام پر چونکا۔

''ساڈی عزت دے جنازے اُتے فاتحہ پڑھن لئی آیا تھا۔''

''لیکن اسے یہ سب پتا کیسے چلا؟'' میران نے ایک نہایت احمقانہ سوال کیا تھا۔

''پتر! دنیا دے بندے بندے نوں ایس ٹی وی دے نال پتا لگ گیا، تو بتا میری دھی رانی دا کش پتا چلیا؟ ساری رات او ہاسٹل کیوں نئیں گئی تے لفٹ اندر کس طرح۔۔۔ ایہہ سب کی ہو رہیا اے میریا سوہنیا رباّ۔۔۔''

آنسو قطار در قطار آنکھوں سے نکل کر گالوں سے ہوتے ہوئے ان کے لباس میں جذب ہو رہے تھے۔

''فکر نہ کر اماں سائیں! اسے کچھ نہیں ہوا، ٹھیک ہے وہ۔''

''پر اے کتھے؟ تے اے سب کی ہویا پتر؟''

''فی الحال تو کچھ پتا نہیں ہے اماں سائیں! مہربانو کو بھی کتنی دفعہ فون کر چکا ہوں کوئی جواب ہی نہیں آ رہا۔ فون مسلسل بند ہے اور بابا سائیں۔۔۔''

''ہاں او تے فون کر کے پوچھو پتر! وہ بھی اس کے ہاسٹل ہی گئے ہیں۔'' وہ بے تابی سے بولیں تو میران حیران رہ گیا۔

''کیا مطلب ہے اماں سائیں! وہ کب گئے اور

کیسے؟ اور کیا انہیں ٹی وی پر آنے سے پہلے پتا چل گیا تھا کہ مہربانو رات بھر ہاسٹل نہیں پہنچی۔''

اس کے لیے یہ اطلاع نہایت چونکا دینے والی ہی تو تھی۔ ملکانی سائیں بھی بات کر کے لحہ بھر کے لیے گڑبڑا سی گئیں کہ شاہ سائیں کے منع کرنے کے باوجود میران کے سامنے ان کے منہ سے یہ بات نکل گئی ہے لیکن پھر خیال آیا کہ صرف میران کیا اب تو سبھی اس بارے میں جان چکے تھے اس لیے پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں اور تب انہوں نے میران کو مہربانو کی دوست کی فون کال کے متعلق سب کچھ من و عن کہہ سنا دیا۔

''اتنی بڑی بات ہوگئی اور آپ نے اور بابا سائیں نے مجھ سے چھپائے رکھی، اتنی دور وہ اکیلے چلے گئے کیا بیٹا ہونے کے ناتے اور مہربانو کا بھائی ہونے کی وجہ سے یہ میرا فرض نہیں تھا کہ بابا سائیں کو اس پریشانی میں تنہا نہ جانے دیتا۔۔۔ کیا میں اتنا ہی برا ہوں اماں سائیں! کہ آپ لوگ مجھے ہر معاملے سے الگ ہی رکھتے ہیں۔''

''نہ پتر! ایہہ گل نئیں، میں نے تے رات نوں کتنی دفعہ فون کیا پر کوئی جواب ہی نہیں آیا۔''

اور ملکانی سائیں کی بات پر تب میران کو یاد آیا تھا کہ واقعی فون تو کافی دیر سے بج رہا تھا لیکن اس نے ہی اٹھانے کی زحمت نہیں کی بلکہ دوبارہ فون نہ کرنے کا بھی کہہ دیا اور ساتھ ہی بند بھی کر دیا تاکہ نہ ہی بیل کی آواز آئے اور نہ ہی اس کی تفریح میں کوئی مخل ہو۔

''اللہ جاندا اے، میں تے آج تک کسی دے بہن یا بیٹی دا برا نئیں سوچیا، شاہ سائیں دا وی مزاج جیسا وی ہے پر ہمیشہ دوسریاں دی عورتاں نوں عزت دی نظر نال ای ویکھیا، فیر میری بچی تے بھولی جئی مہربانو نال اے کی ہویا۔'' وہ مسلسل روئے جا رہی تھیں اور دھیمی آواز میں میران سے مخاطب ہو کر اپنے اندر کا بوجھ بھی ہلکا کر رہی تھیں۔

''مینوں خود سے بڑھ کر اپنی دھی تے یقین اے او کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکدی، اوہدے قدم نئیں لڑکھڑا سکدے، او کدی وی کوئی ایسا کم نئیں کرے گی جس دے نال شاہ سائیں دا سر نیچے ہو جائے۔ اے ضرور کسے دی بددعا لگی ہے، نظر لگی ہے یا کسے ٹوٹے ہوئے دل دی ہاہ لگ گئی ہے۔''

سونی خراماں خراماں چلتی ہوئی داخل ہوئی تھی اور ملکانی کا موڈ دیکھ کر صوفے پر چڑھنے کے بجائے وہیں ان کے قدموں کے قریب ست سی ہو کر بیٹھ گئی۔ ملکانی سائیں زار و قطار آنسو بہا رہی تھیں اور ان کی باتوں پر میران کے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا تھا۔ یہ سچ تھا کہ مہربانو بے حد سیدھے سادے اور صاف ستھرے خیالات کی مالک اور اپنے اصولوں کی پابند لڑکی تھی۔ شاہ سائیں اور ملکانی سائیں بھی بے حد خدا ترس مشہور تھے۔ ملکانی کے انداز میں ان کے میکے کی طرف سے وراثت میں ملنے والا چوہدراہٹ والا رویہ تو ضرور تھا مگر ان کے خیالات بہت حد تک اپنے بھائیوں سے مختلف تھے۔ ان سب باتوں کے بعد رہ جاتی تھی میران شاہ کی اپنی ذات۔۔۔ اور وہ نہ صرف رویہ میں اپنے ننھیال والوں کی تقلید کرتا تھا بلکہ اس کے مشاغل اور دلچسپیاں بھی اکثر اوقات انہی کا رنگ لیے ہوئے نظر آتیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو عورت کو ہمیشہ اپنے سے نچلے درجے پر ہی دیکھتے ہیں۔ ملکانی سائیں اعمال کے آئینے میں باری باری سب کی ذات کھنگال رہی تھیں اور تب میران کو احساس ہوا کہ چھوٹی موٹی حرکتیں تو ایک طرف مگر اس نے جان بوجھ کر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اگر کسی لڑکی کی زندگی برباد کی تھی تو وہ کوئی اور نہیں بلکہ ندی ہی تھی۔ جسے یونیورسٹی میں تو ہر ممکن طریقے سے تنگ کیا تھا مگر اب اسی کے ساتھ شادی کر کے وہ ساری زندگی اگر اپنی حاکمیت کے زیر اثر رکھنا چاہتا ہے تو صرف اس لیے کہ اس میں میران کی بات سے اختلاف کرنے اور سب کے سامنے اسے اس کی اوقات دکھانے کی جرأت بھی تھی اور ہمت بھی اور اس کی یہ ہمت ہی تھی کہ میران نے اس کا غرور توڑنا چاہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہمیشہ شاہ زین کو اہمیت دے

کر جو طمانچہ وہ میران کے منہ پر مارتی تھی اس نے وہ تمام قرض سود کے ساتھ اتارنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی مقصد کے لیے پہلے اسے شہر بھر میں رسوا کیا اور پھر بڑی چالاکی سے شادی تک کرنے کا ارادہ کر لیا۔

مگر یہ کیا۔۔۔؟ اب ملکانی سائیں کی باتیں اور آنسو اسے یہ احساس دلانے پر تلے ہوئے تھے کہ اگر آج مہربانو اور سارے گھر کے افراد کی سر عام رسوائی ہوئی ہے تو اس کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ صرف اور صرف میران خود ہے۔ یہ اسی کا مکافات عمل ہے۔ جس کی وجہ سے آج سارے حویلی کے افراد کو یہ دن دیکھنا پڑے۔ غرور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اعمال میں سے ایک ہے اور یہ کسی بھی انسان کو زیبا نہیں کہ وہ کسی بھی ایسی چیز پر غرور کرے جس پر اس کا کوئی اختیار نہیں اور تبھی تو عین اسی لمحے جب میران، شاہ زین کے سامنے اپنے تئیں اسے رسوا کر کے خود غرور اور تکبر کی سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا تو ٹی وی اسکرین پر نوبیج کے ساتھ چلتی خبر نے اس کے قدموں تلے سے زمین سرکا دی تھی۔

اس نے ندی کو صرف اخبارات کے ذریعے اسکینڈلائز کیا تھا لیکن چونکہ سود ہمیشہ اصل سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس کی اپنی بہن کا معاملہ اخبارات تک بعد میں پہنچا لیکن ٹی وی اسکرین کے ذریعے گھر گھر میں پہلے پہنچ گیا۔ یعنی اللہ کی لاٹھی حرکت میں آچکی تھی۔ عزت، غیرت، غرور اور تکبر اکڑ بھی کچھ تو پل بھر میں مٹی میں جا ملا تھا۔ دوسروں کی طرف ایک انگلی اٹھانے والے میران کی طرف باقی چاروں انگلیاں اٹھ گئی تھیں اور یوں اٹھی تھیں کہ اس کی اکڑی ہوئی گردن جھک گئی تھی۔

''شاہ سائیں نوں فون کر کے پتا کر پتر!'' ملکانی سائیں نے بوجھل آنکھوں سے اسے یوں کسی سوچ بچار میں گم دیکھا تو بولیں اور ان کی آواز نے میران کو چونکا ہی تو دیا تھا۔ بڑی خاموشی سے کچھ بھی بولے بغیر جیب سے موبائل نکالا اور شاہ سائیں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت زیادہ بیلز جانے کے بعد دوسری طرف سے فون ریسیو نہیں کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ دونوں مزید پریشان ہو گئے۔ کوئی اور ایسا ذریعہ بھی نہیں سجھائی دے رہا تھا جس سے وہ ان کے متعلق کوئی معلومات حاصل کر سکتے۔ اسی دوران میران کے فون پر بیل ہوئی۔

''سائیں! ابھی ٹی وی میں ایک خبر چلتے دیکھی ہے، پوچھنا یہ تھا کہ اگر آپ نے اس خبر کی کوئی تردید وغیرہ دینی ہو یا کوئی وضاحت۔۔۔''

یہ ایک شام کے اخبار کے ایڈیٹر کا فون تھا جو بالواسطہ طور پر اس سے خبر لگانے یا نہ لگانے کے متعلق اجازت چاہتا تھا اور یہ بھی باور کروانا چاہتا تھا کہ خبر ان تک بھی پہنچ چکی ہے مگر وہ بہ وجہ ان سے قرابت داری کے یہ خبر چھاپنے سے گریز کر رہے ہیں تبھی براہ راست بات کرنے کے لیے یہ انداز اپنایا گیا تھا۔

''لگتا ہے اخبار چھاپنے کے لیے یا تو تمہارے پاس خبریں کم پڑ گئی ہیں یا روپے۔۔۔'' میران نے بڑے کھردرے انداز میں جواب دیا۔ ملکانی سائیں مکمل دھیان سے اس کی طرف متوجہ تھیں۔

''نہیں سائیں! روپے تو ابھی وہی چل رہے ہیں جو آپ نے کچھ عرصہ پہلے تصویروں کو کاٹ چھانٹ کر چھپوانے پر دیے تھے اور ہم تو ایسے وفادار ہیں کہ ابھی تک شاہ سائیں کو بھی نہیں بتایا۔'' اس کے لہجے سے لالچ کی بو آ رہی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جسے میران شاہ نے ندی اور شاہ زین کی تصویروں کی ایڈیٹنگ کر کے اپنے اخبار میں چھاپنے اور دوسرے اخبارات تک بھی پہنچانے کا ٹاسک دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی وفاداری اور راز فاش نہ کرنے کو جتا رہا تھا مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں میران کو قطعاً اس کی ضرورت نہیں تھی۔

''چلو ٹھیک ہے پھر اپنے کام سے کام رکھو، میں ملتا ہوں تمہیں کسی وقت۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں بات کرتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔ ملکانی سائیں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ مگر وہ اس وقت خود احتسابی کے عمل سے گزرتے ہوئے

اپنے آپ سے بھی نظریں چرانے پر مجبور تھا سو انہیں بھلا کیا جواب دیتا۔

☆☆☆

ناصر بھائی اور ثروت آپا کے جانے کے بعد اماں ایک عجیب سے سکون کی کیفیت میں تھیں۔ ماں سے بڑھ کر اس پوری دنیا میں کسی کے لیے کوئی رشتہ اہم نہیں ہوتا۔ ہاں ایک ایسا مرکز ہوتا ہے جہاں پر ساری اولاد جمع ہوتی اور اپنے دکھ سکھ بیان کرتی ہے۔ ماں ہی اولاد کو اکٹھا رکھتی ہے اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبتیں بڑھانے کی کوشش میں لگی رہتی ہے اور آج انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ شاہ زین نے اپنا خون دے کر امرِ الٰہی سے کسی اور کی ماں کی جان بچالی ہے تو احساسِ شکر سے اب تک وہ جیسے ایک سرور کے حصار میں تھیں اور شکر گزار تھیں کہ ایسے موقع پر جب شاہ زین کو پتا چلا کہ اس کا خون کسی کی جان بچانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے تو اس نے پل بھر دیر نہ لگائی۔

”کیا سوچ رہی ہیں اماں؟“ ثمینہ چائے کے برتن دھو کر کچن سے آئی تو انہیں یوں مسکراتے لبوں کے ساتھ بڑی خوشی سے تسبیح کے دانے گراتے دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

”سوچنا کیا ہے بیٹا! میں تو بس شکر کر رہی ہوں اس ذاتِ پاک کا جس نے مجھے شاہ زین سا بیٹا عطا کیا اور دعا گو ہوں کہ اللہ ہر ماں کو فرماں بردار اولاد سے نوازے۔“

”سچ اماں! مجھے بھی جب پتا چلا نا کہ بھائی نے انہیں خون دیا تو یقین کریں میرا بھی سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا۔“ ثمینہ کا لہجہ اور انداز دونوں ہی پر جوش تھے۔

”جب بھی ہم خدا کی رحمت سے کوئی ایسا عمل کر گزریں کہ جس سے دنیا کی طرف سے داد و تحسین وصول ہونے لگے، چاروں اطراف سے تعریفی کلمات ہمارے کانوں میں پڑنے لگیں اور اس بات کا بھی احساس ہونے لگے کہ دنیا ہمیں معتبر گرداننے لگی ہے تو سر فخر سے اونچا کرنے کے بجائے شکر کرتے ہوئے عاجزی سے جھکا لو کہ اس پاک ذات نے ایک مرتبہ پھر ہمارے عیبوں پر پردہ ڈالتے ہوئے دنیا کے سامنے صرف ہماری خوبیاں ہی ظاہر کی ہیں۔“

”بالکل اماں! بات تو آپ کی بھی ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”اور ویسے بھی اللہ تو اجر دے گا ہی لیکن خوشی ہوتی ہے نا کہ جن کے لیے بندہ کوئی اچھا کام کرے وہ بھی ایسی بات کو سراہیں۔ جیسے یہ لوگ ابھی صرف بھائی کا تھینکس کرنے گھر پر آئے۔“

”ہاں بیٹا! اس میں تو کوئی شک نہیں، ویسے بھی ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنا بھی ہم پر ایک اخلاقی فرض ہوتا ہے نا، لیکن ایک بات شاہ زین کی مجھے اچھی نہیں لگی۔“ بات کے دوران وقفہ کرتے ہوئے انہوں نے کمر کے پیچھے کشن رکھا۔

”یہ تو چلو بہت اچھا کیا کہ اس نے کسی کی جان بچاتے ہوئے خون دیا لیکن ایسا بھی کیا کہ گھر میں مجھے بتایا نہ تمہیں اور بس وہی روٹین میں دفتر بھی چلا گیا۔ ایسی لاپروائی کرنی چاہیے کیا؟“

”میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہی ہوں اماں! اگر بھائی بتا دیتے تو کم از کم آج کے دن تو میں انہیں ہرگز آفس نہ جانے دیتی۔ آلینے دیں اب انہیں پھر دیکھیے گا میں انہیں کیسا ڈانٹوں گی۔“ اماں کی بات پہ ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ثمینہ نے بھی اپنا غصہ ظاہر کرنا بہت ضروری سمجھا تھا اور اس کی ڈانٹنے والی بات پر تو اماں بھی بے اختیار مسکرا دیں۔

”ویسے بھی جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی بے شک ڈانٹ ڈپٹ لیا کرو لیکن پھر بہو کے سامنے میں تمہیں شاہ زین کو کچھ بھی نہیں کہنے دوں گی۔“

”اماں ایک بات بتاؤں آپ کو۔“ ان کے شگفتہ سے مذاق پر وہ ان کے پاس ہی آبیٹھی تھی اور اب سہیلیوں کی طرح کا انداز اپنائے ہوئے تھی۔ اماں نے بھی چند لمحے تسبیح کے دانے روک کر استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے ندی کو دیکھا تھا اور بھائی کی بھی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔“ اپنے تئیں اس نے انکشاف کیا اور واقعی اس کی بات پر اماں کے چہرے پر حیرت ابھر آئی تھی۔

”کیا ملا تھا وہ اس سے؟ اور تم نے کیسے دیکھا؟“

”جب آپ ہاسپٹل میں تھیں اور بھائی مجھے گھر سے لے کر آئے تھے نا تب ملاقات ہوئی تھی میری۔ وہ بھی اپنی والدہ کو لے کر ہاسپٹل آئی تھیں لیکن اماں سچ بتاؤں تو میں نے اتنی معصومیت آج تک کسی کے چہرے پر نہیں دیکھی۔ خوب صورتی کی بات تو ایک طرف اماں! لیکن پتا نہیں ان میں ایسا کیا تھا کہ آپ یقین کریں خود میرا دل چاہ رہا تھا کہ بس ان کے چہرے سے نظر نہ ہٹے۔ وہ بولتی جائیں اور میں چپ چاپ بیٹھی سنتی جاؤں۔“

”ہوں۔۔۔“ اماں نے ایک گہری سانس لی۔

”وہ اور میں باتیں کر رہے تھے کہ اتفاق سے بھائی بھی وہاں آگئے۔ روکھے پھیکے اور اکھڑے ہوئے لہجے میں تھوڑی سی بات کی اور مجھے بھی ساتھ لے کر آپ کے روم میں آگئے حالانکہ میرا پتا نہیں کیوں دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ ان کو یوں اکیلا چھوڑوں۔“ ثمینہ ایک جذب کے عالم میں تصوراتی آنکھ سے وہ مناظر دوہراتے ہوئے جو بولنا شروع ہوئی تو بولتی ہی گئی۔

”اماں! وہ بہت پریشان تھیں، ان کی امی بھی اسی ہاسپٹل میں تھیں نا، تو جیسے ہی میں نے ان سے بات کی وہ مجھ سے یوں باتیں کرنے لگیں جیسے میری اور ان کی بہت پہلے کی جان پہچان ہو۔“

”کاش کہ تمہاری اس سے ملاقات کسی خوش گوار ماحول میں شاہ زین کے ذریعے اس کی نسبت سے ہوئی ہوتی تو آج صورت حال قدرے مختلف ہوتی لیکن ہمیشہ وہی سب کچھ تو نہیں ہوتا نا جو ہم سوچتے ہیں۔“

”اماں! ساری باتیں ٹھیک، لیکن بھائی کو دیکھ کر جس بے تابی سے وہ ایک دم ان کی طرف لپکی تھیں اور ان کی آنکھوں میں بھائی کے لیے جو جذبات میں نے دیکھے تھے، میں اب تک ان ہی کی وجہ سے شدید ذہنی الجھن کا شکار ہوں کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ بھائی کے سامنے آنے پر ندی کی آنکھوں میں اترتے جگنو میری غلط فہمی ہو سکتے ہیں۔“

ثمینہ نے اماں کے سامنے ساری بات تفصیلاً بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات بھی پیش کر دیے تھے اور اماں اس کی ایک ایک بات کو بہت توجہ سے سن رہی تھیں۔

”اگر انہوں نے میران کے ساتھ ہی شادی کرنی ہے یا ہونے والی ہے تو بھائی کو دیکھ کے ان کے انداز میں اتنی وارفتگی کیوں تھی؟ مجھے لگا جیسے وہ بھائی سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہیں مگر بھائی نے تو کوئی لفٹ ہی نہیں کروائی۔“

”شادی کی بات تو خود زمین نے بتائی تھی جو یقیناً جھوٹ تو نہیں ہو سکتی پھر ندی کا رویہ۔۔۔“ اماں ثمینہ کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کسی سوچ میں پڑ گئی تھیں اور پھر ایک دم ہی جیسے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”کہیں شاہ زین نے ندی ہی کی والدہ کو تو خون نہیں دیا۔“ اماں کی بات پر ثمینہ چونکی۔

”ابھی جو دونوں بہن بھائی آئے تھے انہوں نے اپنا نام ثروت اور ناصر ہی بتایا تھا نا؟“ ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے اماں نے تصدیق چاہی اور ثمینہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔

”ندی کے بڑے بھائی اور بہن کا نام بھی تو یہی تھا نا؟ شاہ زین نے جب ایک دفعہ اس واقعے کے بعد وہ لوگ شاہ زین سے ہوٹل میں ملے تھے۔“

ثمینہ نے سوچنے کی کوشش تو کی مگر بے سود، اس کے ذہن میں شاید وہ نام محفوظ نہیں رہ سکے تھے۔

”تم شاید بھول گئی ہو لیکن مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے یہی نام تھے۔“ اماں کے لہجے میں اپنی بات پر مکمل اعتماد ظاہر ہو رہا تھا۔

”اگر ایسا ہے پھر تو ہم انہیں فون کر کے ان کی

امی کی خیریت معلوم کرنے کے بہانے ساری باتوں کی تصدیق کرسکتے ہیں نا۔" ثمینہ کا جوش دیدنی تھا۔ لگتا تھا اندھیرے راستوں میں چلتے چلتے اچانک روشنی کا سراغ مل گیا ہو اور اب جلد از جلد وہ اس روشنی تک پہنچنا چاہتی ہو۔

اماں نے اس کے چہرے پر پھوٹتی روشنی کی کرنوں کو اپنی آنکھوں میں سموتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور بغیر کچھ کہے تسبیح کے دانوں کی طرف متوجہ ہوگئیں کہ وہ شاہ زین کے مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتی تھیں۔

☆☆☆

مہربانو کے ہاتھ سے موبائل فون چھوٹ کر نیچے گرا تو اکمل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اس کا ساکت چہرہ اور پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ سامنے ہی موجود گاڑیوں کی قطار میں بیٹھے شاہ سائیں سپاٹ چہرے اور سرد تاثرات سے مہربانو ہی کو دیکھ رہے تھے۔ اکمل سے نظریں ملی ہی تھیں کہ سگنل کی لائٹ سبز ہوئی اور گاڑیاں آہستہ آہستہ ایک مرتبہ پھر اپنی اپنی منزل کی طرف رینگنے لگیں۔ شاہ سائیں نے اشارے سے اکمل کو گاڑی فالو کرنے کا کہہ کر اپنی گاڑی دھیرے سے آہستہ بڑھائی۔ اکمل نے دانستہ طور پر گاڑی کی رفتار معمول سے کم رکھ کر گاڑی اسی قطار میں داخل کردی جس میں شاہ سائیں کی گاڑی موجود تھی۔ یوں اب وہ اپنی گاڑی میں شاہ سائیں کے بالکل عقب میں موجود تھے۔

مہربانو کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی گود میں دونوں ہاتھ رکھے اسی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ قسمت اب اس کے حق میں کیا فیصلہ سنانے والی ہے؟ اور حویلی کے مکین اس کی بات کا اعتبار کرتے ہیں کہ نہیں؟ اور اگر ان لوگوں نے اس کا اعتبار نہ کیا تو اس کی اگلی منزل کیا ہوگی؟ خدشات کا ایک بے معنی سا ہجوم تھا جو دھیرے دھیرے اس کے ذہن کو اپنے قبضے میں لیتا جارہا تھا۔

شاہ سائیں کی گاڑی سیدھی جارہی تھی اور انہیں بہرحال ان کی تقلید کرنی تھی۔ اکمل کی بلال سے بات ہوچکی تھی اور اس نے اسے معاملہ سمجھا کر کچھ دیر تک دوبارہ فون کرنے کا کہا تھا۔ تھوڑی دیر کی مسافت کے بعد شاہ سائیں کی گاڑی بائیں طرف مڑ کر ایک ریسٹورنٹ کے سامنے جارکی اور گاڑی سے اترتے ہوئے یہ دیکھ کر مہربانو کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان کے ساتھ ہی گاڑی سے میری اور کنول بھی نکل کر اب اس کی طرف حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھیں اور یقیناً یہ شاہ سائیں کی ذات کا رعب ہی تھا کہ وہ دونوں یوں چپ چاپ ہاتھ باندھے کھڑی تھیں ورنہ دل تو ان کا چاہ رہا تھا کہ بس کسی طور فوراً جا کر مہربانو کے گلے لگ جاتی اور اس سے پوچھتیں کہ آخر یہ سب معاملہ کیا تھا؟ کیسے ہوا اور اب وہ کہاں جارہی تھی؟ لیکن ظاہر ہے کہ ماحول ایسا نہ تھا کہ وہ یہ سب کر پاتیں لہٰذا خاموشی سے چپ چاپ شاہ سائیں کے ساتھ ہی ہاتھ باندھے کھڑی رہیں۔ اکمل نے قریب پہنچ کر شاہ سائیں سے مصافحہ کیا ان دونوں کو سر کے اشارے سے سلام کیا اور شاہ سائیں کے دائیں طرف جا کھڑا ہوا۔ اسی دوران مہربانو چپ چاپ گم سم سی ان تک پہنچی اور سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ شاہ سائیں نے حسب معمول اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور سب ریسٹورنٹ کے اندر تک قدم بڑھانے لگے۔

نیم تاریکی اور ہلکے میوزک کے پھیلے ہوئے فسوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے شاہ سائیں نے ریسپشن سے اپنے کمرے کی چابی حاصل کی اور نہایت خاموشی سے پہلی منزل تک پہنچنے کے لیے لفٹ کے بجائے سیڑھیوں کا استعمال کرنے کے بعد آہستگی سے کمرہ کھول کر اندر داخل ہوئے، لائٹس آن کیں اور صوفے پر بیٹھنے کے بجائے اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ رکھی نشست سنبھالی اور ان سب کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگے۔

مہربانو اور اکمل کے لیے گاڑی میں ان کے دیکھنے سے لے کر اب تک کا وقت انتہائی مشکل تھا۔

ایک ایک لمحہ اتنا طویل لگنے لگا تھا کہ گزرنے میں ہی نہ آتا۔ اسی طرح اب بھی اتنی دیر سے کمرے میں راج کرتی خاموشی ہی سب سے زیادہ تکلیف کا باعث بن رہی تھی۔ مہربانو سر جھکا کر بیٹھی اس انتظار میں تھی کہ وہ کچھ پوچھیں اور وہ بتائے جبکہ شاہ سائیں اس وقت ایک عجیب قسم کی اذیت سے اس لیے بھی دوچار تھے کہ میراں نے ان کا فون ریسیو نہ کرنے پر میسج کے ذریعے ٹی وی پر نظر آنے والی تمام صورت حال سے آگاہ کردیا تھا اور انہیں جلد از جلد رابطہ کرنے کا بھی کہا تھا۔ اکمل کی خاموشی کی ایک وجہ تو ان کے مزاج سے ناشناسائی تھی اور دوسرا یہ معاملہ چونکہ بہت پیچیدہ اور حساس نوعیت کا تھا اس لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ منہ سے نکلی کوئی ذرا سی بات بھی بات کو بڑھانے کا باعث بنے اور آخر مہربانو اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم لے کر شاہ سائیں کے قدموں میں جا بیٹھی۔

"مجھے معاف کردیں بابا سائیں! میری وجہ سے آپ اتنی ٹینشن میں ہیں لیکن یقین کریں اس سب میں میری کوئی غلطی نہیں تھی۔"

شاہ سائیں نے یوں اس کے کارپٹ پر بیٹھ جانے سے ایک دم اپنے پاؤں اس انداز میں پیچھے کیے گویا کوئی برقی رو ان کے پاؤں کو چھو کر گزری ہو۔

"یہ تم کیا کررہی ہو؟ اندازہ بھی ہے تمہیں؟" ڈپٹنے کے انداز میں انہوں نے مہربانو کو اس کے دونوں شانوں سے پکڑ کر دوبارہ بیڈ پر بٹھاتے ہوئے سرزنش کی۔

"بابا سائیں! وہاں پر وہ میڈیا والے جو کچھ کہہ رہے تھے نا سب جھوٹ ہے، میں پوری رات اگر لفٹ میں بند رہی تو وہ صرف حادثاتی طور پر، ورنہ یہ سب دانستہ نہیں ہوا۔۔۔ اگر آپ چاہیں تو میں قسم اٹھانے کو بھی تیار ہوں، لیکن خدارا آپ میری بات کا یقین کریں کہ ایسا کچھ غلط نہیں ہوا بابا سائیں! کہ جس کی وجہ سے آپ کو کسی کے بھی سامنے صفائیاں دینی پڑیں یا آپ کا سر کسی کے سامنے جھکے۔ میں بالکل وہی مہربانو ہوں جس کے لیے آپ نے سب کی مخالفت مول لی تھی اور یہ اکمل۔۔۔" تھوک نگلتے ہوئے اس نے اکمل کو دیکھا جو دل ہی دل میں اس کے لیے بے حد دعاگو تھا۔ اسی طرح چادر میں خود کو لپٹائے ہوئے وہ شاہ سائیں کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کرتے ہوئے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں میری اور کنول کے ساتھ شاپنگ مال پر جانے سے لے کر اب تک کا واقعہ بتانے کے بعد اکمل کا تعارف کروا رہی تھی۔

"یہ بہت اچھے انسان ہیں بابا سائیں! ساری رات لفٹ میں یہ بھی میرے ساتھ ہی بند ہوگئے تھے لیکن انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے میں کسی کے بھی سامنے شرمندہ ہوتی اور آپ خود بھی سوچیں نا بابا سائیں! اگر ایسا ہوتا تو کیا میں ان کے ساتھ گاڑی میں یوں بیٹھی ہوتی؟" اکمل کے کردار کی بلندی بیان کرتے ہوئے وہ ان ڈائریکٹ طریقے سے اپنی ذات اور وجود کی ہی صفائیاں دے رہی تھی۔ ڈھکے چھپے انداز میں وہ کیا سمجھانا چاہ رہی تھی۔ یہ کمرے میں موجود بھی لوگ بہت اچھی طرح سے جان گئے تھے۔

"آپ کو اللہ کا واسطہ ہے بابا سائیں! کہ میری باتوں کی سچائی پر یقین کریں۔" ان کی اس قدر طویل خاموشی مہربانو کے کرب میں اضافہ کرتی ہوئی اب اعصاب شکن ثابت ہورہی تھی۔

"کیا اب میری بیٹی کو اپنے بابا سائیں کے سامنے اپنی ہی ذات اور کردار کی صفائیاں دینی پڑیں گی۔" شاہ سائیں آخر بول ہی پڑے تھے اور یوں کہ مکمل طور پر حیران کرگئے۔

"دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جو مجھ سے بڑھ کر میری بیٹی کو جانتا ہوگا۔ پہلے تمہیں سب کی مخالفت کے باوجود اگر یہاں بھیجا تھا تو صرف اسی وجہ سے کہ مجھے علم تھا کہ میری بیٹی کبھی بھی کوئی ایسا کام نہیں کرے گی جس سے اس کے بابا سائیں کا سر کسی کے بھی سامنے جھکے اور میں یہ بات بڑے فخر اور اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ جیسے میں کل سر اٹھا کر چلتا تھا۔ آج بھی میں اسی انداز میں دنیا والوں کے سامنے سر اٹھا کر

چل بھی سکتا ہوں اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہر قسم کی بات کا منہ توڑ جواب بھی دے سکتا ہوں۔"

شاہ سائیں کے مضبوط لہجے اور اس درجہ اعتماد پر جہاں میری، کنول اور اکمل نے سکھ کا سانس لیا تھا وہیں مہربانو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش میں ان کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ شاہ سائیں سمیت کسی نے بھی اسے چپ نہیں کروایا تھا اور ان کا خیال تھا کہ ایک مرتبہ اسے کھل کر رو لینے دیا جائے تاکہ کل سے اعصاب پر موجود خدشات کا کہر ڈھل سکے۔

شاہ سائیں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سہلا رہے تھے، حوصلہ دے رہے تھے اور اپنے اس عمل سے باور کروا رہے تھے کہ ان کے لیے صرف اور صرف مہربانو کی بات کی اہمیت ہے۔ دنیا والے کیا کہہ رہے ہیں، کیا سوچتے ہیں اس سے ان کو کوئی غرض نہیں ہے۔ ادھر اکمل نے بھی ان کے اس ردِعمل پر سکون کا سانس لیا تھا کیونکہ یہ سب بالکل اس کی توقعات کے برعکس تھا۔ جس طرح کے خاندان سے ان کا تعلق تھا وہاں ایسا بولڈ اسٹیپ لینا یقیناً قابلِ تحسین تھا۔ لیکن مسئلہ اب بھی اس کے نزدیک پوری طرح حل اس لیے نہیں ہوا تھا کہ ندی کے معاملے میں بھی اس کے امی اور بابا نے اس سے کوئی بھی صفائی نہیں مانگی تھی۔ اس کی باتوں پر اور اس کے کردار پر اپنے مکمل اعتبار کا اظہار کیا تھا لیکن ہاں اتنا ضرور تھا کہ شاید وہ شاہ سائیں کی طرح مضبوط حیثیت نہ رکھتے تھے۔ گھر پر ناصر بھائی کا عمل دخل اور حیثیت ایسی تھی کہ انہوں نے مخالف اسٹینڈ لیا تو وہ اندر ہی اندر کڑھنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ اب مہربانو کے معاملے میں اگر شاہ سائیں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا تو میران کا ردِعمل ابھی باقی تھا۔

کافی دیر رونے سے مہربانو کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کنول نے روم فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکالی اور ٹیبل سے گلاس اٹھا کر اس میں پانی ڈالا اور مہربانو کو شاہ سائیں سے الگ کر کے تھوڑا سا پانی پلا کر اس کی ہتھیلیاں سہلانے لگی۔ مہربانو بھی پانی پینے کے بعد اب سنبھل چکی تھی۔

"بابا! میں اگر ساری زندگی بھی کوشش کروں تو آپ کے اس عمل اور اعتماد کا بدلہ نہیں اتار پاؤں گی۔" مہربانو ایک بار پھر بولی۔

"یہ کوئی احسان نہیں ہے بیٹا! یہ تمہارا اپنا قائم کردہ اعتماد ہے۔ میں نے تو بس اس کی تصدیق کی ہے تمہیں میرے ہوتے کسی بھی قسم کی کوئی اِن سیکورٹی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔"

"بھائی۔۔۔؟" وہ کچھ کہتے کہتے جھجک کر رک گئی تھی۔

"تمہارے سر پر ابھی میں زندہ ہوں۔ اس لیے تمہیں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود دیکھ لوں گا سب کو۔" شاہ سائیں نے اس کے سر سے گویا منوں وزن چند ہی لمحوں میں اتار پھینکا تھا۔ وہ خود کو بالکل ہلکی پھلکی محسوس کرنے لگی تھی اور اللہ کی شکر گزار تھی کہ اس نے اتنے پیارے بابا سائیں کو اس کے والد کے طور پر منتخب کیا۔

"تم تینوں دوستیں مل کر تھوڑی دیر ریسٹ کرو، گپ شپ کرو، میں ذرا اکمل کے ساتھ باہر لابی میں بیٹھ رہا ہوں۔"

اکمل اور شاہ سائیں اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اکمل نے نظر بھر کر مہربانو کو دیکھا جو مسکراتے ہوئے شاہ سائیں کی بات سن کر گردن ہلا رہی تھی اور اچانک اکمل سے نظریں ملنے پر گڑبڑا کر ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"اور ہاں انٹر کام سے اپنے اور اپنی دوستوں کے لیے کچھ کھانے کو منگوالو اور فریش ہو جاؤ۔ ہم وہیں کچھ کھا لیتے ہیں۔" مہربانو کو ہدایت دیتے ہوئے وہ اکمل سے مخاطب ہوئے۔

"جی بالکل۔" اکمل نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور وہ دونوں کمرے سے نکل کر لابی کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

میرے ہم سفر ہیں تیری نظر میرے جذبۂ دل کی شدتیں
میرے خواب میری بصارتیں میری دھڑکنیں میری چاہتیں
وہ جو ساتھ چلنے کا خواب تھا، کہیں رہ گیا کہیں کھو گیا
کہیں کھو گیا میرا ہمسفر رہیں پاس اب نہ وہ چاہتیں

ندی کے ساتھ جس طرح شاہ زین کی ملاقات ہوئی تھی اس طرح اس سے سامنا ہونا تو شاہ زین کے کہیں وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ندی سے کبھی اس کی یوں اچانک ہی سرِ راہ ملاقات ہو جائے گی۔ ملگجے کپڑے جو شکنوں سے بھرپور تھے ان پر اوڑھی گئی بڑی سی سیاہ چادر جو اس کے ایڑیوں کو چھو رہی تھی۔ شفاف آنکھوں کا ہر عکس دھندلا کر ماند پڑ چکا تھا۔ مگر پھر بھی اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی شاہ زین کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر بے تابی سے اس کی طرف لپکنا اور بڑی امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنا شاہ زین کو اب تک پریشان کیے ہوئے تھا۔

وہ جو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ اب اگر اس کی کبھی ندی سے ملاقات ہوئی بھی تو وہ اپنے مخصوص شوخ انداز میں اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے بتائے گی کہ یونیورسٹی ٹائم میں جو کچھ بھی ہوا وہ سب ایک مذاق تھا جو بڑھتے بڑھتے اتنی سنجیدہ صورت حال کا باعث بنا۔ اس کے بعد وہ مزے لے کر اسے اپنی اور میران کی شادی کے قصے سنا کر دوبارہ ملنے کا کہتے ہوئے واپس لوٹ جائے گی اور شاہ زین ہر وہ ذریعہ مقفل کر دے گا جس سے کبھی بھی کہیں بھی دوبارہ ندی سے ملنے کا کوئی بھی امکان نظر آتا ہو۔ مگر یہ سب جو ہوا، وہ اتنا غیر متوقع تھا کہ اب تک شاہ زین اپنی آنکھوں کی پتلیوں پر ندی کا عکس اسی طرح منجمد محسوس کر رہا تھا گویا وہ منظر اس کی زندگی کا آخری منظر ہو۔ تب سے اب تک وہ اسی منظر کے سحر میں گرفتار تھا۔ رات کو خون دینے کے بعد اصولاً اسے آج آفس سے چھٹی کر کے گھر پر ریسٹ کر لینا چاہیے تھا لیکن آج بھی اگر وہ مقررہ وقت پر آفس آ پہنچا تھا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بہت دیر اس معاملے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ سو چپ چاپ صبح اٹھ کر معمول کا ناشتا کیا اور آفس آ پہنچا۔

وہ خود کو مصروف کر لینا چاہتا تھا۔ اتنا مصروف کہ اسے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہ ملے۔ وہ یادیں جن سے دل کو سکون اور قرار ملنے کے بجائے افسردگی ہونے لگے۔ ایسی یادوں کو بھلا دینا ہی بہتر فعل ہے اور کسی بھی غم، مصیبت، فکر، پریشانی سے بچنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ خود کو مصروف کر لیا جائے۔ سو شاہ زین بھی یہی طریقہ اپنائے ہوئے تھا۔ آج کا دن عموماً اس نے پورے ہفتے کی کارکردگی کا جائزہ لینے، فائلز اور ڈاکومنٹس چیک کر کے انہیں سیٹ کر کے رکھنے، اپنی نگرانی میں کام کرنے والی مشینوں اور ان کے پرزوں کے بارے میں آگاہی لینے اور چھوٹی موٹی خرابی کو ٹھیک کروانے کے بجائے صرف اور صرف آفس ورک کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ لیکن آج کا دن صبح سے ہی دوسرے دنوں سے مختلف اس لیے بھی رہا کہ رات سے ہی ذہن میں ندی کے ساتھ گزارے گئے خوش گوار وقت کی جو فلم چلنا شروع ہوئی تھی تو وہ اب تک رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ پہلے پہل اس سے ملاقات سے لے کر آخری دن تک ایک ایک لمحہ شاہ زین کے ذہن پر نقش تھا اور پھر آخری دن اس کا نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگنا اور شاہ زین کا اس کی سفید گداز ہتھیلی پر شعر لکھنا۔۔۔ اسے سبھی کچھ تو یاد تھا مگر تھا بہت تکلیف دہ اور اس پر یہ احساس کہ وہ اور میران دونوں اب ایک ہونے جا رہے ہیں۔ شاہ زین کے دل کو اندر ہی اندر کچوکے لگا رہا تھا۔

سو اپنا دھیان بٹانے کے لیے آج کا دن اس نے معمول سے ہٹ کر ڈیپارٹمنٹ کے ورکرز کے درمیان گزارنے کا سوچا تھا تاکہ اسے مشینوں کے شور میں اپنے اندر کے شور سے نجات مل جائے۔ وہاں موجود ورکرز سے تو یوں بھی اس کا رویہ بہترین تھا۔ سو آج یونہی چلتے ہوئے راؤنڈ لگانے کے دوران کسی کسی ورکر کے پاس رک کر ان کا حال چال پوچھنے لگا

اور اسی دوران کچھ پیپرز فائل میں رکھنے کی ضرورت پیش آئی تو آفس کے اندر قدم رکھتے ہی میران کو اپنی کرسی پر بیٹھا دیکھ کر یقیناً اسے حیرت کا ایک زوردار جھٹکا تو ضرور لگا تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنے جذبات پر مکمل کنٹرول حاصل ہوتا ہے اور اصل فاتح تو وہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو خود اپنے نفس کو فتح کر لیں۔ اپنی ذات کو جذبات کے ہاتھوں گروی رکھنے کے بجائے دل کی لگامیں دماغ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کوئی بھی ردِعمل ظاہر کرنے کے لیے مکمل ہوش وحواس سے کام لیں۔ سو یہی وجہ تھی کہ میران کی تمام تر توقعات کے برعکس نہایت تحمل سے شاہ زین نے اس کا سامنا کیا اور میران جو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ شاہ زین کی ذرا سی ''گستاخی'' کی صورت میں وہ اسے سب کے سامنے ذلیل ورسوا کر کے اس کو آفس سے باہر نکال دے گا۔ یہ نہ ہو سکا بلکہ اس کے برعکس مہربانو کے حوالے سے ٹی وی اسکرین کی زینت بنی اس خبر نے خود میران شاہ کو ہی شاہ زین کے سامنے ٹھہرنے کے لائق نہ چھوڑا تھا اور تب شاہ زین حیران پریشان اس پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بس سوچتا ہی رہ گیا۔

اب بھی وہ اپنے آفس میں موجود تقدیر کے صفحے پر ابھرنے والے ان نئے الفاظوں کو ورق الٹ کر سارے لفظوں سے ملاتا ہوا سوچ رہا تھا کہ آج سے کچھ ہی عرصے پہلے اسی طرح ٹی وی تک نہ سہی لیکن اخباروں میں اس کی اور ندی کی بھی تصاویر چھپوا کر انہیں رسوا کیا گیا تھا اور یقیناً وہ سب کرنے میں میران کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور اب خود میران کی بہن کے ساتھ پیش آنے والے اس تمام تر واقعے میں کتنی سچائی ہے؟ اور اب شاہ سائیں اور میران سمیت دیگر لوگ اس معاملے پر کیا ردِعمل دیں گے، قطع نظر اس کے کہ اب میران اور ندی کے درمیان یقینی طور پر معاملات طے پا چکے ہیں جس کے نتیجے میں وہ دونوں اب شادی کے بندھن میں بندھنے والے ہیں مگر یہ سب ممکن کیسے ہوا؟ اس بات کی حیرت شاہ زین کے ذہن میں ابھی تک باقی تھی۔

☆☆☆

یہ سچ ہے کہ ہم سے خستہ تن
دکھوں کی دھوپ میں سایہ نہیں کرتے
ہماری مسکراہٹ میں زہر ہوتا ہے
ہمارے لب ہمیشہ طنز کے نشتر چلاتے ہیں
مگر ہم اپنے پیاروں کو کبھی بے خودی میں
کوئی ایسی بات کہہ دیں
کہ وہ افسردہ ہو کر رو پڑیں
تو سن لو۔۔۔
ہم بھی چین سے سویا نہیں کرتے

باقی گھر والوں کے ساتھ ذہنی طور پر عائشہ بھابھی کے کتنے ہی اختلاف کیوں نہ ہوتے مگر ناصر بھائی کے ساتھ ان کی محبت ایسی ہی تھی جیسی کسی بھی مشرقی بیوی کو اپنے بے حد محبت کرنے والے شوہر کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ جب سے شادی کے بعد وہ اس گھر میں آئی تھیں، امی، بابا، ندی اور ناصر بھائی نے ہمیشہ انہیں اسپیشل پروٹوکول دیا تھا۔ امی، بابا ہر معاملے میں ان کی رائے کو اتنی اہمیت دیا کرتے کہ اگر کسی بھی معاملے میں وہ ''ویٹو'' کر جاتیں تو وہ ارادہ پایہ تکمیل تک پہنچانا پھر ناممکنات میں سے لگنے لگتا۔ ہر موقع پر ان کے حقوق کا بے حد خیال رکھا جاتا۔

ناصر بھائی اگر کام کی زیادتی کی وجہ سے عائشہ بھابھی کو باہر نہ لے جا پاتے تو امی خود انہیں اس کمی کی یاددہانی کرواتے ہوئے ناصر بھائی کو سمجھایا کرتیں کہ وہ بھول رہے ہیں کہ بہت دنوں سے وہ عائشہ کو کہیں باہر لے کر نہیں گئے۔ عائشہ بھابھی کے میکے کے رشتہ داروں میں سے کسی کے بھی آنے پر انہیں وی آئی پی ٹریٹ کیا جاتا۔ صرف اس لیے کہ عائشہ بھابھی اب اس گھر کی بہو تھیں اور پہلا حق ان ہی کا تھا۔ ناصر بھائی کا غصہ ذرا تیز ضرور تھا مگر پھر بھی وہ عائشہ بھابھی کے لیے ایک بہت کیئرنگ شوہر کے طور پر ان کی زندگی میں آئے تھے۔ جو ہر لحاظ سے انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ امی، بابا اور ندی کے

حقوق پورے کر کے گھر کو ہر لحاظ سے پرسکون بنانے میں اپنا کردار ادا کیے ہوئے تھے۔ لیکن مسئلہ پیدا ہوا تو تب کہ جب عائشہ نے خود ہی یہ بات اخذ کر لی کہ گھر میں ندی کو اس سے کہیں زیادہ اہمیت ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خاندان بھر میں ندی کی خوب صورتی، اس کے اخلاق، پہننے، اوڑھنے کے انداز کی تعریفیں سن سن کر عائشہ بھابھی نادانستہ طور پر دل ہی دل میں اس سے حسد محسوس کرنے لگی تھیں۔

اور تابوت میں آخری کیل ٹھونکی گئی تب، جب ندی نے اکمل کے رشتے سے انکار کر دیا اور انہی دنوں یونیورسٹی میں ہونے والی بدمزگی سے عائشہ بھابھی کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے ''حقوق'' حاصل کر کے رہیں، جبھی اس واقعے کو سب کے سامنے اور خصوصاً ناصر بھائی کے سامنے اس قدر اچھالا گیا کہ وہ نہ صرف ندی بلکہ اس کے نام سے ہی بدظن ہو گئے۔ مگر یہ سب کرتے ہوئے یقیناً عائشہ بھابھی یہ بات بھول بیٹھی تھیں کہ گیند جتنی زور سے زمین پر دے ماریں وہ اس سے بھی دگنی طاقت اور شدت کے ساتھ دوبارہ اوپر کی طرف واپس آئے گی۔

یہی وجہ تھی کہ اب جو ناصر بھائی کے سامنے ساری اصلیت خود عائشہ بھابھی کی زبانی ہی سامنے آئی تھی تو ان کا ردِعمل بھی اسی طرح شدید تھا جس طرح ندی کے معاملے میں تھا۔ ان سے بات چیت کرنا بند کی تھی اور انہیں گھر سے بھی نکل جانے کا حکم سنایا گیا تھا وہ بھی اس اضافے کے ساتھ کہ بصورت دیگر وہ گھر میں قدم نہیں رکھیں گے اور باقی سب کے ساتھ تو عائشہ بھابھی کے تعلقات جیسے بھی تھے مگر وہ ناصر بھائی کو چھوڑنے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھیں کہ شادی کے بعد لڑکی کا اصل گھر وہی ہوتا ہے جہاں اس کا شوہر ہو لیکن اس سب کے باوجود وہ اس قدر شرمندہ تھیں کہ ان کے اندر ناصر بھائی کا سامنا کرنے کی نہ تو ہمت تھی اور نہ ہی اخلاقی جرأت۔ اور اسی لیے وہ کچھ دنوں کے لیے میکے جانا چاہتی تھیں تاکہ حالات ذرا اپنی نارمل روٹین میں بحال ہو سکیں اور ناصر بھائی کے ذہن میں جو تازہ بہ تازہ جذبات جنم لے رہے ہیں وہ ان سے وقتی طور پر بچ سکیں۔ مگر ممی اس واقعے کو بڑی زیرک نگاہی سے دیکھ رہی تھیں جبھی اس سے پہلے کہ وہ میکے چلی جاتیں ممی نے خود ڈرائیور کو ساتھ لیا اور عائشہ بھابھی کو سمجھانے کی غرض سے ان کے پاس جا پہنچیں۔

''وہ تمہارا میکہ ہے، اس بات سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر اس وقت اگر تم نے اس گھر سے قدم باہر نکالا تو ہمیشہ پچھتاؤ گی۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی؟''

''سب سمجھ میں آ رہا ہے ممی! بچی نہیں ہوں میں؛ لیکن ان سب کے باوجود میں ناصر کا سامنا نہیں کر سکتی۔ سب کچھ انہوں نے خود سن لیا ہے ایسے میں، میں اپنا دفاع کیسے کروں ان کے سامنے؟'' وہ جھنجھلائی ہوئی تھیں۔

''یہاں رہوں گی تو مجھے سامنے دیکھ کر ان کے منہ سے کچھ بھی غلط نکل سکتا ہے کیونکہ ان کے غصے سے تو آپ بھی واقف ہیں نا، لیکن اگر یہاں سے چلی گئی تو فون پر آج نہ سہی کل، کل نہ سہی کچھ روز بعد میں خود انہیں سمجھا لوں گی۔''

وہ دونوں اس وقت عائشہ بھابھی کے بیڈ روم میں تھیں۔ ان کے لیے چائے وغیرہ تیار کرنے کے بہانے سے ثروت آپا وہاں سے اٹھ گئی تھیں تاکہ وہ دونوں بلا جھجک ایک دوسرے سے بات کر کے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوئی راہ نکال سکیں۔

''تم کیا سمجھتی ہو عائشہ! کچھ منہ سے غلط نکلنے کے لیے تمہارا سامنے ہونا ضروری ہے؟ کیا فون پر تم اس سے بات کرو گی اور اپنی صفائیاں پیش کرو گی تو وہ تم سے گھنٹہ بھر باتیں کرتا رہے گا تاکہ تم ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے مزید سو جھوٹ اس کے سامنے بول سکو؟'' ممی انہیں آئینہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھیں ہر طرح سے انہیں سمجھانا چاہ رہی تھیں مگر وہ شاید سن ہی نہیں رہی تھیں اور یقیناً اس وقت ان کا سمجھنے کا کوئی

ارادہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اسی لیے وہ ممی کی کہی ہوئی ہر بات کو صرف جواب دینے کے نظریے سے سن رہی تھیں، سمجھنے کی نیت سے نہیں۔

''ممی! آپ تو خوامخواہ بس نیگیٹو سوچ رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ بس میں بھی ہتھیار ڈال دوں لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کرنے والی۔''

''نیگیٹو میں سوچ رہی ہوں؟ یا نیگیٹو تم نے کیا ہے ان گھر والوں کے ساتھ؟ چھوٹی موٹی باتیں جو تم میرے ساتھ کیا کرتی تھیں میں تو یہی سمجھتی رہی کہ تم اپنا دل ہلکا کر رہی ہو میرے ساتھ اور جب تھوڑا بہت مجھے کہہ سن لو گی تو ریلیکس ہو جاؤ گی اور ذہن سے وہ سب باتیں نکال دو گی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اپنے اندر اس قدر زہر پال رہی ہو۔ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن میری بیٹی اس قدر بدنیت ہوگی، میں تو اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی اور اب جب تمہارے کیے گئے سارے وار ناکام ہو گئے ہیں اور ناصر اپنی والدہ اور بہن سے اپنے کیے گئے تمام غلط فیصلوں اور اعمال کی معافی طلب کر چکا ہے پھر بھی تم شرمندہ ہونے اور پچھتانے کے بجائے جلی ہوئی رسی کا بل بننے پر تلی ہوئی ہو۔''

''مجھے کم از کم آپ سے یہ امید ہرگز نہیں تھی ممی! اور میں نے بھی اس بات کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جب خود ناصر تک میرے مخالف ہو جائیں گے تو آپ ماں ہو کر میرا ساتھ چھوڑ دیں گی، آپ نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے ممی! اپنے جیتے جی آپ میرے میکے کے دروازے مجھ پر بند کر رہی ہیں۔ کل کو کوئی بھابھی آئے گی وہ تو یقیناً آپ ہی کے نقش قدم پر عمل کرے گی۔'' وہ روہانسی ہو گئی تھی تب ممی اس کے نزدیک آ بیٹھی تھیں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولیں۔

''میری کہی ہوئی باتیں تمہیں آج بری اس لیے لگ رہی ہیں کیونکہ تم اس وقت جذبات سے سوچ رہی ہو، مگر یقین کرو میری جان! کل کو انہی سب باتوں کی وجہ سے تم خود کو اپنی ماں کا احسان مند سمجھو گی، جس نے تم پر میکے کے دروازے وقتی طور پر بند کر کے تمہاری خوش حال اور پرسکون زندگی کے دروازے تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھلے رہنے دیے تھے اور جہاں تک بات رہ گئی تمہاری مستقبل کی بھابھی کی، تو جب تک تم خود کسی کی اچھی بھابھی نہیں بنو گی تو یہ کیسے امید کرو گی کہ کوئی تمہاری اچھی بھابھی بنے؟''

ممی نے اسے نہایت نرم الفاظ سے سمجھانے کی کوشش کی تھی باوجود اس کے کہ وہ اس وقت عائشہ بھابھی کی ذہنی حالت کا اندازہ کر سکتی تھیں مگر وہ چاہتی یہی تھیں کہ وہ اپنے اس وقتی جذبات کو خود پر اس قدر سوار نہ کر لیں کہ پھر ان کے پاس پچھتاوے اور کاش کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے کیونکہ ایک دفعہ زندگی سنوارنے کا موقع جان بوجھ کر ہاتھ سے نکال دیا جائے تو آئندہ وقتوں میں ''کاش'' راکھ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

''میں مانتی ہوں ممی! کہ میں نے غلط کیا ہے۔ میں نے ندی کا برا چاہا اور پھر جذبات کی رو میں میں اس قدر آگے نکل گئی کہ میں نے خود اپنی شادی شدہ زندگی بھی داؤ پر لگا دی لیکن ــــــ'' وہ چند لمحے کے لیے رکیں اور کچھ کہتے کہتے ممی سے نظریں چرالیں۔

''اگر سچ کہوں ممی! تو ـــ میرے اندر ناصر کو فیس کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اسی لیے میں کچھ دنوں کے لیے منظر سے ہٹ جانا چاہتی ہوں اور بس ـــ مجھ سے ایک نہیں کئی غلطیاں ہوئی ہیں، ناصر کے دل کو گھر والوں سے تو اچاٹ کیا سو کیا، لیکن میرا رویہ امی اور ندی کے ساتھ بھی بہت روکھا پھیکا سا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو ہمیشہ ناصر کے سامنے میری ڈھال بنا کرتی تھیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی میری سائیڈ لیتی تھیں، پتا نہیں میں اتنی اندھی کیسے ہو گئی کہ پھر ان سے سیدھے منہ بات تک کرنا چھوڑ دی ـــ اب آپ خود بتائیں میں ان کا سامنا کیسے کروں؟ اور کیسے خود کو ڈیفینڈ (Defend) کروں ان کے سامنے؟''

''صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے نا تو اسے بھولا نہیں کہتے بیٹا! مانا کہ تم سے غلطیاں ہوئی ہیں لیکن یہ بھی تو سچ ہے نا کہ تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا اور پشیمانی ہے۔ ناصر سمیت یہ تمام گھر والے صاف نیت اور محبت کرنے والے لوگ ہیں اور مجھے امید ہے کہ اگر تم ان سے سچے دل سے معافی مانگو گی تو یہ سب ایک مرتبہ پھر تمہیں گلے لگا لیں گے۔''

عائشہ بھابھی نے بھیگی آنکھوں سے سر اوپر اٹھا کر ممی کو دیکھا اور ان کے تائید میں ہلتے سر اور مسکراتے لبوں کو دیکھ کر رہ گئیں۔ اسی دوران ثروت آپا چائے کی ٹرالی میں لوازمات سجائے کمرے میں داخل ہوئیں اور عائشہ بھابھی سوچ میں پڑ گئیں کہ آخر اب کیا ہونے والا ہے۔ ثروت آپا نے چائے کا کپ ممی کی طرف بڑھایا۔

''ثروت آپا! یہ سب جاننے اور محسوس کرنے کے باوجود کہ میرا امی اور ندی کے ساتھ کیا رویہ رہا آپ ابھی بھی میری ممی کے ساتھ وہی پہلے سا رویہ رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کا دل نہیں چاہا کہ جیسے میں نے کیا وہی رویہ آج آپ میری ممی کے ساتھ رکھتیں؟'' ذہن میں آئی بات کو عائشہ بھابھی نے زبان دے ڈالی۔

''عائشہ! جب گھر بسانے کے بارے میں سوچا جاتا ہے نا تو بہت سی چھوٹی بڑی باتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ سمجھوتے، مصلحت، برداشت اور نظر انداز کرنے کو اگر منفی کر دیا جائے تو کسی بھی گھر کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور میں اپنا میکہ آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے عائشہ بھابھی کو سمجھانا چاہا تھا اور پھر ممی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''ویسے بھی جو کچھ غلطیاں جانے انجانے میں سرزد ہوئیں وہ تم سے ہوئیں، اس میں ممی کا کیا قصور، یہ ہمارے لیے آج بھی اتنی ہی محترم ہیں جتنی پہلے ہوا کرتی تھیں اور میں بڑی بہن ہونے کے ناتے تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گی کہ اپنا گھر بچا لو، ٹوٹنے سے جھک جانا بہتر ہے۔ ناصر شدید رنج اور غصے میں ضرور ہیں لیکن کوئی بھی حرف زندگی میں حرف آخر تو نہیں ہوتا نا۔ وہ بھی مان جائیں گے۔ تم پہلے امی سے بات کرو پورے سچے دل سے اور مجھے یقین ہے کہ اگر امی بات کریں گی تو وہ کبھی ٹال نہیں پائیں گے۔''

خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی
لوگ تسخیر ہو بھی سکتے ہیں
لفظ دل سے ادا کرے کوئی

ثروت آپا کی باتیں عائشہ بھابھی کے دل کو لگی تھیں۔

☆☆☆

میران شاہ بے چینی کے عالم میں یہاں سے وہاں ٹہل رہا تھا۔ ملکانی سائیں بھی شاہ سائیں کے فون کے انتظار میں مجسم دعا بنی ہوئی تھیں۔ اتنی بڑی بات ہو جانے کے بعد وہ شاہ سائیں سے کسی بھی قسم کے ردعمل کی توقع کر سکتی تھیں اور یہی ایک خوف تھا جو ان کے ذہن پر مسلط ہو کر انہیں ہلکان کیے دے رہا تھا۔ میران شاہ اب تھک ہار کر صوفے پر آن بیٹھا تھا اور اضطراب و بے چینی کی حالت میں مونچھوں کو بل دیتے ہوئے دائیں ٹانگ ہلاتا جا رہا تھا۔

اگر خود اس کے ساتھ کچھ غلط ہو جاتا تو شاید کیفیت کچھ اور ہوتی لیکن اب بات اس کی عزت پہ آ گئی تھی۔ اس کی بہن کے ساتھ ساتھ پوری حویلی کا مقام داؤ پر لگا ہوا تھا۔ رحمٰن شاہ تو جو کچھ کہہ کے گیا سو گیا خود ملکانی کے بھائیوں نے بھی آ کر بجائے اس پریشانی کے لمحے میں انہیں تسلی دینے، ہمدردی کے دو بول بولنے کے صرف اور صرف شاہ سائیں کی ذات کو ہی تنقید کا نشانہ بنایا کہ جن کے غلط فیصلے کی وجہ سے آج یہ دن دیکھنا پڑے اور جب جذبات کی روانی میں وہ مہربانو کو بھی یوں قصوروار ٹھہرانے لگے تو میران سے برداشت نہ ہوا اور ملکانی سائیں کے سامنے ہی ان کے بھائیوں سے الجھ بیٹھا۔ مہربانو کے متعلق وہ کسی کی زبان سے بھی کچھ غلط بات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ملکانی سائیں زرد رنگت لیے اپنے بھائیوں کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن ان کے نزدیک سب سے بڑے قصوروار مہربانو اور شاہ سائیں تھے سو

تھے اور اسی طرح بکتے جھکتے ہوئے آخر وہ حویلی سے نکل گئے۔ بار بار شاہ سائیں کو فون کرنے کے بعد بھی ان سے بات نہ ہو پانا ایک تشویش ناک بات تھی جس نے انہیں مزید پریشان کر کے رکھ دیا تھا اور ان کے علاوہ وہ کسی سے رابطہ کر نہیں پا رہے تھے۔ اسی پریشانی میں بیٹھے بیٹھے ایک دم میران کے فون پر ہوتی بیل نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ دوسری طرف شاہ سائیں تھے جو اس سے پہلے کہ تمام تفصیل بتاتے میران شاہ نے انہیں بتایا کہ وہ ٹی وی پر سب کچھ دیکھ چکا ہے۔ اس بات پر انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔

"تمہارا کیا خیال ہے میران؟ اس سارے معاملے میں قصوروار کون ہے؟ اور اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" فیصلہ تو بلاشبہ وہ کر چکے تھے لیکن پھر بھی وہ جاننا چاہتے تھے کہ اس اہم ترین معاملے میں میران شاہ کے سوچنے کا انداز کیا ہے اور آیا کیا وہ ان کی طرف سے کیے گئے کسی بھی فیصلے کی حمایت میں کھڑا نظر آئے گا یا کہ مخالفت میں۔

"بابا سائیں! سب سے پہلے تو اللہ کا شکر ہے کہ مہربانو خیریت سے ہے، قصور سراسر شاپنگ مال کی انتظامیہ کا ہے جنہوں نے لفٹ کے خراب ہونے پر اسے بند کرنے کے بجائے اِن سروس رکھا اور کوئی وارننگ وغیرہ بھی جلی حروف میں لکھ کر نہیں لگائی، آپ سیدھا سیدھا کیس کریں ان لاپروا لوگوں پر۔" میران شاہ نے بہت اچھا نقطہ اٹھایا تھا۔

"اور دوسری بات یہ کہ مہربانو کو یقین دلائیں کہ اسے ہمارے ہوتے ہوئے نہ تو کسی کو صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اپنا یقین دلانے کی۔ ہمارے لیے اس کے آج اور کل میں کوئی بھی فرق نہیں آیا ہے۔ جس قدر اعتماد، محبت اور بھروسہ ہمیں اس پر کل تھا، آج شاید اس سے بھی بڑھ کر ہے۔" ملکانی سائیں کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ آج سے پہلے میران شاہ نے کبھی بھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اس کے لیے زندگی میں موجود ان رشتوں کی کیا اہمیت ہے۔ لیکن محبت اظہار کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ رشتہ کوئی بھی ہو لیکن اپنے رویے کے ساتھ ساتھ لفظوں سے بھی اپنی محبت کا اظہار کرنا اسی طرح ضروری ہوتا ہے جس طرح پودوں کو پانی دینا۔۔۔ ملکانی سائیں جو رحمٰن شاہ اور اپنے بھائیوں کے رویے کے بعد شاہ سائیں کو تنہا خیال کر رہی تھیں۔ اب ان کا سر فخر سے بلند ہو رہا تھا اور وہ گزرے لمحوں کی پریشانی کے برعکس ان آنسوؤں میں اپنی ساری گھٹن بہا رہی تھیں۔

میران شاہ کی باتوں نے شاہ سائیں کو بھی ایک نیا حوصلہ بخشا تھا اور وہ خود کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط محسوس کر رہے تھے۔ ملکانی سائیں نے ان سے بات کرنے کے دوران انہیں رحمٰن شاہ کے رویے اور اپنے بھائیوں کے شور و غوغا مچانے کے بارے میں بھی بتایا اور یہ جان کر شاہ سائیں کو ناقابل بیان اطمینان نصیب ہوا کہ رحمٰن شاہ جو خود ہی مہربانو سے رشتہ ہونے کا دعوے دار بنا بیٹھا تھا اب بغیر کسی مزید بدمزگی کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ بقول اس کے کہ وہ کسی "باعزت اور شریف" لڑکی کو اپنی دلہن بنائے گا اور اس کے لیے چاہے اسے مزید دس سال بھی انتظار کرنا پڑے یعنی مہربانو اور تمام حویلی والوں کو ایک وقتی پریشانی کا سامنا کروا کر مکمل اور دائمی مصیبت سے بچا لیا گیا تھا اور اس بات کے لیے ملکانی سائیں اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ شاہ سائیں نے چند لمحے آئندہ کے لائحہ عمل پر بات کرنے کے بعد انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ نیکسٹ فلائٹ سے جلد از جلد مہربانو کے ساتھ حویلی پہنچ رہے ہیں۔

ایک سکون سا جیسے حویلی کی در و دیواروں پر مسکرانے لگا تھا۔ صبح سے پھیلی وحشت اور پریشانی منہ لپیٹ کر کسی دوسری طرف جا نکلی تھی۔ قدموں میں بیٹھی سونی کو ملکانی سائیں نے شدتِ جذبات سے گود میں بھر لیا تھا اور میران شاہ بند آنکھوں پر ہاتھ رکھے رب کے حضور معافی کے ساتھ ساتھ شکر کے الفاظ بھی ادا کر رہا تھا۔ لیکن دل پر بوجھ پتھر کی سل کی طرح ٹس سے

مس ہونے کا نام لیتا نظر نہ آتا تھا۔ یہ خیال کہ ندی اور اس کے گھر والوں پر اس وقت کیا گزری ہوگی جب میران کی زیرِ ہدایت جعلی تصاویر اخبار میں چھپ کر ہر گھر میں موضوعِ گفتگو بنی ہوں گی۔ اس کا بھائی کیا محسوس کر رہا ہوگا جب ہر طرف سے لوگ ظاہر و خفیہ ان پر انگلی اٹھاتے ہوں گے اور شاہ زین۔۔۔ اور جب سارے خیالات ایک بگولے کی طرح اس کے ذہن کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے تو آخر کار اس نے ایک ایک بات ملکانی سائیں کو کہہ سنائی۔

اول و آخر ایمان داری سے اس نے بغیر کسی مبالغے یا جھوٹ کی آمیزش کیے واقعات کو جمع تفریق کی مسند پر بٹھائے بغیر جو کچھ اور جیسا ہوا تھا سب بیان کر دیا اور آخر میں یہ بھی اعتراف کر ڈالا کہ آج مہربانو کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں قصوروار مہربانو نہیں بلکہ حقیقتاً وہ خود تھا اور موردِ الزام اگر کوئی ہے تو وہ صرف اور صرف اس کی ذات ہے۔

ملکانی سائیں دم بخود ساری باتیں سنتی رہی تھیں۔ وہ اس کی فطرت سے بخوبی واقف تھیں اور جانتی تھیں کہ یہ سب اسی طرح ہوا ہوگا۔ لیکن ان کے لیے باعثِ حیرت و شکر بات یہ تھی کہ وہ اپنے کیے پر نادم تھا اور اب اس عمل کی تلافی کرنا چاہتا تھا یعنی آج کے واقعے نے اس کی ذہنیت میں موجود اکڑ اور غرور کی بلند دیوار میں دراڑ ڈال دی تھی۔

☆☆☆

یونیورٹی میں میران کی طرف سے کی جانے والی بدتمیزی کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں ندی اور شاہ زین کے درمیان رابطہ منقطع ہو جانے کے بعد بھی ندی کے دل میں شاہ زین کے لیے کسی قسم کی بدگمانی نے جنم نہیں لیا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی کسی موڑ پر شاہ زین کو ان تمام حالات پر قصوروار ٹھہراتے ہوئے موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ اس کا دل ہمیشہ سے بس یہی کہتا تھا کہ ایک دفعہ شاہ زین سے ملاقات ہو جائے تو سارے معاملات خود بخود طے پا سکتے ہیں۔ اسی کوشش میں وہ انتہائی رسک لیتے ہوئے شاہ زین کے گھر تک بھی گئی اور اس کی شادی کے جلد ہونے کی خبر سن کر بھی وہ اپنے دل سے اس کی محبت میں رتی بھر بھی کمی نہیں کر پائی تھی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ہاسپٹل میں ہونے والی ملاقات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس کا لیے دیے والا روکھا پھیکا انداز، اجنبیوں کا سا برتاؤ اور بس سرسری سا اندازِ گفتگو، ندی کو حقیقتاً ہرٹ کر گیا تھا اور اس پر ثمینہ کا وہ خط جس نے سراسر ندی کو ہی موردِ الزام ٹھہرا دیا تھا اور تب ندی کو لگا کہ شاید وہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ دل نے شاہ زین کے خلاف دہائیاں دینی شروع کر دیں۔ مرد ہونے کے باوجود اس کی خاطر کوئی اسٹرونگ اسٹیپ نہ لینے، اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے، اس کی خیر خبر نہ لینے اور سب سے بڑھ کر اس بات پر یقین کرنے کہ وہ میران شاہ سے شادی کر رہی ہے۔ ان سب باتوں نے مل کر اسے پہلی دفعہ شاہ زین سے ناراض کر دیا تھا اور اسی غصے میں جب ثمینہ کا خط پھاڑ کر روم ڈسٹ بن کے بجائے باہر پھینک کر آئی تو کمرے میں امی کے پاس موجود ثروت آپا، عائشہ بھابھی اور ان کی ممی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ ان کے آنے سے چند لمحوں پہلے تک وہ سب گفتگو میں مصروف تھے جو اس کے آنے کے بعد ہی منقطع ہوئی۔ سو دھیمی آواز میں سب کو ایک ساتھ سلام کرتے ہوئے امی کے تکیے کے قریب کھڑی ہوئی تو ان کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر چونک گئی۔ استفہامیہ نظروں سے ثروت آپا کو دیکھا مگر عائشہ بھابھی اٹھ کر اس کے قریب چلی آئیں۔

"ندی! میں جانتی ہوں کہ مجھ سے ایک نہیں کئی غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ ماضی تھا اور گزر چکا ہے اور تم مجھے موقع دو تو میں اپنے کیے ہوئے ہر قصور اور غلطی کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔۔۔ لیکن صرف ایک دفعہ تم سب لوگ مجھے معاف کر دو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی؟" ان کی باتوں نے اسے حیران بھی کیا تھا اور اسے افسوس بھی ہو رہا تھا۔

"اور ہم کون ہوتے ہیں آپ کو معاف کرنے اور سزا دینے والے؟ کیا آپ کو معاف کرنے سے یا سزا دینے سے میرے بابا واپس آجائیں گے؟ آخری لمحات جس کرب میں انہوں نے گزارے اور ان کی میت پر بھی جس طرح آپ نے سب خاندان والوں کے سامنے میری کردار کشی کی وہ وقت واپس آئے گا؟ آپ کی وجہ سے میری ماں آج یہاں تک پہنچیں، ایک ایک لمحہ کس اذیت میں گزارا ہے انہوں نے، کس طرح یہ صرف ناصر بھائی کو دیکھنے اور ان کی آواز سننے کو ترسا کرتی تھیں، اس کا اندازہ کر سکتی ہیں آپ؟" ندی جذباتی ہو گئی تھی۔

"اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ زبردستی کسی بھی شخص کو آپ دنیا بھر سے دور کر کے صرف اور صرف اپنا بنا لیں گی تو یہ بھول ہے کیونکہ لوگ صرف اور صرف رویوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور بھی ہوتے ہیں اور نزدیک بھی۔۔۔ اور ناصر بھائی تو آپ کے ہی ہیں پھر بھلا آپ کو کیا بے یقینی تھی کہ آپ ہم سب کے خلاف اس قدر آگے چلی گئیں۔"

عائشہ بھابھی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بس سر جھکا ہوا تھا اور زبان خاموش۔ ندی کو بھی اس لیے خاموش نہیں کروایا گیا تھا تاکہ وہ کہہ سن کر اپنے جی کو ہلکا کر لے۔

"ندی بیٹا! جو کچھ ہوا وہ ماضی تھا۔ اب اپنے نئے کل کا آغاز کرو اور دل صاف کر کے ایک دوسرے کے گلے لگ جاؤ۔"

امی نے بیٹھتے ہوئے کہا تو ندی ہلکا سا مسکرا دی۔

"ڈونٹ وری امی! میرے دل میں جو تھا وہ میں نے کہہ دیا ہے اور اگر آپ انہیں معاف کر چکی ہیں تو میرا دل بھی ان کے لیے صاف ہے۔" ندی نے آگے بڑھ کر عائشہ بھابھی سے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا تو انہوں نے ندی کو گلے لگا لیا۔

اسی دوران ناصر بھائی ہاتھ میں امی کی ڈسچارج سلپ لے کر اندر آتے آتے یہ منظر دیکھ کر چونک گئے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے امی نے آنکھوں کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کا کہہ دیا۔

"آج کتنے ہی عرصے بعد جب ہم گھر جائیں گے تو وہاں سکون اور اپنائیت کا احساس ملے گا۔" ثروت آپا نے امی کی آنکھوں کا آرڈر دیکھنے کے بعد مسکراتے ہوئے ناصر بھائی کا پھولا ہوا منہ دیکھا۔

"ناصر! تم ایسا کرو گھر جانے سے پہلے صدقہ دے کر آؤ اور آتے ہوئے ساتھ مٹھائی بھی لے آنا۔"

"جی امی!" عائشہ بھابھی کی والدہ کو سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے وہ عائشہ بھابھی کو مکمل نظر انداز کر گئے تھے اور امی کی بات کے جواب کے بعد واپس باہر کی طرف مڑنے ہی لگے تھے کہ امی کی آواز پر پھر سے پلٹ آئے۔

"عائشہ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔" امی کی بات پر جہاں عائشہ بھابھی جز بز دکھائی دیں وہیں ناصر بھائی نے بھی آنکھوں کے ذریعے احتجاج کیا جو رد کر دیا گیا اور امی کے کہنے پر عائشہ پرس سنبھالتے ہوئے ناصر بھائی کے ساتھ کمرے سے نکلیں مگر اس سے پہلے ایک شرمسار مسکراہٹ کے ساتھ ندی کے ہاتھ میں اس کا موبائل دبا گئی تھیں۔

☆☆☆

شاہ زین آج عام دنوں کی نسبت ذرا جلدی گھر آ گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ کچھ نقاہت محسوس کر رہا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ ذہنی جنگ سے اب بری طرح تھک چکا تھا۔ تبھی خلاف معمول ریسٹ کرنے کے ارادے سے گھر جا پہنچا جہاں ثمینہ دھلے ہوئے کپڑوں کو بالٹی میں رکھے گھر کے دائیں اور بائیں طرف پچھواڑے میں لگائی جانے والی نائیلون کی تار پر سوکھنے کی غرض سے پھیلا رہی تھی۔ بیل ہوئی تو باہر آنے والے کے بارے میں اندازے اور مفروضے قائم کرتے ہوئے گیٹ کھولا اور سامنے شاہ زین کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"بھائی! آپ۔۔۔ اس وقت۔۔۔؟ آج جلدی آ گئے۔" اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تو شاہ زین مسکرا دیا۔

"کہتی ہو تو واپس چلا جاتا ہوں۔"

"ارے نہیں، سوری بھائی! وہ دراصل آپ کبھی اس طرح وقت سے پہلے آئے نہیں نا اس لیے۔" کھسیا کر وضاحت دیتے ہوئے اس نے رستہ چھوڑ کر انہیں اندر آنے دیا۔

اماں جو ابھی چند لمحوں پہلے ہی لیٹی تھیں شاہ زین کی آواز سن کر وہ بھی اٹھ بیٹھی تھیں اور شاہ زین کے جھک کر سلام کرنے کے جواب میں حسب معمول اس کے کندھے پر ہاتھ پھیرا تو وہ ان کے قریب ہی صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ آج بے انتہا تھکاوٹ کا شکار ہے۔ ثمینہ جلدی سے فریج میں سے انار کا جوس گلاس میں ڈال کر لے آئی تھی۔

"بیٹا! کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ آج دفتر جانے کے بجائے چھٹی کر کے گھر پر ہی ریسٹ کرتے۔" جوس پی لینے کے بعد خالی گلاس ثمینہ کو تھمایا تو اماں بولیں۔

"ریسٹ۔۔۔؟ لیکن کیوں اماں۔۔۔! ایسا کون سا پہاڑ توڑا ہے میں نے کہ گھر بیٹھ کر ریسٹ کرتا۔"

"اوہ یعنی اب تم ہم سے باتیں چھپانے بھی لگے ہو۔" اماں نے مسکرا کر شاہ زین کو دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ثمینہ کے منہ سے اچانک ہی نکلا۔

"پوری ایک بوتل خون کی دے کر تو لوگ ہفتہ بھر ریسٹ کرتے ہیں، طاقت والی غذا کھاتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔"

"اوہ۔۔۔! یعنی آپ لوگوں تک خبر پہنچ گئی۔" خجل ہو کر اس نے سر کھجاتے ہوئے کن انکھیوں سے اماں کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اب وہ کچھ کہیں گی مگر وہ خاموش ہو کر اس کے جواب کی منتظر رہیں تو وہ مکمل طور پر ان کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔

"دراصل اماں! میں نے سوچا یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے اسی لیے نہیں بتایا ورنہ تو آپ میری اچھی دوست اور پیاری اماں ہیں نا، اور آپ سے تو میں نے کبھی بھی کچھ نہیں چھپایا، یہ بات تو آپ بھی مانتی ہیں نا۔۔" بچوں سے انداز میں اپنے سامنے بیٹھے شاہ زین کی بات پر وہ مسکرائیں۔

"اور پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ نیک کام ہے خوامخواہ تشہیر کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے میری جان! لیکن اگر بتا دیتے تو ہم نے تو خوش ہی ہونا تھا نا کہ تم کسی کام آئے لیکن ہاں اتنا ضرور ہے کہ تمہیں زبردستی ہی سہی فوری طور پر کوئی پھل فروٹ وغیرہ تو کھلا دیتے نا، اب آج تمہیں کس قدر کمزوری محسوس ہوتی رہی ہوگی سارا دن۔"

وہ پریشان ہو چکی تھیں اور اب چونکہ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ شاہ زین نے خون دیا ہے اس لیے نفسیاتی طور پر بھی انہیں شاہ زین بہت کمزور اور اس کا چہرہ بھی پھیکا پڑتا نظر آ رہا تھا۔

"دیکھو تو چہرہ بھی کیسا زرد ہو رہا ہے میرے بچے کا۔ ثمینہ۔۔۔! اٹھو بھائی کے لیے یخنی بنا کر لاؤ۔"

"اماں۔۔۔! وہ تو میں نے آپ کے کہنے سے پہلے ہی جب جوس لینے گئی تھی تب ہی چڑھا دی تھی، اور اگر مجھے پتا ہوتا کہ بھائی آج جلدی آنے والے ہیں تو اب تک تیار کر کے رکھ دیتی۔"

"اوہو۔۔۔ اسی لیے تو میں نے بتایا نہیں تھا۔ اب بھلا اس میں اتنا پریشان ہونے اور یوں ایکسٹرا کیئر کرنے والی کیا بات ہے؟" وہ اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے مسکرایا۔

"بات تو ہے نا بھائی! آپ اپنا خیال رکھیں گے، اچھی ڈائٹ لیں گے بھی تو کسی اور کو بھی خون دے کر اس کی مدد کر سکیں گے نا۔۔۔ اس لیے صحت بنائیں اور تگڑے ہو جائیں۔" ثمینہ نے بڑوں کی طرح اسے سمجھایا۔

"لیکن ایک بات سمجھ نہیں آئی۔" باری باری اس نے ثمینہ اور اماں دونوں کو دیکھا، دونوں ہی مکمل دلچسپی

اور توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

''اس بارے میں اگر میں نے آپ کو نہیں بتایا تو پھر آپ دونوں کو کیسے پتا چلا؟''

''ہمیں ہمارے ذرائع سے یہ مصدقہ اطلاع ملی تھی بھائی! کہ آپ جذبۂ ہمدردی میں خون دے کے آرہے ہیں۔'' ثمینہ مذاق کے موڈ میں تھی لیکن وہ حقیقتاً جاننا چاہ رہا تھا۔

''دراصل بیٹا! وہ لوگ گھر آئے تھے تمہارا شکریہ ادا کرنے، مگر تم سے ملاقات نہیں ہوسکی۔''

''گھر آئے تھے؟ مگر کون؟''

''جنہیں تم نے خون دیا تھا ان کا بیٹا ناصر اور بیٹی ثروت، ان کے آنے پر ہی ہمیں بھی پتا چلا تھا۔''

''اوہ اچھا، ہاں انہوں نے وہیں ہاسپٹل سے ایڈریس لیا ہوگا۔'' شاہ زین نے ریلیکس ہوکر کہا۔

''ثمینہ بتارہی تھی کہ وہاں تمہاری ندی سے بھی ملاقات ہوئی۔'' اماں کی بات منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ شاہ زین کے چہرے پر ایک واضح تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوتی محسوس ہوئی۔

''جی ہاں اس کی والدہ بھی شاید وہیں پر ایڈمٹ تھیں۔''

''اور اس کے بہن بھائی کا نام بھی ناصر اور ثروت ہی ہے نا۔'' وہ جو سمجھ رہا تھا کہ شاید اماں اب ملاقات کی نوعیت کے بارے میں پوچھیں گی یا احساسات کے بارے میں بات ہوگی اس سب کے برعکس انہوں نے ایک دم ہی زنجیر کی ایک کڑی کو کہاں سے اٹھا کر کہاں سے جوڑا تھا کہ خود شاہ زین بھی حیران ہوکر چونکے بغیر نہیں رہ پایا تھا۔

''جی جی، بالکل نام تو یہی تھے۔'' اسے ذہن پر زور دینے کی بھی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ ندی اور اس سے وابستہ ہر چیز اور شخص تو یوں ہی اس کے ذہن و دل پر نقش تھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے ندی کی والدہ کو خون دیا ہو۔'' شاہ زین کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب اتفاقات کیوں ہورہے ہیں۔ وہ بغیر کچھ کہے بس اماں کا منہ دیکھنے لگا۔

''مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہے اور اتفاقات زمانہ چاہے تم دونوں کو اب ایک دوسرے سے دور کر بھی چکا ہو مگر شاید قدرت پھر بھی کسی نہ کسی بہانے ان دونوں گھرانوں کو جوڑے رکھنا چاہتی تھی تبھی تو ظاہری صورت میں نہ سہی لیکن اب ندی کی والدہ کے جسم میں خون بن کر تم ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہو گے۔'' اماں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بھائی! میں اماں کو بھی کہہ رہی تھی کہ ندی کو دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا نا کہ یہ وہی ندی ہیں جن کی باتیں آپ سناتے تھے یا پھر جن کی چند روز میں شادی ہونے والی ہو، ایسا نہیں لگتا تھا نا؟'' وہ شاہ زین سے تائید چاہتی تھی۔

''اور نہ ہی ایسا لگتا تھا کہ وہ کبھی جھوٹ بولتی ہوں گی اتنی پیاری اور معصوم کہ اماں یقین کریں میرے پاس تو مثال بھی نہیں ہے کہ آپ کو بتاؤں اور اسی لیے مجھے دکھ بھی زیادہ ہوا تھا نا اور میں بھی ان کے نام خط لکھ کر دے آئی۔'' باتیں کرتے کرتے ثمینہ کے منہ سے پھر بات پھسل گئی تھی۔

''کیسا خط؟'' اماں اور شاہ زین دونوں الجھ کر ثمینہ کو دیکھنے لگے تو اس نے خط کا مکمل متن بیان کر دیا۔

''لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی ثمینہ! یہ سب باتیں لکھنے کی۔'' شاہ زین کو ثمینہ کا یہ عمل بالکل پسند نہیں آیا تھا جبھی چڑ کر بولا۔

''سوری بھائی! لیکن میرا بھی دل چاہ رہا تھا نا کہ ذرا میرا بھی غبار نکلے اور ندی بھی یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم ان تمام واقعات سے ناواقف ہیں۔'' ثمینہ نے اپنے تئیں عقلمندی کی تھی اور چاہتی تھی کہ اب اسے داد دی جائے لیکن شاہ زین نے سر جھٹک کر سامنے رکھا ریموٹ اٹھایا اور نیوز چینل پر ہیڈ لائنز سننے کی غرض سے اد کے کا بٹن دبایا۔ پہلی دوسری اور یہ کیا تیسری ہی خبر نے شاہ زین سمیت اماں کی بھی آنکھیں حیرت سے کھول دیں۔

''ممبر صوبائی اسمبلی حیدر شاہ کا بیٹی اور سید اکمل پر مکمل اعتماد کا اظہار، شاپنگ مال انتظامیہ پر کسٹمرز ایکٹ کے تحت مقدمہ درج، رات بھر انتظامیہ کی غفلت سے لفٹ میں بند ہونے پر ایک کروڑ کا ہرجانہ طلب۔''

اسکرین پر مہربانو اور اکمل کی وہی فوٹیج چلائی جارہی تھی اور ساتھ ہی انہیں پریس کانفرنس کرتے دکھایا گیا جس میں مہربانو اور اکمل شاہ سائیں کے دائیں بائیں موجود تھے۔ میری، کنول اور وکیل بھی ساتھ ہی تھے اور اس پریس کانفرنس میں ہاسٹل کے واچ مین کے مطابق اس نے بچیوں کے پریشان ہونے پر پولیس کو اطلاع دی تا کہ مہربانو کا کھوج لگایا جاسکے اور تب پولیس کھوج لگاتے ہوئے میڈیا کے نمائندگان کو بھی مدعو کرنا ہرگز نہیں بھولی تھی تا کہ ان کی اس کارروائی پر حکام بالا کی بھی نظر پڑے۔

''یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟'' اماں نے اسکرین پر نظر جماتے ہوئے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا تو شاہ زین جواب خبرنامہ کی شہ سرخیاں ختم ہوجانے پر تفصیل سے یہ خبر جاننے کے لیے باقی نیوز چینل چیک کررہا تھا بولا۔

''اماں یہ جو سفید شلوار سوٹ میں تھے نا، وہی تو ہیں شاہ سائیں، میران کے والد اور اس فیکٹری کے مالک جہاں اب میں جاب کرتا ہوں۔''

''کیا کہا۔۔۔؟ میران۔۔۔ حیدر شاہ کا بیٹا ہے؟ اور۔۔۔ اور مہربانو۔۔۔ میران کی بہن؟'' اماں کو تو جیسے اس نئے انکشاف پر یقین کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

''بالکل اماں! لیکن دیکھیں کتنا تضاد ہے نا میران کی شخصیت، عادات اور فطرت میں، شاہ سائیں کے تو بالکل متضاد ہیں اس کی تمام حرکتیں۔'' اماں کے چونکنے اور حیرت سے بھرپور تاثرات کو وہ خبر کی تفصیل جاننے کے لیے اِدھر اُدھر چینلز بدلتے ہوئے نوٹ نہیں کرپایا تھا۔ یوں بھی یہ پریس کانفرنس اب سے چار پانچ گھنٹے پہلے کی تھی اور تب براہ راست دکھائی بھی گئی تھی مگر اب خبرنامے میں موجود تمام خبریں ظاہر ہے کہ ایک ترتیب سے آنا تھیں، سو شاہ زین کو انتظار کرنا ہی تھا۔ تب تک وہ اس سے پہلے کہ اماں کے ساتھ اسی موضوع پر کوئی بات شروع کرتا باہر ہوتی بیل نے اسے چونکا دیا تھا۔ ثمینہ کچن میں تھی اور یوں بھی شاہ زین کے گھر ہونے کی صورت میں وہ خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا کرتا تھا مگر اس وقت شاہ زین کو اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل ہوگیا جب گیٹ کھولنے پر سامنے نہ صرف شاہ سائیں بلکہ ملکانی سائیں میران اور مہربانو سمیت کھڑے نظر آئے۔

''شاہ سائیں آپ۔۔۔!'' ابھی چند ہی لمحوں پہلے انہیں ٹی وی اسکرین پر دیکھنے کے بعد یوں اچانک اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر شاہ زین کی حیرت دیدنی تھی اور سونے پہ سہاگہ پوری فیملی یوں آئی تھی جیسے اپنے کسی عزیز رشتے دار کے گھر جایا جاتا ہے۔

''آیئے نا اندر آئیں۔'' وہ انہیں اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا اور اس دفعہ یقینی طور پر حیران ہونے کی باری شاہ سائیں کی تھی۔ ملکانی سائیں نے بھی اماں کو دیکھا تو جیسے یک ٹک دیکھتی ہی رہ گئیں۔ ان کے استقبال کے لیے کھڑی اماں اب تک اپنی حیرت پر قابو پاچکی تھیں مگر دونوں گھرانے کا ایک ایک فرد ابھی تک حیرت کے طلسم میں جکڑا ہوا تھا اور آخر فسوں ٹوٹا تو تب جب شاہ سائیں اور ملکانی سائیں نے امی کے نزدیک ہی نشست سنبھالی اور گویا ہوئے۔

''بھابھی آپ۔۔۔!'' شاہ سائیں یقیناً کچھ مزید کہنا چاہتے تھے مگر آدھے ادھورے لفظوں ہی کی مدد سے تصدیق چاہی تو اماں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

''ہاں حیدر شاہ میں۔۔۔ سلطان شاہ کی بیوہ!'' اماں کے الفاظ تھے یا کوئی بہت زور کا دھماکا جو ثمینہ اور شاہ زین کی سماعتوں کے عین قریب ہوا تھا۔

''شاہ۔۔۔؟'' دونوں ہی نے زیر لب اس لفظ کو دوہرایا۔

''بابا سائیں کی وفات کے بعد میں نے آپ کو اور بھائی صاحب کو بہت ڈھونڈا، ہر جگہ کوشش کی کہ

www.paksociety.com

کسی طرح آپ دونوں کا پتا چل جائے اور میں آپ کو منالوں، بابا سائیں کی طرف سے آپ سے اور بھائی صاحب سے معافی مانگ کر ان کا جائز حق ان کے حوالے کرسکوں، لیکن میری بہت سی کوششوں کے بعد بھی میں ناکام ہی رہا، لیکن کاش! کہ میں بھائی صاحب کی زندگی میں ہی ان کو ڈھونڈ پاتا۔" شاہ سائیں کو اگر اپنے بھائی کے خاندان کے یوں اچانک مل جانے پر خوشی تھی تو بھائی کی وفات کا دکھ بھی تھا۔ ادھر میران اور شاہ زین یہ سوچ کر کہ وہ دونوں ایک ہی نسب، نسل اور خون سے تعلق رکھتے ہیں عجیب سی کیفیات کا شکار تھے۔

"تم بھلا ہمیں کیسے ڈھونڈ پاتے حیدر! جب بابا سائیں نے میرے حویلی جانے پر سلطان شاہ اور مجھے یہ کہہ کر وہاں سے نکال دیا تھا کہ میں نے ان کی نسل خراب کرکے ان کی ذات پر دھبا لگا دیا ہے اور اس دن کے بعد سے سلطان شاہ نے خود کو ہمیشہ صرف سلطان کہلوایا اور بچوں کے ناموں میں بھی کسی ایسے لفظ کا اضافہ نہیں کیا جس سے بابا سائیں کے نام تک ذرا سا بھی شک جاتا۔" اتنے بڑے انکشافات جو آج ہورہے تھے، اماں نے جانے کب سے اپنے دل میں چھپا رکھے تھے۔

"جو کش بابا سائیں کولوں ہوگیا، جو غلطی ساڈے کولوں ہوگئی تے جو غلطی میرے پتر میران توں ہوئی، تسی سب دل صاف کرکے معاف کردیو۔" ملکانی سائیں نے اماں سمیت ثمینہ اور شاہ زین کو مخاطب کیا۔

"شاہ زین! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے دانستہ طور پر تمہاری زندگی میں بہت سی مشکلات کھڑی کیں، بہت سے ایسے عیب جو سرے سے تم میں تھے ہی نہیں وہ تمہارے نام سے منسوب کرکے اچھالے۔ لیکن یقین کرو کہ میں بہت سخت پچھتاوے کا شکار ہوں، مجھے کسی پل چین نہیں آرہا اور نہ ہی آئے گا، جب تک کہ تم مجھے معاف نہ کردو۔"

"میران تم مجھے شرمندہ کررہے ہو، میرے لیے شاہ سائیں کا مقام اوّل روز سے دل میں بہت بلند تھا اور آج بھی ہے۔ ان کے آنے اور یہ حقیقت کھلنے کے بعد کہ ہم ایک ہی دادا کی اولاد میں سے ہیں میرے لیے کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے لیے دل میں کوئی بھی منفی جذبہ برقرار رکھوں۔" شاہ زین نے گہری سانس لے کر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔

"نہیں یار! تم مجھے معاف کرو میری اپنی وجہ سے بابا سائیں کی وجہ سے نہیں، اور اگر تم چاہو تو جس طرح میں نے بابا سائیں، مہربانو اور اماں سائیں کے سامنے اپنی کی گئی تمام غلطیوں کی تلافی کا ارادہ کیا ہے اس طرح ساری دنیا کے سامنے بھی تم سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔" میران کسی ضدی بچے کی طرح ضد پر اڑا دکھائی دیا تو مہربانو اور ثمینہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیں۔

"میران واقعی اپنی غلطیوں پر پشیمان ہے اور اسی لیے جب میں نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف پچھتاوے سے کچھ حاصل نہیں، جاؤ اور جاکر براہ راست معافی مانگو تب یہ ہم سب کو بھی ساتھ صرف اس لیے لے کر آیا تاکہ اس کی بات نہ ٹالی جائے۔ اس لیے اب بھابھی آپ بھی ہم سب کے سمیت میران کو معاف کردیں اور شاہ زین سے بھی میں یہی امید کرتا ہوں۔" شاہ سائیں نے نپتی انداز اپناتے ہوئے اماں اور پھر شاہ زین کو مخاطب کیا تو اماں مسکرادیں۔

"میں خوش اور میرا اللہ خوش، شاہ زین تم بھی راضی ہوجاؤ تاکہ رب اس سے راضی ہو اور پھر ہم اپنے بیٹے میران کی بارات خوب دھوم دھام سے لے کر جائیں۔" اماں کی بات مکمل ہوتے ہی شاہ زین نے میران کا ہاتھ تھام کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

"بالکل آنٹی! شادی تو اسی دھوم دھام، جوش و خروش اور ڈھول باجوں کے ساتھ ہوگی، لیکن ذرا سی تبدیلی کے ساتھ۔" مہربانو کے مسکرانے پر اس کا ذو معنی انداز شاہ سائیں، میران اور ملکانی سائیں کے

علاوہ ان تینوں کو ہی سمجھ نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

وہ سب لوگ امی کو ہاسپٹل سے لے کر گھر آگئے تھے۔ ذہن و دل ایک عجیب سی سرشاری اور سکون کے عالم میں تھے۔ عائشہ بھابھی کے پاپا بھی امی کو دیکھنے کی غرض سے ان کی طبیعت پوچھنے کے لیے وہیں موجود تھے اور ایسا کافی عرصہ بعد ہوا تھا کہ ان کے ممی، پاپا، ثروت آپا اور ساری فیملی یوں اکٹھی ہوئی ہو۔ مگر اسی دوران اِدھر اُدھر سے عزیز رشتے داروں کی آنے والی فون کالز نے سب کو مضطرب سا کردیا تھا۔ امی کی پریشانی اور پھر گھر میں پیدا اس مسئلے کی وجہ سے وہ سب تو خود ہی اس قدر پریشان تھے کہ نہ تو ٹی وی دیکھنے کا ہوش تھا اور نہ ہی کسی کا فون سننے کا وقت، لہٰذا اب گھر آنے کے بعد اکمل کے متعلق کچھ باتیں اب ہی سننے کو ملی تھیں اور اتفاق سے اس سے پہلے کہ وہ خود اسے فون کرکے تفصیلات معلوم کرتے، اکمل کا فون آگیا۔ وہ گھر کے باہر کھڑا تھا اور ظاہر ہے کہ گھر لاک ہونے کی وجہ ممی، پاپا کا یہاں ہونا تھا، سو اسے بھی یہیں بلالیا گیا۔ ثروت آپا سب کے لیے چائے بنارہی تھیں، جب اکمل آیا۔

اتنے عرصے بعد یوں سب کا اکٹھا بیٹھنا اور خوش باش انداز میں اکٹھا بیٹھنا اکمل کو بھی شاد کر گیا تھا۔ سب کے درمیان بیٹھی ندی کا مسکراتا چہرہ اور باقی سب کے چہروں پر نظر آتا اطمینان اکمل کو وہ تمام پریشانی اور تھکاوٹ بھلا گیا تھا جس کا سامنا اسے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے محکمے کی طرف سے بھی رہا تھا۔

اور پاپا کی طرف سے گردش کرتی باتوں کی تصدیق یا تردید کا سوال کرتے ہوئے اکمل نے انہیں سب باتوں سے من و عن آگاہ کردیا اور مہربانو کے گھر والوں کا اس پر حد درجہ اعتماد اور پھر ان کے دنیا بھر کے سامنے انتظامیہ اور دیگر لوگوں کو قصور وار ٹھہراتے ہوئے مہربانو کو ہر لحاظ سے تحفظ فراہم کرنا ناصر بھائی کو لمحہ بھر کے لیے شرمندہ سا کرگیا تھا۔

اسی دوران سب کے بیچوں بیچ بیٹھی ندی کے ہاتھ میں موجود فون پر ہلکی سی تھرتھراہٹ نے وصول ہونے والے میسج کی اطلاع دی تو نا سمجھی کی کیفیت میں ندی کی نظریں ہلکی سبز اسکرین پر دوڑنے لگیں۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو، مجھے زندگی کی نوید دے
میرے رت جگے ہیں طویل تر، انہیں روشنی کی سعید دے
سرِ لوحِ شام فراق پھر بھی ساتھ تیرا نصیب ہو
وہی پل ہوں جاں سے عزیز تر جنہیں تیرا قرب کشید دے
ہے سماعتوں میں سرور سا وہی لفظ ہیں ابھی گونجتے
ہے کوئی جو ماضی قریب سے مجھے بیتے لمحے خرید دے
وہ شفق شفق سا ہو سامنے اسے دیکھ لیں تو قرار ہو
سرِ خامشی ہو یوں گفتگو کہ جو زندگی کی امید دے
سرِ دشتِ دل جو سحاب تھیں نہیں اب رہیں وہ محبتیں
جو تیرے حوالوں کا ناز تھے انہیں ایک موقع مزید دے
تمہارا شاہ زین"

شاہ زین کا نام پڑھتے ہی دل ایک عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا اور پورے جسم میں گویا سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ آخری ملاقات اور آج کا یہ انداز ایک دوسرے کے اس قدر متضاد تھا کہ ندی سمجھ نہیں پارہی تھی کہ آخر کسے سمجھا جائے۔ کن انکھیوں سے اس نے اپنے اردگرد موجود سب لوگوں کو دیکھا جو بڑے ہی پرلطف انداز میں اس خوش گوار ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شاہ زین کو کوئی جواب دے یا نہ دے اور اگر جواب دے بھی تو کیا؟

دل ہی دل میں خود سے سوال کرتے ہوئے کسی بھی نتیجے پر پہنچ پانے کی صورت میں ندی نے یہ سوچنے کا خیال ملتوی کرنا چاہا مگر اس سے اگلے ہی لمحے ناصر بھائی کے ساتھ شاہ زین اور میران کی اپنی مکمل فیملی سمیت آمد نے اسے ششدر کردیا تھا اور حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ اس کے ساتھ یقینی طور پر لاعلم بھی تھے سوائے ناصر بھائی کے۔ جبھی وہ سب آکر بیٹھے اور سلام دعا اور حال احوال دریافت کرنے کا دور ختم ہوا تو ناصر بھائی نے امی سے ان سب کا تعارف

کروادیا۔

"امی یہ ہے شاہ زین، جس کا خون اب آپ کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔" سب سے آخر میں شاہ زین کا تعارف کروایا گیا تو امی کے دل سے شاہ زین کے لیے دعائیں نکلنے لگیں یوں بھی دعاؤں کی ایک وجہ ندی کے منہ سے اس کی سنی جانے والی باتیں بھی تھیں۔

اتفاق سے ایسا تھا کہ شاہ زین بالکل ندی کے سامنے والی نشست پر براجمان اپنی پُرشوق نظریں گاہے بگاہے اس کے چہرے پر ڈالتا جا رہا تھا۔ کتنا ہی وقت بیت گیا تھا اسے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے اور وہ بھی یوں اتنے پرسکون ماحول میں، دل تو چاہ رہا تھا کہ بس ایک ہی جگہ نظریں جمائے ندی کے چہرے پر ڈولتی اس سرخی کو دیکھتا ہی جائے جو اس کے لیے اجنبی تھی کہ یہ شرمانا گھبرانا تو بھلا ندی کو آتا ہی کب تھا۔

"ندی! ناصر بھائی سے تو میں معافی مانگ چکا ہوں لیکن کیا تم بھی مجھے میری بھابھی بننے سے پہلے معاف کرو گی؟" میران نے سوال کچھ اس انداز میں کیا تھا کہ ندی ہاں، نا میں یوں الجھی کہ سبھی کا قہقہہ ابل پڑا۔

"آپا! ناصر کے ساتھ مل کر یہ پروگرام طے پایا ہے کہ شادی کی ساری رسومات انہی دنوں اور تاریخوں میں صرف دولہا کی تبدیلی سے اس طرح قرار پائیں گی کہ بارات آئے گی تو حویلی سے ہی لیکن دولہا ہوگا شاہ زین۔۔۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔" شاہ سائیں نے امی سے اجازت چاہی تو وہ حالات کی اس دھوپ چھاؤں پر مسکرا دیں اور دل ہی دل میں شکر بجالانے لگیں۔

"اللہ میری بچی سمیت سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

"بھائی صاحب! انتظامات تو آپ کی طرف مہربانو کی شادی کے بھی مکمل ہیں، کیا ہی اچھا ہو اگر آپ مہربانو کو ہماری بیٹی بنا کر اکمل کے ساتھ رخصت کردیں۔"

ممی نے موقع اچھا دیکھا تو اکمل کی ہدایت کے عین مطابق بات چھیڑ دی جو کہ ندی کے لیے بھی ایک خوش گوار خبر بن کر اس کے چہرے پر بھی پھول کھلا گئی تھی۔ مہربانو نے سب کی نظروں سے بچنے کے لیے نظریں جھکالی تھیں۔ اس کا بس چلتا تو ابھی اور اسی وقت وہاں سے غائب ہو جاتی لیکن یقیناً ایسا ممکن نہ تھا۔

"ہمارے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات بھلا کیا ہوگی کہ اکمل جیسا سلجھا ہوا شخص ہماری بیٹی کا ہمسفر ٹھہرے۔"

مبارک سلامت کے شور میں شاہ سائیں وغیرہ کے ساتھ آئی گئی مٹھائی کی ٹوکریاں کھول کر سب کا منہ میٹھا کروایا گیا اور ایسا نادر لمحہ تھا جب سب کے دل ہر قسم کے بغض، نفرت اور رنجشوں سے پاک صرف اور صرف محبت ہی اپنے اندر بسائے ہوئے تھے۔ اماں نے خوشی سے بھیگی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھا۔ ثمینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ندی کے پاس آبیٹھی تھی۔ عائشہ بھابھی مہربانو کے کانوں میں کھسر پھسر کر کے اس کا چہرہ شرم سے سرخ کیے دے رہی تھیں۔

تمام بڑے مل کر چند ہی دنوں بعد ہونے والی تقریبات کو حتمی شکل دے رہے تھے۔

اکمل، میران اور شاہ زین مل کر ایک طرف خوش گپیاں کرنے میں مصروف تھے اور ان مسکراہٹوں، قہقہوں اور محبتوں کو دیکھ کر گھر کے در و دیوار کو بھی اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ مشکل وقت اب گزر چکا تھا اور اٹھکیلیاں کرتی بہاریں تمام تر رنگینیوں، رعنائیوں اور خوشنما سچائیوں کے ساتھ اب سب کی زندگیوں میں یوں داخل ہوئی تھیں کہ اب ایک دوجے کی سچی محبت میں جینا ہی ان کی زندگی کا اصول بھی تھا اور نظریہ بھی۔

||